دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی ماہنامہ

دارالعلوم

زیرِ سرپرستی

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

مدیر مسئول

ریاست علی بجنوری

نگرانِ اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دار العلوم

دار العلوم دیوبند کا علمی دینی

ماہنامہ دار العلوم

شمارہ ۱ ‏65

جلد نمبر ۶۷ | اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء مطابق محرم الحرام سنہ ۱۴۰۴ھ | شمارہ نمبر ۱

سالانہ زرِ اشتراک

ہندوستان سے ۲۵/- روپے

سعودی عرب، کویت، ابوظہبی وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل ۹۰/- روپے

جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل ۱۰۵/- روپے

امریکہ، کناڈا، وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل

۱۱۶/- روپے

پاکستان سے ذریعہ ریل ۴۵/- روپے

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

مجلسِ ادارت

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی

مولانا ریاست علی صاحب (مدیر مسئول)

مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

طابع و ناشر

دار العلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمن صاحب

مہتمم دار العلوم دیوبند

مطبوعہ

محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند

ضروری گزارش

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینہ یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔ بذریعہ سرخ نشان اس کی آپ کو بار بار اطلاع بھی دی جاچکی ہے لہٰذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی پی ہی سے زرِ اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے۔ اگلا شمارہ ۳۱/- روپے کے مطالبہ میں وی پی کر دیا جائیگا

(مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

۱:- ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ خریداری کی اطلاع پاکر اوّل فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

۲:- پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ -/۴۵ روپے مولانا عبد الستار صاحب مقام کرم علی والا تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیجدیں اور انھیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو "رسالہ دار العلوم" کے حساب میں جمع کرلیں۔ ماہ مارچ سے خریداری نمبر بدل دیا گیا ہے۔ خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں۔ خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(مدیر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمن قاسمی

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اسلام کے نام لیوا اور اس کے شیدائیوں کے مقابلہ میں اسلام نے مخالفین و معاندین کی تعداد ہر دور اور ہر زمانہ میں زیادہ رہی ہے اور اسلام کو اپنے ابتدائے قیام سے آج تک نہ جانے کتنے فتنوں سے دوچار ہونا پڑا ہے لیکن اس تاریخی شہادت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ علماء اسلام اور صلحاءِ امت نے ان تمام فتنوں کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا ہے اور اسلام کے حریفوں کو ہر محاذ پر شکست دیکر اسلام کے کارواں کو آگے بڑھایا ہے۔

چنانچہ اسلام پر اوّل ترین حملہ مادیت کی راہ سے ہوا موروثی حکومت کے تسلسل اور دولت و ثروت کی فراوانی سے اسلامی معاشرہ میں تعیش اور راحت پسندی کا عمومی رجحان پیدا ہوگیا تھا جس سے یہ خطرہ ہو چلا تھا کہ خدا نخواستہ ملتِ اسلامیہ بھی اگلی امتوں کی طرح تعیش کی نذر نہ ہو جائے۔ اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے حضراتِ تابعین کی جماعت میدان میں نکل پڑی اور اپنے وعظ و نصیحت، دعوت و تبلیغ اور حرارتِ ایمانی کے ذریعہ مادیت کے اس سیلابِ بلاخیز کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور امت کو اس طوفان سے بچا لیا۔

اسکے بعد اسلام پر دوسرا حملہ عقلیت کی راہ سے ہوا، یونانی فلسفہ نے سطحی ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے کر اسلامی عقاید و اعمال کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا جس سے متاثر ہو امت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ایک کی قیادت فقہاء اور محدثین کر رہے تھے اور دوسرے کی عقلیت زدہ معتزلہ۔ یہ فتنہ چونکہ علمی انداز میں ابھرا تھا اور بدقسمتی سے حکومتِ وقت کی اسے سرپرستی بھی حاصل ہو گئی تھی اس لئے ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ اسلامی علوم و عقائد یونانی افکار و نظریات کے مقابلہ میں اپنی توانائی اور سربلندی قائم نہ رکھ سکیں گے ان سنگین حالات میں علماء ہی کی صف سے ایک بزرگ سر سے کفن باندھ کر میدان میں

کو پڑے اور اس جرآت واستقامت کے ساتھ کہ خلیفۂ وقت مامون الرشید کے تہدیدی فرامین اور معتصم باللہ کے طوق وسلاسل اور تازیانے ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کرسکے بالآخر مردِ جلیل کی ثابت قدمی کی برکت سے یہ فتنہ سرد پڑ گیا۔ اور امت ایک عظیم خطرہ سے مامون ومحفوظ ہو گئی۔

تیسری صدی میں معتزلہ نے اپنی عقلیت پسندی اور اپنی بعض نمایاں شخصیتوں کے سہارے اس سوتے ہوئے فتنہ کو پھر سے جگانا چاہا۔ لیکن امام ابوالحسن اشعری پہلے کے کیمپ کے ایک فرد تھے اور ان کے تمام ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے مقابلہ میں آگئے اور بحث ومناظرہ اور زبانی تفہیم وتقریر کے ذریعہ ان کے حوصلوں کو پست کردیا اور آئندہ ان کے مقابلے کے لئے ایک سو سے زاید نہایت اہم اور وقیع کتابیں بھی تصنیف کردیں۔ اور ساتھ ہی اپنے تلامذہ کی ایک اچھی خاصی جماعت بھی تیار کردی جس نے ہر عالمی محاذ پر معتزلہ کا تعاقب کیا اور انھیں میدان چھوڑنے پر مجبور کردیا۔

معتزلہ کی اس شکست کے بعد اسی فلسفۂ یونان کی کوکھ سے ایک نئے فتنہ نے جنم لیا جو اسلام کے حق میں اعتزال سے بھی زیادہ خطرناک تھا یہ تھا باطنیت کا فتنہ! اس فتنہ کے بانیوں نے اپنی ذہانت اور یونانی فلسفے کی مدد سے دینِ اسلام کے اصول ونصوص اور قطعیات میں تحریف وتنسیخ کا دروازہ کے ساتھ اسلام واہلِ اسلام کے خلاف قوت وطاقت کا بھی مظاہرہ کیا جس کی بناء پر اسلامی حکومتیں عرصہ تک پریشان رہیں۔

اس عظیم فتنہ کی سرکوبی کیلئے بھی صفِ علماء ہی سے ایک مردِ کامل آگئے جنھیں ہم امام غزالی نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔ انھوں نے براہِ راست باطنیوں سے مقابلہ آرائی کے فلسفۂ یونان کو نشانہ بنایا جو اکثر فرقِ باطلہ کا ماخذ ومصدر تھا۔ اور اپنے علمی تبحر، قوتِ استدلال سے اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھدیں اور ان فتنوں کے چشمے کو ہمیشہ کے لئے بند کردیا۔ امام غزالی کے ساتھ اس اہم خدمت میں امام رازی

اور ابن رشد کے کارنامے بھی بھلائے نہیں جا سکتے۔

خیر یہ سارے واقعات تو زمان و مکان کے اعتبار سے آپ سے دور تر ہیں خود اپنے ملک ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالئے۔ عہد اکبری میں "دین الٰہیہ" کے عنوان سے اسلام کے خلاف جو عظیم فتنہ رونما ہوا تھا جس کی پشت پر اکبر جیسے مطلق العنان فرمانروا کی جبروتی طاقت بھی تھی لیکن حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے ہمنوا علماء نے اپنے پایۂ استقامت سے اس فتنہ کے سر کو ہمیشہ کیلئے کچل دیا۔

اور اس آخری دور میں سلطنت برطانیہ کے جلو میں الحاد و زندقہ کا فتنہ نمودار ہوا اس کے مقابلہ میں بھی اگر کوئی جماعت نبرد آزما نظر آتی ہے تو وہ علماء ہی کی جماعت ہے۔ جنھوں نے سفید فام انسان نما وحشی درندوں کے ہر جور و ستم کو برداشت کرکے اسلام اور آئین اسلام کی حفاظت کی اور شہر شہر، قصبہ قصبہ اور قریہ قریہ مدارس کی شکل میں اسلام کی چھاونیاں قائم کرکے پورے ملک میں اسلام کے سپاہیوں کا ایک جال بچھا دیا۔

اور خدا کا شکر ہے کہ اسلام کے یہ سپاہی اسلام کے عقائد و اعمال کی حفاظت و اشاعت میں پورے طور پر معروف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی جڑیں دیگر بلادِ اسلامیہ کے مقابلہ میں ہمارے ملک میں زیادہ مضبوط ہیں اس لئے آج کے کو ان مدارسِ اسلامیہ پر اعتراض کرنے سے پہلے ان کے کارناموں پر غور کرنا چاہئے مجھے یقین ہے کہ جو لوگ ان مدارس پر قوم کے استحصال کا الزام لگاتے ہیں اگر انھیں اسلامی علوم و عقائد اور دینی اخلاق و کردار سے ادنیٰ تعلق بھی ہوتا تو ان مدارس کے خلاف بیانات جاری کرنے کے بجائے وہ ان کی افادیت و ضرورت پر مضامین لکھنے لگیں۔

قسط اول

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی

ملک کا خطرناک رُخ اور دانشور طبقہ کی ذمہ داری

حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہم کا کینیڈی ہال مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں "پیام انسانیت" کے سلسلے کا ایک خطاب ـــــ خدا کرے مولانا کے دل کی یہ آواز اس دور کے غافل انسانیت کے دلوں کو بیدار کرنے میں مؤثر ثابت ہو۔ (ادارہ)

حمد و صلوۃ کے بعد

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْ بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ۔

(سورہ ہود - ۱۱۶)

جو نسلیں تم سے پہلے گزر چکی ہیں، ان میں سے ایسے صاحب شعور کیوں نہ ہوئے جو ملک میں بگاڑ پھیلنے سے روکتے؟ ہاں ایسے تھوڑے تھے جن کو ہم نے بچا لیا اور جو ظالم تھے وہ عیش و آرام کے انھیں اسباب کے چکر میں پڑے رہے جو ان کے لئے مہیا کئے گئے تھے اور وہ مجرم تھے۔

معزز اساتذہ اور عزیز طلبہ!

میں نے آپ کے سامنے قرآن شریف کی ایک آیت پڑھی ہے، اس آیت میں جو درد، جو جوش، جو حقیقت اور طاقت ہے، میں اقرار کرتا ہوں کہ اس کو ترجمہ میں منتقل نہیں کر سکتا، میں قرآن مجید کا طالب علم رہا ہوں اور عربی زبان میں بھی شُد بُد رکھتا ہوں، لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ قرآن مجید کی اس آیت کے اندر (درد کا لفظ استعمال کرنے سے میں ذرا ڈرتا ہوں کہ وہ خدا کا کلام ہے، لیکن درد انگیزی کہنے میں کوئی وجہ نہیں) جو درد انگیزی ہے دوسری زبان میں اس کا منتقل کرنا بہت مشکل ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم سے پہلے کی نسلوں میں ایسے اہل شعور کیوں نہیں رہے۔ جنھیں کچھ بچا کھچا احساس تھا، کچھ ان کے دل پر چوٹ تھی، انسانیت کا کچھ درد تھا زمین میں جو فساد پھیل رہا تھا، جو تباہی مچ رہی تھی، اس سے لوگوں کو منع کرتے، تھوڑے سے ان لوگوں کے علاوہ جو اس کام کے لئے کھڑے ہوئے جن کو ہم نے بچا لیا تھا

باقی تمام لوگ وقت کے دھارے میں بہہ گئے، عیش و عشرت کے جن وسائل کی کثرت تھی اور بگڑی ہوئی صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے جو زریں مواقع حاصل تھے ان سے فائدہ اٹھانے لگے، اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے رہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بگڑی ہوئی صورت حال سے فائدہ اٹھانا زیادہ آسان ہوتا ہے، دوسروں کے گھر ویران کرکے اپنے گھر کی تعمیر اور دوسروں کی لاشوں پر سے گذر کر اپنے مقاصد تک پہنچنے کے مواقع آسانی سے مہیا ہو جاتے ہیں۔ واتبع الذین ظلموا ما اترفوا فیه جو ان کو سامان عیش و عشرت دیا گیا تھا وہ اس میں پھنسے رہ گئے اور وہ مجرم تھے۔

حضرات! انسان کے لئے بیماری کوئی غیر فطری چیز نہیں ہے، صحت کا اعتدال سے ہٹ جانا اور بیماری کا شکار ہو جانا انسانی فطرت کے خلاف نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرح سے زندگی کی علامت ہے، پتھر غلطی نہیں کرسکتا درخت غلطی نہیں کرسکتا انسان ہی غلطی کرتا ہے اس لئے غلطی زیادہ پریشانی کی بات نہیں اور اس پر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، انسانوں کی ایک بڑی جماعت کا کسی غلط راستہ پر پڑ جانا، اپنی سفلی خواہشات اور پست درجہ کے مقاصد کی تکمیل کے پیچھے دیوانہ ہو جانا، تاریخ انسانی کے لئے بھی اور تقدیر انسانی کے لئے بھی شدید تشویش کی بات نہیں ہے، تشویش کی بات یہ ہے کہ بگڑے ہوئے حالات سے پنجہ آزمائی کرنے فساد و انتشار پیدا کرنے والی طاقتوں سے آنکھیں ملانے والے اپنی سہولتوں، عزتوں اور بعض اوقات حکومت و اقتدار کو خطرہ میں ڈال کر میدان میں اترنے والے نایاب ہو جائیں، اصل تشویش کی بات یہ ہے۔

انسان بارہا ایسی بدنیت، فساد انگیز اور انتشار پسند طاقتوں، قیادتوں یا سازشوں کے شکار ہو گئے ہیں اور ایسا نظر آنے لگا ہے کہ انسانیت سکرات کے عالم میں ہے وہ جلد دم توڑ دے گی، لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ ایسے ہر موقعہ پر کچھ ایسے افراد میدان میں آگئے جنھوں نے زمانہ کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر حالات کا مقابلہ کیا، ان غلط رہنمائیوں اور قیادتوں کے مدمقابل بن کر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے جان کی بازی لگادی، انسانی تہذیب کا تسلسل جو ابھی تک قائم ہے، محض نسل تسلسل نہیں، بلکہ انسانی خصوصیات کا تسلسل جو ہر دور میں رہا ہے، انسانی احساسات و جذبات اعلیٰ مقاصد اخلاقی تعلیمات اور ان کی بقاو ترقی کے لئے ہمت و جرأت اور قربانی کا جذبہ

جو اس وقت تک چلا آرہا ہے، یہ درحقیقت انھیں لوگوں کا رہین منت ہے جو بگڑے ہوئے حالات میں میدان میں آئے، اور انھوں نے زمانہ کے چیلنج کو قبول کیا اور ان بگڑے ہوئے حالات سے پنجہ لڑایا اور بعض اوقات زمانہ کی کلائی موڑ دی انھیں لوگوں کی بدولت انسانیت زندہ ہے، ہر زمانہ کے شاعر، ہر زمانہ کے ادیب اور ہر زمانہ کے اہل دل زمانہ کی بگاڑ کی شکایت کرتے چلے آئے ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد بھی انسانی خوبیوں کا سرمایہ، انسانی احساسات و جذبات اور نیک انسان موجود رہے، یہ اصل میں انھیں لوگوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے جو اس وقت اپنے مفادات سے آنکھیں بند کرکے میدان میں آگئے۔ انھوں نے اپنے لئے بھی، اپنے خاندانوں کے لئے بھی اور اپنی آئندہ نسلوں کے لئے بھی خطرہ مول لیا، زمانہ کا رخ موڑ دیا اور انسانیت کی کھیتی ان کی کوششوں اور قربانیوں کے پانی سے ہری ہوگئی۔

حقیقت میں انسانیت کی کھیتی ہر زمانہ میں کھاد چاہتی ہے، جس طرح فرٹیلائزر (FERTILIZERS) زمین میں قوت نمو بڑھاتے ہیں، پیداوار کو طاقت بخشتے ہیں۔ اسی طرح انسانیت کی کھیتی کے لئے بھی کھاد کی ضرورت ہے، انسانیت کی کھیتی کیلئے کھاد " ذاتی مفادات " ہیں۔ اغراض و مفادات کی یہ کھاد جب اس کھیتی میں پڑتی ہے تو وہ کھیتی لہلہا اٹھتی ہے، زمین اپنی پیداوار بڑھا دیتی ہے اور انسانیت کی جھولی بھر جاتی ہے، انسانیت کو زندگی کی ایک نئی قسط عطا ہوجاتی ہے، انسانوں میں زندہ رہنے کا استحقاق اور زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے، زیادہ سے زیادہ وسائل کی فراہمی، سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی، علم، فلسفہ، ادب و شاعری، کوئی چیز بھی انسانیت کی بقا کی ضمانت نہیں، انسانیت کی بقا کی حقیقی ضمانت وہ جری، دلیر جانباز اور دردمند انسان ہیں جو زخمی دل اشکبار آنکھیں اور سلگتے اور جلتے ہوئے دل و دماغ رکھتے ہیں جو ناسازگار حالات کا سامنا کریں چوٹ کو برداشت کریں اور تاریخ کے دھارے کو بدلنے کے لئے جان کی بازی لگادیں، جب کبھی اس جنس کی کمی نظر آتی ہے تو پورا سماج، پورا معاشرہ خطرہ میں پڑجاتا ہے، خواہ دیکھنے میں آپ کو فربہی نظر آئے، جیسے ایک فربہ جسم جس کے اندر بیسیوں قسم کی بیماریاں پرورش پاتی ہیں لیکن اس کی فربہی سب پر پردہ ڈالے رہتی ہے، دیکھنے والوں کو دھوکا ہوتا ہے

اور سمجھتے ہیں کہ یہ انسان بہت تندرست ہے لیکن حقیقت میں وہ بیماریوں کا مجموعہ ہے۔ ایسا ہی سماج کا معاملہ ہے، سماج پر بعض مرتبہ غیر طبعی UNNATURAL اور غیر معتدل فربہی طاری ہوجاتی ہے، اس کے چہرہ پر خون جھلکتا ہوا نظر آتا ہے لیکن جیسے کہ اقبالؔ نے کہا ہے ؎

کچھ اور چیز ہے کہتے ہیں جانِ پاک جسے
یہ آب و رنگ فقط آب و ناں کی ہے بیشی

یعنی پانی اور روٹی کی مقدار جسم میں زیادہ ہوگئی تو چہرہ پر تازگی اور رعنائی نظر آتی ہے لیکن یہ جان پاک نہیں ہے۔ جان پاک تو کچھ اور ہی چیز ہے، سماج کی جان پاک اور سماج کی اصل روح اسکے اندر ایثار کا مادہ ہے، اسکے اندر کی قوت برداشت ہے کہ اسکے افراد کس طرح ناگواریوں کو برداشت کرلیتے ہیں، کتنے کڑوے گھونٹ پی جاتے ہیں، کتنے صدمے برداشت کرلیتے ہیں، وہ جلد اشتعال میں نہیں آتے، آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ سماج میں نیک انسان کی کتنی قدر پائی جاتی ہے، شرافت کی کتنی قدر ہے اس کو لوگ کس نظر سے دیکھتے ہیں احسان کو وہ سماج کتنا مانتا ہے ظلم سے اس کے اندر کتنی نفرت ہے؟

کسی سماج کے لئے سب سے بڑا خطرہ (خواہ وہ دنیا کا قدیم سماج ہو یا جدید سماج ہو) یہ ہے کہ اسکے اندر ظلم کا مزاج پیدا ہوجائے۔ پھر اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اس ظلم کو ناپسند کرنے والے اس معاشرہ میں انگلیوں پر بھی گنے نہ جاسکتے ہوں۔ دوربین تو دوربین، خوردبین سے بھی ان کو دیکھا نہ جاسکتا ہو، پورے سماج میں چند درجن آدمی بھی ایسے نہ ہوں جو اس ظلم کو اس سفاکی کو، اس قساوت اور سنگدلی کو کمزوروں پر دست درازی کو ناپسند کرتے ہوں اور اپنی ناپسندیدگی کا اعلان کرتے ہوں، گھر بیٹھ کر ناپسند کرنے والے تو مل جائیں گے جو چار چھ آدمیوں کی موجودگی میں کہہ دیں کہ یہ ٹھیک نہیں ہورہا ہے۔ بڑے خطرہ کی علامت ہے۔ لیکن اپنی ناپسندیدگی کا اعلان کریں اور اس کو لے کر میدان میں آجائیں۔ ایسے افراد کی جب کسی سماج میں، کسی معاشرے میں کمی ہوتی ہے تو اس سماج، اس معاشرہ اور اس سوسائٹی کو کوئی طاقت نہیں بچا سکتی ہے، جب کسی معاشرہ میں ظلم پھیلنے لگا ہو

اور پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہو، جب ظلم کے لئے یہ معیار بن گیا ہو کہ ظالم کون ہے؟ ظالم کی قومیت کیا ہے؟ ظالم کا فرقہ کیا ہے؟ ظالم کی زبان کیا ہے؟ ظالم کس برادری سے تعلق رکھتا ہے؟ تو انسانیت کے لئے ایک عظیم خطرہ پیدا ہو جاتا ہے جب انسانیت کو اس طرح خانوں میں بانٹا جانے لگے اور ظالم کی بھی قومیت دیکھی جانے لگے، جب اس کا مذہب پوچھا جانے لگے، جب آدمی اخبار میں کسی فساد یا کسی ظلم و زیادتی کی خبر دیکھے تو پہلے اس کی نگاہیں یہ تلاش کریں کہ کس فرقہ کی طرف سے یہ بات شروع ہوئی، اس میں نقصان کس کو پہنچا؟ جب ظلم کے ناپنے اور ظالم ہونے کا فیصلہ کرنے کا یہ پیمانہ بن جاتا ہے کہ وہ کس قوم، فرقہ، طبقہ و برادری سے تعلق رکھتا ہے تو اس وقت معاشرہ کو کوئی طاقت، کوئی ذہانت، کوئی سرمایہ اور بڑے بڑے منصوبے بچا نہیں سکتے۔

اسلام سے پہلے عربوں کا ایک اصول اور مقولہ تھا جس نے محاورہ کی شکل اختیار کر لی تھی کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو، چاہے ظالم ہو، چاہے مظلوم" اور جاہلیت (اسلام سے پہلے) کا عرب اسی اصول پر چل رہا تھا، وہ گویا ایک رہنما اصول تھا اور اور اس نے مذہبی تعلیم کی حیثیت اختیار کر لی تھی، اور یہ بات ایسی مشہور تھی کہ کسی کے سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہو چاہے مظلوم ہو" عربوں کیلئے یہ ایسی جانی بوجھی حقیقت اور روزمرہ کی بدیہی بات تھی کہ اس پر سکوت طاری ہو جانا چاہیئے، پھر اللہ کا رسول کہہ رہا تھا جو غلط بات نہیں کہہ سکتا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی جو تربیت کی تھی اور ان کا جو ذہن بنایا تھا وہ ذہن اس کو ہضم نہیں کر سکا انھوں نے عرض کیا۔

تنصرہ مظلوما، فکیف تنصرہ ظالما (ہم مظلوم کی مدد تو کریں، لیکن ظالم کی مدد کیسے کریں) سوسائٹی اور معاشرہ کی جو سب سے مستحکم بنیاد ہے اور جس پر سب سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا ہے وہ ایسی ہی تربیت ہے کہ اس کا ذوق سلیم بلکہ اس کا قلب سلیم (ذوق سلیم نے بار بار دھوکہ کھایا ہے، لیکن قلب سلیم دھوکہ نہیں کھاتا) اس کا قلب سلیم اس پر جاگ جائے، چوکنا ہو جائے اور پوچھنے لگے کہ یہ کیسے ہو سکتا

ہے کہ معاشرہ میں ظلم ہوتا رہے اور بڑھتا اور پنپتا رہے۔؟

یہ اخلاقی تربیت اور اس کی کامیابی کا آخری نمونہ ہے، دنیا کی تاریخ میں ایسی تربیت کی مثال ملنی مشکل ہے کہ ایک طرف صحابہ کرام اطاعت وانقیاد کا بے مثال نمونہ تھے وہ آنحضرتؐ پر پروانہ وار نثار ہوتے تھے اور یہ نہیں پوچھتے تھے کہ ہمارا انجام کیا ہوگا؟ پروانے شمع پر گرتے ہیں اور جان دیتے ہیں اور انجام نہیں سوچتے، صحابہ کی جماعت رسول کے کہنے کے بعد پھر غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن اب اسکے اندر ایسا انقلاب آچکا تھا، معاشرہ کو ایسی مستحکم، ایسی بلند اور ایسی اصولی بنیاد پر اٹھایا گیا تھا کہ جب آپ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہو چاہے مظلوم تو صحابہ کرام تڑپ اٹھے اور پورے ادب سے کہا کہ یا رسول اللہ! آپ نے اب تک ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم مظلوم کی مدد کریں اور ظالم کا ساتھ نہ دیں، کیا ہم اپنی قوت سماعت پر شک کریں شاید ہمارے کانوں نے اسے صحیح نہ سنا ہو؟ آپ فرمائیں کہ ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟ آپ نے فرمایا ہاں ظالم کا بھی مدد ہوتی ہے! مظلوم کی مدد یہ ہے کہ اس پر ظلم نہ ہونے دو ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسکا ہاتھ پکڑ لو اسکو ظلم کرنے نہ دو

یہ وہ چیز ہے جو انسانی معاشرہ کو بچانے والی ہے کہ بلا تفریق مذہب وملت بلا تفریق قومیت، بلا تفریق ذات برادری، اپنے تعلقات کو بالکل نظر انداز اور مفادات کو بالکل فراموش کرکے؛ یہ نہ دیکھا جائے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے؟ ظالم کوئی بھی ہو اپنی قوم کا محبوب ترین فرد ہو، قائد ہو، رہنما ہو، اس کو ظلم سے روکا جائے۔

اگر معاشرہ میں اخلاقی جرأت، یہ غیر جانبداری اور خلوص کی یہ طاقت ہے تو معاشرہ بچ سکتا ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس معاشرہ کو نہیں بچا سکتی، آج ہندوستان میں کمی اسی چیز کی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے اس معاشرہ سے متعلق خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔

جب کسی انسانی نسل پر، کسی دور میں اخلاقی گراوٹ کا ایسا دورہ پڑتا ہے یا وہ کسی انسانی سازش یا کسی انتشار پسند طاقت کا شکار ہوتی ہے اس وقت دو طبقے میدان میں آتے ہیں، ایک دانشوروں کا طبقہ اور ایک مذہبی انسانوں کا طبقہ، یہ دو طبقے ہیں جن میں بگاڑ CORRUPTION سب سے آخر میں داخل

ہوتا ہے تاریخ ہمیں بتاتی ہے، قیاس بھی یہی چاہتا ہے اور عقل سلیم COMMON SENSE کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ سب سے اخیر میں جس طبقہ میں فساد داخل ہوتا ہے اور خرابی آتی ہے وہ مذہبی آدمیوں کا طبقہ ہے، اسکے بعد دانشوروں کا طبقہ ہے، لیکن جب دانشوروں میں اور مذہبی انسانوں میں بھی بگاڑ CORRUPTION آجائے تو پھر اس معاشرہ کا (یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ خدا حافظ ہے، خدا حافظ ہو تو اطمینان ہی اطمینان ہے) لیکن پھر اس معاشرہ کو کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔

اس وقت ضرورت ہے کہ دانشور اور مذہبی انسان میدان میں آئیں اس وقت ضرورت ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں سے، ہماری دانش گاہوں سے افراد نکلیں اور معاشرہ کو بچانے کی کوشش کریں۔ مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ کا مؤرخ جب اس معاشرہ کی تاریخ لکھے گا جس میں ہم اور آپ سانس لے رہے ہیں تو کہیں یہ نہ لکھے کہ یہ حادثہ اس وقت پیش آیا جب ملک میں مُسلِم یُونیورسٹی موجود تھی دارالعُلوم دیوبند موجود تھا ندوۃ العُلماء موجود تھا اور جامعہ مِلّیہ موجود تھی، ان کی موجودگی بلکہ ان کی دیوار کے نیچے اور ان کے سایہ میں سب کچھ ہو رہا تھا اس وقت ضرورت یہ ہے کہ آپ میدان میں آئیں اور بگاڑ کا، بے اصولی کا، بددیانتی کا رشوت خوری اور ذخیرہ اندوزی کا، اقربا نوازی اور خویش پروری کا، سنگدلی کا اور (مجھے معاف کریں) سب سے بڑھ کر سفاکی اور درندگی کا جو دھارا بہہ رہا ہے اور ملک تباہی و بربادی کے جس رخ پر جا رہا ہے اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں۔

ایسے جوان مردوں کے لئے پہلی شرط تو یہ ہے کہ ان کے اندر اخلاقی جرأت ہو اور وہ بے لوث ہوں، وہ اس معاشرہ کو دینے کے لئے آئیں، لینے کے لئے نہ آئیں اس بگڑے ہوئے نظام سے فائدہ اٹھانے کے لئے نہ آئیں، بلکہ ان کی شان وہ ہو جو ایرانی شاعر عرفی نے بیان کی ہے

عدیل ہمت ما نیست فطرت عرفی   کہ حاتم دگراں و گدائے خویشتن است

ان لوگوں کی جو ایسے بحران (CRISIS) کے موقعہ پر میدان میں آتے ہیں اور پورے معاشرہ کو اور پوری قوم کو موت کے منہ سے نکال دیتے ہیں ان کی تعریف یہ ہے

کہ وہ ساقی کی فطرت اور مزاج رکھتے ہیں، ساقی سب کو پلاتا ہے اور خود نہیں پیتا۔ یہ مرحلہ بہت مشکل ہے اور دل پر پتھر رکھے بغیر طے نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے بغیر کام بھی نہیں چلتا۔ میں اپنے عزیز طلبہ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آج ہندوستان میں عزت کا مقام جبھی حاصل ہوگا جب آپ اس ملک کو بچانے کی مخلصانہ، جاں نثارانہ، بے غرضانہ اور آخر میں کہتا ہوں کہ مجنونانہ کوشش کریں گے، کسی قوم کو، کسی جماعت کو عزت کا مقام اسی وقت ملتا ہے جب وہ کسی کو فائدہ پہونچائے اور خود فائدہ نہ اٹھائے۔ جب وہ اپنا دامن جھاڑ دے اور دوسروں کی جھولی بھر دے۔ وہ اپنے گھر میں اندھیرا پسند کرے اور دوسروں کے گھر میں چراغ جلائے، جب وہ اپنے بچوں کو بھوکا سلائے ابوطلحہ انصاری کی طرح، اور مہمانوں کو شکم سیر کر کے اٹھائے، آپ تاریخ پڑھیں تو آپ پر بہت سے حقائق کھلیں گے اور عبرت و موعظت کا بڑا سامان ملے گا لیکن افسوس ہے کہ تاریخی واقعات کی تہہ میں اور انقلابات سلطنت کے پس پردہ جو حقائق (FACTORS) کام کرتے ہیں، جو مخفی طاقتیں کام کرتی ہیں جو وقت کی رفتار بدل دیتی ہیں، کسی ملک کی قسمت بدل دیتی ہیں، ہمارے مورخوں کی نگاہ وہاں تک نہیں جاتی، وہ زیادہ تر یہی لکھتے ہیں کہ فلاں بادشاہ آیا اور فلاں بادشاہ گیا، فلاں نے فلاں ملک پر حملہ کیا اور فتح یاب ہوا، اور فلاں نے شکست کھائی، لیکن اس کے پیچھے کیا طاقتیں کام کر رہی تھیں؟ حقیقی اسباب کیا تھے؟ پھر اسباب کے پیچھے اسباب ہوتے ہیں جیسے مولانا روم کہتے ہیں کہ گرمی کا زمانہ ہے اور ایک شخص پنکھا جھل رہا ہے تو کوتاہ بیں یہ کہے گا کہ یہ ہوا اس پنکھے کی وجہ سے آرہی ہے، لیکن جس کی نظر اور گہری ہوگی وہ کہے گا کہ نہیں، اصل میں اس ہاتھ کا کارنامہ ہے جو اس کو ہلا رہا ہے پنکھا زمین پر رکھ دو تو ہوا نہیں آئے گی، اس سے بھی جس کی گہری نظر ہے وہ کہے گا کہ نہیں یہ ہاتھ بھی نہیں بلکہ انسان کا ارادہ ہے، اس کی نیک نیتی اور خدمت کرنے کا جذبہ اصل میں اس کا سرچشمہ ہے، اگر کسی کی نظر اور گہری ہے تو وہ کہے گا کہ نہیں۔ یہ نہ پنکھے کا کارنامہ ہے، نہ ہاتھ کا فی ہے، ہوا ضروری تھی یہ ہوا جو فضا میں ہے یہ ہوا اصل میں محسن ہے، لیکن جس کی نظر اس سے بھی آگے ہے وہ کہے گا نہیں اس ہوا کا جو خالق ہے، اس ہوا کو جو حکم دینے والا ہے، جس نے اس کو طاقت دی ہے اور آزادی

بخشی ہے کہ وہ چلے وہ ہے محسن حقیقی۔ تاریخ کا معاملہ بھی یہی ہے کہ واقعات کے پیچھے اسباب ہوتے ہیں۔ ان اسباب کے پیچھے دوسرے اسباب ہوتے ہیں اور ان اسباب کے درمیان رشتہ ہوتا ہے۔ آپ جو یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی سدھار پیدا ہوا اور کوئی سماج موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہونے کے بعد اچانک تازہ دم ہو کر اٹھا اور اس نے پھر زندگی کا سفر شروع کیا اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا شروع کیا۔ اس کے پیچھے کسی ایسی جماعت، کچھ ایسے افراد کا ہاتھ ہوتا ہے جو اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈالتے ہیں اور جو اپنے نفع سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

کسی ایسے ملک میں جیسے کہ ہندوستان ہے۔ جو مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے، جو مختلف قوموں کا وطن ہے۔ اور یہاں کی ایک تاریخ ہے، یہاں کچھ غلط فہمیاں اور تلخیاں رہی ہیں، کچھ سیاسی کشمکش رہی ہے وہاں موجودہ حالات میں (میں آپ سے صفائی کے ساتھ کہتا ہوں) کم سے کم مسلمانوں کے لئے کوئی راستہ عزت حاصل کرنے کا نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ اس ملک کی اخلاقی قیادت کا جھنڈا بلند کریں اور اس ملک کو بچانے کی مخلصانہ کوشش کریں، وہ ثابت کر دیں کہ ملک کو بچانے کے لئے اپنے کو خطرہ میں ڈال سکتے ہیں اور اس ملک کو بچانے میں ان کی کوئی گروہی و مذہبی غرض قومی غرض یا انفرادی غرض نہیں ہے۔ وہ اپنی کوششوں کا اجر صرف خدا سے چاہتے ہیں وہ ایک عقیدہ اور جذبہ کے تحت میدان میں آتے ہیں کہ یہ ملک امانت ہے اس ملک کے باشندے خدا کے پیدا کئے ہوئے انسان ہیں۔ ان کے ساتھ ہمیں رہنا ہے اگر یہ نہ ہوں گے تو ہم بھی نہیں ہوں گے۔

اس وقت ہندوستان میں یہ موڑ آ گیا ہے کہ پڑھے لکھوں کی جماعت، دانشوروں کی جماعت ہماری جامعات اور دانش گاہوں کے فضلاء کی جماعت میدان میں آئے۔ اس وقت میدان دانشوروں کا ہے، مذہبی آدمیوں کا اور ایسے بے لاگ انسانوں کا ہے جو سیاسی پارٹیوں اور سیاسی مفادات سے بالکل آنکھیں بند کر لیں۔ اس سے کوئی مطلب نہ رکھیں کہ ایسا کرنے سے ہماری پارٹی پاور میں آئے گی۔ اور ہمیں حکومت ملے گی۔ ایسی مثالیں بھی تاریخ میں ملتی ہیں کہ جب موقع آیا انعام ملنے کا اور جب حکومت تھالی میں رکھ کر پیش کی جانے لگی تو اللہ کے بندوں نے کہا کہ ہم نے اس لئے کام نہیں کیا تھا، ہم نے تو ہمدردی میں کیا تھا، خلوص کے ساتھ

کیا تھا، خدا کی خوشنودی کیلئے کیا تھا، ہمیں اس کا انعام نہیں لینا ہے۔

حضرات! یہ حقیقت ہے جسے ہمارے نوجوانوں کو خاص طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ یہ بڑا اہم، بڑا قیمتی وقت ہے ایسے زریں مواقع اقوام و ملل کی تاریخ میں اور ملکوں کی تاریخ میں کبھی صدیوں کے بعد آتے ہیں۔ یہ ایک زرّیں موقع خدا کی طرف سے ہم کو اور آپ کو دیا گیا ہے، خدا کا شکر ہے اس کا احسان کہ اس نے آپ کو اس دور میں پیدا کیا۔ لوگ تو ہمدردی کریں گے، کہیں گے ہم کاش ایسے دور میں نہ پیدا ہوئے ہوتے۔ لیکن جواں مردوں اور بلند ہمت لوگوں کے سوچنے کا طریقہ یہ نہیں ہے۔ میں آپکو مبارکباد دیتا ہوں، یہاں کے مسلمانوں کو مبارکباد دیتا ہوں، میں یہاں کے تمام خیر پسند عناصر کو اور تمام انسانیت دوست جماعتوں اور دماغوں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ خدا نے ان کو ایک ایسے دور میں پیدا کیا اور ایک ایسا موقع عطا کیا ہے جسے ہمارے اسلاف بڑی بڑی عبادتوں سے حاصل نہیں کر سکتے تھے، وہ رات رات بھر جاگ کر نہیں حاصل کر سکتے تھے۔ وہ دن دن بھر روزہ رکھ کر نہیں حاصل کر سکتے تھے۔ آج وہ موقع ہمکو حاصل ہے کہ آج ہم انسانیت کی بے لوث خدمت کر کے اور ملک کو بچانے کیلئے جان لڑا کر اس ملک کو خطرہ کے دہانے سے اژدہے کے منہ سے نکال سکتے ہیں۔

میں بغیر کسی معذرت کے صاف کہتا ہوں کہ میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے میں نہیں سمجھتا کہ ہمارا ہندوستانی معاشرہ کبھی ایسے خطرہ سے دوچار رہا ہو جیسا کہ اس دور میں اس تینتیس چونتیس ۳۴ برس کے اندر رہا ہے میں بالکل اس پر معذرت نہیں کروں گا۔ ہندوستان کا جسم بارہا زار و نزار رہا ہندوستان نے شکست کھائی، ہندوستان پر برطانیہ کی بدیسی حکومت رہی یہ سب تاریخی واقعات ہیں۔ لیکن ہندوستان کی روح اور ہندوستان کا ضمیر اس طرح سے کمزور نہیں ہوا تھا کہ اس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ ہندوستان کی تاریخ میں کبھی ایسا دور نہیں آیا کہ برائی کو اور ظلم کو اس آسانی کے ساتھ گوارا کر لیا گیا ہو جس آسانی کے ساتھ آج گوارا کیا جا رہا ہے بلکہ اس کو فلسفہ بنایا جا رہا ہے اس کے ذریعہ سے جماعتوں کو مستحکم اور منظم کیا جا رہا ہے، اس کے ذریعہ ہندوستان میں حکومت کا استحقاق ثابت کیا جا رہا ہے ہندوستان سینکڑوں مصیبتوں کا شکار رہا ہے لیکن ضمیر انسانی، ہندوستان کا (conscience)

زندہ رہا اسنے اپنا کام کرنا، اپنا (FUNCTION) کبھی چھوڑا نہیں۔ اس وقت جو اصل خطرے کی چیز ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگی ہی عبارت ہے تیرے جینے سے

مجھے یہ ڈر ہے کہ ہندوستان کا ضمیر کہیں مر نہ گیا ہو، اس سے بڑھ کر کوئی خطرہ کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اتنے بڑے ملک میں کسی دل دردمند کی کراہ سننے میں نہیں آتی کہ تڑپ کر کسی نے فریاد کی ہو اور قلندرانہ شان سے میدان میں آگیا ہو۔ ؎

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں درنمی آید، سواراں را چہ شد

لیڈر اپنی جگہ پر، سیاسی جماعتیں اپنی جگہ پر، دانش گاہیں اپنی جگہ پر، لائبریریاں اپنی جگہ پر، خطیب و مقرر اپنی جگہ پر، ذہین (INTELLIGENT) بلکہ (GENEU S) قسم کے انسان اپنی جگہ پر لیکن وہ ضمیر کہاں ہے جو معاشرہ کی اس پستی پر، انسانیت کی اس بے بسی پر خون کے آنسو رو دے؟ انسانیت کی حفاظت اسی ضمیر نے کی ہے، تفنگ و شمشیر نے نہیں کی ہے، سپاہ اور فوج نے نہیں کی ہے، شاہی خزانوں اور دولت کی بہتات نے نہیں کی ہے، علم انسانی کی ترقی نے نہیں کی ہے، ٹکنالوجی اور سائنس نے نہیں کی ہے بلکہ ایک ضمیر انسانی ہے جو سب پر غالب آیا، جہاں وسائل نہیں تھے اس نے وہاں وسائل پیدا کر لئے، آپ دیکھئے جب کسی کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور جب کوئی بے قرار ہوتا ہے، وہ کیا کر لیتا ہے؟ ایک آدمی کے پاس وسائل کا ڈھیر ہے۔ لیکن اس کے دل میں درد نہیں ہے اور کچھ کرنے کا ارادہ ہی نہیں ہے تو وقت گزر جاتا ہے اور وہ کچھ نہیں کرتا۔ مجھے جو خطرہ ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی معاشرہ کا ضمیر تعطل کا شکار ہو گیا ہے، اس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہے، یہ خطرہ کی بات ہے اس لئے کہ انسانیت کی آس اسی ضمیر سے ہے اس دنیا میں جو کچھ خیر و فلاح کی امید ہے وہ اسی ضمیر سے ہے۔ جب یہ ضمیر بیدار ہوتا ہے اس کو خدا کی طرف سے روشنی ملتی ہے۔ پیغمبروں کی طرف سے

از ابوالحسن اعظمی فاضل دیوبند
استاذ قراءت دارالعلوم دیوبند

عماد المقرئین محقق جزری رحمہ اللہ
حالات و سوانح

نام و نسب صاحب "المقدمۃ الجزریہ" حضرت ناظم علامہ کا نام نامی "محمد" ہے۔ کنیت ابوالخیر ہے اور لقب شمس الدین ہے۔ والد اور دادا دونوں کا نام محمد ہے سلسلۂ نسب یہ ہے:۔

ابوالخیر شمس الدین محمد بن محمد بن محمد بن علی بن یوسف بن عمر الجزری الدمشقی الشافعی۔ علامہ جزری اصلاً دمشقی ہیں، جزیرہ ابن عمر کی طرف نسبت کر کے الجزری کہلاتے ہیں یہ جزیرہ بلاد مشرق میں واقع ہے۔ شہر "موصل" کے شمال میں ہے (صاحب قاموس کی رائے پر) جسے نہر دجلہ ہلال کی طرح احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یہ "ابن عمر" صحابی نہیں جیسا کہ بعض کو وہم ہوا ہے بلکہ یہ عبدالعزیز بن عمر برقعیدی ہیں جو اس جزیرہ کے آباد کنندہ ہیں۔ اس لئے ان کی طرف منسوب ہے۔ علامہ ابوالولید ابن شحنہ حنفی نے اپنی کتاب "روضۃ المناظر فی علم الاوائل والاواخر" میں اس کو صراحۃً بیان کیا ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ "المنح الفکریہ" میں لکھتے ہیں:۔

والجزری نسبۃ الی جزیرۃ ابن عمر ببلاد الشرق کذا ذکرہ ابن المصنف وتبعہ من بعدہ فی اجمالہ وفی القاموس بلد شمال الموصل تحیط بہ دجلۃ مثل الھلال واللہ اعلم بالحال۔ والمراد بابن عمر الذی نسب الیہ ھو عبدالعزیز بن عمر وھو رجل من اھل برقعید من عمل الموصل بناھا فنسب الیہ۔ نص علی ذالک العلامۃ ابوالولید بن

الشحنة الحنفی فی تاریخہ "روضۃ الناظر فی علم الاوائل والاواخر"

فلیس بصحابی کما توھمہ بعضھم (المنح ص)

آپ "امام جزری" اور "محقق جزری" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں

پیدائش اور تعلیم آپ کے والد محمد ایک تاجر آدمی تھے۔ ایک مدت دراز (۴۰ سال) تک آپ اولاد سے محروم رہے۔ جب آپ خانۂ کعبہ پہنچے تو آپ نے زمزم پی کر ولد صالح و عالم کی دعا مانگی۔ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ جامع صفات اور باکمال فرزند عطا فرمایا۔ اور ۲۵ رمضان المبارک شب شنبہ ۷۵۱ھ بمقام دمشق بعد نماز تراویح آپ کی ولادت ہوئی اور یہیں نشو ونما پائی اور عمر کے چودہویں سال میں آپ نے حفظ قرآن مکمل کیا۔

علی محمد الضباع لکھتے ہیں۔

"ولد رحمہ اللہ بدمشق الشام فی لیلۃ السبت الخامس والعشرین من شھر رمضان سنۃ احدیٰ وخمسین وسبع مائۃ ھجریۃ ونشأ بھا واتم حفظ القرآن فی الرابعۃ عشرۃ من عمرہ" (دیباچہ نشر ص)

حفظ قرآن اور ابتدائی علوم کی تحصیل کے بعد شیخ ابو محمد عبدالوہاب ابن یوسف عرف ابن السلار (و ۶۹۸ھ م ۷۸۲ھ) ابن ابراہیم الطحان اور شیخ احمد ابن رجب (م ۷۷۴ھ) سے قرأت سبعہ افراداً پڑھی۔ اوّل الذکر کے بارے میں "غایۃ النہایہ" کے اندر بڑے وقیع الفاظ کا استعمال فرمایا ہے۔ آخر میں رقم طراز ہیں۔

"فاجازنی وانا مراھق دون البلوغ بکثیر" یعنی بلوغ سے بہت پہلے ہی آپ نے مجھے اجازت دیدی اس کے بعد قرأت سبعہ جمعاً شیخ ابراہیم حموی سے پڑھی۔ نیز شیخ ابوالمعالی محمد بن احمد بن اللبان (و ۷۰۸ھ م ۷۷۶ھ) سے جمع قرأت بشمول کتب پڑھی۔

حج وزیارت اور تعلیمی اسفار ۷۶۸ھ میں حج بیت اللہ شریف کی زیارت نصیب ہوئی اور مدینہ منورہ میں وہاں کے خطیب ابو عبداللہ محمد بن صالح الخطیب سے بشمول "التیسیر" اور "الکافی" پڑھی شیخ ابن الجندی کے بارے میں

لکھتے ہیں:۔

ولما وصل الی قولہ تعالیٰ - إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ توفی ابن الجندی وورد عنہ رحمہ اللہ تعالیٰ انہ استجازہ فاجازہ واشهد علیہ...... قبل وفاتہ " یعنی اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ الخ تک پہنچتے پہنچتے ابن الجندی کی وفات ہوگئی۔ نیز یہ کہ آپ نے وفات سے پہلے علامہ کی درخواست پر اجازت وشہادت بھی دی (نشر ج ۱ ص ۳)

ابن الجندی اور ابن الصائغ سے تکمیل قرارت کے بعد آپ نے دمشق کی جانب مراجعت فرمائی ۔ پھر دوبارہ مصر آئے اور ابن الصائغ سے دوبارہ بشمول کتب ثلاثہ مذکورہ مع "المستنیر" التذکرہ " الارشادین" اور "التجرید" پڑھی ۔ اس کے بعد ابن البغدادی سے اربعۃ عشر (واسوی یزیدی) پڑھی

دمشق کا پھر ایک سفر فرمایا اور وہاں قاضی ابو یوسف احمد بن الحسین الکفری الحنفی (و ۶۹۱ھ م ۷۷۶ھ) سے قرارت سبعہ جمعاً ختم کی ۔

تیسری بار پھر دیار مصر پہنچے اور کتاب " الاعلان" للامام ابی القاسم عبدالرحمٰن الصفراوی الاسکندری (م ۶۳۶ھ) وغیرہ شیخ عبدالوہاب القروی سے پڑھی نیز دوسری بہت سی کتب قرارت کی سماعت کی اور اجازت لی اور ان کے اندر مہارت تامہ پیدا کی۔

علم قراءت میں علامہ کے شیوخ کی تعداد تقریباً چالیس ہے

دمشق میں حافظ شرف الدین عبدالمؤمن الدمیاطی (م ۷۰۵ھ) سے حدیث اور امام اسنوی (و ۷۰۴ھ م ۷۷۲ھ) سے فقہ حاصل کیا۔ اسکے بعد دیار مصر پہنچے اور یہاں اصول معانی اور بیان وغیرہ کی تعلیم متعدد شیوخ سے حاصل کی۔ جن میں سے شیخ ضیاء الدین سعد اللہ القزمی (م ۷۸۶ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

ناظم علام کو انتہا کی اجازت شیخ الاسلام المقری المحدث المورخ ابوالفداء حافظ عماد الدین اسماعیل ابن کثیر (و ۷۰۱ھ م ۷۷۴ھ) نے اپنی وفات سے پہلے ۷۷۴ھ

میں اور شیخ ضیاء الدین نے ۷۷۸ھ میں عطا کی اسی طرح شیخ الاسلام علامہ بلقینی نے بھی ۷۸۵ھ میں اجازت سے نوازا. علاوہ ازیں اور بہت سے ارباب فضل وکمال سے آپ کو اجازت حاصل تھی۔ مؤرخ سخاوی (م ۸۳۱ھ م ۹۰۲ھ) کا بیان ہے۔

"اذن لہ غیر واحد بالافتاء والتدریس والاقراء" یعنی آپ کو بہت سے علماء نے افتاء، درس وتدریس، اور تعلیم قرارت کی اجازت دی۔

درس و افتاء

اسی زمانہ سے آپ نے پڑھانا بھی شروع کر دیا. چنانچہ جامع اموی میں قبہ نسر کے نیچے بیٹھ کر کئی سال تک درس دیا. ۷۹۳ھ میں آپ شام کے قاضی مقرر ہوئے. تقریباً پانچ سال تک مصر میں قیام فرمایا. شام اور مصر میں بہت بڑی تعداد نے آپ سے عشرہ قرارت کی تحصیل وتکمیل کی جن میں خاص طور پر ابن ناظم، ابوبکر احمد شیخ محمد الحسین بن سلیمان الشیرازی، شیخ ابو بکر بن مصبح الحموی، شیخ نجیب الدین عبداللہ بن قطب بن الحسن البیہقی، شیخ احمد بن محمود ابن احمد الحجازی الضریر المحب محمد بن احمد الہام۔ شیخ الخطیب مومن بن علی بن محمد الرومی وغیرہم حضرات قابل ذکر ہیں۔

پانچ سال کے بعد حکومت مصر سے بگاڑ کے نتیجے میں آپ روم تشریف لے گئے اور بمقام "بروصہ،، سلطان عادل بایزید العثمانی کے یہاں ۷۹۸ھ میں قیام کیا اور یہاں ۸۰۵ھ تک تقریباً سات سال بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ مقیم رہے اور علم قرارت وحدیث کی خوب اشاعت کی۔ مخلوق کو آپکے ذریعہ نفع عظیم پہنچا. تمام ممالکِ اسلامیہ میں خصوصیت کے ساتھ امام قرارت تسلیم کیے گئے۔

یہاں بھی بہت سے لوگوں نے آپ سے عشرہ قرارت کی تکمیل کی جن میں شیخ احمد ابن رجب، شیخ سلیمان الرومی، شیخ مومن بن عبداللہ، فاضل علی پاشا۔ الامام صفر شاہ۔ شیخ الصالح الزاھد فخر الدین الیاس بن عبداللہ کے دونوں صاحبزادے محمد ومحمود اور شہر العلایا کے شیخ ابوسعید بن بشلش بن فنتشا وغیرہم قابل ذکر ہیں۔

سلطان بایزید کے انتقال کے بعد ۸۰۵ھ میں فتنۂ تیمور لنگ کے نتیجہ میں آپ کو امیر تیمور کے ساتھ اس کے مترجم کی حیثیت سے ماوراء النہر جانا پڑا۔

آپ کا مرتبہ تیمور کے نزدیک

امیر تیمور دو چار ہی صحبتوں میں آپ کی بزرگی کا قائل ہو گیا۔ موصوف کی عظمت و جلالت اور تیمور کی گرویدگی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ تیمور جب سمرقند پہنچا تو اُس نے ایک عظیم الشان دعوت کا انتظام کیا جس میں اعیان مملکت، عمائد سلطنت اور علماء و فقراء سب کو مدعو کیا اس دعوت میں محقق شہیر سید شریف جرجانی (م ۸۱۶ھ) بھی مدعو تھے۔ جب سید شریف تشریف لائے تو تیمور نے آپ کو محقق جزری کے پیچھے بٹھایا۔ حاضرین مجلس میں سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ نے سید شریف جرجانی کو ابن الجزری کے پیچھے کیوں بٹھایا جبکہ آپ سب سے آگے بٹھائے جانے کے لائق تھے۔ امیر تیمور نے فوراً جواب دیا۔

"کیف لا اقدم رجلاً عارفاً بالکتاب والسنۃ ویشا درما اشکل علیہ فیھما النبی صلے اللہ علیہ وسلم بالذات فیحل"	یعنی بھلا میں ایسے شخص کو مقدم کیوں نہ کروں جو کتاب اللہ اور سنۃ رسول اللہ کا عالم ہو۔ اور جب اُسے کتاب و سنت میں کوئی اشکال پیش آتا ہو تو وہ اس کو براہِ راست بارگاہ رسالت سے حل کر لیتا ہو (الشقائق النعمانیہ)

* * * * * * *

درویش خدامست

بہر حال یہاں شہر "کش" اور "سمرقند" میں کچھ روز ٹھہرے یہاں بھی آپ سے لوگوں نے قرأت کی تحصیل کی۔ شہر "کش" میں آپ سے عشرہ قرأت کی تکمیل کرنے والوں میں چند یہ ہیں:۔

شیخ عبدالقادر طلہ الرومی، حافظ بایزید الکشی، حافظ محمود المقری شیخ القراء شہر کش

پھر جب ۸۰۷ھ میں تیمور لنگ کا انتقال ہو گیا تو آپ ماوراء النہر سے خراسان تشریف لے گئے اور ہرات، یزد اور اصفہان میں کچھ عرصہ قیام کیا۔

ہرات میں آپ نے بڑی جماعت کو عشرۂ قرأت پڑھایا۔ یہاں آپ سے تکمیل کرنے والے حضرات میں جمال محمد بن محمد..... معروف بہ ابن افتخار الہروی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور یزد کے دوران قیام میں عشرہ قرأت کی تکمیل کرنے والی جماعت میں المقری نفیس شمس الدین ابن محمد الدباغ البغدادی قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح اصفہان میں بھی ایک جماعت

نے آپ سے اکتساب فیض کیا۔

رمضان ۸۰۸ھ میں آپ شیراز پہنچے، یہاں والیٔ شیراز امیر محمد عمر نے آپ کو ٹھہرا لیا ایک بڑی جماعت نے یہاں بھی آپ سے قرارت عشرہ کی تکمیل کی۔ جن میں سید محمد ابن احمد ابن حیدر السبعی، امام الدین۔ عبدالرحیم الاصبہانی، نجم الدین الخلال اور ابوبکر الجبنی ہیں۔

شیراز میں والیٔ شیراز کے اصرار سے کچھ عرصہ خلاف طبیعت خدمت قضا بھی انجام دی، آپ نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا جس میں تجوید و قرارت کی تعلیم کا انتظام کیا تھا۔

اس دوران میں حکومتیں بدلتی رہیں۔ چنانچہ آپ وہاں سے بددل ہو کر نکلے اور بصرہ پہنچے یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد آپ نجد میں عنیزہ نامی ایک قریہ میں پہنچے۔ پھر تقریباً ۸۲۳ھ۔ میں یہاں سے بیت اللہ الحرام کے قصد سے مکہ معظمہ پہنچے اور حرمین کے قریب مقیم رہے۔

آپ کی زندگی اس شعر کے بالکل مصداق تھی۔

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند

فضل و کمال کے ساتھ آپ دولتِ حسن کے مالک تھے اور بڑے صاحب ثروت اور فصیح و بلیغ تھے۔

تقی الدین احمد المقریزی (م ۸۴۵ھ) درر العقود الفریدہ فی تراجم الاعیان المفیدہ میں لکھتے ہیں کہ "علامہ جزری نہایت فصیح و بلیغ اور شکیل و جمیل تھے۔"

حافظ ابن حجر العسقلانیؒ فرماتے ہیں "آپ بڑے صاحب ثروت، حسین اور فصیح و بلیغ تھے اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ نظم و نثر اور بہت سے خطبات زندہ ثبوت اور یادگار ہیں۔

قوت حافظہ اور ذوق شعر و سخن

مبدأ فیاض سے آپ نے نہایت قوی حافظہ پایا تھا۔ جو چیز ایک بار یاد کر لی گویا وہ کتاب کی طرح محفوظ ہو گئی۔ زبردست قوت حافظہ کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ کو سند کے ساتھ ایک لاکھ احادیث یاد تھیں۔ آپ کے اشتغال بالحدیث کے بارے میں علامہ شمس الدین الدیری رقمطراز ہیں۔

سبب اشتغالہ بالحدیث بعد ان یعنی فن قرارت سے شغف دانہماک کے بعد علم حدیث

کان مکبًا علیٰ علم القراءت ان بعض اشیاخہ قال لہٗ ذات یوم انّ علم القراءت کثیر التعب قلیل الجدوی وانت رائق وفہمک فائق ومن کان ھٰکذا فعلیہ بعلم الحدیث فاجتھد فیہ حتیٰ حفظ مائۃ الف حدیث باسانیدھا (فہرس الفہارس ازعلامہ عبدالحئی الادریسی الکتانی ج ۱ ص۲۲۳)

اشتغال کا سبب یہ ہوا کہ ایک دن آپ کے بعض شیوخ (غالبًا ابو بکر بن المحب المقدسی) نے آپ سے فرمایا کہ فن قراءت کثیر المشقت اور قلیل المنفعت ہے اور تم عمدہ اور جید ذہن وفہم کے مالک ہو۔ ایسے شخص کو فن حدیث پر محنت کرنی چاہئے۔ چنانچہ آپنے اس فن پر محنت کی اور ایک لاکھ احادیث بالاسناد یاد کرلی۔

اس سے آپ کے فہیم وذکی اور ذکی وذہین ہونے کا واضح ثبوت ملتا ہے

شعر وشاعری سے آپ کو فطری ذوق تھا۔ آپنے اس ملکہ سے قرآن وحدیث کی خدمت کی فن تجوید وقراءت کے اصول وضوابط منضبط کئے۔ "مقدمۃ الجزریہ" آپ کی زندہ یادگار اور بیّن ثبوت ہے۔ اور مدارس عربیہ کے نصاب تجوید میں داخل ہے۔ "طیبۃ النشر" میں عشرہ قراءت کے اختلافات کو ایک ہزار اشعار میں نظم کیا۔ جو آج بھی داخل نصاب ہے اور پڑھایا جاتا ہے آپنے اٹھارہ سال کی عمر میں "الھدایہ فی تتمۃ العشرہ" تصنیف فرمائی جو علامہ شاطبیؒ کے شہرۂ آفاق قصیدۂ شاطبیہ کا ہموزن وہم قافیہ ہے اہل فن خوب جانتے ہیں کہ علامہ شاطبیؒ کے .... وزن وطرز پر لکھنا انتہائی مشکل کام ہے۔ خود محقق جزری لکھتے ہیں۔

من وقف علی قصیدتیہ علم مقدار ما اٰتاہ اللہ تعالیٰ فی ذالک خصوصًا اللّامیۃ التی عجز البلغا من بعدہ عن معارضتھا فانہ لا یعرف مقدارھا الا من نظم علی منوالھا وقابل بینھا وبین ما نظم علی طریقھا"

یعنی اللہ تعالیٰ نے فن قراءت میں شاطبیؒ کو کیسا علم عطا فرمایا تھا اس کا اندازہ اس کو ہوگا جو آپ کے دونوں قصیدوں سے واقف ہوگا علی الخصوص قصیدۂ لامیہ کہ جس کے مقابلہ اور جواب سے بعد کے بلغاء بھی عاجز آگئے اور اس کی فصاحت وبلاغت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے، اس کی قدر ومنزلت وہی جان سکتا ہے جس نے اس انداز پر نظم لکھی ہو یا اس کا موازنہ کیا ہو

٭ - ٭ - ٭ - ٭

اندازہ کیجئے کہ محقق جزری کو کس قدر قدرت حاصل تھی کہ عنفوان شباب ہی میں شاطبیہ کے انداز پر اس کا تتمہ اور تکملہ لکھدیا۔

مذاقِ زبان و ادب اللہ تعالیٰ نے آپ کو زبان و ادب کا مذاق نہایت شستہ و پاکیزہ عطا فرمایا تھا۔ ذیل میں ہم بطور نمونہ چند اشعار درج کرتے ہیں۔

الا ای سوّد الوجہ الخطایا	و بیضت السنون سواد شعری
یعنی میری خطاؤں نے مجھے سیاہ رو کردیا	اور سنین عمر نے میرے بال سفید کردیئے
فما بعد التقیٰ الا المصلی !!	وما بعد المصلّیٰ غیر قبری
تقویٰ کے بعد مصلیٰ کے سوا کچھ نہیں	اور مصلے کے بعد میری قبر کے سوا کچھ نہیں

"شمائلِ ترمذی کے ختم پر اپنی مجلس میں فی البدیہہ ذیل کے دو شعر نظم فرمائیے"

اخلّا ئی فان شط الحبیب وربعہ	وعز تلا قیہ و ناءت منازلہ
فان فاتکم ان تبصروہ بعینہ	فما فاتکم بالسمع ھٰذا شمائلہ

یعنی۔۔۔ میرے دوستو! اگر محبوب اور اس کا مکان دور ہے اور اس سے ملاقات مشکل اور اس کے کوچہ تک رسائی دشوار ہے۔ اور اگر تم سے یہ نہ ہو سکے کہ تم انھیں آنکھوں سے دیکھ سکو۔ (تو کیا ہوا) یہ تو ممکن ہے کہ ان کے خصائل و شمائل کا حال سنو۔

دیارِ حبیب ؐ کے متعلق دو شعر ملاحظہ ہو۔

مدینۃ خیر الخلق تجلو ناظری	فلا تعزلونی ان قتلت بھا عشقا

دیارِ حبیب افضل المخلوقات کا شہر مدینہ میری آنکھوں کو جلا بخشتا ہے۔ پس اگر میں اس کے عشق میں مارا جاؤں تو مجھے ملامت نہ کرو۔

وقد قیل فی زرق العیون شامۃ	وعندی ان الیمن فی عینھا الزرقا

اور یوں کہا جاتا ہے کہ چشم نیلگوں منحوس ہوتی ہے مگر میرے نزدیک تو اس کے عین الز (چشمۂ آب) میں نیک فالی ہی نیک فالی ہے۔

مسند احمد کے خاتمہ پر آپ نے ایک عالیہ نظم فرمایا تھا جس کے اندر غضب کا زور اور معانی ہے جسے ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ آپ کی نظم کے بارے میں "نظم وسط" کے الفاظ لکھتے ہیں یعنی آپ کی نظم اوسط درجہ کی ہوتی ہے لیکن معلوم ہونا چاہیئے کہ شعر و سخن کا تعلق بیشتر حسن وعشق سے ہے جس کا اصلی جوہر غزل کے اندر ہی کھلتا ہے۔ خالص علمی اور فنّی چیزیں نظم کرنے میں ظاہر ہے رنگینیٔ بیان نہیں پیدا کی جا سکتی۔ اور محقق علامہ جزریؒ ہمیشہ مجرّد رہے۔ اسی کے ساتھ آپ کا میدان خالص علمی میدان رہا ہے اس لئے اگر آپ کی نظمیں "اوسط درجہ" کی ہیں تو یہ بھی آپ کا بہت بڑا کمال ہے۔

اخلاق وعادات | ناظم علام رحمۃ اللہ علیہ اخلاق وعادات میں شیریں گفتار، بےحد ملنسار اور خدا ترس تھے۔ گفت گو کرتے تو معلوم ہوتا کہ گویا منہ سے بجائے الفاظ کے پھول جھڑ رہے ہیں فصاحت وبلاغت تو آپ کے ہر فقرے سے ٹپکتی تھی مزاج میں تواضع وانکساری تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دولت دنیا سے حصّہ وافر فرمایا تھا۔ لوگوں کے ساتھ احسان وسلوک سے پیش آتے۔ خصوصیت سے اہل حجاز کے ساتھ بہت احسان کرتے تھے۔

عبادت وریاضت | آپ کو عبادت وریاضت کا خاص ذوق تھا حالانکہ تصنیف و تالیف اور تعلیم وتحقیق جیسے اہم مشاغل اور مصروفیات کے ساتھ اگر فرائض وسنن ہی پر اکتفا کرتے تو بھی بہت تھا۔ مگر نہیں علم کے ساتھ زیور عمل سے بھی آپ آراستہ تھے۔ عبادت وریاضت میں محنت شاقہ برداشت کرتے تھے۔ زندگی کے مشاغلِ ثلثہ میں تیسرا مشغلہ عبادت وریاضت ہی تھا اور سفر وحضر میں کبھی فرق نہ پڑتا۔ انضباط اوقات کا بےحد خیال رکھتے تھے۔ غرضیکہ آپ بڑے عابد اور نہایت مرتاض بزرگ تھے۔

شبانہ روز کے مشاغل | رات دن کے مشاغل آپ کے اس طرح تھے۔ (۱) قرارت کی تعلیم اور درس حدیث (۲) تصنیف وتالیف (۳) عبادت وذکر الٰہی میں مواظبت، اس میں ذرا بھی فرق نہ آنے دیتا، پوری عمر آپ ان پر بڑی پابندی سے عمل پیرا رہے۔ اسی کے ساتھ ہر مہینے تین روزے رکھتے تھے، دوشنبہ اور پنجشنبہ کے روزے اس کے علاوہ تھے۔ جو کبھی قضا نہیں ہوئے۔ شب بیداری اور تہجد گذاری میں سفر کی حالت ہو یا قیام کی کبھی فرق نہ آیا۔

انھیں فضل وکمال اور زہد وورع کی بنا پر آپ مرجع خلائق بن گئے۔ جہاں رہے طالبان

خالی از مبالغہ ہے۔ بلاشبہ آپ کے بعد ایسا ماہر فن پیدا نہیں ہوا۔
نشر کبیر جیسا کہ معلوم ہوا دو ضخیم جلدوں میں (۹۸۴ صفحات پر مشتمل) ہے "مگر مصنف کا کمال بالائے کمال دیکھئے کہ جب اس ضخیم اور تقریباً ایک ہزار صفحات کی کتاب کی تلخیص اور اسکے اصل مقصد یعنی قراءات عشرہ اور اسکے مسائل کا عطر نکالنے پر آئے تو صرف ایکہزار اشعار میں نظم فرمادیا۔ بیشک یہ آپ ہی کا حصہ تھا اور جس نے یہ کہا ہے خوب ہی کہا ہے ؎

داستان شوق جب پھیلی تو لامحدود تھی　　اور جب سمٹی تو تیرا نام بن کر رہ گئی

علامہ شاطبیؒ کے بعد بلاشبہ فن قراءت میں سب سے زیادہ مرکزی حیثیت آپ ہی کو حاصل ہوئی

المقدمۃ الجزریۃ

محقق جزری کی یوں تو تمام ہی تصنیفات و تالیفات مشہور اور گرانقدر ہیں لیکن سب سے زیادہ شہرت اور تلقی بالقبول آپکے قصیدہ "المقدمۃ الجزریۃ" کو حاصل ہوئی واقعہ یہ ہے کہ عمریں بیتیں، صدیاں گذریں، مگر اس قصیدے کی شہرت، مقبولیت اور چمک دمک ماند نہیں پڑی، علیٰ حالہ باقی ہے۔ ایک سو سات اشعار پر مشتمل یہ قصیدہ آج بھی شائقین فن تجوید کے لئے "سرمۂ بصر" "بلکہ" "در نجف" ہے۔

بلاشبہ ہر زمانہ میں علماء اور قراء نے اس فن میں نثراً اور نظماً قصائد اور رسائل لکھے اور وہ اپنی جگہ مفید بھی ہیں مگر جو حیثیت اور عظمت مقدمۃ الجزریہ کو نصیب ہوئی وہ اظہر من الشمس فی نصف النہار ہے۔ تقریباً تمام ہی مدارس میں یہ قصیدہ داخل نصاب بلکہ مدار سند ہے۔ بلاشبہ۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشآء۔

مقدمہ کی شروحات

مقدمہ الجزریہ کی اہمیت اور مقبولیت عامہ کی وجہ سے ہر زمانہ میں اصحاب فن نے اس کی جانب التفات اور اعتنا کیا اور اسے حل کرنے کے لئے حواشی اور شرح لکھے اب تک کی تلاش و جستجو کے نتیجے میں اس کی شروحات کے بارے میں جو معلومات فراہم ہو سکیں ان کا تذکرہ اختصار کے ساتھ درج ذیل ہے۔

سب سے پہلی (۱) شرح ابن ناظمؒ ابوبکر الجزری کی ہے صاحب کشف الظنون نے اس کا نام "الحواشی المفہمہ" لکھا ہے۔ دوسری (۲) شرح الدقائق المحکمۃ" فی شرح المقدمۃ شیخ الاسلام زین الدین ابو یحییٰ زکریا انصاری مصری کی ہے۔ جو عموماً ملا علی قاریؒ کی المنح الفکریہ کے حاشیہ پر ہوتی ہے۔ تیسری (۳) شرح "العقود السنیۃ" ہے۔ یہ شیخ شہاب الدین احمد بن محمد بن ابی بکر قسطلانی مصری کی ہے۔

چوتھی(۴) شرح "الفوائد الدّریۃ" رضی الدین محمد ابن ابراہیم حلبی کی ہے اسی طرح شیخ شمس(۵) الدین دلجی شارحِ شفا، احمد(۶) بن مصطفیٰ طاش کبری زادہ(۷) شیخ زین الدین نے شرحیں لکھیں، عبدالدائم خالد ازہری نے دو(۸) شرحیں لکھیں جن کا نام "الحواشی الازہریۃ فی الفاظ المقدمۃ الجزریۃ" اور (۹) "شرح جزری" ہیں، دسویں(۱۰) شرح زبان ترکی شیخ محمد بن عمر آفندی کی ہے۔

گیارہویں(۱۱) شرح "المنح الفکریہ" ملا علی قاری کی ہے مقدمہ کی تمام شروحات میں جو شہرت اور اہمیت علی قاری کی المنح کو حاصل ہوئی کسی اور شرح کو نہ ہوئی بعد کے تقریباً تمام شراح نے اس کو اولین ماخذ کی حیثیت دی ہے، بیحد عمدہ مفید اور محققانہ شرح ہے پہلے ہر شعر کی نحوی تحقیق کی ہے اس کے بعد اس کے جملہ متعلقات کو بیان فرمایا ہے، ساتھ ہی جابجا اس کے دوسرے شارح۔ شارح یمنی اور شارح مصری کا کلام ذکر کرتے ہوئے رد بھی فرمایا اور محاکمہ بھی کیا ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ یہ مفید ترین شرح اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہوتی جارہی ہے۔ اس کی اہمیت کا تقاضہ ہے کہ یہ ہر جگہ سے چھپے اور بیش از بیش اس سے استفادہ کیا جائے۔ کاش ناشرین کتب اور اہل شروت متعلقین فن اس کی طرف توجہ فرمائے۔

ان کے علاوہ شیخ محمد مکی نصر اپنی کتاب "نہایۃ القول المفید" کے دیباچے میں مزید کچھ شروحات کا ذکر فرمایا ہے جیسے شرح المقدسی، شرح ابن غازی، شرح القسطلانی، شرح ابن الناظم شرح حلبی اور شرح شیخ حجازی، جن میں سے چند کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔

فارسی اور اُردو میں بھی مقدمہ کی متعدد شروحات لکھی گئیں، مولانا کرامت علی جونپوری نے ایک شرح اوّلاً فارسی میں لکھی تھی پھر اُسے اُردو میں منتقل فرمایا جو "شرح جزری ہندی" کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے

مولانا سعید احمد اجڑاروی کی شرح القلائد الجوہریہ کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ مولانا قاری محمد سلیمان صاحبؒ دیوبندی سابق شیخ التجوید مظاہر علوم سہارنپور نے مقدمہ کی ایک مختصر شرح ۱۳۵۳ھ میں لکھی جو "فوائد مرضیہ" کے نام سے معلوم ومشہور ہے۔ مختصر شرحوں میں نہایت عمدہ اور مفید ہے۔

تین اُردو شرحیں پاکستان سے نکلی ہیں ایک تو "العطایا الوھبیہ" مولانا قاری رحیم بخش صاحبؒ

پانی پتی سابق صدر شعبہ تجوید و قراءت مدرسہ خیر المدارس ملتان کی ہے، آسان اور مفید شرح ہے فن کی تمام ضروریات کو یکجا کرنے کی کامیاب کوشش ہے، ۱۳۸۰ھ میں چھپی ہے۔

دوسری شرح مولانا عاشق الٰہی صاحب مظاہری بلند شہری کی ہے ۱۳۹۳ھ میں طبع ہوئی ہے اور اچھی شرح ہے۔ اکثر ضروریات فن کیلئے جامع ہے۔

تیسری شرح "الجواهر النقية" ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب اسم بامسمّیٰ ہے

چوتھی شرح خود راقم الحروف نے .... "النفحة العنبرية" کے نام سے لکھی ہے جو پہلی بار ۱۹۸۰ء اور دوسری بار ۱۹۸۱ء میں طبع ہوئی، ایک سو صفحات میں ایک مفصل مقدمہ بھی شامل کتاب ہے جسمیں فن تجوید پر صدی وار علمی و تصنیفی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کل صفحات چار سو انواسی ہیں اس کتاب میں خود صاحب قصیدہ کی شہرۂ آفاق کتاب النشر فی القراءات العشر اور اس قصیدہ کے عظیم شارح ملا علی قاری کی شرح المنح الفكرية المذکور کا جوہری خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے

مولانا قاری اظہر حسن امروہوی کی بھی ایک مفصل شرح جزری ہے مگر قلمی ہے تاحال غیر مطبوعہ ہے موصوف نے مقدمہ کا ایک سلیس، عام فہم اور تشریحی ترجمہ بھی فرمایا ہے جو بہت مفید ہے ساتھ ہی حضرت فخر القراء المقری محب الدین احمد صاحب مرحوم کا عربی حاشیہ بھی ہے جو عربی داں طلبہ کے لئے دوچند فائدے کی چیز ہے۔

علامہ جزری کی دیگر تصانیف محقق جزری کا خاص فن اگرچہ قراءت تھا مگر جیسا کہ گذرا، آپ عظیم المرتبت محدث اور فقیہ بھی تھے، نیز دوسرے علوم میں بھی آپ مہارت اور کمال رکھتے تھے۔ چنانچہ تفسیر، حدیث، اور فقہ وغیرہ میں قابل قدر اور اہم تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ چند کتابوں کا تذکرہ درج ذیل ہے كفاية الالمعی فی آیۃ یا ارض ابلعی:۔ اس کتاب کے اندر سورۂ ہود کی اس آیت کے وجوہ اعجاز بیان فرمایا ہے۔

الحصن الحصين من كلام سيد المرسلين۔ اذکار و ادعیہ کا بہترین اور مشہور مجموعہ ہے جس میں اکیس محدثین کرام کی کتابوں سے اقتباسات درج ہیں پھر اس کتاب کی تلخیص میں دو مجموعے الحصن الحصین جنۃ الحصن الحصین۔ مرتب فرمائے۔

التوضيح فی شرح المصابیح۔ یہ علامہ بغوی کی مصابیح السنۃ کی شرح ہے

الهدايه فی فنون الحديث (منظوم) البداية فی علوم الرواية، الاولوية فی احاديث الاوّلية، عقد اللآلی فی الاحاديث المسلسلة العوالی، التعريف بالمولد الشريف،

عرف التعریف بالمولد الشریف یہ التعریف بالمولد الشریف کا خلاصہ ہے۔

المسند الاحمد فیما یتعلق بمسند احمد، القصد الاحمد فی رجال احمد المصعد الاحمد فی ختم مسانید احمد۔ الاجلال والتعظیم فی مقام ابراهیم، الابانة فی العمرة من الجعرانہ اسنی المطالب فی مناقب علی بن ابی طالب، الجوهر فی النحو (منظوم) وغیرہ۔

وفات ۷۵۱ھ سے ۸۳۳ھ تک بعمر ۸۲ سال علوم وفنون کا یہ نیر تاباں اور درویش خداست، اطراف واکناف عالم کو منور کرتا ہوا جمعہ ۵ ربیع الاول ۸۳۳ھ بمقام شیراز غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ کی تدفین اپنے مدرسہ دار القرار میں ہوئی۔ آپ کے جنازے میں ہجوم کا یہ عالم تھا کہ جنازے کو کندھا دینا تو ایک طرف، اسکو چھو لینے والوں کو بوسہ دینے کے لئے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ جنہیں جنازہ تک رسائی نہ ہوئی وہ ہاتھ لگانے والوں کے ہاتھوں کو تبرکاً بوسہ دیتے۔ بلاشبہ آپ کے انتقال سے اسلام کی ایک عظیم الشان یادگار کا خاتمہ ہوگیا۔

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تھدما

باقیات صالحات ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، ہندی کے اس ضرب المثل کی بلامبالغہ آپ اور آپ کے اولاد واحفاد مصداق تھیں۔ باقیات صالحات کہنا بالکل بجا ہے۔

علامہ جزریؒ نے اولاد میں چھ فرزند اور تین دختر نیک اختر یادگار چھوڑی تھیں۔

(۱) ابو الفتح محمد الجزری سب سے بڑے تھے ۲ ربیع الاول ۷۷۷ھ میں دمشق میں آپ کی ولادت ہوئی آپ بید ذکی و ذہین تھے۔ آپ کی ذہانت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ آٹھ برس کی مختصر عمر میں قرآن مجید کے حافظ ہو گئے تھے۔ اس کے بعد علامہ شاطبیؒ کے مشہور قصائد "رائیہ" اور "لامیہ" نیز التنبیہ، الفیہ، حدیث الفیہ، نحو منہاج الاصول بیضاوی اور بلقینی کی تلخیص کو بچپن ہی میں یاد کر لیا تھا۔ والد کے بعض اساتذہ وشیوخ سے حدیث اور قرات پڑھی۔ علامہ بلقینی اور ابناسی سے فقہ کی تحصیل کی۔ اُن بزرگوں سے درس وتدریس اور افتاء کی بھی آپ کو اجازت حاصل تھی، حافظ ابن حجرؒ انباء الغمر میں رقمطراز ہیں۔

کان جید الذھن مستحضراً کثیراً — آپ بید ذہین تھے، فقہ کا اکثر حصہ مستحضر تھا۔

من الفقه ويقرئ بالروايات و	قرآن روایات کے ساتھ پڑھاتے تھے، بہت
يخطب جيداً وقد رايته بالقاهرة	عمدہ خطیب تھے میں نے آپ کو قاہرہ میں دیکھا ہے

۷۸۱ھ میں دمشق میں بعارضہ طاعون انتقال فرمایا۔

(۲) ابوبکر احمد الجزری ۱۷ رمضان المبارک ۷۸۰ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ بڑے بھائی کی طرح آپ بھی بڑے ذہین تھے۔ قرآن مجید کے حافظ دس برس کی عمر میں ہو گئے تھے اس کے بعد علامہ شاطبیؒ کے قصائد اور اپنے والد بزرگوار کی بعض تالیفات بھی یاد کیں۔ والد ماجد ہی سے النشر اور طیبۃ النشر پڑھی اور متعدد بار اس کا سماع کیا۔ اپنے بھائی ابوالفتح سے قرأت اثنا عشرہ کی مشق کی۔ حافظ عراقی جیسے نادرۂ روزگار محدثین سے حدیث کی تحصیل کی

(۳) ابوالخیر محمد الجزری ۷۸۹ھ میں بمقام شباش جلجولیہ میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ ائمہ وقت اور ارباب فضل وکمال سے علوم وفنون کی تحصیل کی۔ آپ قرآن پاک کے حافظ تھے۔ اپنے والد ماجد سے قرأت عشرہ کی مشق کی، نیز والد کی تصنیفات میں سے "مقدمہ الجزریہ" "طیبۃ النشر" اور جوہرہ کو یاد کیا۔ علامہ جزریؒ نے طبقات القراء میں ابوبکر احمد اور ابوالخیر محمد دونوں کا تذکرہ کیا ہے

تین فرزند ابوالقاسم علی، ابوالبقا اسماعیل، اور ابوالفضل اسحاق بھی بلند پایہ قاری اور محدث تھے۔ دختران نیک اختر ہیں فاطمہ، عائشہ، سلمیٰ، اور خدیجہ تھیں۔ یہ سب بھی جلیل القدر محدثہ اور فن قرأت کی ماہر تھیں طاش کبری زادہ کے الفاظ آپ کی تمام اولاد کے فضل وکمال کی تصدیق کرتے ہیں۔

جميع هؤلاء من القراء المجودين	یہ سب فن تجوید کے ماہر، بہترین قاری
والمرتلين ومن الحفاظ المحدثين	اور حافظ حدیث تھے۔

اللهم اغفر لهم وارحمهم مغفرةً كاملة ورحمة واسعة

عالم اسلام کے مسائل
از مولانا امین الحق محمودی کشور گنج بنگلہ دیش
مکتوب بنگلہ دیش بنام مدیر

بنگلہ دیش میں عیسائی مشنری سرگرمیاں

بنگلہ دیش کو مختلف قسم کی پریشانیاں لاحق ہیں۔ ان میں سے تعلیم اور زراعت کا مسئلہ اہم ترین ہے۔ عام طور پر جہالت غالب ہونے کی وجہ سے یہ سب مشکلات درپیش ہیں مسلمانوں کے ہر ہر فرد کو چاہیئے کہ ان مشکلات پر غور کریں اور حل کرنے کی کوشش کریں۔ یہاں کا اقتصادی حال بھی ناگفتہ بہ ہے کوئی مال کے پہاڑ بنا کر عیاشانہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور نیچے والے طبقات کس طرح ایام گزار رہے ہیں اس طرف دیکھنے کی نہ ان کو خواہش ہے اور نہ فرصت۔ نیچے والے طبقات چاہے مریں یا جئیں اس سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ اس قسم کے لوگ یہاں پانچ فیصد ہیں اور بقیہ ۹۵ فیصدی جہالت اور مسکنت کی تاریکیوں میں ڈوبی ہے۔ اوپر والے طبقات روز بروز ترقی کر رہے ہیں اور ماتحت طبقات اس کے برعکس تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کو نہ تو رہنے سہنے کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ جہاں جگہ ملی وہیں پناہ لیا۔ ریل اسٹیشن بس اسٹنڈ لانچ ٹرمینل۔ راستہ گھاٹ میں ڈیرہ ڈالے ہوئے۔ اور نہ ان کے کھانے کا کوئی انتظام ہے۔ ہوٹل سے جو باسی سڑی ہوئی چیزیں پھینکی جاتی ہیں اسے اٹھا کر بھوک کو رفع کرتے ہیں۔ مسلمان قوم اپنے چوپاتے جانور کو جس قدر محنت اور عزت سے پالتے ہیں اس اشرف المخلوقات کو اس کا ایک فیصدی بھی عزت نہیں ملتی۔ ان کی اولاد بھی بڑے خطرات سے دوچار ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اور بوڑھے دربدر پھر کر بھیک مانگ کر گزارہ کرتے ہیں! ان کے نوجوان تو جس طرح بھی ہو گذار لیتے ہیں لیکن لڑکیوں کا مسئلہ بڑا سنگین ہے وہ بعد بلوغت کسی کام کے لائق ہوتی ہیں۔ بلکہ عموماً دہ نخش

کاموں میں مبتلا ہو جاتی ہیں اب سوال یہ ہے کہ ان کو راہِ راست پر لانے کا ذمہ دار کون ہے ؟ بلکہ ان کو انسانیت کے درجہ میں لانے کے لئے ذمہ داری ہمارے اوپر عائد ہوتی ہے ۔

یہ لوگ صرف حیوانوں کی طرح زندگی بسر کر کے اپنا ایمان وعقیدہ کو بھی کھو بیٹھے ہیں ۔ مذہب اور ملت سے ان کا کوئی رابطہ نہیں ۔ بنگلہ دیش میں اسلامی محاذ موجود ہے ۔ مگر کوئی محاذ بھی ان کی تہذیبی وتمدنی فکر نہیں کر رہا ۔ یہاں کے علماء اور ائمہ مساجد بھی ان سے تغافل برت رہے ہیں ایسے نازک حالات میں عیسائی مشنری کو سنہری موقعہ مل گیا ہے وہ لوگ کروڑوں روپے خرچ کر کے رہائش کے مکانات اسکول کالج تیار کر کے یتیم ونادار لوگوں کی خدمت گذاری کر کے ان کو مرتد بناتے جا رہے ہیں ۔ بنگلہ دیش میں تقریباً دو لاکھ مساجد موجود ہیں ۔ ان مساجد کو مرکز بنا کر اپنے نادار دوست احباب بھائی برادر پڑوسی لوگوں کی خدمت گذاری کر کے ان کو دین کے بارے میں واقفیت کرانے سے چونکہ ہم عاجز ہیں تو کیا اس سے ہماری قومیت وملت برقرار رہے گی ؟ نتیجۃً ہر سال ہزارہا مسلمان عیسائی اور مرتد بنتے جا رہے ہیں مندرجہ ذیل اعداد سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کس تیز رفتاری سے یہاں کے لوگ مرتد بن رہے ہیں سنہ ۱۹۵۱ء میں مرتدین ایک لاکھ سات ہزار تھے اور سنہ ۱۹۶۱ء میں وہ تعداد بڑھ کر ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گئی سنہ ۱۹۷۴ء کی مردم شماری میں دیکھا گیا کہ عیسائی مرتدین کی تعداد ڈھائی لاکھ ہے ۔ راج شاہی ضلع میں سنہ ۱۹۵۹ء میں عیسائیوں کی تعداد گیارہ ہزار سات سو اور سنہ ۱۹۷۴ء میں نصف لاکھ آٹھ سو تک پہنچ گئی ۔ ضلع چاٹگام میں سنہ ۱۹۵۱ء میں عیسائیوں کی تعداد بارہ ہزار چار سو تھی ۔ اور سنہ ۱۹۷۴ء میں سولہ ہزار ہو گئی ۔

ضلع دیناجپور میں ان کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے ۔ اس ضلع میں بہاڑی قوم کی تعداد تیس ہزار ہے ۔ ان میں بیس ہزار عیسائی بن گئے ۔ عنقریب سب کے سب عیسائی بن جائیں گے ۔ وہاں اسکول ، ہسپتال ، ٹیکنیکل اسکول اور خدمت گار ہیں وہ سب عیسائیوں کے ذریعہ چل رہے ہیں ۔ اور عیسائیوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے ۔ دوسری طرف سنہ ۱۹۵۱ء بنگلہ دیش میں مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ سے زائد اور سنہ ۱۹۷۴ء میں چھ کروڑ

سے زائد ہوگئی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد ۸۸٪ ہے لیکن اصل میں تقسیم ملک کے بعد مغربی بنگال، بہار۔ یوپی سے آنے والے مسلمانوں کی وجہ سے یہ تعداد بڑھ گئی تھی ۱۹۷۱ء کے بعد اس ملک میں بڑی تیز رفتاری سے عیسائیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور عیسائی لوگ جائز اور ناجائز طریقوں سے اپنی تعداد بڑھانے میں کوشاں ہیں اور ادھر مسلمان ضبطِ تولید اور تحدید نسل کے قانون بنا کر اپنی تعداد کم کرنے میں کوشاں ہیں یہی سلسلہ بنگلہ دیش میں جاری رہا تو مستقبل قریب میں لبنان کا جو حال پیش آیا بنگلہ دیش میں وہی حال پیش آئے گا۔

عیسائی مختلف قسم کے ادارے قائم کرکے عیسائیت کی اشاعت کر رہے ہیں۔ ایک معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے ادارے تین سو کے قریب ہیں۔ یہ لوگ خدمت گذاری کے نام سے جو مختلف شعبے چلا رہے ہیں۔ وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(الف) تعلیمی اسکیم جو علاقہ غیر متمدن اور جہالت اس پر غالب ہو وہاں تعلیمی ادارے قائم کرکے لوگوں کو ضروری کپڑا دوا اور کھانے کا انتظام کرکے انکے لڑکے لڑکیاں کو اپنے مشنری اسکولوں میں تعلیم دے رہے ہیں اور وظیفے دیکر بڑے شوق سے وہ لوگ تعلیم حاصل کر رہے ہے اور عیسائی لوگ بڑی حکمت سے ان کو عیسائی بنا رہے ہے ان اسکولوں کی نسار معلمات تدریب یافتہ ہونے کی وجہ سے اپنا پروگرام میں کامیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈھاکہ شہر میں عیسائیوں کے پندرہ بیس ادارے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے ہر شہر کے سب سے اہم مقامات پر مشنری اسکول قائم کرکے اعلیٰ طبقہ کے لڑکے لڑکیوں کو تعلیم دے کر ایسا ماحول اور فضا تیار کر رہے ہیں کہ اگرچہ وہ لوگ عیسائی نہیں بن رہے مگر وہ پکے مسلمان نہیں۔ بنینگے یا نہیں بن رہے۔ یہی لوگ مستقبل میں قوم کے نمائندے بن کر خلافِ اسلام عیسائیت کے طرز طریقوں پر حکمرانی کر رہے ہیں یا کریں گے۔ ملک بھر میں تقریباً ستر اسی مشنری اسکول موجود ہیں۔ دیناج پور شہر میں پانچ عدد مشنری اسکول اور ایک عدد ٹیکنیکل اسکول موجود ہے۔ لڑکوں کے ان سب اسکولوں میں پڑھانے کیلئے بڑا اہتمام کرتے ہیں اور وہاں پڑھانے کو بڑا فخر سمجھتے ہیں۔ لڑکوں کو وہاں پڑھانا

انسگنیاب ۔۔۔۔ اسٹیٹ یعنی اعزازی تمغہ محسوس کرتے ہیں اس قسم کا ذہن رکھنے والوں کے لئے بڑا اتف اور حیرت ہے۔ ان مشنری اسکول کے لڑکے لڑکیوں کے لئے نقد روپے چاول کپڑا اور درسی کتب مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ اور بتدریج وہ اپنا آبائی دین اسلام چھوڑ کر عیسائی بنتے جارہے ہیں

(ب) **خدمتِ خلق اسکیم** اس اسکیم کے تحت جہاں مصیبت زدہ علاقہ ہوتا ہے عیسائی لوگ مختلف قسم کی امداد لے کر وہاں پہنچ جاتے ہیں اور ان سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو غیر متمدن غیر ترقی یافتہ ہے وہاں ہسپتال قائم کرکے علاج معالجہ سے لوگوں کو عیسائیت کی طرف مائل کر رہے ہیں اور نہایت ہوشیاری سے عیسائیت کا پرچار کرتے اور مرتد بناتے جارہے ہیں۔ ان ہسپتالوں میں معالجین لوگ علی الاعلان خلافِ اسلام رسائل وکتب تقسیم کرتے ہیں۔ علاج کے ساتھ تبلیغ عیسائیت بھی جاری ہے۔ تمام ہسپتالوں میں اس نظریہ پر کام ہو رہا ہے۔

(ج) **زراعتی اسکیم** عیسائیوں نے بنگلہ دیش کے اہم زراعتی علاقوں میں زمین جائداد خرید کر کے ارتداد کا پلان تیار کیا ہے۔ لوگوں کو مکانات جائداد اور کھیتی باڑی کے لئے گائے بیل دینے پر مائل کر رہے ہیں۔ مصیبت زدہ لوگ اس میں گرفتار ہو رہے ہیں۔

(د) **تمکینی اسکیم** نادار غریب لوگوں کو امداد کے نام سے صناعت کی تعلیم دیر ہے ہیں۔ مکانات دیکھ ان کو مرتد بنا رہے ہیں۔ بے پناہ لوگوں کو پناہ دینے اور طعام کا انتظام کے فریب سے ان کو عیسائی بناتے جارہے ہیں۔ ارباب حکومت اس طرف توجہ نہیں دے رہے۔

(۲) **بذریعہ ڈاک بائبل کی تعلیم** جن کو مکمل تعلیم حاصل نہیں ہے۔ اس قسم کے تمام طبقات میں سوالات کے جوابات میں مشنری لوگ بائبل کی باتوں کا پرچار کر رہے ہیں تین چار لاکھ لوگ اس طرح بذریعہ ڈاک بائبل کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ علاوہ اس کے ان کے مختلف قسم کے رسائل کیلنڈر

فری یا کم قیمت سے بازار راستہ گھاٹ میں بکری ہو رہی ہے۔ چھوٹے بڑے شہروں میں عیسائی دفتر بنا کر بیٹھے ہیں۔ عیسائی رسل و رسائل کا لوگ بڑا شوق سے مطالعہ کرتے ہیں اور ان کو مشنری لوگ بڑا اعزاز و اکرام سے نوازتے ہیں۔

(س) **جنگی تربیت** جو لوگ عیسائی بن گئے ان کو موجودہ طرز و طریقہ سے جنگ کی تعلیم دیتے ہیں۔ پہاڑی علاقہ اور چاٹگام کے پہاڑی علاقہ میں نہایت ہنرمندی کے ساتھ جنگ کی ٹریننگ ہو رہی ہے۔ قابل یادداشت پر ہے کہ سلاطین کے زمانہ میں نصرانی لوگ اس ملک میں تجارت اور مشنری کی حیثیت سے داخل ہوتے تھے۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ انہی لوگوں نے بالآخر حکمرانی حیثیت اختیار کی۔ آج بنگلہ دیش میں یہی صورت دیکھی جا رہی ہے۔ خدا حافظ۔

اس جنگی تدریب کے پیچھے انٹرنیشنل چارج کمیٹی کا ہاتھ ہے وہ کمیٹی نہایت مخفی طور سے ایسی مشنری کو جنگی سامان پہنچا رہی ہے۔ ان کو جنگ کے ایسے آلات موجود ہیں جو کسی حکومت کو بھی حاصل نہیں۔ اس علاقہ میں ایک اسٹیٹ قائم کرنے کے لئے بہت پہلے ہی سے نقشہ تیار ہو گیا ہے۔ جس کا اصل مقصد ایشیا کے جنوب مشرق میں بھارت کے کچھ حصے سے لیکر بنگلہ دیش کے پہاڑی علاقہ سمیت ایک عیسائی اسٹیٹ قائم کرنا۔ یہ ہوگا نصرانیوں کا دوسرا اسٹیٹ۔ اس سے قبل جزائر فلپائن میں پہلا اسٹیٹ قائم ہو چکا ہے۔ یہ لوگ دوسرا اسٹیٹ قائم کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ دونوں اسٹیٹ قائم کرنے کا اصل مقصد ایشیا کے جنوب مشرق حصہ میں عیسائیوں کے مفادات کو بچانا اور ساتھ ساتھ کمیونسٹوں کے حملہ کو روکنا بھی ہے۔

مشاہدہ کی بات یہ ہے کہ ٹونگی دت پارہ کیمپ۔ ڈمرا چھن پارہ چھاؤنی۔ محمد پور جینوا کیمپ اور سید پور کے غیر بنگالی مسلمان لوگ نوجوان عیسائی اور مرتد بن گئے اگر چیخ پکار کر مشنری ورک ملتوی کا مطالبہ کیا جائے تو جنگ کا فتح نہ ہوگا (ماخوذ از ماہنامہ مدینہ انیسواں سال ؁)

ایسے نازک حالات میں چاہیئے کہ بنگلہ دیش ہو یا غیر بنگلہ دیش ہو مسلمانوں کا فریضہ ہے تمام عالم اسلام کیلئے متحدہ طور پر عیسائیوں کا مقابلہ کرنا از حد ضروری اور جس ملک میں عیسائی مشنری ان کی کارروائیوں کو کڑی نگاہ سے دیکھیں اور انسداد کا طریقہ اختیار کریں تمام عالم اسلام سے یہی میری گذارش ہے۔

اللہ تعالیٰ اسلام کو پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے تمام عالم میں رائج کیا ہے۔ اللہ کا منتخب دین اسلام ہے۔ اسی نے قرآن حکیم کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے جو بھی اس کو مٹانا چاہے گا وہ خود مٹے گا۔ مگر عادت اللہ یہ جاری ہے آزمائش کے بغیر کامیابی نہیں ہوتی قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔ وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِإِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا۔ اس قسم کی آیات کثیرہ ہمارے دعویٰ پر دال ہیں۔

عالم اسلام اور مسلم جہاں کو ہمیشہ دشمنان اسلام سے تیقظ رہنا چاہیے۔

وما علینا الا البلاغ

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد و آلہ وصحبہ اجمعین۔

بقیہ صـ کا

اس کو غذا ملتی ہے اور یہ دولت پرستی کا شکار نہیں ہوتا، طاقت پرستی کا شکار نہیں ہوتا، تو پھر یہ ضمیر وہ کام کرتا ہے جو بڑی بڑی سلطنتوں سے اور بڑی بڑی فوجوں سے نہیں ہو سکا۔ دیکھئے کچھ زندہ ضمیروں نے، کچھ صالح ضمیروں نے، کچھ دردمند ضمیروں نے اپنے اپنے زمانہ میں کیا کام کر لیا یہ بزرگان دین کیا رکھتے تھے، ان کے پاس کیا سرمایہ تھا، لیکن انھوں نے ایک نیا معاشرہ پیدا کر دیا، ایک نیا دور اُن کی ذات سے شروع ہو گیا۔

مسائلِ حاضرہ

سوال : ۔ علماء دین مفتیان شرع متین کی درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کیا رائے ہے۔ مدارسِ عربیہ میں صدقاتِ واجبہ اور عطیات کی رقم جو جمع ہوئی ہے اس پر سال گذرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوں گی یا نہیں؟ نیز یہ رقم معطی کی ملک سے خارج ہوتی ہے یا معطی کی ملک شمار ہوتی ہے۔ اس میں تین صورتیں متصور ہوسکتی ہیں

(۱) معطی کی ملک باقی ہو جیسا کہ امداد الفتاوی میں بھی لکھا ہے۔ لیکن اس پر مندرجہ ذیل اشکالات ہیں۔ (الف) حولانِ حول کے بعد عطیات کی رقوم پر زکوٰۃ فرض ہونی چاہئے۔ مگر اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟ جب ان کے مالکوں کا کچھ علم نہیں اسلئے کہ اوّلاً تو چندہ دینے والوں کی فہرست بہت طویل ہوتی ہے۔ جن میں سے بیشتر کا پتہ لگانا مشکل ہے، پھر چندہ کی رقم ایک جگہ جمع ہوتی ہے۔ اور حسب موقع خرچ ہوتی رہتی ہے اس صورت میں یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ اس میں سے کس شخص کی کتنی رقم ہے؟

کسی شخص نے پچاس برس پہلے رقم دی تو ابتک اس کی بھی شرکت چلی آئی ہے اور آئندہ بھی یہ شرکت جاری رہے گی۔

(ب) چندہ دینے والوں میں سے کسی کا انتقال ہو جائے۔ تو اس کے چندہ کی رقم اس کے ترکہ میں داخل ہوگی۔ اس لئے اداءِ وصیّت و قرض اور وارثوں کے حقوق اس سے متعلق ہوں گے۔ وارثوں میں مجنون اور نابالغ بھی ہو سکتے ہیں جو ابراء و تبرع کے اہل نہیں ہیں۔ پس اس رقم کو واپس کرنا فرض ہوگا۔ اور یہ بنمبر الف کی وجوہ سے ناممکن ہے۔

(۲) مہتمم طلبہ کی طرف سے وکیل ہو اس میں مندرجہ ذیل قباحتیں ہیں۔

(۱) طلبہ ان رقوم کے مالک ہوں گے، اس لئے جب وہ چاہیں مہتمم (وکیل) کو طرف سے

کردیں اور اپنی رقوم کا مطالبہ کر دیں۔

(۲) اگر کسی طالبِ علم کا انتقال ہو جائے تو اس کے ورثاء اپنے حق کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

(۳) جب مدرسہ میں اتنی رقم جمع ہو جائے کہ ہر طالبِ علم کا حصہ بقدر نصاب پہنچ جائے تو مہتمم کیلئے اس سے مزید رقوم وصول کرنا جائز نہ ہو گا۔ بلکہ خود طالبِ علم پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی۔

(۴) رقومِ چندہ کو بیت المال پر قیاس کرکے یوں کہا جاوے کہ یہ معطی کی مِلک سے تو خارج ہو گئی مگر کسی کی ملک میں داخل نہیں ہوئی۔ لیکن بیت المال میں حاکم کی ولایتِ جبریہ عامہ ہوتی ہے۔ اور مہتمم کی وکالت اختیاریہ حاصل ہے اس لئے یہ قیاس مع الفارق معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح تسلیم کر لیا جائے تو مدِ زکوٰۃ میں تملیک ضروری نہیں رہے گی۔

ازراہِ کرم ان اشکالات کو رفع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ والسلام۔

المستفتی احتشام الحق آسیا آبادی

مدرسہ اشرف المدارس ناظم آباد۔ کراچی ۱۸ (پاکستان)

باسمہ سبحانہ

الجواب وباللہ التوفیق

پیش آمدہ مسئلہ کو تو احقر اس طرح سمجھے ہوئے ہے کہ مہتممین مدارس نہ تو محض معطین کے من کل الوجوہ وکیل و نائب ہوتے ہیں کہ نمبر ایک کی شق پر عائد شدہ اشکالات وارد ہوں اور نہ محض یہ مہتممین مدارس محض فی الحال داخل شدہ مستحق طلباء کے وکیل و نائب ہوتے ہیں کہ نمبر ۲ میں درج شدہ اشکالات وارد ہوں اور نہ یہ مہتممین مدارس من کل الوجوہ عمال بیت المال

کے شامل ہوتے ہیں، اور نہ ہی مدارس میں داخل شدہ کل رقوم من کل الوجوہ بیت المال کے حکم میں ہوتی ہیں کہ ان پر نمبر۳ میں درج شدہ اشکالات وارد ہوں، بلکہ صورت کچھ اور ہوتی ہے، اور اس کے سمجھنے کے لیے پہلے ان داخل شدہ رقوم کی حیثیت و نوعیت معلوم متعین کرلینا ضروری ہے سو عرض ہے کہ:۔

مدارس میں عموماً تین قسم کی رقوم داخل ہوتی ہیں۔

۱۔ رقوم عطیات، ہدایا وصدقاتِ نافلہ وغیرہ، یعنی وہ رقوم جو واجب التملیک نہیں ہوتیں اور دینے والا کسی خاص ومتعین کام ومصرف کیلئے نہیں دیتا، بلکہ بلا کسی تعیین وقید کے مدرسہ کو دیتا ہے۔

۲۔ رقوم زکوٰۃ ونذر وکفارہ وغیرہ یعنی وہ قسم جو واجب التملیک ہوتی ہے۔

۳۔ وہ رقوم جس کو دینے والا کسی خاص کام کے لیے متعین کرکے دیتا ہے مثلاً کہتا ہے کہ اس رقم سے فلاں کمرہ بنوالو، یا نل لگوالو، یا فلاں فرش بنوادو وغیرہ۔

تفصیل حکم رقوم (۳) یعنی وہ رقوم جس کو دینے والا کسی خاص کام کے لئے نامزد کردیتا ہے مثلاً کوئی خاص کمرہ بنوانے کے لئے وغیرہ وغیرہ

اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں مہتمم مدارس محض معطی کے وکیل ونائب ہوتے ہیں۔ اور یہ رقم مِلکِ معطی سے خارج نہیں ہوتی۔ بلکہ جب تک یہ رقم موجود رہتی ہے۔ بحکم امانت رہتی ہے۔ اور معطی کو اختیار رہتا ہے کہ جب چاہے اس توکیل کو ختم کردے۔ اور اپنی رقم واپس لے لے۔ اور جب حسبِ ہدایت معطی خرچ ہو جاتی ہے۔ تو مِلکِ معطی پر خرچ ہوتی ہے غرض اس صورت میں محض معطی مالک رہتا ہے۔ پس مملوکیت کے تمام احکام (مثلاً حق تصرف للمعطی اور بعد ممات معطی ترکہ ووراثت وغیرہ سب احکام اس پر نافذ ولاگو ہوں گے۔ اور اسی وجہ سے اس قسم کی رقوم کو خلط واستہلاک سے بچانے کے لئے مدارس میں بالکل الگ الگ رکھنا اور ہدایت ومنشاء معطی کے موافق خرچ کرنا لازم رہتا ہے اور اگر الگ الگ رکھنے میں دشواری ہو تو قرض کی صورت میں منتقل

کرالینا ضروری ہوتا ہے۔ اور خلط واستہلاک کی صورت میں ضمان عائد ہوتا ہے۔

وھذہ الاحکام کلھا ظاہرۃ وباھرۃ فی الفقہ۔

تفصیل حکم رقوم نمبر ۲

رقوم نمبر ۲ یعنی رقوم زکوٰۃ وغیرہ جو واجب التملیک ہوتی ہیں۔ ان رقوم میں مہتممین مدارس اور حسب ضابطہ مدرسہ ان کے نواب معطی کے بھی من وجہ وکیل ہوتے ہیں، اس لئے قبضہ مہتمم من کل الوجوہ قبضہ مستحق نہیں ہوگا۔ اور اسی وجہ سے تملیک طلبہ یا تملیک مستحق زکوٰۃ ضروری رہتی ہے۔ نیز اس تملیک کے کسی دوسرے مصرف میں صرف کرنا جائز نہیں رہتا۔ اور خلط واستہلاک سے بچنے کے لئے ان رقوم کو غیر واجب التملیک رقوم سے مستقل طور پر الگ رکھنا چاہئے۔ نیز ان رقوم میں یہ لوگ ان طلبہ کے جو فی الحال مدرسہ میں موجود ہیں اور ان طلبہ کے جو آئندہ داخل ہونے والے ہیں یا ان مستحقین زکوٰۃ کے جو مدرسہ میں فی الحال موجود ہیں اور ان مستحقین زکوٰۃ کے جو آئندہ مدرسہ میں رہنے والے ہوں اگرچہ یہ لوگ مجہول الذوات والکمیۃ ہوں ان سب کے بھی وکیل و نائب ہوتے ہیں اور اس جہت کے اعتبار سے چونکہ حق مستحق بھی متعلق ہوجاتا ہے، اس لئے ان رقوم کو دے دینے کے بعد معطین واپس بھی نہیں لے سکتے اور نہ ان رقوم پر حولان حول کے بعد پھر کبھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور نہ مقدار کثیر ہونے پر مزید حاصل کرنے کو ناجائز کہہ سکیں گے۔ اور نہ کوئی مستحق غنی قرار پائے گا۔ اور نہ وہ اشکالات عائد ہوں گے جو سوال میں مذکور ہیں۔

اس جواب کی فی الجملہ تائید حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نوراللہ مرقدہٗ کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے۔ جو فتاویٰ اشرفیہ حصہ سوم فتاویٰ امدادیہ ص ۲۱۹ جلد ۱ قدیم میں مذکور ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ۔ وقف نہیں مگر اہل مدرسہ مثل عمال المال کے معطین اور آخذین ہر دو کی طرف سے وکلا ہیں، لہٰذا نہ اسمیں زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ معطین واپس لے سکتے ہیں۔ انتہی بلفظہ۔

ایک شبہ کا ازالہ

مستحقین طلبہ میں یہ توسیع وتعمیم اس لئے ہوگی کہ مدارس دینیہ عربیہ جو محض چھ سال چھ ماہ کے لئے قائم نہیں کئے جاتے بلکہ رہتی دنیا کیلئے بغرض احیاء دین وعلم دین قائم ہوتے ہیں۔ کما ھو مقتضاو جمیع الاوقاف کالمساجد والرباطات وغیرہ۔ اور مدارس میں ان رقوم کو دینے والے بھی اسی نیت وتصور سے دیتے ہیں۔ لہذا رہتی دنیا تک مستحقین زکوٰۃ فی الجملہ ضمناً وطبعاً متصور ومراد ہو جائیں گے۔ اور یہ استحقاق ان کے مجہول الذوات والکمیۃ ہونے کے باوجود ان سے متعلق ہو جائے گا۔ پھر معطین بھی مختلف طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض تو طلبہ پر خرچ کی تصریح کے ساتھ دیتے ہیں اور بعض بغیر اس کے دیتے ہیں۔ بلکہ بعض تو یہ کہکر دیتے ہیں کہ مثلاً یہ زکوٰۃ کا روپیہ ہم مدرسہ کے کام کے لئے دیتے ہیں۔ اور یہ جانتے ہوتے دیتے ہیں کہ اس مدرسہ میں فی الحال نادار طلبہ کو کھانا کپڑا نہیں ملتا پس اس جملہ کی تصحیح اور شرعی توجیہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ تملیک شرعی کے ذریعہ اس رقم سے مدرسہ کا کام کیا جائے۔ اور جب مدرسہ میں طلباء نادار نہ ہوں تو لامحالہ کسی بھی مستحق زکوٰۃ سے تملیک کرا کر کسی مصرف مدرسہ میں رقم صرف ہو سکے گی اور عاقل بالغ کے کلام کا محل حسن پر مہما امکن حمل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے پس اگر معطی نے یہ کہکر دیا ہے کہ یہ رقم ضروریات طلباء پر خرچ کے لئے ہے تو جب تو اس پر تملیک طلباء ملحوظ رکھنا ضروری ہو گا۔ اور اگر مطلقاً بلالحاظ تعیین طلباء دیا ہے تو مدرسہ کے کسی بھی مستحق زکوٰۃ سے بلا تکلف تملیک کرالینا کافی ہوگا، بلکہ ایسی صورت میں اگر کسی ملازم مدرسہ کو جو مستحق زکوٰۃ و نادار بھی ہو اور مصلحت شرعی ہو تو اراکین مدرسہ کے مشورہ سے اجرت وتنخواہ قرار دئے بغیر محض بطور صدقہ کے اس رقم سے اس کی کچھ مدد کر دینا بھی جائز رہے گا۔ اس لئے مصرف کی ان دونوں شکلوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ان رقوم کو بھی الگ الگ رکھنا بہتر ہو گا۔ تاکہ وہ رقوم بوجہ اتم معطی کی ہدایت و منشاء کے مطابق صرف ہو سکیں۔

تفصیل حکم رقوم نمبر ۱

یعنی رقوم عطیات وغیرہ جو غیر واجب التملیک ہوتی ہیں ان رقوم کے بارے میں بھی مہتمم

مدارس اوران کے نواب وکیل ونائب ہوتے ہیں البتہ اس کی نوعیت و احکام میں کچھ فرق ہوتا ہے۔

مثلاً رقوم نمبر ۲ (واجب التملیک رقوم) میں تملیک فقراء شرط ہوتی ہے اور ان رقوم (غیر واجب التملیک رقوم) میں یہ شرط نہیں ہوتی لیکن ارباب حل وعقد کے مشورہ سے خرچ کا جو ضابطہ حدود شرع میں رہتے ہوئے مقرر ومتعین ہوتا ہے، صرف اس ضابطہ کے ماتحت خرچ کرنا ضروری رہتا ہے۔ اور اگر ارباب حل وعقد نہ ہوں یا ہوں مگر کسی خرچ کے بارے میں کوئی واضح ضابطہ نہ ملے تو ادارہ کے سابق اہل علم و دیانت وذمہ داروں کا معمول واجب الاتباع رہتا ہے۔ اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو دیگر ایسے ہی مدارس اور اداروں کا معمول دیکھا جائیگا۔ اور اس کی اتباع کی جاتے گی۔ مہتمم یا عملۂ مدارس خود رائی نہیں کرسکتے ہیں کما ھو ظاہر و بایں من فتوی الاکابر۔

اور مثلاً رقوم نمبر ۲ میں مہتمین مدارس اولاً صرف معطین وآخذین کے وکیل ونائب ہوتے ہیں پھر بعد تملیک شرعی کے تمام مسلمانوں کے یا ارباب حل وعقد کے وکیل ونائب ہو جاتے ہیں۔ اور رقوم نمبر ۱ میں شروع ہی سے تمام مسلمانوں کے یا ارباب حل وعقد کے وکیل ونائب ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ مہتمین ارباب حل وعقد کے انتخاب سے امیر ونائب ہوتے ہیں یا اگر ارباب حل وعقد نہ ہوں تو جس خطہ کا یہ مدرسہ ہے اس خطہ کے بااثر سمجھدار ذمہ دار مسلمانوں کے امیر ونائب یا نمائندہ ہو جاتے ہیں اور سلطان کے ایک خاص وصف (انتظام حقوق عامہ) میں سلطان کے قائم مقام ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ جب ارباب حل وعقد کے اتفاق سے یا تراضی مسلمین سے یہ منصب مسلمانوں کو وابستہ ہے "کما ھو مبرھن فی مقامہ"، تو پھر اس کے قائم مقام کا نصب کیوں نہ ان سے وابستہ ہوگا ضرور ہوگا۔

ایک شبہ کا ازالہ:- اور قوت قہریہ کے فقدان سے اس نیابت کے اقامت و تحقق میں شبہ نہ کیا جائے اس لئے کہ سلطان میں دو وصف ہوتے ہیں۔

ایک وصف (حکومت و سلطنت) جس کا ثمرہ سدِ ثغور و تنفیذ، حدود و قصاص وغیرہ اعمال ہیں اور اس میں قوتِ قہریہ شرط ہے۔ اس میں تو کوئی بغیر اس قوت کے قائم مقام نہیں ہو سکتا ہے۔

دوسرا وصف :۔ وہ محض انتظام حقوق عامہ ہے۔ جس کے لئے قوتِ قہریہ شرط نہیں ہوتی، اس وصف میں بغیر قوتِ قہریہ کے بھی نیابت ہو سکتی ہے۔

ھٰکذا فی امداد الفتاویٰ ص۲۲ ج ۲ قدیم۔

اور یہ مالی انتظام مدارس اسی قبیل سے ہے۔ بغیر قوتِ قہریہ کے بھی محض آپس کی مصالحت و رضامندی سے بھی قائم و درست ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قوتِ قہریہ کے فقدان سے اس نیابت (مالی انتظام مدارس) کے اقامت و تحقق میں فتور واقع نہ ہوگا۔ چنانچہ اقامتِ جمعہ و اعیاد کے انتظام میں یہ نیابت امیر تسلیم و رائج ہے اور اسی پر وجوبِ جمعہ و اعیاد وغیرہ ہمارے ملک میں دائر ہے۔ اور ان کے تحقق و اقامت میں کوئی فتور واقع نہیں ہوتا۔ پھر جب یہ انتظام حقوقِ عامہ دنیوی امور سے بھی متعلق ہو سکتا ہے۔ اور اس کے درست و منتظم رکھنے میں یہ نیابتِ سلطان جائز ہو سکتی ہے تو مالی امداد انتظام مدارس کے لئے جو خالص امر دینی ہے، درست و منتظم کرنے کے لئے (یعنی احیاء دین اور علم دین اور اس کے ابقاء و تحفظ کیلئے) ہے اور جو سب سے مقدم فریضہ ہے اور اہم الواجبات میں سے ہے اس میں یہ نیابت کیوں جائز و درست نہ ہوگی۔ بدرجہ اولیٰ جائز و درست ہوگی بالخصوص جبکہ یہ مالی انتظام مدارس ملاک اور مستحقین کے رضا و رغبت سے ہوگی۔ اور جب مہتمم مدرسہ سلطان کے وصف ثانی (انتظام حقوق عامہ) میں سلطان کا قائم مقام ہوگا تو عملہ مدرسہ عمال بیت المال کے مثل ہوں گے۔ اور یہ رقوم قسم ثانی (رقوم غیر واجب التملیک) جب برضا و رغبت من جانب ملاک داخل ہو جائیں گی تو یہ رقوم اموال بیت المال کے مثل ہو جائیں گی۔ اور اگرچہ یہ رقوم وقف شمار نہ ہوں گی۔ مگر بحق مدرسہ محبوس ضرور ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ بغیر اس حبس کے یہ انتظام

اہر دینی کافی زمانہ قائم و منتظم نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ اس کا قائم و منتظم رکھنا سب پر حسب استطاعت واجب ہے۔ اور واجب کا ذریعہ بھی واجب ہوتا ہے۔ اس لئے یہ حبس بھی واجب ہوگا۔ اور چونکہ رہتی دنیا تک کے لئے یہ نظم قائم و منتظم ہوتا ہے جیسا کہ ہم پہلے (نمبر ۲ کے جواب میں) کہہ آئے ہیں۔ اس لئے ان کو واپس لینے کا بھی حق کسی کو حاصل نہ ہوگا۔ خود معطین کو بھی حق نہ ہوگا اس لئے کہ اس سے حبسِ واجب میں جو مقصود اوّل ہے، فتور واقع ہو جانے کا ظن غالب متصوّر ہے۔

اسی طرح ان رقوم کی فی الحال مقدار کثیر جمع ہو جانے کے بعد مزید رقوم کا استحصال بھی ممنوع نہ ہوگا۔

اس لئے کہ جب یہ نظم رہتی دنیا تک کے لئے واجب ہے، تو آئندہ ان رقوم کثیر کے مصرف کا وجود بھی بذریعہ غالب مظنون ہے۔ اسی طرح حولانِ حول پر ان رقوم میں زکوٰۃ بھی واجب نہ ہوگی۔ اس لئے کہ بیت المال کی رقوم کا یہی حکم ہے۔ نیز اس لئے کہ اس حبس دائمی کی وجہ سے ملاک کا تصرف مالکانہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اور ادائے زکوٰۃ کا حکم اسی تصرف مالکانہ کے قبیل سے ہے لہٰذا وہ بھی منقطع ہو جائے گا۔

اسی طرح ولایتِ عامہ جبریہ سے بھی اشکال نہ ہوگا۔ کیونکہ ولایت عامہ جبریہ سلطان کے وصفِ اول یعنی حکومت و سلطنت (جس کا ثمرہ سدّ ثغور و قوتِ تنفیذ وغیرہ ہوتا ہے) سے متعلق ہے اور یہ نیابت (مالی انتظام مدارس) محض وصفِ ثانی انتظام حقوقِ عامہ سے متعلق ہے۔ اور یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ کما مر آنفا۔ فافترقا۔ ولا منافاۃ ولا تضاد بینھما۔ ھٰذا ما عندی من الشرع الشریف فان کان خطأ فمن نفسی وان کان حقا وصوابا فمن اللہ وعلیہ التکلان وھو الموفق للسداد والصواب فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہٗ:- العبد نظام الدین۔

ادبیات

مولانا محمد عثمان صاحب کاشف الہاشمی

چاند کا گیت

میری ضیا پہ منحصر، نور و نمائشِ جہاں آئینہ دارِ زندگی، مجھ سے بساطِ آسماں
مجھ سے قرارِ انجمن، صورتِ نجم و کہکشاں میرے جمال سے عیاں عشق کا سوزِ جاوداں
میری شعاعِ نور ہے، سوز کی ایک داستاں

کوچۂ و دشت و بحر و بر، میری تمام رہ گذر حاصلِ زندگی سفر، مقصدِ زندگی سفر
کیف کہیں کہیں اثر، زیر کہیں، کہیں زبر میری نظر میں ایک ہے، ذرۂ خاک یا گہر
میری نمودِ حسن سے، شعلۂ عشق تا جگر

روز نئے ہیں واقعات، عالمِ ممکنات میں تازہ بتازہ حادثات شیشہ گہِ حیات میں
روز نئے نئے صنم دہر کے سومنات میں جہدِ ثبات کو بکو، عالمِ بے ثبات میں
ریشہ دواں ہے زندگی خرمنِ کائنات میں

میری نظر پہ فاش ہے تابشِ لعلِ خواجگی میری نظر میں ہے ابھی صورتِ قیدِ بندگی
پوچھ مری نگاہ سے خاک پہ جنگِ زرگری یاد ہے مجھ کو آج تک، دبدبۂ سکندری
حیف عروجِ بُتگری، حیف زوالِ زندگی

محفلِ ہست و بود میں، آہ وہ خونِ آرزو حرفِ حکایتِ غلط، کوششِ جذبۂ نمو
آہ وہ زخمِ اندروں، آہ وہ کوششِ رفو آہ تباہ و رائیگاں، نظم و کمالِ رنگ و بو
خیمۂ تیرگی بپا، دشت بدشت کو بکو

مجھ پہ کھلا کہ زندگی، نام نہیں قیام کا نقشِ عمل ہے زندگی، عشق و سبک خرام کا
مظہرِ نورِ مہر ہے، بزمِ بساطِ شام کا تا بہ زمیں ہے سلسلہ، حسن کے فیضِ عام کا
کام ہے بزمِ دہر میں جرأتِ تشنہ کام کا

فہرست کتب مکتبہ دار العلوم دیوبند (شعبہ نشر و اشاعت دار العلوم دیوبند)

نام کتب	قیمت	نام کتب	قیمت	نام کتب	قیمت
فتاویٰ دار العلوم جلد ۱	۲۴/-	دیوان متنبی	۱۱/-	انتصار الاسلام	۹/-
〃 ۲	۱۷/-	تاریخ دار العلوم دیوبند جلد ۱	۴۰/-	مصابیح التراویح	۶/۵۰
〃 ۳	۱۵/-	〃 〃 ۲	۴۰/-	تفسیر معوذتین	۳/-
〃 ۴	۳۱/-	〃 انگریزی ۱، ۲	۱۱۵/-، ۱۲۵/-	اسلامی عقائد اور سائنس	۲/-
〃 ۵	۳۰/-	سوانح قاسمی جلد اول	۴۰/-	مودودی مذہب	۲/۵۰
〃 ۶	۲۶/-	〃 دوم	۲۸/-	مودودی دستور و عقائد	۲/۵۰
〃 ۷	۲۲/-	〃 سوم	۱۲/-	نظریہ مودودی، قرآن پر ایک نظر	۴/-
〃 ۸	۲۸/-	مخطوطات جلد اول	۱۹/-	مکتوبات	۳/-
〃 ۹	۳۱/-	〃 دوم	۳۶/-	مکتوبات ثلثہ	۳/۵۰
〃 ۱۰	۲۲/-	قبلہ نما	۲۸/-	دو ضروری مسئلے	۱/-
〃 ۱۱	۱۱/-	دینی دعوت کے قرآنی اصول	۶/۵۰	جماعت اسلامی کا دینی رخ ۱	۳/۵۰
مقدمہ ابن الصلاح	۴/-	ناقابل فراموش واقعات	۲۶/-	〃 〃 〃 ۲	۳/۵۰
الفیۃ الحدیث	۱۲/-	المنار الانوار	۷/-	〃 〃 〃 ۳	۲/۵۰
مشکوٰۃ الآثار	۵/-	مثنوی فروغ	۴/۵۰	〃 〃 〃 ۴	۴/-
النخبہ	۴/-	براہین قاسمیہ	۱۰/-	اجتماع گنگوہ	۱/-
نفحۃ الادب	۶/-	حکمت قاسمیہ	۵/-	درمنثور اول	۱/-
تفسیر مدارک التنزیل	۸/-	مدارج سلوک	۱۶/-	〃 دوم	۱/-
الاشباہ والنظائر	۲۰/-	جائزہ تراجم قرآنی	۱۱/-	اعفاء اللحیہ	۱/-
عقیدۃ الطحاوی	۲/-	قرآن محکم	۵/-	ایمان و عمل	۳/-
حسامی	۴/-	حجۃ الاسلام	۱۰/-	دار العلوم دیوبند کا ایک	
ملا حسن	۱۲/-	اسرائیل	۴/-	فتویٰ اور اس کی حقیقت	۱/۵۰
مقامات حریری	۵/-	قرآنی پیشین گوئی	۳/۷۵	ماثورہ دعائیں	۱/۵۰

Regd No. SHN-L-13-NP-21-83

DARUL-ULOOM MONTHLY
DEOBAND (U.P.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالعلوم دیوبند
کے ترقیاتی منصوبے

(۱) رواق خالد کی دوسری منزل اور مزید جدید دارالاقامہ کی تعمیر جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو

(۲) دارالتربیت (دارالاطفال) کا قیام اور اس کی تعمیر

(۳) ایک وسیع مسجد کی تعمیر جس میں اضافہ شدہ تمام طلبہ کی گنجائش ہو (قدیم مسجد ناکافی ہو چکی ہے)

(۴) علمی و دینی اجتماعات کے لئے ایک وسیع ہال کی تعمیر ـــــ (۵) ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر

(۶) مہمان خانہ کی توسیع ـــ (۷) نئی درسگاہوں کی تعمیر ـــــ (۸) لائبریری کی تعمیر جدید

(۹) اساتذۂ دارالعلوم کی علمی ترقی کے لئے عالم اسلام سے علمی کتابوں کی فراہمی کا انتظام

(۱۰) تمام دنیا میں پھیلے ہوئے فضلاء دارالعلوم سے روابط اور اُن سے متعلق معلومات۔

(۱۱) نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر تمام ذمہ داران مدارس عربیہ کا اہم کنونشن طلب کرنا۔

(۱۲) تعلیم و تربیت کے نئے اصول و ضوابط کی ترتیب اور اُن کا اجراء۔

اس ادارے کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے

دست تعاون بڑھانے کی شدید ضرورت ہے

مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی امداد روانہ فرمائیں ـــــــ شکریہ

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب) دارالعلوم دیوبند یوپی

مطبوعہ تاج پرنٹرس سہارنپور

دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی ماہنامہ

دارالعلوم

زیر سرپرستی

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

مدیر مسئول

ریاست علی بجنوری

نگرانِ اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند

دار العلوم دیوبند کا علمی دینی ماہنامہ

دار العلوم

جلد نمبر ۶۵ / نومبر ۱۹۸۳ء مطابق صفر المظفر ۱۴۰۴ھ / شمارہ نمبر ۲

مجلس ادارت

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مولانا ریاست علی صاحب

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

طابع و ناشر

دار العلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دار العلوم دیوبند

مطبوعہ

محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند

کاتب:- طارق عثمانی پوتوی

سالانہ زرِ اشتراک

ہندوستان سے ۲۵/- روپے

سعودی عرب، کویت، ابو ظہبی وغیرہ سے

بذریعہ ایر میل ۹۰/- روپے

جنوبی، شرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے بذریعہ

ایر میل ۱۰۵/- روپے

امریکہ، کناڈا، وغیرہ سے بذریعہ ایر میل ۱۱۶/- روپے

پاکستان سے بذریعہ رجسٹری ۴۵/- روپے

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

ضروری گذارش

○ اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینہ یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے بذریعہ سرخ نشان اس کی آپ کو بار بار اطلاع بھی دی جا چکی ہے۔ لہٰذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا منی آرڈر نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی پی ہی سے زرِ اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے مبلغ ۲۱/- روپے کے مطالبہ میں وی پی کر دیا جائے گا۔ (مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ، نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۵/۴ روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والا تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان کو بھیجدیں اور انھیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو "رسالہ دارالعلوم" کے حساب میں جمع کرلیں۔ ماہِ مارچ سے خریداری نمبر بدل دیا گیا ہے خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں۔ خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(مدیر)

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن القاسمی

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی تیز و تند آندھی نے جب ہندوستان میں صدیوں سے روشن اسلامی سلطنت کے چراغ کو گل کر دیا اور سرزمینِ ہند پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم ہو گیا تو اس عہد کے اہلِ دل علماء نے اپنی نورِ بصیرت سے مستقبل کے اس عظیم الحادی فتنہ کو دیکھ لیا جو اس سیاسی زوال اور مادی انحطاط کے پسِ پردہ برق رفتاری کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کی جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا وہ اپنی فراستِ ایمانی سے یہ سمجھ رہے تھے کہ اس سیلابِ بلاخیز کے آگے بند نہیں باندھا گیا اور اس کے رُخ کو پھیرنے کی کوشش نہیں کی گئی تو اسلامی عقائد و افکار اور دینی اخلاق و کردار اس طوفان کی موجوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے اور وہ مسلم معاشرہ جو صدیوں کی سعیٔ پیہم اور انتھک کوششوں کے بعد وجود میں آیا ہے تشتت و انتشار کی نذر ہو جائے گا۔

ان حضرات نے اپنے تجربہ کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا کہ اس فتنہ عمیا کا مقابلہ جو ایک زبردست اور مستحکم سلطنت کے زیرِ سایہ پروان چڑھ رہا ہے طاقت و قوت سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ان اللہ کے بندوں نے تحفظِ دین اور بقائے ملت کی اس جنگ میں آہنی اور آتشی اسلحوں کے بجائے علم و للہیت کے ہتھیاروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا چنانچہ اسباب و ذرائع سے یکسر محرومی کے عالم میں اللہ کے اعتماد اور بھروسہ پر الحاد و زندقہ کے اس بادِ صرصر کے بالمقابل قصبہ دیوبند میں علم و عرفان کا ایک چراغ روشن کر دیا۔ ہندوستان میں تحفظِ دین کی اسی اولین کوشش کا مظہرِ جمیل "دارالعلوم دیوبند" ہے جس کا آغاز انتہائی ناساعد حالات میں محض اللہ کے اعتماد پر ہوا۔ پھر اسی قندیلِ معلق اور چراغِ توکل سے مسلسل چراغ سے چراغ روشن ہوتے رہے یہاں تک کہ علم و نور کا یہ سلسلہ پھیلتے پھیلتے پورے برصغیر پر چھا گیا۔ اور اس کی ضیاء پاش کرنوں نے مسیحی مشنریوں کی برپا کی ہوئی ظلمتوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اور اسلامیانِ ہند کو ایک ایسے مہیب اور خطرناک فتنے سے بچا لیا جس سے اس کا تشخص و امتیاز ہی نہیں وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ اگر ۱۸۵۷ء کے بعد دارالعلوم دیوبند ایک تحریک بن کر نمودار نہ ہوا ہوتا تو آج برصغیر میں اسلام کی صورت یا تو مسخ و محرف ہو چکی ہوتی یا اس کا نام و نشان مٹ چکا ہوتا۔

دارالعلوم کا یہی ایک واقعہ نہیں ہے کہ اس نے برٹش امپائر میں برپا الحاد و اسلام کے معرکہ میں قیادت کا کردار ادا کیا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اقدار اور اسلام کی مقدس شخصیتوں کے خلاف برصغیر میں جتنی تحریکیں بھی وجود میں آئی ہیں خواہ وہ مسیحیت کے نام سے آئی ہوں یا شدھی و سنگھٹن کے عنوان سے چلی ہو وہ قادیانیت و بہائیت کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آئی ہوں یا رافضیت رضاخانیت اور مودودیت کے لباس میں اسلام کے چہرے کو مسخ کرنے کے درپے ہوئی ہوں دارالعلوم دیوبند نے ایسی ہر باطل اور گمراہ تحریکوں کا آگے بڑھ کر مقابلہ کیا ہے اور اسلام کی صحیح ترجمانی کا حق ادا کرکے دین کے تحفظ کی اہم ترین خدمت انجام دی ہے۔

ان معرکوں کی جدوجہد کے ساتھ دارالعلوم دیوبند نے اپنی ایک سو بیس سال کی مدت حیات میں ہزاروں ایسے افراد پیدا کئے جنہوں نے تعلیم، تزکیۂ اخلاق، تصنیف، افتا، صحافت، خطابت، تذکیر، تبلیغ، سیاست، حکمت، طب، وغیرہ میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ پھر ان خدمات کا دائرہ کسی خاص خطہ میں محدود نہیں ہے بلکہ برصغیر کے ہر ہر گوشہ اور دیگر بلاد بعیدہ کے ہر ہر حصہ میں پہنچ کر انہوں نے دین خالص کا پیغام پہنچایا اور خلق خدا کو جہل کی تاریکی سے نکال کر نور علم کی دولت سے ممتاز کیا۔ اور تحفظ دین کی تحریک کو آگے بڑھایا۔

چنانچہ مولانا محمد الحسنی لکھتے ہیں:۔

"اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کرسکتا کہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اور اسکو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام و بقا و استحکام میں بیش بہا مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور جو روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے۔ (پیام ندوہ)

دارالعلوم دیوبند کا یہ امتیاز بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ عوامی چندہ سے تعلیمی ادارے چلانے کا طریقہ اسی کا ایجاد کردہ ہے۔ دارالعلوم کے قیام سے پہلے برصغیر میں جتنے دینی ادارے تھے ان کے وجود و بقا کا تمام تر انحصار حکومت یا امراء و رؤسا کی داد و دہش کا مرہون منت ہوتا تھا ان مدارس کا عوام سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہوا کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت کے ختم ہوتے ہی جو آئی ہے ان کے اکثر و بیشتر اصحاب کی علمی انجمنیں اجڑ گئیں۔ علماء و طلبہ نان شبینہ کے محتاج ہو کر کسب معاش کے امور میں منتشر ہوگئے۔ اس کے برخلاف دارالعلوم نے کبھی کسی حکومت یا ریاست کے در پر

جب [illegible] نہیں کیا بلکہ اس نے اپنا سرمایۂ حیات توکل علی اللہ اور خدا کے صالح بندوں کے جذبۂ [illegible] کو قرار دیا اور آج تک وہ اپنے اس امتیاز و کردار پر پامردی اور مضبوطی کے ساتھ قائم ہے۔

برصغیر کو غلامی کی لعنت سے نجات دلانے میں بھی دارالعلوم نے بنیادی کردار پیش کیا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ برادرانِ وطن کے دلوں میں آزادیٔ کامل کا جذبہ پیدا کرنے والے ابنائے دارالعلوم اور اس کے فضلاء ہی ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے تلامذہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا منصور انصاری حضرت مولانا عزیر گل، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ وغیرہ کی جدوجہد اور مساعیٔ جمیلہ سے کون انکار کر سکتا ہے۔

مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ، مولانا محمد میاں دیوبندی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی وغیرہ دارالعلوم دیوبند ہی کے سپوت تھے، جنھوں نے آزادیٔ وطن کی خاطر لاٹھیاں کھائیں اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور اس وقت تک چین سے نہیں رہے جب تک کہ ملک کے چپے چپے کو غاصب انگریزوں کے تسلط سے چھڑا نہیں لیا۔

غرضیکہ دارالعلوم دیوبند نے کتاب و سنت کی اشاعت، اسلامی تہذیب و ثقافت کے بقاء و تحفظ، اور مذہبی و سیاسی فتنوں سے ملت اسلامیہ کو خبردار رکھنے میں جو ہمہ گیر و جرأتمندانہ کارنامہ انجام دیا ہے وہ مدارسِ اسلامیہ کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی انہیں مساعیٔ جمیلہ کا یہ اثر ہے کہ آج برصغیر میں اسلام کا قدم دیگر بلادِ اسلامیہ کے مقابلہ میں زیادہ مستحکم ہے، مسجدیں آباد ہیں۔ اسلامی علوم و فنون کے [illegible] مدارس کا پورے ملک میں اس طرح سے جال پھیلا ہوا ہے کہ عالم اسلام کے [illegible] حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ دارالعلوم اپنی ان تمام خصوصیات کے ساتھ آج بھی کتاب و سنت کی [illegible] کی کوششوں میں مصروف ہے۔ اب یہ ملتِ اسلامیہ کی ذمہ داری ہے کہ [illegible] کے اس مرکز کو مضبوط سے مضبوط تر بنائیں تاکہ وہ اطمینان و سکون کے ساتھ [illegible] خدمت میں ماضی کی طرح مشغول رہے۔

ملک کا خطرناک رخ اور دانشور طبقہ کی ذمہ داری

★ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی

آج ہمیں جس چیز کا شکوہ ہے وہ یہ کہ ہر طرح کی آوازیں سننے میں آتی ہیں ہر طرح کے منشور (MANIFESTOS) سامنے آتے ہیں، ہر طرح کے اعلانات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ لیکن انسانیت کی پستی اور انسانی جان و مال اور انسانی حقوق کی پامالی پر کوئی رونے والی آنکھ اور کوئی درد محسوس کرنے والا دل نظر نہیں آتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی دانشگاہوں میں جہاں سب کچھ سکھایا پڑھایا جاتا ہے۔ وہیں ایسے لوگ ملنے چاہئیں وہیں ایسے لوگوں کو ڈھونڈنا چاہئے چند نوجوان ہی سہی جو اپنے مستقبل کی طرف سے آنکھ بند کر لیں جیسے کہ ایک پیغمبر نے اسی طرح کے ایک بگڑے ہوئے معاشرہ میں اصلاح کا کام شروع کیا تو ان کی قوم نے طعنہ دیا تھا، انھوں نے کہا "لقد کنت فینا مرجوًا قبل ھٰذا" اے صالح تم سے تو بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں تم تو بڑے (PROMISING) آدمی تھے تم سے تو بڑی بڑی توقعات قائم تھیں کہ تم اپنے گھر کو خوش حال بناؤ گے، تم اپنی قوم کا نام روشن کرو گے، اپنے وطن کا نام روشن کرو گے، یہ تم کیا لے بیٹھے۔ تم نے یہ جھگڑا کہاں سے شروع کر دیا۔ قوم کے نزدیک جھگڑا تھا لیکن انسانیت کی ڈوبتی کشتی ہمیشہ انھیں لوگوں نے بچائی ہے جنھوں نے اپنے مفاد کو نہیں دیکھا۔ معاشرہ کے مفاد کو دیکھا۔ لیکن جس قوم میں نام لینے کے لئے بھی ایسے چند آدمی نہ پائے جائیں جو کسی بڑے عہدہ اور منصب کو اپنے مقصد کے راستے میں خاطر میں نہ لائیں تو ایسی جماعت اور ایسی قوم کے متعلق کوئی بڑی امید قائم نہیں کی جا سکتی اور اس کا کوئی وزن نہیں خدا کے میزان میں بھی اور انسانیت کے میزان میں بھی۔ ایسے صاحبِ عزیمت اور باہمت لوگ کم سے کم مسلمانوں میں ہر دور میں پائے گئے ہیں۔ جنھوں نے سلطنتوں اور بادشاہوں کو منہ نہیں لگایا۔ آج ہمارے ملک کی ضرورت ہے۔ کسی تعداد میں سہی لیکن ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو یہ کہہ سکیں۔

برو ایں دام بر صید دگر نہ کہ عنقا را بلند است آشیانہ

آج مصیبت یہ آگئی ہے کہ بار بار کے تجربوں سے مزاج دانوں اور تجربہ کاروں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس معاشرہ میں ہر شخص کی ایک قیمت ہے اگر وہ اتنے دام میں نہیں بک سکےگا تو اتنے دام میں ضرور بک جائے گا۔ لیکن خدا کے کچھ بندے ہمیشہ رہے اور رہنے... چاہئیں جو کسی دام میں بھی نہ بک سکیں۔ بڑے سے بڑا سنہرا جال آپ اُن کے سامنے ڈال کر دیکھے کہیں ان کے تصوّر میں بھی یہ آجائے کہ اعزاز قبول کر لوں تو ان کی راتوں کی نیند اُڑ جائے۔ میں کہتا ہوں خدا کے فضل سے ابھی ایسے لوگ اس دنیا میں ہیں ؎

خاکساران جہاں را بحقارت منگر تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

ابھی ہماری نسل میں بھی ایسے لوگ ہیں کہ بڑے سے بڑا عہدہ اور منصب ان کو اپنے اس جادۂ حق سے اور مقام سے جس کو انھوں نے سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ اپنے اس بوریائے فقر سے، اپنے خاک کی اس ڈھیر سے ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ آج بھی خدا کے فضل سے ایسے لوگ موجود ہیں، اس لئے ہر شخص کے متعلق یہ خیال کرنا کہ یہ کسی نہ کسی قیمت میں بک جائے گا۔ یہ ہما سہی لیکن ہما کے بھی شکاری ہوتے ہیں۔ یہ ہما بھی دام میں آجائے گی غلط ہے، ایسی ہما انسانیت کی آبرو ہے۔ آپ سے میں اس لئے نہیں کہتا کہ آپ ان کو تلاش کریں، میں کہتا ہوں آپ وہ ہما بنیں جس کو بڑے سے بڑا شکاری بھی شکار نہیں کر سکتا۔ پھر آپ وہ ہما بنیں گے کہ جس کے سر پر سے اُڑ جائے گی اس کے سر پہ بادشاہی کا تاج رکھ جائے گا۔ وہ ہما ایک خیالی پرندہ ہے لیکن آپ حقیقی معنی میں ہما بن جائیں گے، آپ جس کے پاس سے گذر جائیں گے اُسے عزت ملے گی، طاقت ملے گی، اس کو اعتماد ملے گا، ایمان ملے گا۔

آج ہمارے ملک اور ہمارے جاں بلب معاشرہ کو بڑے بڑے فاضلوں بڑے عالموں اور بڑے دانشوروں کی ایسی ضرورت نہیں جتنی صحیح اور دلیر انسانوں کی قربانی کے لئے تیار ہونے والے انسانوں کی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسلم یونیورسٹی جیسے کبھی اس ملت اور اس ملک کو محمد علی جوہر جیسا فرزند دیا ہے جنھوں نے اس ملک

میں صحیح طور پر جمہوری زندگی کا آغاز کیا۔ یہاں عوامی سیاست درحقیقت مولانا محمد علی سے شروع کی وہی گاندھی جی کو میدان میں لائے، یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ ان سے پہلے سیاست دانشوروں اور دستور کی سمجھ رکھنے والوں میں تھی۔ دانشوروں کا ایک بہت اونچا طبقہ تھا جو سیاسی باتیں کرتا، بازار میں سیاست کو لانے والے، پارکوں میں سیاست کو لانے والے اور پبلک میں سیاست لانے والے محمد علی اور شوکت علی ہیں وہ آپ کی اسی یونیورسٹی کے فرزند تھے، جنھوں نے اس ملک میں حریت پسندی اور قومی و دینی غیرت کی آگ لگا دی اور جنھوں نے تحریکِ خلافت شروع کی اور پھر تحریکِ آزادی میں ہراول دستہ بلکہ قائد کا کردار ادا کیا۔ آج پھر ہندوستان کا معاشرہ طالب ہے، اس نے اپنا دامن پھیلا رکھا ہے، میں اس کی طرف سے ترجمانی کر رہا ہوں کہ ہمارا معاشرہ پھر آج آپ سے وقت کا سپاہی چاہتا ہے۔ ہر وقت کا ایک سپاہی ہوتا ہے ہر وقت کی ایک دعوت ہوتی ہے، ہر وقت کی ایک ضرورت ہوتی ہے۔ جب ضرورت تھی تحریک آزادی کے سورماؤں کی، جب ضرورت تھی حریت کے صور پھونکنے والے سرفروشوں کی، تو اس وقت علی برادران میدان میں آئے آج ملک کو اخلاقی زوال سے بچانے والوں کی ضرورت ہے۔ آج اس ملک میں ایثار و قربانی کا ایک مثالی نمونہ قائم کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ آج اس ملک میں اصحابِ کہف جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے:۔

إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ
هُدًى وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا
رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ،
لَن نَّدْعُوَ مِن دُونِهِ إِلٰهًا،
لَقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا، (کہف ۱۳، ۱۴)

وہ چند نوجوان تھے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے، ہم نے انھیں ہدایت میں اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ اور ان کے دلوں کی صبر و استقامت کی بندش کر دی وہ جب (راہِ حق میں) کھڑے ہوئے تو انھوں نے (صاف صاف) کہہ دیا ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو پکارنے والے نہیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ بڑی ہی بے جا بات ہوگی۔

آج ہمارے معاشرہ کو ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو میدان میں آئیں اور ملک کو اخلاقی زوال سے بچائیں۔ اخلاقی زوال آخری حد تک پہنچ گیا ہے۔ ایک آدمی کسی حادثہ کا شکار ہوجائے تو یہ تو ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے کہ اس کے قرب وجوار میں کہرام مچ جاتے لوگ جمع ہوجائیں۔ مائیں اپنے گھروں سے نکل آئیں۔ اپنے بچوں کو چھوڑ دیں۔ کوئی پانی لے کر آئے کوئی دوالے کر آئے کہ ہمارے بھائی معلوم نہیں کہاں جارہے تھے حادثہ کا شکار ہوگئے۔ لیکن اس ملک کی اخلاقی گراوٹ کا حال یہ ہے کہ اس وقت لوگ ان مرے ہوئے کچلے ہوئے انسانوں کے ہاتھ سے گھڑیاں نکال لیتے ہیں اور ان کے پرس کی تلاشی لیتے ہیں، اس وقت بجائے اس کے کہ ان کے خشک لبوں میں پانی کا ایک قطرہ ڈالیں وہ ظالم ان کی قیمتی چیزیں لوٹنے میں لگ جاتے ہیں۔ آپ یہ واقعات تاریخ میں پڑھتے تو یقین نہ کرتے اور دوسرے ملک کے لوگ یقین نہیں کریں گے۔ لیکن ہم کیا کریں۔ ریلوں میں بارہا ایسے حادثے پیش آتے ہیں اور قریب کی دیہاتی آبادی ہے۔ دیکھتی ہے کہ ایک آدمی دبا ہوا ہے۔ دو لکڑیوں کے بیچ میں اس کا بدن آگیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرا سب کچھ لے لینا لیکن کسی طرح مجھے اس شکنجے سے نکال دو تو انھوں نے اس کے ہاتھ سے گھڑی چھین لی اور اس کی جیب سے کچھ روپئے نکال لئے اور اسکو مرتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔ جو معاشرہ اس سنگدلی کی حد تک پہنچ گیا ہو اس معاشرہ کی کسی چیز کو دیکھ کر بھلا دل خوش ہوسکتا ہے۔ اس سے کچھ امید کیجا سکتی ہے کہ وہ معاشرہ دنیا میں باقی رہے گا کوئی بڑا قیادت کا رول ادا کرے گا۔

خدا کو انسان کی جو چیز سب سے زیادہ ناپسند ہے، جس پر اس کی غیرت کو جوش آتا ہے وہ ظلم ہے، سب کچھ وہ معاف کرسکتا ہے۔ عقائد کی حد تک قرآن اعلان کرتا ہے کہ شرک معاف نہیں کرے گا اور انسانوں کی قسمتوں کا جہانتک تعلق ہے، سلطنتوں تہذیبوں اور معاشرے کی قسمتوں کا جہانتک تعلق ہے ظلم ان کے لئے پیغام موت ہے ظلم کے بعد ان کو ڈھیل نہیں دی جاتی۔ تو میرے عزیزو! ہندو مسلمان نوجوانو! اس معاشرہ کو ظلم سے بچانے کے لئے میدان میں آئیں۔ دیہاتوں اور شہروں میں جائیں اور پکار

لگائیں کہ ظلم..... نہیں ہونا چاہیئے، یہ فسادات نہیں ہونے چاہئیں۔ اس میں بے گناہ مارے جاتے ہیں۔

میں نے کئی مرتبہ اس کا نقشہ کھینچا ہے کہ ایک مسافر بڑے ارمانوں کے ساتھ بمبئی سے آرہا ہے تھوڑی سی پونجی بچا کر، سنا ہے کہ ماں بیمار ہے میں جاتے ہی دوا لاؤں گا۔ وہ میری صورت دیکھکر خوش ہوں گی ان کے اندر طاقت آجائے گی۔ وہ آنکھیں کھول دیں گی۔ ابھی وہ اسٹیشن سے چلا ہی تھا کہ اُسے چھرا بھونک دیا گیا۔ ادھر ماں تڑپ رہی ہے اور یہاں بیٹے نے جان دیدی۔ جس معاشرے میں یہ واقعات ہوں اس معاشرے میں کیا کوئی بھی ترقی، اقتصادی، سیاسی اور علمی ترقی خوشی کی بات ہوسکتی ہے؟ اس ملک میں جو یونیورسٹیوں کی تعداد بتلائی جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں اس کے دس گنا یونیورسیٹیاں ہوجائیں جب بھی اس معاشرے کے لئے کوئی خوشی اور اطمینان کی بات نہیں، کوئی عزت کی بات نہیں، متوسط پڑھے لکھے لوگ ہوں مگر ظلم سے نفرت ہو، گناہ سے نفرت ہو CORRUPTION سے نفرت ہو۔ وہ معاشرہ زندہ ہے۔ طاقتور ہے اور ممکن ہے کہ دوسری قوموں کی قیادت کرے۔

میرے عزیز بھائیو! میرے محترم اساتذہ اور فضلا! میں معافی چاہتا ہوں۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

اگر میں نے اپنے حدود سے تجاوز کیا ہے، اگر میں نے بعض تلخ حقیقتیں تلخ انداز میں کہی ہوں تو مجھے معاف فرمائیں کہ جب حقائق کی تلخی حد سے بڑھ جاتی ہے تو کوئی شیریں کلامی اُسے شیریں نہیں بنا سکتی، وہ فریب دہی ہوتی ہے۔ میں نے ایک تلخ حقیقت کو تلخ انداز میں کہا ہے۔ اس پر میں آپ سے معذرت خواہ ہوں، ہماری سوسائٹی کا روگ یہ ہے کہ کوئی صاف بات کہتا نہیں، بہت دور سے چل کر، اپنی پارٹی اور اپنے فرقے کو محفوظ رکھتے ہوئے، اس کو بچاتے ہوئے۔ ہزار احتیاط کے ساتھ ایک بات ایسی کہی جاتی ہے کہ پھر کوئی پکڑ نہ سکے، ان کو پکڑے جانے کی فکر زیادہ ہوتی ہے

اور سوسائٹی کے تباہ ہونے کی فکر کم ہوتی ہے۔ لیکن جب آگ لگی ہو تو یہ تحفظات باقی نہیں رہتے۔ گفتگو کے آداب باقی نہیں رہ سکتے۔ جب آگ لگ جاتی ہے تو پھر کسی زبان میں کیسے ہی بے ڈھنگے طریقے سے کہا جاتا ہے۔ بچہ بھی بول اٹھتا ہے کہ آگ لگی ہے۔ اس وقت صورت حال یہی ہے، نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ، اس وقت ہمارا معاشرہ کوہِ آتش فشاں کے دہانے پر پہنچ گیا ہے اور کوئی تدبیر اس کو بچا نہیں سکتی۔ اگر کوئی چیز اسکو بچا سکتی ہے تو وہی مذہبی انسانوں، دانشوروں اور بے غرض انسانوں کا میدان میں آنا اور حالات سے پنجہ آزمائی کرنا اور اپنا عملی نمونہ دنیا کے سامنے اور کم از کم ہندستان کے سامنے پیش کرنا۔

میں پھر کہتا ہوں کہ اس یونیورسٹی نے محمد علی اور شوکت علی کو پیدا کیا ہے حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان کو پیدا کیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ جامعہ اب بھی ایسے آدمیوں کو پیدا کر سکتی ہے اور اس میں پیدا کرنے کی صلاحیت ہے میں آپ کے سامنے اقبال کا یہ شعر پڑھوں گا ؎

تو ہما کا ہے شکاری، ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی، یہ جہان مرغ و ماہی

آپ مرغ و ماہی پر اپنی طاقتیں صرف نہ کریں آپ نے اگر ایک چھوٹی سی چڑیا کا شکار کر بھی لیا تو کوئی فخر کی بات نہیں۔ آپ کو سارا ہندوستان پیش نظر رکھنا چاہئے اور آپ کو اپنی توانائی چھوٹے چھوٹے مسائل پر نہیں خرچ کرنا چاہئے، آپ کی طاقت بڑی قیمتی ہے اس کا اصل مستحق آپ کا معاشرہ ہے آپ کا یہ پورا عہد ہے۔ آپ کا یہ پورا ملک ہے۔ آپ کی ملت ہے۔ اس لئے آپ اپنے ساتھ بھی زیادتی کریں گے اور ملک کی بھی حق تلفی کریں گے۔ اور ملت کی بھی حق تلفی کا ارتکاب کریں گے۔ اگر آپ نے چھوٹے چھوٹے مسائل میں اپنی طاقت صرف کر دی۔ یہ مسائل آپ کی عقابی شکار ہمت، آپ کی بلند نگاہی اور آپ کی اندرونی صلاحیتوں اور جس ملت کی میراث آپ کو ملی ہے۔ اور جس کتاب الٰہی کے آپ حامل ہیں اس کے شایاں نہیں ہیں۔ جس کی آیت پڑھ کر میں نے

آپ کو سنائی ہے۔ "فلولا کان من القرون من قبلکم اولوا بقیۃ ینھون عن الفساد فی الارض"، ارے ان نسلوں میں کچھ بچے کچھے انسان تو ہوتے، دردمند انسان تو ہوتے، شعور والے انسان ہوتے، وہ فساد سے لوگوں کو روکتے منع کرتے۔ اگر وہ نہیں تھے تو ان قوموں کا تختہ الٹ دیا گیا، ان کی داستان بھی داستانوں میں نہیں رہی، وہ حرفِ غلط کی طرح تاریخ کے اوراق سے مٹا دیئے گئے۔ اور ہمیشہ اندیشہ ہے کہ ہندوستان کا یہ موجودہ معاشرہ خدانخواستہ کہیں ایسے ہی کسی انجام سے دوچار نہ ہو اس لئے میں آپ سے یہ اپیل کرتا ہوں کہ آپ اپنی توانائی، اپنی ذہانت، اپنی قوتِ عمل اپنا (ENERGY) اور اپنا (TALENT) چھوٹے چھوٹے مسائل پر خرچ کرنے کے بجائے ہندوستان کو بچانے کے لئے اور ملت کو اس کی عزت کا مقام دلانے کے لئے صرف کریں۔

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے پورے صبر و سکون کے ساتھ اور اس متانت و ثقاہت کے ساتھ جو اس یونیورسٹی کی ہمیشہ روایت رہی ہے میری معروضات سنیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

شانِ مومن

نقشِ باطل کو زمانے سے مٹا سکتا ہے
قصرِ طاغوت کی بنیاد ہلا سکتا ہے
ترے بازو میں تو زورِ اسد اللّٰہی ہے
اہرمن کو درِ یزداں پہ جھکا سکتا ہے

حضرت ثاقب قنوجوی

از:- مولانا نجم الدین اصلاحی

مرشدِ تھانویؒ اور مرشدِ مدنیؒ

حرف از زبانِ دوست شنیدن چہ خوش بود
یا از زبان آنکہ شنید از زبانِ دوست

ہندوستان کے متعدد شیوخ کبار جن میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ کا نام بطور مثال کے لیا جاسکتا ہے جسطرح اپنے گوشۂ عزلت یا مرکز ارشاد و تربیت میں بیٹھ کر بڑی بڑی انقلاب انگیز اور عہد آفریں تحریکوں کی رہنمائی اور سرپرستی فرمائی ہے۔ اسی طرح حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت سید احمد شہید، حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہم اللہ وغیرہم نے میدانوں میں نکل کر دار و رسن کو چیلنج کیا اور وقت کے فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے خلفاء و تلامذہ کے ذریعہ اشاعت یا حفاظت اسلام کا نہایت موثر اور وسیع کام انجام دیا، چنانچہ تاریخ ہند کے صفحات نے ان واقعات اور صداقتوں کو محفوظ کر رکھا ہے۔ وسعتِ قلب و نظر اور انصاف سے دیکھا جائے تو صلاح الدین ایوبی ٹیپو سلطان شہید اور خواجہ اجمیری اور سید احمد شہید رحمہم اللہ کا اگر کوئی مثنیٰ تھا تو وہ شیخ الہند اور اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہم اللہ تھے جو برطانیہ جیسی ظالم اور جبروت حکومت کے مقابلہ پر مستقل بغاوت بن کر آئے اور صاف صاف اعلان کر دیا

درمیانِ کارزارِ کفر و دیں
ترکشِ ما را خدنگِ آخریں

یہ بلند مقام وہی کر سکتا ہے جو بلند درجہ کے اخلاص للّٰہیت، بے نفسی

بر منجانب اللہ مقبولیت، کمالِ ذاتی، استقامت، جامعیت اور جہاد فی سبیل اللہ کی لذت وحلاوت سے بھرپور اور اسی نشہ خمار میں چور ہو۔ سچ ہے ؎

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دارورسن کہاں؟

اسی لئے روحانی ترقی وکمالِ باطنی کا آخری اور لازمی درجہ شوقِ شہادت ہے اور مجاہدے کی تکمیل جہاد ہے۔ حضرت حاجی عبدالرحیم ولایتی فرماتے ہیں کہ جب اللہ نے سید احمد شہیدؒ کو سہارنپور پہونچایا اور مجھ سے ملایا اور مجھ کو توفیق دی کہ میں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت اور آپ کا طریقہ دیکھا اس وقت اپنے نزدیک مجھ کو خیال ہوا کہ اگر میں مرجاتا تو میری موت بری ہوتی"

معاصرت سبب المنافرت

مذکورہ بالا فقرہ بہت مشہور ہوا اور زباں زد خاص وعام ہے مگر اہل اللہ جن کے قلوب کی ذکاوتِ حس اور لطافتِ روح کے سامنے بادشاہوں کی نازک دماغی کوئی حقیقت نہیں رکھتی ان کے درمیان رہنے کے لئے ایسی بے نفسی، ایسی سبک روحی، ایسی جامعیت اور ایسی روشن ضمیری کی ضرورت ہے کہ کوئی بداندیش یا کوئی غالی معتقد بھی ان کے درمیان آپس کے تعلقات میں رخنہ نہ ڈال سکے اور ان کے قلبِ صافی پر کبھی میل نہ آسکے۔ ہمارے مرشدِ مدنیؒ نے اس نازک مرحلہ کو بڑی کامیابی کے ساتھ طے کیا اگرچہ بعض حضرات سے سیاسی ذوق، مسلک اور خیالات کا اختلاف تھا۔ اور یہ بالکل قدرتی عمل تھا ؏

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

واضح ہو کہ راقم الحروف نے ۱۳۶۸ھ میں ایک عریضہ پروفیسر مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کو لکھا تھا جس میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی اور شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی قدس سرہما کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا اور اوپر والا مصرع لکھ گیا تھا.... جس کے جواب میں مولانا عبدالباری مرحوم نے تحریر فرمایا تھا "آپ نے بالکل صحیح لکھا" ہر گلے را....

مولانا ندوی مرحوم لکھتے ہیں ایک صاحب اپنے چھوٹے بھائی کو لائے کہ ان کو اپنا

عقیدت تو مولانا مدنیؒ سے ہے لیکن اب حضرت تھانویؒ سے بھی بہت اعتقاد ہوگیا ہے دونوں کو کس طرح جمع کریں۔ میں نے کہا کہ عمر و علی رضی اللہ عنہما کے جمع کرنے میں تو دشواری رافضی یا خارجی ہو سکتی ہو سنی کو کیا دشواری ہے ؟

مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کی یہ تشبیہ بہت خوب ہے۔ مولانا ندوی اس کے بعد خود ہی فرماتے ہیں الحمدللہ اس جمع اضداد میں یہ سراپا نالائق بھی زیادہ نالائق نہیں رہا۔ (مکتوبات شیخ الاسلام جلد اوّل)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہندو پاک بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پوری اسلامی دنیا میں مرشد تھانویؒ اور مرشد مدنیؒ کا سا شیخ شریعت و طریقت کے رموز و نکات کا ترجمان دوسرا کوئی اور جہاں تک اپنی معلومات کام کرتی ہے ان دونوں بزرگوں کا مثل موجود نہ تھا ان حضرات نے جس شان سے مدارس اور خانقاہ کی تفریق کو مٹا کر اسلافِ کرام کی روایات کو قائم رکھا یہ انھیں کا حصہ تھا بقولِ عارف ؎

درکفِ جامِ شریعت، درکفِ سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

ان حضرات کی روشن ضمیری کا اثر تھا اور عالم رویا تک میں ہم آہنگی تھی کہ ہندوستان کی تین عظیم المرتبت شخصیتیں جو قدیم و جدید کا سنگم تھیں شعوری طور پر انھیں ہر دو مشائخ کرام کے آستانہ پر حاضر ہو کر مرید سے مراد بن گئے یعنی علامہ سید سلیمان ندوی، پروفیسر عبدالباری اور مخدوم دریابادی رحمہم اللہ تعالیٰ کون نہیں جانتا کہ ان ہر سہ بزرگوں کے علوم و فنون اور انکی تحقیقات کا سکہ ہند و بیرونِ ہند میں پوری شان سے چل رہا تھا باوجود اس کے جو کمی رہ گئی تھی وہ آبِ حیات کی محتاج تھی جس کے ایک ہی گھونٹ نے منزل کے بعد کو قرب میں تبدیل کر دیا ؎

اگر او دیدہ دارت کہ دیدارش بہ او بینی
طلب کن دیدۂ دیگر کہ دیدارِ دگر دارد

تفصیلات "تذکرہ مرشد مدنی قدس سرہٗ جو زیر تحریر ہے اس میں ملاحظہ فرمائیں گے اس موقع پر ہم ایک نہایت اہم شہادت درباب مولانا مدنی قدس سرہٗ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ شیخ التفسیر کی ناظرین کی آگاہی کیلئے درج کر رہے ہیں جو مولانا لاہوری نے

پروفیسر مولانا یوسف سلیم چشتی مدظلہ کو سنایا جس سے چشتی صاحب کو اپنے سابقہ گستاخانہ اور توہین آمیز رویے پر اعترافِ تقصیر واظہار ندامت اور باری تعالیٰ کی بارگاہ سے توفیقِ توبہ وانابت کی دولت حاصل ہوگئی۔ پروفیسر صاحب محترم سے مولانا لاہوری کے قدیم تعلقات رہے ہیں مولانا لاہوری کے زمانہ میں خاصانِ حق کے اجتماع میں برابر شریک ہوتے رہے۔ فرماتے ہیں کہ ان تمام اہل اللہ کا اسی بات پر اتفاق تھا کہ حضرت مولانا مدنیؒ کا روئے زمین پر کوئی اور روحانیت وتقویٰ میں مثل اور ہمرتبہ نہیں ہے پروفیسر صاحب سراپا حیرت بنے ہوتے مولانا لاہوری کی زبان سے حضرت مدنی قدس سرہٗ کی عظمت کا اعتراف سن رہے تھے اس کے بعد حضرت لاہوریؒ نے فرمایا حضرت مدنی کی جوتیوں کا تلا بھی میری داڑھی سے محترم ہے۔ اس لئے تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ حضرت مدنی کی شان میں تم سے جو گستاخیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ان سے رجوع کرلو۔ اگر تم حضرت مدنیؒ کے مقام سے آگاہ ہوتے تو ہرگز ایسی گستاخی کا ارتکاب نہ کرتے۔ دیکھو حضرت تھانوی حضرت مدنیؒ کے سیاسی خیالات سے متفق نہ تھے اس کے باوجود ان کا نہایت احترام کرتے تھے اور اپنی مجالس میں ان کی روحانی اور عرفانی عظمت کا اعتراف کرتے تھے۔

بقول مدیر میثاق لاہور کہ اللہ تعالیٰ کا پروفیسر سلیم چشتی پر بڑا ہی کرم ہوا کہ انھیں اس مشکل کام کی توفیق بارگاہ خداوندی سے حاصل ہوگئی ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ تفصیل اسی کتاب میں آرہی ہے۔

حضرت تھانویؒ اور حضرت مدنیؒ کے تعلقات کا اندازہ واقعۂ ذیل سے ہوگا

یہ صحیح ہے کہ ان ہر دو بزرگوں میں سیاسیات کے سلسلے میں اختلاف رہا جہاں تک ان حضرات کی ذات کا تعلق تھا وہ اختلاف اپنی حد پر ہی رہا اور اس کے باوجود قلبی محبت جانبین میں موجود تھی۔ آج سے تقریباً نصف صدی پہلے کی بات ہے مولانا الحاج حافظ ریاض احمد صاحب اشرفی قاسمی تحریر فرماتے ہیں کہ میں تھانہ بھون حضرت تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ اچانک حضرت تھانوی کے برادرزادہ جو خانقاہ کے مہتمم ہونے کے

ساتھ اکثر امور کی انجام دہی کے سلسلہ میں مختار عام کا درجہ رکھتے تھے حاضر ہوتے اور یوں عرض کیا حضرت وہ آگئے حضرت "وہ مولوی حسین احمد مدنی ..." حضرت تھانوی نے بڑے ٹھہراؤ اور اطمینان سے فرمایا۔ کیا تم اپنے مولانا حسین احمد دیوبند والو کی بات کر رہے ہو اس پر مولوی شبیر علی صاحب نے اثبات میں جواب دیا تو حضرت تھانوی نے بڑے اور سرتاسر محبت اور شفقت کے انداز اور گھبراہٹ آمیز لہجہ میں فرمایا "کہاں کدھر" اتنے میں حضرت مدنیؒ تشریف لاتے حضرت تھانویؒ اٹھ کر بڑے تپاک اور مجسم اخلاص سے حضرت مدنیؒ کے استقبال کے لئے بڑھے اور بغل گیر ہوئے بندہ نے اپنی آنکھوں سے جو منظر دیکھا وہ آج نصف صدی کے بھیانک سال بیت جانے کے بعد بھی یوں ہے جیسے یہ ابھی ابھی ان سطور کے رقم کرتے میرے سامنے ہی پیش آیا ہے۔ حضرت مدنیؒ نے حضرت تھانویؒ کی دست بوسی فرمائی اور حضرت تھانویؒ اشتیاق و محبت بھری آنکھوں سے حضرت مدنیؒ کی طرف دیکھتے رہے جب حضرت مدنی کا یہ عمل ختم ہوا تو حضرت تھانویؒ نے دوبارہ حضرت مدنیؒ کو گلے سے لگایا اور حضرت مدنی کا کندھا اور پیشانی چوم کر ان کا ہاتھ اپنے سینے پر لگایا اور پھر اپنی نشست گاہ پر تشریف لاتے اور حضرت مدنی کو اپنے ساتھ سجادہ پر بیٹھنے کا حکم دیا حضرت مدنی سجادہ سے ہٹ کر بیٹھنا چاہتے تھے لیکن، حضرت تھانویؒ نے فرمایا میرا حکم ہے کہ آپ میرے ساتھ ہی سجادہ پر بیٹھیں۔ حضرت مدنیؒ نے فوراً تعمیلِ ارشاد کی۔ حضرت تھانویؒ نے شکایتاً فرمایا آپ نے بہت زیادتی کی کہ آمد کی پہلے سے اطلاع نہیں کی بندہ شرمندہ ہے کہ آپ کی آمد کے لئے سواری کا بندوبست کرنے سے قاصر تھا یا جیسے بھی حالات ہوتے کم از کم کچھ عزیزوں کو استقبال کیلئے بھیجتا اس پر شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ نے فرمایا حضرت اپنے گھر میں بھی کوئی اطلاع کرتا ہے اپنے گھر میں تو ہمیشہ بغیر اجازت اور بغیر اطلاع ہی آنا ہوتا ہے۔ البتہ حضرت تھانویؒ کے چہرہ کی سرخی، آنکھوں کی چمک اور شفقت آمیز لہجہ میں یہ کہنے کا لطف حقیقی طور پر صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جو وہاں موجود تھا اور یا ذہن

جوان دونوں مسلم مشائخ کا گردیدہ اور دلدادہ ہو۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا بلاشک وشبہ آپ کی بات درست ہے۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا اور بندہ تو ہمیشہ سے آپ کو اپنے استاد حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند قدس سرہٗ کا قائم مقام اور جانشین سمجھتا ہے۔ یہ منظر قلم اور گفتگو میں ادا نہیں کیا جاسکتا یہ منظر کشی بندہ سے ممکن ہی نہیں۔ البتہ آج تک اس کی حلاوت آمیز لذت اپنے دل ودماغ میں اسی طرح محسوس کرتا ہوں جس طرح چالیس سال قبل کی تھی۔ اس کے بعد حضرت تھانویؒ نے حضرت مدنیؒ سے کھانے سے متعلق دریافت فرمایا تو حضرت مدنیؒ نے بالکل بے تکلفی اور اپنائیت کے لہجہ میں شلجم کے اچار اور روٹی کی فرمائش کی حضرت تھانویؒ نے مولانا شبیر علی مرحوم سے فرمایا کہ بڑے گھر سے اچار روٹی اور چھوٹے گھر سے لسی لے آؤ ۔۔۔ چنانچہ کچھ دیر کے بعد یہ سب کچھ آگیا۔ میرے اور دوسرے خدام کے دل ابھر للچا رہے تھے کہ شیخین کا پس خوردہ ہمیں بھی اگر مل جائے تو ہمارے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ ہوگا لیکن حضرت تھانویؒ کے نظام اور ضوابط کے تحت کسی کو لب کشائی اور اس قسم کی کیا بلکہ ہر قسم کی درخواست بلا اجازت قبل از وقت جرأت ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن قربان جائیے رحمۃ للعالمین صلعم کی مسجد کے عاکف اور جانشین شیخ الہندرحؒ کے اخلاقِ عالیہ کے انھوں نے خود ہی حضرت تھانویؒ سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو یہ روٹی اور اچار اپنے ان دو تین طفیلیوں کو دے دیا جائے۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا اس میں اجازت کی ضرورت ہے؟ آپ نے اُسے جب اپنا گھر فرمایا ہے تو یہ سب آپکا ہے میری جانب سے کوئی اعتراض نہیں تو اس پر حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ میں نے اس لئے اجازت کے لئے عرض کیا ہے کہ مہمان کھانے کا مالک نہیں ہوتا ہے اسے اس میں تصرف کا اختیار نہیں اسے صرف کھانیکا اختیار ہے اور بقایا میزبان کی ملکیت ہے۔ حضرت تھانویؒ اس پر مسکرائے اور خوش دلی سے اجازت بھی مرحمت فرمائی چنانچہ بندہ کو مع دوسرے خدام کے بلوایا گیا اور یہ تبرک ہمیں حضرت مدنیؒ نے عطا فرمایا ۔۔۔ جب مرشد مدنیؒ نے رخصت چاہی تو حضرت تھانویؒ نے بڑے گھر سے بڑی عمدہ ململ کی دستار منگوائی اور حضرت

مدنیؒ کو عطا فرمائی حضرت مدنیؒ نے وہ دستار اپنے سر پر رکھکر اس درخواست کے ساتھ واپس کردی کہ حضرت آپکے علم میں ہے کہ بندہ نے انگریزی مال کا بائیکاٹ کر رکھا ہے اس لئے بندہ استعمال کرنے سے مجبور ہے اس پر حضرت تھانویؒ نے اس طرح معذرت فرمائی کہ یہ بھی صرف دیکھنے اور محسوس کرنے سے متعلق ہے کہنے اور لکھنے میں وہ تاثرات نہیں دیئے جا سکتے۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا بھائی معاف کرنا میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا مجھے یہ مطلقاً دھیان میں نہیں رہا مجھ سے سہو ہو گیا ۔ چنانچہ وہ پگڑی حضرت مدنیؒ سے لیکر مولوی شبیر علیؒ کو واپس کردی گئی اس کے بعد حضرت تھانویؒ نے فرمایا بڑے گھر سے کھدر کی پگڑی لے آؤ ۔ آئی ، چنانچہ حضرت تھانویؒ نے یہ پگڑی حضرت مدنیؒ کو عنایت فرمائی تو حضرت مدنیؒ نے اپنا سر مبارک آگے کرکے عرض کیا آپ خود ہی باندھ دیں چنانچہ حضرت تھانویؒ ہی نے اپنے مبارک ہاتھوں سے حضرت مدنیؒ کے سر پر پگڑی لپیٹ دی اور دو روپے ہدیہ بھی دیئے جو حضرت مدنیؒ قدس سرہٗ نے بڑے ادب کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے لئے اور انہیں اپنی پگڑی کے ایک کونے میں باندھ کر سر میں دبا لیا اس کے بعد حضرت تھانویؒ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے باہر تک تشریف لے آئے۔

ع تو خود حدیثِ مفصّل بخواں ازیں مجمل "

پوری تفصیلات کے لئے الرّشید مدنی و اقبال نمبر اور راقم الحروف کا تذکرۂ مرشد مدنی قدس سرہ کا انتظار فرمایا جائے

اسلامی قدر و تعلیمات ——— ایک جائزہ

محمد سعید الرحمٰن شمس ——— مدیر ماہنامہ نصرت الاسلام کشمیر

اسلام ایک جامع، مکمل اور عالمگیر اصلاحی تحریک ہے، اس کی تعلیمات اور اقدار کی وسعت وسیع و عریض کائنات کی طرح پھیلی ہوئی ہیں اور زندگی کا کوئی گوشہ اس کی رہبری سے خالی نہیں ہے، اس کا ظہور انسانیت کے لئے خیر و برکت، سعادت و عظمت، مساوات و اخوت اور آزادی و حرّیت کا پیغام لے کر آیا ہے۔

اسلام نے ایک ہمہ گیر انسانی وحدت کا تصوّر اور پیغام دیا ہے کیونکہ اسلام ایک اللہ کی "وحدانیت" کا سبق دیتا ہے، اس نے لوگوں کے سامنے انسانی وحدت کا ایسا تصور پیش کیا جس میں دنیا کے تمام لوگ شامل ہیں، جو جغرافیائی حدود نسلی، قومی، لسانی، صوبائی اور ملکی امتیازات سے یکسر پاک اور تنگ نظری و قومی عصبیت سے یکسر مبرّا ہے۔

اسلام نے سارے عالم کے لوگوں کو ایک ہی کنبہ قرار دیکر بنی نوع کی اخوت، محبت باہمی رواداری اور بھائی چارے کی ایک مضبوط، مستحکم اور نئی اساس کی بنیاد ڈالی ہے اور انسانیت کو تمام آلائشوں سے پاک و صاف کرکے " کلکم من آدم و آدم من تراب "، لکھکر ایک ہی کڑی میں پرو دیا ہے۔

یہ اسلام ہی ہے جس نے انسان کو نیکی، پارسائی، شائستگی، شرافت، عفت اور تقویٰ و طہارت، جیسی اعلیٰ خصوصیات سے متصف کرکے انسانی زندگی کا صحیح مقصد واضح کیا ہے اس طرح اسلام نے انسان کو انسانیت کی معراج اور اوجِ کمال تک پہنچایا ہے۔ غلط اور گمراہ کن راستوں سے واپس لاکر صراطِ مستقیم پر گامزن کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مخلوق کو اپنے خالقِ حقیقی کی دہلیز پر جھکنا سکھایا ہے، عبد و معبود کا رشتہ مستحکم اور استوار کیا ہے۔

مذہبی آزادی

اسلام ساری دنیا میں عدل و مساوات کی عظیم دولت لیکر آیا، بلکہ عقائد اعمال، مسالک اور مذاہب کی آزادی بھی عطا کی "اقوام متحدہ" نے انسانی حقوق کے چارٹر میں اب صرف چند سال پہلے، مذہب، عقائد اور انسانی آزادی کا اعلان کیا ہے، لیکن داعئ اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل انسانوں کو بتلایا کہ "مذہب کا تعلق دل سے ہے زبان سے نہیں"، جبراً کسی کی زبان سے کچھ کہلوانا وہ مذہب نہیں ہوگا اور دل مذہب سے خالی ہے کیونکہ "لا اکراہ فی الدین" یعنی دین اور مذہب کے بارے میں کوئی زبردستی روا نہیں۔ انکار و اقرار کے دونوں راستے کھلے ہیں، اور ہدایت و ضلالت کی شاہراہیں الگ الگ ہیں، اور ان کے نتائج آخرت میں عنقریب ظاہر ہوں گے۔

جنگ اور خونریزی کا خاتمہ

پیشوائے اعظم، محسنِ انسانیت، محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے الفاظ میں جنگ اور خونریزی کو ناممکن بنانے کی کوشش کی ہے اور جنگ و جدل کے خلاف ایک ایسا نسخہ تجویز کیا ہے، جسے ہر زمانہ میں تیر بہدف کہا جاسکتا ہے یعنی:-

"وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا، ان اللہ لا یحب المعتدین۔ (القرآن)

یعنی تم اللہ کی راہ میں صرف ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ اور اس میں بھی تمہاری طرف سے زیادتی نہ ہو، بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنیوالوں کو پسند نہیں فرماتا۔

لڑنیوالوں کو لڑائی سے روکنے کے لئے مقابلہ کا حکم دیا گیا ہے اگر یہ حکم نہ دیا جاتا تو لڑائی سے روکنے والے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے!

انفرادی و اجتماعی ذمہ داری

اسلام نے معاشرہ کے تمام لوگوں پر انفرادی اور اجتماعی طور پر کچھ ذمہ داریاں ڈالی ہیں اور اس طرح اس نے اجتماعی، شخصی اور خاندانی نظام کو بھی عدل و مساوات محبت و آشتی کی بنیادوں پر قائم کیا ہے، جس سے معاشرہ کے تمام افراد اعلیٰ

سے ادنیٰ تک احساس ذمہ داری اور بیداریٔ ضمیر سے جاگ اٹھے۔ اور قوم کا سردار اپنے قوم کا ایک ادنیٰ خادم سمجھنے لگے، کہ "سید القوم خادمھم" اور وہ صحیح اسلام کی سادہ اور فطری زندگی کا نمونہ نظر آنے لگے۔

متوازن اقتصادی نظام

اسلام اعلیٰ اخلاق کا معلّم، انسانیت کا حامی اور شرافتِ نفس کا علمبردار ہے۔ اسلام ناجائز ذرائع سے زر و دولت کے استحصال کا شدید مخالف ہے۔ اور دولت کی صحیح تقسیم اور اس کے جائز طریقوں کا رہنما اور متوازی مالی نظام کے اصولوں کا حامل اور پاسبان ہے، جس سے دورِ حاضر کے سیاسی، معاشی اور اقتصادی نظاموں کے منادول اور مفکروں کا دامن یکسر خالی ہے۔ اگر اسلام کے متوازن مالی اور معاشی نظام پر عمل کیا جائے تو مخلوقِ خدا کو ہلاکت خیز طبقاتی اور نظریاتی جنگ سے نجات حاصل کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ اور یہ مفکرین انسانیت کے لئے گرانقدر خدمت ہوگی، کیونکہ تمدن و معاشرت میں سب سے پہلی منزل دولت کی ہے۔ اسلام نے دولت کو معیشت قرار دیکر قرآن مجید کے ذریعہ صاف ہدایت کردی ہے کہ "ولا تؤتوا السفھاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاماً۔"

یعنی تم اپنا مال بے وقوفوں کو مت دو، یہ تو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لئے معیشت کا قوام بنایا ہے۔

روحانیت اور مادیت میں خوشگوار توازن

اسلام انسانی زندگی میں جو کردار ادا کر رہا ہے وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کا کردار ہے، وہ انسانیت کو اطمینانِ قلب کی دولت بخشتا ہے اور روحانیت و مادیت کے درمیان ایک خوش گوار توازن قائم کرتا ہے قرآنی الفاظ میں اشارہ ملتا ہے:۔

"ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار"

اسلام ہمیشہ انسان کو بحیثیت مجموعی مخاطب کرتا ہے اور بیک وقت انسان

کی عقل سے بھی خطاب کرتا ہے اس کے دل، اس کے دماغ اور اس کے اعضاء رئیسہ سے بھی، لیکن اصلاح کہ روح وجسم کے توازن کو برقرار رکھتا ہے اور اپنے حلقہ بگوشوں کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ علم وعمل سے مسلح ہو کر زمین کے پوشیدہ خزانوں کا سراغ لگائے اور اسے تمام انسانیت کی بھلائی میں صرف کرے۔

اسلامی معاشرت

تمدن ومعاشرت کی تاریخ میں موجودہ دور کے دنیا کا سب سے زیادہ مہذب، ترقی پذیر، اور سائنسی عروج و ارتقاء کا دور مانا جاتا ہے یہ سب کچھ اپنی جگہ پر ہے، اور اس میں بڑی حد تک اختلاف کی بھی گنجائش ہے۔ اور جہاں تک مادی ترقی کا سوال ہے تو اس حقیقت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ دورِ حاضر کا انسان مادہ پرستی اور خود غرضی میں اسقدر آگے جاچکا ہے، کہ زندگی کے اس تگ ودو میں پیچھے مڑ کر ماضی کی اخلاقی قدروں انسان دوستی، بے غرض تعلق اور فطرت کے مطابق "طرزِ حیات" کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا، یہ رنگ حاکم ومحکوم اور امیر وغریب دونوں پر یکساں چڑھا ہوا ہے۔

اس مقابلہ میں اسلامی اقدار، اس کے نظامِ حیات اور اسلامی معاشرت پر نظر ڈالی جائے تو حاکم ومحکوم اور طاقت ور وکمزور مساوات کی ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں، اگر قوم پر کوئی مصیبت یا برا وقت آئے تو بڑے سے بڑا حاکم یا خود خلیفۃ المسلمین بھی اس کی مدد کو فوراً حاضر ہو جاتا ہے اس کے دل میں ایک معمولی شخص کی خدمت کرنے میں کوئی عار یا شرم محسوس نہیں ہوتی بلکہ خدائی محاسبہ کے خوف اور آخرت کی گرفت سے اسے ایک دینی فریضہ سمجھ کر انجام دیتا ہے۔

تاریخ کے سینکڑوں صفحات ایسے زندہ واقعات سے پُر ہیں، نہ یہاں ان کا احصاء مقصود ہے اور نہ محدود صفحات میں اس کی گنجائش! خود امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اکثر رات کو مدینہ کی گلیوں میں گشت فرماتے اور لوگوں کے حالات معلوم کرتے تاکہ ضرورت مندوں اور محتاجوں کی بروقت امداد واعانت کی جاسکے، اس کے علاوہ ان کے مقرر کردہ مخبرین (جاسوس) تمام بلادِ اسلامیہ میں

پھیلے ہوئے تھے اور مفتوح علاقوں کے عوام کے تمام مسائل اور گورنروں کے فیصلوں کی پوری رپورٹ، عوام کا ردِ عمل، حاکم کا طرزِ عمل بھی کچھ پہنچایا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ گورنروں کی چھوٹی موٹی غلطیوں اور لغزشوں پر بھی آپؓ فوراً متنبہ فرماتے اور سخت مواخذہ کرتے تھے، چنانچہ اسی گرفت اور مواخذہ کے خوف سے وہ اپنے فیصلوں اور طرزِ عمل میں بڑے محتاط اور چوکس رہتے تھے۔ اسلامی فوج کے ایک نامور سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کی بیوی نے قیصر روم کی ملکہ کو "عطر" تحفہ میں روانہ کیا، جس کے جواب میں قیصر روم کی ملکہ نے ایک نہایت ہی بیش قیمت ہار بھیجا، ہدیوں کا یہ تبادلہ بھی فاروقِ اعظمؓ کی عقابی نگاہوں سے مخفی نہ رہ سکا، آپؓ نے وہ ہار مدینہ منگواکر فروخت کر دیا عطر کی قیمت حضرت ابو عبیدہ ابن جراح کی بیوی کو دیدی اور باقی قیمت بیت المال میں جمع کروادی، ان کی یہ کارروائی محض اس وجہ سے تھی کہ حکومت کے کسی عہدہ پر فائز افسر کو ہدیہ وغیرہ اس کی کرسی کی بدولت ملتے تھے ورنہ اگر وہ اس کرسی اقتدار پر نہ ہوتا تو کوئی شخص یہ ہدیہ ان کے گھر نہ لے جاتا۔ لہٰذا کرسی کی بدولت ملنے والا ہدیہ بیت المال ہی کا حق ہونا چاہیے۔

ظاہر ہے اس احتیاط، تورع اور باریک بینی و نزاکت کی رعایت انسانی خود ساختہ تمدن اور معاشرت بھلا کیسے کرسکتی ہے؟

یہ منصب اور مقام بے شبہ اسلامی نظام ہی کا ہے، دوسرے باطل نظاموں کا نہیں

نظامِ نظافت

یہ پہلے بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ "اسلام" ہر پہلو سے ایک جامع "نظامِ حیات" ہے، اس کے اقدار دینی و دنیوی دونوں امور میں یکساں طور پر موجود ہیں کیونکہ اسلام اولین مقصد "روئے زمین" پر ایک ایسی مثالی سوسائٹی، معاشرہ اور سماج کی تشکیل ہے، جو اخلاقی، سیاسی اقتصادی، سماجی، قومی، اور طبی غرضیکہ تمام حیثیتوں سے مکمل ہو، اسلام وہ واحد دین و مذہب ہے جس نے "نظافت" اور طہارت کا ایک مستقل مربوط نظام قائم کیا ہے

اور صحت و صفائی کے قیام کو لازم قرار دیا ہے بلکہ اس کو عقیدہ اور ایمان سے بھی مربوط کر دیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا گیا کہ نظافت ایمان کا ایک جزء ہے۔

فلاحی معاشرہ اسلام میں باہمی کفالت کی اہم ترین یہی اجتماعی ضمانت اور گارنٹی ہے جو معاشی اور اقتصادی صورتوں میں ہمارے سامنے بھی اسی طرح نمایاں ہو کے آجاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلامی مملکت کا فرض ہوتا ہے کہ حدود مملکت میں آباد تمام محتاجوں اور مجبوروں کی ہر طرح کفالت کرے اور یہ کفالت زکوٰۃ وخیرات کے ذریعہ بیت المال میں جمع شدہ رقم سے کی جائیگی۔ دراصل اسلام نے اجتماعی۔ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اور محتاجوں کی کفالت کے لئے ہی۔ زکوٰۃ کا باقاعدہ نظام قائم کیا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے علاوہ کسی بھی مذہب میں زکوٰۃ جیسا کوئی نظام نہیں ملتا۔ زکوٰۃ کی رقم مسلمان مالداروں سے وصول کر کے غریبوں اور محتاجوں پر صرف کی جاتی ہے۔

اسلام نے چند لوگوں کے ہاتھوں میں دولت جمع ہو جانے کی شدید مخالفت کی ہے اور اسی سماجی تفاوت اور طبقاتی کشمکش کو ختم کرنے کے لئے اس نے ایک بالکل ہی منفرد نظام زکوٰۃ کی بنیاد ڈالی ہے۔ اسلام کا اصل مقصد ایک ایسے فلاحی معاشرہ کا قیام ہے جس میں ہر شخص کو بلا تفریق مذہب و ملت اور قومیت پھلنے اور پھولنے کا پورا پورا حق حاصل ہے اور اس راہ میں رکاوٹ بننے والوں کو سخت ترین سزائیں دی جانے کی ہدایات ہیں۔ ایک اسلامی معاشرہ میں لوٹ کھسوٹ، ناجائز ذخیرہ اندوزی، رشوت ستانی، کرپشن، نے حکم وتشدد، چوری ڈاکہ زنی، غصب، خیانت اور قتل وغارت گری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ظاہر ہے یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جبکہ اسلام کے بے نظیر "نظام حیات" کو کامل طور اپنایا جائے، اور اس کی مکمل تصویر خلافتِ راشدہ کے دور اور قرنِ اول میں ملتی ہے۔

قصاص و حدود اسلام نے لوگوں کی زندگی، عزت اور مال کے تحفظ کا تاکیدی

حکم دیا ہے اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سزائیں اور تعزیرات مقرر کی ہیں جن کا مقصد امن و امان کا قیام اور انسدادِ جرائم ہے، جیسے ناحق قتل، جھوٹ، چوری، بددیانتی، لوٹ مار، زنا، حرام کاری اور بغاوت وغیرہ کی الگ الگ سزائیں مقرر کی ہیں، جن کی وضاحت اور تفصیل اسلامی کتب میں موجود ہے۔

حقیقتاً مجرم کو سزا یا قصاص کی حد جاری کرنا جرائم کی روک تھام کرنا ہے۔ تاکہ لوگ آزادانہ ماحول میں سکھ اور چین کی زندگی بسر کر سکیں۔ قرآن عزیز اس پر شاہد عدل ہے اور اس کا فلسفہ یوں بیان کیا ہے، "ولکم فی القصاص حیوٰۃ،، الایہ۔ یعنی قصاص سے زندگی حاصل ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ جو شخص یہ جان لے گا کہ اگر وہ کسی دوسرے کو قتل کرے گا تو وہ بھی قتل کیا جائے گا تو پھر وہ قتل سے ضرور باز رہے گا۔ اس طرح سے کم سے کم دو آدمیوں کی جان بچے گی۔ پتہ چلا کہ اسمیں انسانی زندگی کی حفاظت کا راز مضمر ہے۔

حقوق میں انصاف

آج کے دور میں ناپ تول میں کمی، ڈنڈی بازی اور ملاوٹ وغیرہ سماجی بدعات وبائی امراض کی طرح پھیل گئی ہیں ان کے انسداد کیلئے روزانہ قانون اور قواعد بنائے جاتے ہیں، مگر اسلام نے پہلے ہی اس مرض کی نشاندہی کر کے دنیا والوں کو متنبہ کر دیا ہے کہ اس کے ثمرات اور نتائج کیا ہوں گے؟ قرآن مجید میں اس کی روک تھام کے لئے ارشاد ربانی ہے:۔

"ووضع المیزان الا تطغوا فی المیزان واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان، (القرآن) یعنی اللہ تعالٰے نے ایک میزان مقرر کر دیا ہے کہ تم اس میزان میں کسی طرح کی کمی بیشی نہ کرو اور انصاف کے ساتھ معیار کو درست رکھو اور اللہ کے مقرر کردہ میزان میں کسی قسم کا نقصان مت کرو!

مسلمان خیر امت جو نسل انسانی کی بہی خواہ ہے۔

دیکھ ارضی پر یہ امت مسلمہ ہی ہے جو دنیا کی وہ مثالی امت ہے جو خدائی عزت پہ ساری دنیا کو قربان کر سکتی ہے ساتھ

اسلامیہ کے لئے عزت وعظمت اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے اندر واضح طور پر بیان فرمایا دیا ہے جس کے بلند مقاصد میں برائیوں اور شر وفساد کی روک تھام اور نیکیوں کی اشاعت اور پھیلاؤ ہے۔ قرآنی الفاظ ہیں:۔

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر" (القرآن)

تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے وجود میں لائی گئی ہے، جن کا مقصد تخلیق نیکیوں اور اچھائیوں کا پھیلانا اور برائیوں اور منکرات سے روکنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان اس امر کا مامور ہے کہ دنیا کے کونے کونے اور ملک کے گوشے گوشے میں، نیکیوں، خوبیوں اور اچھائیوں کی تبلیغ و پرچار کرے اور برائیوں اور بے حیائیوں اور شر وفساد کے خلاف جہاد کرکے ان کا قلع قمع کرے آج اقوام متحدہ سمیت تمام ممالک نے برائیوں کے انسداد کے لئے قانون وضع کئے ہیں اور ان کے خلاف آواز بھی بلند کیجا رہی ہے مگر اسلام نے تو صدیوں پہلے ہی اس کا تاکیدی حکم دیدیا ہے۔

رشوت ستانی اور ناجائز منافع خوری

اسلام نے رشوت لینے دینے، ناجائز کمائی، اور منافع خوری، ذخیرہ اندوزی وغیرہ کی سخت مذمت کی ہے اور ان سب چیزوں کو قطعاً حرام اور ناروا قرار دیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ "فلا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون" (القرآن)

یعنی پس تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ اور نہ حاکموں کو اس غرض کے لئے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ ذرائع سے کھانے کا موقع مل جائے۔

احادیث نبوی میں بھی اس کے متعلق تاکیدی احکامات ملتے ہیں چنانچہ ایک مشہور حدیث ہے۔ "المحتکر ملعون" ذخیرہ اندوز (اشیاء خوردنی کو بند کرکے ناجائز منافع پر بیچنے والا) ملعون ہے۔ اور "لا یحتکر الا خاطئی" کہ وہی شخص احتکار اور ذخیرہ اندوزی کی جرأت کرے گا جو خطا کار ہو گا (بحوالہ مسلم شریف) اور "الراشی والمرتشی کلاھما

فی النار"۔ رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں جہنم میں جائیں گے۔

یہ وہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی اقدار کی چند جھلکیاں ہیں جو چودہ سو برس قبل داعیٔ اسلام محمد العربی الامی صلے اللہ علیہ وسلم نے پیش کی ہیں اور دورِ حاضر کے لوگ اب حالات اور ماحول سے مجبور ہو کر ہی سہی ان کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہیں۔

اسلام کی ہمہ گیر تعلیم

اسلام نے سیاحت، زراعت، فلاحت، ثقافت، معیشت، معاشرت، سائنس، تمدن، تاریخ وفاءِ عہد، معدنیات، نباتات، اختراعات، ایجادات، اور انکشافات، امداد باہمی اور مشترکہ ذمہ داری کے بارے میں وضاحت اور تفصیل سے احکامات جاری کئے ہیں جن کی تفصیل اس مختصر مقام میں ناممکن ہے۔

صنفِ نازک پر اسلام کے احسانات

یہ اسلام ہی ہے جس نے عورتوں کے مساوی حقوق اور درجات مقرر کر کے اسے سماجی توقیر اور عظمت عطا کی ہے۔ چنانچہ عورتوں کو حقوق و درجات میں مردوں کے برابر کھڑا کیا گیا ہے، وراثت میں اس کا باقاعدہ حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ تعلیم و تعلم میں یکساں سہولت کا دروازہ کھولا گیا ہے، "طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلمٍ ومسلمۃ" (الحدیث) اس پر شاہد ہے، عورتوں کو شرم و حیا کی تعلیم دینا، اس کا دائرہ کار اور فرائض منصبی کی یاددہانی یہ صرف اسلام ہی کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

حصولِ تعلیم

اسلام نے تعلیم و تربیت اور تحقیق و ریسرچ کی طرف لوگوں کو سب سے زیادہ توجہ دلائی ہے اور ہر فرد پر حصولِ علم کو لازم اور ضروری قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ علوم و فنون ہی سے انسان دنیوی و اخروی منافع اور فوائد حاصل کر سکتا ہے اور ملک و ملت کی گرانقدر خدمات انجام دے سکتا ہے

قومی انقلاب کی پہلی شرط تبدیلیٔ نفوس ہے

عصر حاضر میں ہر چہار طرف قومی انقلاب کے فلک شگاف نعرے لگائے جاتے ہیں لیکن نتیجہ صفر اور صرف صفر ہے۔ لیکن اسلام جو تقاضیٔ فطرت ہے "صالح انقلاب" کے لئے پہلے افراد اور نفوس میں تبدیلی ناگزیر قرار دیا ہے۔ اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ "قومی انقلاب" اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا ہے جبتک اس کے داعی اور مبلغ اس کا مثالی نمونہ نہ پیش کریں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دنیا میں ایک صالح انقلاب کو برپا کیا تو سب سے پہلے افراد کی ایک ایسی جماعت تشکیل دی، جو باطل کے مقابلہ میں دین کا آہنی قلعہ ثابت ہوئی۔

ذیل کی آیت قومی انقلاب کی نمائندگی کرتی اور تصویر پیش کرتی ہے۔

"اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ" (القرآن)

یعنی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتے جب تک وہ قوم اپنے نفوس کی حالت نہیں بدلتی۔ اور سورۂ انفال کی آیت "ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَہَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ" (القرآن)

یعنی اللہ تعالیٰ کسی قوم سے اپنے انعام واکرام اس وقت تک سلب نہیں کر لیتا جبتک کہ وہ اپنے حالات نہیں بدلتی ہے۔

افراد کی ذمہ داری

اسلام ہی وہ دین ہے جس نے جماعتی حیثیت کے علاوہ فرد کو اچھے اور برے اعمال کے نتائج کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ افراد ہی سے خاندان اور قومیں بنتی ہیں، فرد کا کیریکٹر جتنا بلند ہوگا قوم کا مستقبل اسی قدر تابناک اور روشن ہوگا، قرآنِ عزیز کی یہ آیت فرد ہی کی ذمہ داری کی بہترین وضاحت ہے۔ "مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَیْہَا" جو اچھے کردار پیش کریگا تو اس کا پھل وہ ضرور پائیگا اور جو برا عمل کرے گا اس کا خمیازہ اس کو

جھگتنا پڑیگا، اس سے متعلق ارشادِ نبوی ہے، کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ (الحدیث) تم میں سے ہر ایک فرد ذمہ دار اور نگہبان ہے جس سے اپنی رعیت اور ماتحت کے سلسلہ میں پوچھ گچھ ہوگی۔

دورِ حاضر میں اس فرد کی احساسِ ذمہ داری کا فقدان ہے، جس کی وجہ سے انفرادی جماعتی، تعمیری، اقتصادی، سیاسی، اور ملکی غلطیاں، خامیاں اور تباہیاں آئے دن رونما ہوتی رہتی ہیں۔

یہ صورتِ حال کب تک جاری رہے گی کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل ہے۔

اسلام اور سائنس

اسلام چونکہ ایک سائنٹیفک دین ہے جو ہر جائز ترقی اور ارتقار کا ساتھ دیتا ہے۔ تحقیق و ریسرچ، طبعیات ریاضیات، علم النفس، ٹکنالوجی، خلائی تحقیق اور تدقیق کی طرف رہبری اور رہنمائی کرتا ہے، چنانچہ سفرِ معراج کے علاوہ مسلمانوں کے شاندار سائنسی کارنامے اور مختلف ایجادات وانکشافات اس کا بین ثبوت ہیں۔

انسانیت وشرافت کا معیار اور اس کا لاثانی منشور

چند برس پہلے "اقوام متحدہ" کے چارٹر میں انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے چند رسمی قراردادیں اور ہدایات مرتب کی گئی ہیں، مگر خود اس کے پیش کرنے والے بڑے ممالک نے انسانیت کی جتنی تذلیل اور توہین کی ہے اور اسے جتنا پائمال کیا اور کررہے ہیں اس کی مثال ماضی کی تاریخ میں بھی ملنی مشکل ہے۔ آزاد اور خود مختار ممالک اور اقوام کو غلام بنانا آج ایک فیشن اور امن کا موٹو بنا لیا گیا ہے اور اسی امن کے نام پر ان ممالک نے چنگیزی دور کو بھی مات کردیا ہے اس کی زندہ اور تازہ مثال امریکہ کے اشارہ پر نہتے فلسطینیوں کے واجبی حقوق پر ڈاکہ اور ناحق قتل وغارت اور افغانستان میں روس کی کھلی اور ننگی جارحیت ہے۔ یہاں انسانی اور اخلاقی قدروں اور ضابطوں کو جس طرح پاؤں تلے روندا اور کچلا گیا ہے

اس کی نظر ماضی قریب کی تاریخ میں ملنی ممکن نہیں ہے۔ اس پرطرہ یہ کہ یہی لوگ مساوات اور رواداری کے علمبردار بنے بیٹھے ہیں اور اس طرح سے اقوام متحدہ کے نام نہاد چارٹر کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں،

آیئے اب اس انسانی منشور پر ایک سرسری نظر ڈالیں جو چودہ سو برس پہلے داعیٔ اسلام محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور پہلے اس پر خود عمل کر کے ایک لافانی مثال قائم فرمائی ہے۔ چنانچہ فرمایا ”اے لوگو! تمھارے خون اور تمھارے مال اور تمھاری عزتیں ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں جیسے کہ تمھارے اس مہینہ۔۔۔۔ میں، تمھارے اس شہر میں تمھارا یہ دن حرام ہے“ تم سب آدم کی اولاد ہو کسی عربی کو عجمی کے مقابلہ میں یا کسی عجمی کو عربی کے مقابلہ میں کوئی برتری اور فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اگر عنداللہ فضیلت کا معیار ہے تو وہ تقویٰ اور خداترسی کی صفت ہے، لوگو! جاہلیت کے تمام جھگڑے اور قضیے اپنے پاؤں تلے روندتا ہوں اور پہلا خون جو اپنے خاندان کا خونی جھگڑا ابن ربیعہ کے قتل کا تھا اسے ختم کرتا ہوں اور سود کی رقمیں اور غلط معاملات کالعدم قرار دیتا ہوں۔ لوگو! تم نے عورتوں کو اللہ کی امانت کے طور پر اپنی رفاقت میں لیا ہے ان کی بہترین اور احسن طریق پر تربیت کرنا عورتوں کے تم پر اور تمھارے ان پر حقوق مرتب کئے گئے ہیں،،

یہ خطبۂ رسالت طویل بھی ہے اور فصیح و بلیغ بھی، یہاں پورا خطبہ نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے، اس خطبۂ مبارکہ میں نبیٔ آخر الزّماں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اونچ، پنچ، ذات پات، خاندانی اور نسبی برتری کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔ اور نسلی غرور و تکبّر کی جڑ کاٹ کر رکھدی ہے، پوری دنیا کے لوگوں کو انسانیت کی ایک ہی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے، معیارِ شرافت اور معیارِ انسانیت جس چیز کو قرار دیا ہے۔ وہ تقویٰ اور عملِ صالح ہے۔

مذکورہ بالا اسلامی تعلیمات کے چند نمونے بطورِ نمونہ پیش کئے گئے، ورنہ

؎ سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

اسلام کی تعلیمات اور اس کے اقدار اس کی سادگی اور فطری تعلیم آج بھی اس گئے گذرے اور مادیت اور ہوس رانی کے دور میں دلوں کو چھیڑتی ہوئی اثرانداز ہوتی ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں بغیر کسی دنیوی غرض اور لالچ کے لوگ اس فطری دین (اسلام) کے دائرہ میں داخل ہوتے رہتے ہیں، اللّٰہمّ زِد فزد۔

بقول برنارڈشاہ "کہ ایک دن آئے گا کہ سارے عالم میں مستقبل کا مذہب اسلام ہوگا جو فطرتِ انسانی کے قریب اور عقلِ سلیم کے عین مطابق ہے۔"

یہ بھی اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے کہ "آج دنیا اسلام کا نام لئے بغیر بہت سی اسلامی تعلیمات کو اپنائے ہوئے ہے"

یہ ہے اسلام کی تعلیم اور اس کا پیغام جو انسانی معاشرہ کو صحت مند زندگی گذارنے کے لئے عطا کیا گیا ہے اور اس پیغام کو عام کرنے سے دنیا جو فی الحقیقت تباہی اور بربادی کے دہانے پر پہونچ گئی ہے، امن وسکون، آرام وراحت اور دنیادی وروحانی شادابی اور خوشحالی کا سدابہار چمن اور گہوارہ بن سکتی ہے۔

فکرو آہنگ

تخئیل یہی میری حقیقت پہ
پرِ فشاں اوجِ فکرِ تشکیل
اپنی دنیا کی مجھے آپ ہے تمنا ثاقب
مجھ سے کہتی ہے مری زندہ مقامِ جبریل
مری زد سے نہیں باہر ہے

حضرت ثاقب پورنوی

تبلیغی نصاب ایک مطالعہ پر ایک نظر

(مولوی) عبدالمعید نیاز فتحپوری
* متعلم دورۂ حدیث، دارالعلوم دیوبند

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات اور ہر زمانہ، ہر دور میں انسانوں کی صحیح رہنمائی کرنے والا مذہب ہے۔ اس کے اصول ونظریات اور اقدار و روایت میں کسی قسم کا کوئی تغیر وتبدل ناممکن ہے۔ اور زمانہ کا اتار چڑھاؤ اس پر بالکل اثر انداز نہیں ہو سکتا ہے زمانہ ترقی کے کتنے ہی منازل طے کرلے اسلام اپنی پرانی روایت وساخت پر قائم رہتے ہوئے انسانوں کی تمام ضروریات کو پورا کرتا رہے گا۔ اس لئے اسلامی ادیب و نقاد کے لئے قرآن وحدیث کے قائم کردہ حدود میں مقید رہنا ازبس ضروری ہے۔ اور اسلامی اقدار و روایت کی پابندی اور اس کا صحیح علم رکھنے والوں کے متعین کردہ خطوط کو مشعلِ راہ بنا کر ہی وہ کسی صحیح فیصلہ اور نتیجہ پر پہونچ سکتا اور قابلِ اعتبار رائے قائم کر سکتا ہے لیکن اس کے برعکس کسی تغیر پذیر معاشرہ ابھرنے ہوئے فن اور زبان وادب کے بارے میں لکھنے اور سوچنے والا نقاد کسی ایک نقطہ اور مرکز پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ زمانہ کے ماحول ومعیار اور افراد کے بدلنے کے ساتھ ساتھ زبان وادب میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ (اور اسی تبدیلی وتغیر میں زبان وادب کی ترقی وارتقا کا راز مضمر ہے) اس بنیادی فرق کو ملحوظ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اور اس فرق کو نظر انداز کر دینے والا نقاد نہ روح اسلامی تک پہونچ سکتا ہے اور نہ اس کے خیالات مزاج اسلامی سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔

دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ عام نقاد وتبصرہ نگار کا اپنا ایک خیال اور نقطہ نظر

ہوتا ہے اور وہ اسی کو اپنا محور بنا کر اسی کے ارد گرد گھومتا اور چکر لگاتا ہے اور ادیبوں اور شاعروں ادب اور فن پاروں کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا اور ان پر تبصرہ کرتا ہے بلکہ بعض تو اپنے خیالات و نظریات کا عکس فن پارے ہی میں تلاش کرتے ہیں اور اسے اپنے خیالات و نظریات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اسلامی ادیب و نقاد کے لئے ضروری ہے کہ اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود قرآن و حدیث اور اسکی روشنی میں بنائے ہوئے اصول و ضوابط ہی کو محور بنائے اور اپنے خیالات و نظریات کو انھیں کے مطابق ڈھالے یا بالفاظِ دیگر اپنے نظریات کے خاکے میں انھیں اصول و ضوابط کا رنگ بھرے اور پھر اپنی تنقیدی حس کو بروئے کار لائے جب وہ صحیح اور کوئی قابلِ اعتنا رائے قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کام کو بحسن و خوبی وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس کا قرآن حدیث، اصولِ حدیث، تفسیر، اصولِ تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ وغیرہ کا مطالعہ وسیع اور عمیق ہو اور اس کی کمندِ نگاہ تمام جزئیات پر محیط ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ منتشر مواد کو ترتیب دینے اور صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی اس میں غیر معمولی صلاحیت ہو اور جو لوگ اس شرط کو پورا نہ کرتے ہوں اور اس کے باوجود نقد و تبصرہ کیلئے ہاتھ دھو کر بیٹھ جائیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام پر ظلم کر رہے ہیں۔ اس کی اقدار کو پامال کر رہے ہیں، اس کی روح کو مجروح کر رہے ہیں اور خود گمراہ ہونے کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی گمراہ کر رہے ہیں۔ اس سنگین خطرہ اور فتنہ کے سدِ باب کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی سخت ترین الفاظ میں فرمایا!

من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدہ من النار (رواہ الترمذی مشکوٰۃ ۱/۳۵)

(جس نے قرآن میں بغیر علم کے کچھ کہا اسے اپنا ٹھکانہ جہنم سمجھنا چاہئے)

اور دینی مسائل میں دست اندازی کرنے والے جاہلوں کے بارے میں فرمایا:۔

فاذا لم یبق عالماً اتخذ الناس رؤساً جہالاً فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا (رواہ ابن ماجہ ص۶) جب اہل علم باقی نہیں رہیں گے تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنالیں گے اور ان سے مسائل دریافت کریں گے اور یہ جاہل پیشوا بغیر علم کے فتویٰ دیدیں گے اور اس طرح خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

ان معروضات کے بعد تابش مہدی صاحب کی کاوشِ فکر ملاحظہ فرماتے اور ناظرین خود فیصلہ کریں کہ "تبصرہ نگار" تابش صاحب مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کے سخت ترین وعیدوں کی زد میں آتے ہیں یا نہیں ...... !

حضرت شیخ الحدیث نے صحابی رسولؐ عبداللہ بن زبیرؓ اور مالک بن سنانؓ کے آپؐ کا خون پی لینے سے متعلق دو حدیثیں نقل کی ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"حضورِ اقدس نے ایک مرتبہ سینگیاں لگوائیں اور جو خون نکلا وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو دیا کہ اسے کہیں دبا دیں وہ گئے اور آکر عرض کیا کہ دبا دیا۔ حضورؐ نے دریافت کیا کہ کہاں؟ آپؓ نے عرض کیا کہ میں نے پی لیا حضورؐ نے فرمایا جس کے بدن میں میرا خون جاتے گا اس کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکتی۔" (تبلیغی نصاب صـ۱۷۲)

دوسری روایت ہے:۔ اُحد کی لڑائی میں جب نبی اکرمؐ کے چہرۂ انور یا سرِ مبارک میں خود کے دو حلقے گھس گئے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ دوڑتے ہوئے آگے بڑھے اور دوسری جانب سے ابوعبیدہؓ دوڑے اور آگے بڑھ کر خود کے حلقے دانت سے کھینچنے شروع کئے۔ ایک حلقہ نکالا جس سے ابوعبیدہؓ کا ایک دانت ٹوٹ گیا اس کی پرواہ نہ کی دوسرا حلقہ کھینچا جس سے دوسرا دانت بھی ٹوٹ گیا لیکن وہ حلقہ بھی کھینچ ہی لیا۔ ان حلقوں کے نکلنے سے حضورؐ کے پاک جسم سے خون نکلنے لگا تو حضرت ابوسعید خدریؓ کے والد ماجد مالک بن سنانؓ نے اپنے لبوں سے اس خون کو چوس لیا اور نگل لیا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جس کے خون میں میرا خون ملا ہے اس کو جہنم کی آگ نہیں چھو سکتی۔"

مذکورہ بالا ان دونوں روایتوں کو تبصرہ نگار نے حضرت شیخ الحدیث مرحوم کی "کاوشِ فکر" کہا ہے (صـ۳۶) یہی نہیں بلکہ خوف خدا سے بے خوف ہو کر یہاں تک کہہ دیا: "ایسی عظیم اور برگزیدہ ہستی (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف اس قسم کی غلط بات کا انتساب صد درجہ ناجائز اور نادرست ہے۔"

غالباً حضرت شیخ الحدیث کی نظر سے آنحضورؐ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ضرور گزری

ہوگی :۔ من کذب علیّ متعمدًا فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ (جس نے قصداً میری طرف جھوٹ بات منسوب کی اس کا ٹھکانا جہنم ہے) بلاشبہ حضرت شیخ الحدیث نے یہ بے سند روایت ذکر کر کے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک عظیم اتہام کا ارتکاب کیا ہے (تبلیغی نصاب ایک مطالعہ ص۳۸)

تبصرہ نگار کی اس کجروی و کج فہمی پر تبصرہ نہ صرف اتنا عرض کریں گے کہ ع

ادا شناس نہ دلبر خطا ایں جاست

انتہائی افسوس کا مقام ہے آج لوگ گروہی عصبیت میں اس حد تک ملوث ہوگئے ہیں کہ "قولِ رسول" کو "قولِ ذکریا" اور ان کی "کاوشِ فکر"... کہہ رہے ہیں اور ایک ان کی ذات کو مجروح کرنے کے لئے "فرمانِ رسول" کی تکذیب کر رہے ہیں اور اس طرح اپنے دین و آخرت خراب اور اپنی ہلاکت کا سامان فراہم کر رہے ہیں ۔

بہرحال مذکورہ بالا حن دونوں حدیثوں کو تبصرہ نگار نے شیخ الحدیث کی "کاوشِ فکر" اور آنحضور کی طرف اس کے انتساب کو "عظیم بہتان" قرار دیا ہے اور شیخ الحدیث پر کذب و وضع کا الزام لگا کر "فلیتبوأ مقعدہ من النار" کا مصداق ٹھہرایا ہے ان دونوں حدیثوں کو روایت کرنے والے مشہور ائمہ و محدثین کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں ۔

(۱) بزار (۲) ابو یعلی (۳) طبرانی (۴) حاکم (۵) بیہقی (۶) ابن کثیر ۔ چنانچہ جلال الدین عبدالرحمن سیوطی (صاحبِ جلالین) فرماتے ہیں :۔

اخرج البزار وابویعلی والطبرانی والحاکم والبیہقی عن عبد اللّٰہ بن زبیر انہ اتی النبیؐ وھو یحتجم فلما فرغ قال یا عبد اللّٰہ اذھب بھذا الدم فاھرقہ حیث لا یراک احد فشربہ فلما رجع قال یا عبد اللّٰہ ما صنعت قال جعلتہ فی اخفی مکان علمت انہ مخفی عن الناس قال لعلک شربتہ قلت نعم قال ویل للناس منک وویل لک من الناس فکانوا یرون ان القوۃ التی بہ من ذالک الدم

(الخصائص الکبریٰ ص۶۸ ج۱)

ترجمہ :۔ بزار، ابو یعلیٰ، طبرانی، حاکم، بیہقی نے اس روایت کی تخریج کی ہے کہ عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ اس وقت سینگیاں لگوا رہے تھے جب آپ فارغ ہو گئے تو وہ خون عبداللہ بن زبیرؓ کو دیکر ایسی جگہ دبا دیں جہاں کوئی دیکھ نہ سکے ۔ وہ اسے لیکر کچھ دور گئے اور پی لیا جب لوٹے تو آپ نے دریافت کیا کہ عبداللہ! اُسے کیا، کیا ؟ انھوں نے عرض کیا کہ ایسی مخفی جگہ رکھدیا ہے کہ کسی کی نظر وہاں تک نہیں پہنچ سکتی ۔ آپ نے فرمایا شاید تم نے اُسے پی لیا ہے۔ عبداللہ ابن زبیرؓ نے کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا لوگوں کو تجھ سے تکلیف پہونچے گی اور تجھ کو لوگوں سے (پیشین گوئی آپ نے متعدد موقعہ پر فرمائی ہے) لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ میں اعلیٰ درجہ کی قوت اور شجاعت اسی خون کی وجہ سے تھی۔"

مشہور مورخ، محدث، مفسر ابوالفدا حافظ ابن کثیر دمشقیؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب "البدایہ والنہایہ" میں اس سلسلہ کی دو روایتیں نقل کی ہیں۔"

(۱) وقد روی من غیر وجه ان عبد الله ابن الزبیر شرب من دم النبی صلی الله علیه وسلم کان النبی قد احتجم فی طست فاعطاه عبد الله ابن زبیر لیریقه فشربه فقال له لا تمسك النار الا تحلة القسم، وویل لك من الناس وویل للناس منك .

ترجمہ :۔ یہ روایت متعدد طرق اور سند سے نقل کی گئی ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خون نوش فرمایا ہے ۔ اور یہ اس موقعہ پر ہوا کہ آپ نے سینگیاں لگوائیں اور وہ طشت جس میں خون تھا اسے عبداللہ بن زبیرؓ کو دے کر فرمایا کہ اسے کہیں دبا دو ۔ انھوں نے اس خون کو پی لیا اس پر آپ نے فرمایا ۔ اور لوگوں کو تجھ سے اور تجھ کو لوگوں سے تکلیف پہنچے گی۔

(۲) فی روایة انه قال له :۔ یا عبد الله إذهب بهذا الدم فاهرقه حیث لا یراك احد فلما بعد عمد الی ذلك الدم فشربه، فلما رجع قال ما صنعت بالدم ؟ قال ! انی جعلته فی اخفی مکان ظننت انه اخفی عن الناس، قال لعلك شربته ؟ قال : نعم قال لا تمسك النار الا تحلة القسم، وویل لك من الناس وویل للناس منك .

ولیکن شیئ من جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی جسدی وجسدک اولی بھمن الارض فقال البشر لا تمسک النار ابداً =

ترجمہ:- اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا عبداللہ! اس خون کو لے جا کر کسی مخفی جگہ میں دبا دو عبداللہ ابن زبیرؓ اس خون کو لے کر گئے اور کچھ دور جا کر اسے پی لیا اور جب واپس ہوئے آپؐ نے فرمایا کیا کیا؟ عبداللہؓ نے عرض کیا کہ میں نے اسے پی لیا تاکہ میرے علم و ایمان میں زیادتی ہو اور اللہ کے رسول کے بدن کا کچھ حصہ میرے بدن کا جزء ہو جائے۔ اور میرا بدن زمین کی تمام چیزوں سے اولی اور بہتر ہو جائے۔ آپ نے فرمایا! تمھیں بشارت ہو؛ جہنم کی آگ تمھیں کبھی نہیں چھو سکتی "۔ حاکم نے بھی اس روایت کو عبداللہ بن زبیر کے صاحبزادہ حضرت عامر سے نقل کیا ہے (المستدرک صفحہ ج ۲)

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے والد ماجد مالک بن سنانؓ کا جنگِ احد کے موقع پر آپؐ کا خون چوسنے اور نگل جانے کے متعلق حدیث ملاحظہ ہو:۔

اخرج البیہقی عن عمر بن السائب انہ بلغہ ان مالکا ابا ابی سعید الخدری لما جرح النبی یوم احد مص جرحہ حتی انقاہ ولاح ابیض فقیل لہ مجہ فقال واللہ لا امجہ ثم ادبر یقاتل فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اراد ان ینظر من اھل الجنۃ فلینظر الی ھذا الرجل فاستشھد (اخرجہ البیہقی) (الخصائص الکبری للسیوطی صفحہ ج ۱)

ترجمہ:- عمرو بن سائبؓ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب جنگِ احد میں زخمی ہو گئے تو ابو سعید خدریؓ کے والد ماجد مالکؓ بن سنان آپؐ کے زخم کو چاٹنے لگے یہاں تک کہ بالکل صاف کر دیا اور سفیدی جھلکنے لگی۔ لوگوں نے کہا آپ اس کو کلی کر دیں۔ ؟ انھوں نے کہا خدا کی قسم میں اس کو ہرگز کلی نہیں کرونگا پھر وہ قتال کے لئے مڑ لے پس آپؐ نے فرمایا جو کسی جنتی کو دیکھنا چاہتا ہے وہ مالک بن سنان کی طرف دیکھے اور وہ اسی غزوہ میں شہید ہو گئے۔

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی (سابق شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی)

رشتہ طراز ہیں:۔

"سرکارِ دوعالمؐ کے ایک شیدائی مالکؓ بن سنان نے (حضرت ابوسعید خدریؓ کے والد) چہرۂ مبارک سے خون بہتے ہوئے دیکھا اس وقت اور کچھ نہیں کر سکتے تھے تو لب لگا کر خون چوس لیا اور جب منہ بھر گیا تو تھوکنے کے بجائے نگل لیا۔ حضرت مالک رضی اللہ عنہ کے اس والہانہ ایثار کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی کہ "من مس دمہ دمی لم تصبہ النار" "میرا خون جسکے خون سے چھو جائے اس کو دوزخ کی آگ نہیں چھو سکے گی۔ ابن ہشام ج۲ (عہدِ زرین اور مثالی حکومتیں ص۴۷ ج ۲)

اس کے بعد ناظرین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بول وبراز اور خون کے پاک ہونے کے سلسلہ میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

سوال:۔ (۱۲۳) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگِ احد میں بعض صحابہ کا خون زخم کا چوسنا اور اس کا ذائقہ حاصل کرنا اور حضور کا بول نے جانا روایتِ معتبرہ سے ثابت ہے درحالیکہ یہ دونوں چیزیں نجس العین ہیں پس اس واقعہ کی تاویل کیا ہے ارشاد فرمایا جاوے

الجواب:۔ روایت کی تو میں نے تنقید نہیں کی لیکن اگر یہ ثابت بھی نہ ہو تو علماء نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ان رطوبات کو طاہر کہا ہے۔ علامہ شامی نے اس کی تحقیق کی ہے پس کچھ بھی اشکال نہیں اور اس کی کوئی دلیل میں نے کسی کلام میں منقول نہیں دیکھی لیکن اس وقت میرے ذہن میں آئی ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شاربین پر کوئی نکیر نہیں فرمائی اور آپ کا نکیر نہ فرمانا حجۃ شرعیہ بالاجماع ہے (امداد الفتاویٰ ص۱۲۷ ج ۱)

اس مسئلہ کے ضمن میں حاشیہ نگار (استاذِ محترم) مولانا سعید احمد پالن پوری دامت برکاتہم (استاذ حدیث وتفسیر دارالعلوم دیوبند) فرماتے ہیں:۔ علامہ شامی نے اس مسئلہ پر رد المختار ص۲۰۹ پر بحث کی ہے۔ اور طہوریت کی جو دلیل حضرت

اقدس کے ذہن پر وارد ہوئی ہے بعینہٖ قاضی عیاض نے "الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ" (ج ۱ ص ۱۲۸ فصل فی نظافۃ جسمہ) میں ذکر فرمائی ہے :- ومنہ (ای ومن الشواھد) علی طہارۃ بولہ ودمہ وسائر فضلاتہ شرب مالک بن سنان دمہ یوم احد ومصہ ایاہ وتسویغہ (ای تجویزہ) ذالک لہ وقولہ لن تصیبہ النار (ایضاً ص ۱۲۸)

ترجمہ:- (اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشاب، خون اور تمام فضلات کے پاک ہونے کے شواہد میں سے مالک بن سنان کا جنگِ احد کے دن آپ ؐ کا خون پینا اور چوسنا اور آپ کا اس فعل کو جائز قرار دینا اور یہ کہنا ہے کہ تم کو دوزخ کی آگ کبھی نہ چھو سکے گی)۔ علامہ شامی فرماتے ہیں:-

صحح بعض ائمۃ الشافعیۃ طہارۃ بولہ صلی اللہ علیہ وسلم وبہ قال ابو حنیفۃ کما نقلہ فی المواہب اللدنیۃ عن شرح البخاری للعینی وصرح بہ البیری فی شرح الاشباہ وقال الحافظ ابن حجر تظافرت الادلۃ علی ذالک وعد الائمۃ ذالک من خصائصہ صلی اللہ علیہ وسلم ونقل بعضہم عن شرح المشکوٰۃ لملا علی قاری انہ قال اختارہ کثیر من اصحابنا واطال فی تحقیقہ فی شرحہ علی الشمائل فی باب ما جاء فی تعطرہ علیہ الصلوٰۃ والسلام (رد المحتار ج ۱ ص ۲۱۲)

ترجمہ:- بعض شافعی ائمہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشاب کو پاک کہا ہے۔ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسی کے قائل ہیں جیسا کہ اسے "مواہب لدنیہ" میں عینی کی شرح بخاری سے نقل کیا ہے۔ "شرح الاشباہ" میں (علامہ) بیری نے اس کی تصریح کی ہے حافظ ابن حجر نے کہا کہ دلائل وشواہد بھی اس کے ہم نوا ہیں۔ ائمہ نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے شمار کیا ہے۔ اور بعض نے ملا علی قاری کی شرح مشکوٰۃ سے نقل کیا ہے کہ:- انھوں نے کہا کہ ہمارے اکثر اصحاب نے اسی کو اختیار کیا ہے اور شرح "شمائل" (فی باب ما جاء فی تعطرہ) میں اس پر سیر

حاصل کلام کیا ہے۔
علامہ یوسف بنوری "معارف السنن (شرح ترمذی شریف) میں لکھتے ہیں:۔

وقد صرح اهل المذاهب الاربعة بطهارة فضلات الانبياء ومن الشافعية ابن حجر "فى التلخيص الجبير" ومن الحنفية ابن عابدين فى "رد المختار" وعند القسطلانى الى بدر الدين العينى انه قال:۔ وبه قال ابو حنيفة (معارف السنن ص۹۷ ج۱)

ترجمہ۔ اور اہل مذاہب اربعہ نے فضلات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے پاک ہونے کی تصریح کی ہے۔ شافعیہ میں سے ابن حجر نے (اپنی کتاب) تلخیص الجبیر" میں اور حنفیہ میں سے ابن عابدین نے "رد مختار" میں اور قسطلانی نے عمدۃ القاری (شارح بخاری شریف) نے (علامہ بدرالدین عینی کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابو حنیفہ بھی اسی کے قائل ہیں"، علامہ بدرالدین العینی "عمدۃ القاری" (شرح بخاری) میں رقم طراز ہیں:۔ بخوف طوالت صرف ترجمہ دیا جاتا ہے حوالہ کے لئے دیکھئے۔

شراح بخاری نے آپؐ کے پیشاب، خون کے بارے میں دو قول ذکر کیے ہیں اولی والیق یہ ہے کہ . . . . پاک ہے، قاضی حسین نے "عذرۃ" میں دو قول ذکر کئے ہیں۔ اور بعض نے کہا کہ غزالی نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ بالاتفاق نجس ہے۔ میں کہتا ہوں افسوس ہے غزالی یہ کیسی ہفوات ہے؟ اور پھر آپؐ کے بارے میں؟ حالانکہ اس سلسلہ میں کثرت سے احادیث منقول ہیں کہ ایک جماعت نے آپؐ کا خون پیا، ان میں سے حجام طیبہ اور قریش کا ایک بچہ ہے جس نے آپؐ کے سینگی لگائی تھی، اور عبداللہ بن زبیر نے آپؐ کا خون پیا، بزار، طبرانی، حاکم، بیہقی اور ابو نعیم نے "حلیۃ" میں اسے نقل کیا ہے۔ اور روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے آپ کا خون نوش فرمایا اور روایت کیا جاتا ہے کہ ام ایمن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیشاب پیا۔ حاکم، دارقطنی، طبرانی،

ابونعیم نے اس کو روایت کیا ہے : اور طبرانی نے "اوسط" میں اس کی تخریج کی ہے ایک روایت میں ہے کہ ابو رافع کی بیوی سلمہ نے آپؐ کے غسل کردہ پانی کو پی لیا تو آپؐ نے فرمایا! اللہ نے تیرے بدن کے لئے آگ حرام کردی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپؐ کا حکم احکام تکلیفیہ میں تمام مسلمانوں کی طرح ہے۔ مگر یہ کہ آپؐ کی خصوصیت کے لئے کوئی دلیل ہو، میں کہتا ہوں کہ اس سے لازم آتا ہے کہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوی اور برابر ہیں ایسی بات کوئی جاہل، غبی ہی کہے گا، اور اس کا کوئی اعتبار و مرتبہ نہیں اور یہ کوئی لازم نہیں ہے کہ آپؐ کی خصوصیت کی دلیل ہمیشہ نقل ہی سے ہو۔ آپؐ کے ان جیسے مسئلوں میں غیر سے ممتاز ہونے کو عقل بھی کہتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپؐ پر کسی غیر کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اور جو اس کے علاوہ کچھ کہتا ہے۔ میں اس کے سننے کے لئے تیار نہیں۔" (عمدۃ القاری ص۱۷ ج۲)

ان تمام تر روایات اور اقوال ائمہ سے ناظرین کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ مسئلہ کوئی غیر معروف نہیں لیکن تبصرہ نگار نے بغیر کسی تحقیق و تفحص کے واہی، تباہی باتیں لکھ ڈالیں اور اس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کہ اس طرح حضرت شیخ الحدیث (نور اللہ مرقدہ) کی عظیم شخصیت کو مجروح اور پائمال کر کے ان سے اور ان کے طریقہ کار سے برگشتہ کیا جائے اور یہ جنون اس حد تک بڑھ گیا کہ احادیث پاک کا بھی انکار کر دیا (نعوذ باللہ من ذالک)

حضرت شیخ الحدیث نے خون پینے کی دونوں حدیثوں کو ذکر کرنے کے بعد عام قاری کے ذہن میں پیدا ہونے والے خلجان و تشویش کو ختم کرنے کے لیے "فائدہ" کا نوٹ لگا کر لکھ دیا ہے کہ! "حضورؐ کے فضلات پاخانہ، پیشاب وغیرہ سب پاک تھے اس لئے اس میں کوئی اشکال نہیں،، (حکایاتِ صحابہ ص۱۷۲)

لیکن جب آدمی تعنت اور مکابرہ پر اتر جاتا ہے تو ذہن ماؤف اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ بر ملا حق کی تکذیب اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ تابش صاحب لکھتے ہیں :۔

"یہ قصہ (خون پینے والی حدیث) بیان کرنے کے بعد مؤلف محترم نے اپنی طرف سے فائدہ کا نوٹ یہ بھی لکھا ہے کہ :۔

"حضورؐ کے فضلات پاخانہ پیشاب وغیرہ سب پاک ہیں اس لئے اس میں (خون پینے میں) کوئی اشکال نہیں" لیکن موصوف مرحوم نے یہ نہ بتایا کہ انھیں یہ بات کہاں سے ملی آیا براہِ راست قرآن مجید میں موجود ہے یا خود آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔ یا آپؐ کے صحابہؓ نے اس کا عملاً ثبوت دیا ہے

(تبلیغی نصاب ایک مطالعہ)

ناظرین اس طنز اور استہزاء آمیز تحریر کی روشنی میں تبصرہ نگار کی دینی و شرعی مسائل سے ناواقفیت کا اندازہ لگائیں۔ جب ایسے ناواقف حضرات اس قسم کے دینی مسائل پر تبصرہ اور نقد و جرح کرنے لگیں گے تو اس کا کیا انجام ہوگا؟ دین و شریعت کی کیا حالت ہوگی؟ عوام میں کتنی شدت سے گمراہی پھیلے گی؟ اس قسم کے سنگین نتائج پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محترم تابش صاحب کسی عظیم سازش کا شکار ہیں ورنہ ایک سچے مسلمان کے قلم سے اس قسم کی واہی تباہی باتیں نہیں نکل سکتیں۔ موصوف آگے فرماتے ہیں :۔

"خیر محترم شیخ الحدیث تو اس دنیا میں نہیں رہے ان کے خلفاء ہی کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ کسی مستند حوالے سے کم از کم ایسے کسی صحابی کی نشاندہی فرما دیں جس نے آپؐ کے فضلات، پاخانہ، پیشاب وغیرہ نوشِ جاں فرما کر امت کے لئے اس کے پاک و حلال ہونے کا ثبوت پیش کیا ہو میں ان کا بے حد ممنون و متشکر ہوں گا"، (تبلیغی نصاب ایک مطالعہ ص)

محترم نے شیخ الحدیثؒ کے خلفاء کی خدمت میں التماس کیا ہے۔

تابش صاحب نے حضرت شیخ الحدیث قدس سرہٗ کو طنزیہ مخاطب کرکے دلیل طلب کی ہے ان کے علم و خبر کے لئے یہ طالب علمانہ کاوش پیش کی جا رہی ہے اس امید پر کہ وہ صحیح علم کے بعد اہل حق کے اسوہ کے مطابق وہ اپنی غلطی سے رجوع کرلیں گے بشرطیکہ اہل حق کے زمرہ میں

شامل ہونے کو پسند کرتے ہوں۔

سردست پیشاب پینے سے متعلق چند روایتیں پیش خدمت ہیں:۔

اخبرنا احمد بن کامل القاضی ثنا عبد اللہ بن روح المدائنی ثنا شبابۃ ثنا ابو مالک النخعی عن الاسود بن قیس عن نبیح العنزی عن ام ایمن رضی اللہ عنہا قالت قام النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اللیل الی فخارۃ من جانب البیت فبال فیھا فقمت من اللیل وانا عطشی فشربت ما فی الفخارۃ وانا لا اشعر فلما اصبح النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یا ام ایمن قومی الی تلک الفخارۃ فاھریقی ما فیھا قلت قد واللہ شربت ما فیھا قال فضحک رسول اللہ حتی بدت نواجذہ ثم قال اما انک لا یفجع بطنک بعدہ ابداً۔

(رواہ الحاکم فی "المستدرک ص ۶۳ ج ۴ مطبوعہ حیدرآباد دکن)

ترجمہ:۔ نبیح عنزی فرماتے ہیں کہ ام ایمن رضی اللہ عنہا (آپ کی آزاد کردہ باندی اور اسامہ بن زید کی والدہ ماجدہ) کہتی تھیں کہ ایک رات آپؐ اُٹھے اور گھر کے ایک جانب میں رکھے ہوئے مٹی کے برتن میں پیشاب کیا۔ مجھے رات میں پیاس لگی میں اٹھی اور اس برتن میں جو کچھ تھا میں اسے پی گئی اور مجھے کچھ بھی محسوس نہ ہوا جب صبح ہوئی آپؐ نے فرمایا! اُم ایمن! اس برتن میں جو کچھ ہے اسے پھینک دو میں نے عرض کیا بخدا جو کچھ اس میں تھا میں نے اُسے پی لیا پس آپؐ ہنس پڑے۔ یہاں تک کہ آپؐ کے دانت ظاہر ہوگئے اور فرمایا! سن لو! اس کے بعد اب تیرے شکم میں کبھی درد نہیں ہوسکتا۔

روی حجاج ابن محمد عن ابن جریج عن حکیمۃ بنت امیمۃ عن امھا امیمۃ بنت رقیقۃ قالت: کان للنبی قدح من عیدان فیبول فیہ یضعہ تحت السریر، فجاءت امرأۃ اسمھا برکۃ فشربتہ فطلبہ فلم یجدہ، فقیل شربتہ برکۃ۔ فقال "لقد احتظرت من النار بحظار" ای

لقد احتمیت بحجر عظیم من النار یقیک حرھا او منک دخولھا)

(البدایہ والنھایہ ص۳۲۶ ج ۵ مطبوعہ بیروت)

ترجمہ:- امیمہ بنت رقیقہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک لکڑی کا پیالہ تھا جس میں پیشاب کرکے پلنگ کے نیچے رکھ دیتے، ایک عورت آئی جس کا نام برکۃ ہے اس پیشاب کو پی لیا۔ آپؐ نے پیشاب کے بارے میں دریافت کیا تو کہا گیا کہ اُسے تو برکۃ نے پی لیا۔ آپؐ نے فرمایا:-

اس نے پیشاب پی کر آگ سے بچاؤ کا اپنے لئے بڑا سامان پیدا کر لیا ہے (یعنی آگ کی گرمی اور اس میں داخل ہونے سے یہ پیشاب محفوظ رکھے گا)

(یہ برکہ رضی اللہ عنہا حبشہ سے ام المومنین ام حبیبہ کے ساتھ آئی تھیں۔ ان کی کنیت ام یوسف ہے)۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے "باب الاستشفاء ببولہ صلی اللہ علیہ وسلم" (آپ کے پیشاب سے شفا حاصل کرنے کے بیان) میں دو روایتیں نقل کی ہیں:-

پہلی روایت میں ہے کہ جب ام ایمن رض نے آپؐ کو صبح پیشاب پینے کی اطلاع دی تو آپ ہنسے اور بشارت دی کہ "لن تشتکی بطنک بعد یومک ھذا ابداً" اب تیرے شکم میں کبھی درد نہیں ہو سکتا۔

حسن بن سفیان نے اپنی مسند میں ابویعلیٰ، حاکم، دارقطنی، ابونعیم نے اس کی تخریج کی ہے ۔۔۔ دوسری روایت میں ہے کہ جب ام یوسف برکۃ نے آپؐ کو اس کی اطلاع دی تو آپؐ نے فرمایا:- "صحۃ یا ام یوسف" فما مرضت قط حتی کان مرضھا الذی ماتت فیہ۔ اے ام یوسف! تو ہمیشہ صحت مند رہیگی چنانچہ وہ سوائے مرض الوفات کے کبھی بیمار نہیں ہوئیں۔ اخرجہ عبدالرزاق

(الخصائص الکبریٰ ص۷۱ ج۱)

ناظرین مذکورہ بالا احادیث اور ائمہ و محدثین کے اقوال ذہن میں رکھتے ہوئے ذرا سطور ذیل ملاحظہ فرمائیں:۔ "

"خون کو خدا تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، خواہ وہ کسی کا بھی خون ہو، ارشاد خداوندی ہے اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ (النحل ۱۱۰) اللہ تعالیٰ نے تو تم پر صرف مردار کو حرام کیا ہے اور خون کو اور خنزیر کے گوشت کو (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جس معاملے میں قرآن یا حدیث کا صریح حکم موجود ہو اسمیں کسی قسم کی تاویل و منطق کی گنجائش نہیں باقی رہتی۔ لہٰذا قرآن کے رو سے خون ہمیشہ ہمیشہ اور ہر فرد و بشر کیلئے حرام ہے، اب اگر اپنی مرضی سے کوئی اُسے جائز قرار دیتا ہے تو گویا وہ خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے (صفحہ ۳۰-۳۶)

تابش صاحب کی تحریر آپنے ملاحظہ فرمائی ان کے نزدیک ہر فرد بشر کا خون حرام ہے خواہ وہ حضورؐ ہی کا کیوں نہ ہو اس لیے کہ آیت میں کسی قسم کا کوئی استثنا اور تخصیص نہیں۔ یہ تابش صاحب کا اپنا نظریہ ہے جس پر انھیں تو بہرحال عمل کرنا ہوگا لیکن یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت کی رو سے ہر قسم کے مردار حرام ہونے چاہیئے اس لیے کہ حکم صریح ہے اور اسمیں استثنا و تخصیص موجود نہیں، اس بنیاد پر تابش صاحب کے نزدیک مری ہوئی مچھلی بھی حرام ہونی چاہیئے اپنے اس بیان کردہ اصول کے مطابق وہ مری ہوئی مچھلیاں کھانا چھوڑ دینگے؟ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے ماضی میں جو انھوں نے درجنوں مری ہوئی مچھلیاں کھائی ہیں ان کا کیا ہوگا؟ اور تابش صاحب اس کا کیا کفارہ ادا کریں گے؟

مسائل حاضرہ

السوال۔ زاہد حسن پاکستانی ہے اور ناصرہ جو ناگپور مہاراشٹر میں رہتی ہے ان دونوں کا نکاح ناگپور میں بذریعہ ٹیلی فون ہوا جس کی تفصیل ذیل کے مطابق ہے۔

زاہد حسن نے اپنا ایک فوٹو کویت سے بھیجا ہے جس میں مرد بائیس سال جوان دیکھائی دیتا ہے، ناصرہ کی عمر سترہ سال ہے اس کا فوٹو کویت بھیجا گیا۔ فوٹو دیکھ کر رشتہ منظور کر لیا گیا۔ نکاح کی ایک تاریخ مقرر ہو گئی کہ اس روز ٹیلیفون پر نکاح ہو گا نکاح کے روز لڑکے کے مکان پر کچھ لوگ جمع ہوتے ایک صاحب کو ناصرہ کے نکاح کا وکیل بنا دیا گیا اس نے دو گواہوں کے سامنے ناصرہ سے اجازت و منظوری حاصل کی کہ ناصرہ کا نکاح زاہد حسن کے ساتھ بعوض دس ہزار روپے مہر کے کر دیا جائے۔

قاضی نے نکاح کے رجسٹر میں ضروری اندراجات کئے۔ کویت فون لگایا گیا اور فون پر ایجاب وقبول ہوا جس کی نوعیت یہ ہے کہ قاضی صاحب نے وکیل کا بیان لیا اور گواہوں نے اس کی تصدیق کی پھر قاضی نے زاہد حسن کو نکاح کا پیغام فون پر دیا اور اس نے فون پر اس کو قبول کیا اس طرح یہ نکاح منعقد ہوا۔ زاہد حسن نکاح سے قبل ناگپور کبھی نہیں آیا۔ ناصرہ اور اس کے والدین اور وکیل نکاح اور گواہوں اور قاضی صاحب کسی نے بھی اسکو نہیں دیکھا۔ اور نہ اس کی آواز کی پہچان کسی کو تھی نکاح کے ڈیڑھ سال بعد جب زاہد حسن اپنی اس منکوحہ ناصرہ کو لینے کے لئے ناگپور آیا تو ناصرہ بیگم اور اس کے والدین نے اس فوٹو والے زاہد حسن سے بہت فرق معلوم کیا۔

اس کے پاسپورٹ میں اس کی عمر ۴۸ سال لکھی تھی جب کہ نکاح کے وقت پچیس سال بتلائی گئی تھی۔ بالوں میں خضاب بھی لگا ہوا تھا اور ناصرہ کے لئے وہ ویزا بنا کر لایا تھا۔ اس میں خادمہ لکھا تھا

اس بنا پر ناصرہ بیگم اور اس کے ماں باپ نے اس نکاح سے انکار کر دیا اور وہ اس کے ہمراہ نہیں گئی۔

دریافت طلب یہ امر ہے کہ فون پر جس صورت میں یہ نکاح ہوا ہے از روئے شرع درست ہے یا نہیں اس صورت میں یہ نکاح فسخ کر سکتی ہے یا نہیں بینوا و توجروا۔

الجواب وباللّٰہ التوفیق

اگر سوال میں لکھے ہوئے واقعات بالکل اسی طرح ہیں جس طرح سوال میں لکھے ہوئے ہیں تو اس کا حکم یہ ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں زاہد حسن کا جو نکاح ناصرہ سے بذریعہ ٹیلی فون ہوا، وہ نکاح بچند وجوہ درست نہیں ہوا۔

(۱) شرائطِ نکاح میں سے یہ بھی ہے کہ سماع الشاہدین کلامہما معًا (عالمگیری ج ۲ ص ۲۶۷) اور یہاں پر شاہدین نے عورت کے ایجاب کا سماع تو کیا مگر قبول کا سماع نہیں کیا اس واسطے مذکور کا نکاح درست نہیں ہوا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ زاہد حسن نے جو قبولِ عقد ٹیلی فون پر کیا ہے اسمیں اس کی آواز، یہاں پر قاضی عقد اور دیگر لوگ پہچانتے نہیں ہیں، اس واسطے اس میں اشتباہ ہو گیا کہ قبولِ عقد زاہد حسن نے کیا یا اور کسی نے، اور جب اشتباہ ہو جاتے ایجاب وقبول کرنے والے میں تو پھر نکاح صحیح نہیں ہوتا، وفی الفتاوی ابی اللیث رجل قال لقوم اشہدوا انی تزوجت ھذہ المرأۃ التی فی ھذا البیت فقالت المرأۃ قبلت فسمع الشہود مقالتها ولم یروا شخصها فان کانت فی البیت وحدھا جاز النکاح وان کانت فی البیت معها اُخریٰ لا یجوز (عالمگیری ج ۲ ص ۲۶۸)

(۳) اسی طرح شرائطِ نکاح میں سے ہے ان یکون الایجاب والقبول فی مجلس واحد عالمگیری ج ۲ ص ۲۶۷) یہاں پر ایجاب وقبول کی مجلس متحد نہیں ہے اس واسطے کہ زاہد حسن وقتِ عقد میں مجلسِ عقد میں موجود نہیں غائب تھا لہٰذا غائب کو جب ایجاب کی خبر پہونچی تو اس نے قبول کیا۔ اس کا قبول معتبر نہ ہوگا، اختلافِ مجلس کی وجہ سے ولکن اذا کان احدھما غائبًا لم ینعقد حتی وکالت امرأۃ بحضرۃ شاھدین زوجت نفسی من فلان وھو غائب فبلغہ الخبر فقال قبلت او قال رجل بحضرۃ شاھدین تزوجت فلانۃ وھی غائبۃ فبلغها الخبر فقالت زوجت نفسی منہ لم یجز وان کان القبول بحضرۃ ذینک الشاھدین (عالمگیری ج ۲ ص ۲۶۸) — ناصرہ کا یہ نکاح شرعًا بالکل معدوم ہے اور غیر معتبر ہے غیر صحیح ہے اس واسطے جب ناصرہ کا نکاح منعقد ہی نہیں ہوا تو اس پر رخصتی کرانے کیلئے آنا ہی شرعًا صحیح نہیں ہوا اور نہ اس غلط نکاح کی بنیاد پر رخصت کرنا ہی جائز رہا، ہاں اگر ناصرہ کے پاس رخصت کرنا ہو تو پھر سے جدید عقد حسب ضابطہ پڑھا کر رخصت کیا جا سکتا ہے، ورنہ ناصرہ کو شرعًا اختیار ہے کہ جہاں چاہے کفو میں اپنا نکاح حسب ضابطہ شرع کر سکتی ہے۔

نوٹ:- اور اس صورت کو نکاح بارسال الکتاب پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، دونوں میں فرق

العبد نظام الدین، مفتی دارالعلوم دیوبند۔

Regd No. SHN-L-13-NP-21-83
DARUL-ULOOM MONTHLY
DEOBAND (U.P.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالعلوم دیوبند کے ترقیاتی منصوبے

(۱) رواقِ خالد کی دوسری منزل اور مزید جدید دارالاقامہ کی تعمیر جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو

(۲) دارالتربیت (دارالاطفال) کا قیام اور اس کی تعمیر

(۳) ایک وسیع مسجد کی تعمیر جس میں اضافہ شدہ تمام طلبہ کی گنجائش ہو (قدیم مسجد ناکافی ہو چکی ہے)

(۴) علمی و دینی اجتماعات کے لئے ایک وسیع ہال کی تعمیر۔ ——— (۵) ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر

(۶) مہمان خانہ کی توسیع ——— (۷) نئی درسگاہوں کی تعمیر ——— (۸) لائبریری کی تعمیرِ جدید

(۹) اساتذۂ دارالعلوم کی علمی ترقی کے لئے عالمِ اسلام سے علمی کتابوں کی فراہمی کا انتظام

(۱۰) تمام دنیا میں پھیلے ہوئے فضلاءِ دارالعلوم سے روابط اور اُن سے متعلق معلومات۔

(۱۱) نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم پر تمام ذمہ دارانِ مدارسِ عربیہ کا اہم کنونشن طلب کرنا۔

(۱۲) تعلیم و تربیت کے نئے اصول و ضوابط کی ترتیب اور اُن کا اجراء۔

اس ادارے کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے

دستِ تعاون بڑھانے کی شدید ضرورت ہے

مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی امداد روانہ فرمائیں ——— شکریہ

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب) دارالعلوم دیوبند یوپی

صرف ناٹیل مطبوعہ تاج پرنٹرس سہارنپور

دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی ماہنامہ

دارالعلوم

زیر سرپرستی

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

مدیر مسئول

ریاست علی بجنوری

HLY

(۱) رواق
(۲) دار
(۳) ایک
(۴) علم
(۶) ،
(۹) ا
(۱۰)
(۱۱)
(۱۲)

نگران اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا علمی، دینی

ماہنامہ دارالعلوم

جلد نمبر ۶۵ | دسمبر ۱۹۸۳ء مطابق ربیع الاول ۱۴۰۴ھ | شمارہ نمبر ۳

سالانہ زر اشتراک

ہندوستان سے -/۲۵ روپے
سعودی عرب، کویت، ابوظہبی وغیرہ سے
بذریعہ ایرمیل -/۹۰ روپے
جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے
بذریعہ ایرمیل -/۱۰۵ روپے
امریکہ، کناڈا، وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل
-/۱۱۶ روپے
پاکستان سے ذریعہ ریل -/۴۵ روپے
فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

طابع و ناشر

دارالعلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مطبوعہ:۔ محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند

◯ ضروری گذارش:۔ اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینہ یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو چکی ہے۔ بذریعہ سرخ نشان اس کی آپ کو بار بار اطلاع بھی دی جا چکی ہے لہذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی پی ہی سے زرِ اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے۔ اگلا شمارہ -/۳۱ روپے کے مطالبہ میں وی پی کر دیا جائے گا۔ (مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

۱:۔ ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اوّل فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کیساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

۲:۔ پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۴۵/- روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والہ تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیجدیں اور انھیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کرلیں ماہ مارچ سے خریداری نمبر بدل دیا گیا ہے۔ خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں۔ خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

الحمدللہ کہ دارالعلوم اپنی سابقہ زریں روایات وخصوصیات کے ساتھ علم دین کی اشاعت اور تعمیر ملّت کے کاموں میں مصروف ہے۔ اس وقت پہلے کے اعتبار سے طلبہ کی تعداد میں دوگنا اضافہ کردیا گیا ہے انکی سہولیات اور راحت رسانی کی جانب بھی بطور خاص توجّہ دی جارہی ہے تعلیم وتربیت کا معیار بھی روزافزوں ترقی پذیر ہے۔ ضرورت کے مطابق تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اسلامی موضوعات پر جدید مطبوعات کی فراہمی کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے غرضیکہ دارالعلوم کی حیات علمیہ کیلئے جن امور کی ضرورت ہے ان سب کی جانب پوری توجہ دیجارہی ہے۔

ان ترقیاتی اقدامات کے باوجود بعض حلقوں کی جانب سے خلاف واقعہ باتیں پھیلانے اور انکی بنیاد پر دارالعلوم کے ہمدردوں کو دارالعلوم سے بدظن وبدگمان بنانے کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ جس کے تدارک لئے مجلس شوریٰ دارالعلوم نے فیصلہ کیا کہ بہی خواہان دارالعلوم (جن کا حلقہ بحمداللہ بہت وسیع ہے اور وہ ملک کے ہر خطے میں پھیلے ہوتے ہیں) کو دعوت دی جائے کہ وہ دیوبند تشریف لاکر دارالعلوم، اس کے طلبہ واساتذہ اور تمام شعبوں اور انکی کارکردگی کا بچشم خود معائنہ کریں تاکہ خواہ مخواہ کیلئے جو غلط پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے اس کے اثرات مشاہدہ کے ذریعہ ختم ہوجائیں۔ چونکہ تمام ہمدردانِ دارالعلوم کو بیک وقت دعوت دینا دارالعلوم کی وسعت و استطاعت سے باہر کی بات ہے اس لئے یہ بھی طے کیا گیا کہ ہر ملک کے ہر صوبہ اور ہر خطہ سے وہاں کے نمایاں اور منتخب افراد کو دعوت دی جائے چنانچہ اس تجویز کے مطابق ۲۱، ۲۲ر صفر ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۷، ۲۸ر نومبر ۱۹۸۳ء کو ہمدردانِ دارالعلوم کا دوروزہ نمائندہ اجتماع منعقد ہوا جسمیں ملک کے اطراف واکناف سے دوہزار سے زائد مندوبین نے شرکت کی اور پروگرام کے مطابق دارالعلوم کے اساتذہ، طلبہ سے ملے، دارالعلوم کے تمام شعبوں میں جاکران کی کارکردگی کا معائنہ کیا، اور دارالعلوم کی کارکردگی سے پورے طور پر مطمئن ہوئے چند تجویزیں بغرض اشاعت منظور کیں جو قارئین دارالعلوم کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

ہمدردانِ دارالعلوم کے

نمائندہ اجتماع

منعقدہ ۲۷، ۲۸ / نومبر ۸۳ء میں

منظور شدہ تجاویز

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند اپنی زریں روایات اور منفرد خصوصیات کے ساتھ تعلیمی و تدریسی خدمات میں مصروف ہے۔ بہتر سے بہتر اساتذہ طلبہ کی تعلیم و تربیت میں مصروفِ عمل ہیں، طلبہ کی تعداد پہلے کے اعتبار سے دوگنی سے زائد ہے، اور انھیں ہر طرح سے سہولیات پہونچائی جارہی ہیں، ضرورت کے مطابق تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

غرضیکہ دارالعلوم کی فلاح و بہبود کیلئے جن امور کی ضرورت ہے وہ سب انجام دئے جارہے ہیں لیکن بایں ہمہ بعض حلقوں کی جانب سے مخالفانہ پروپیگنڈے کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ جس کے اثرات کو ختم کرنے کیلئے مجلس شوریٰ نے مناسب سمجھا کہ بہی خواہان و ہمدردانِ دارالعلوم سے درخواست کی جائے کہ وہ خود یہاں تشریف لاکر بچشم خود دارالعلوم اور اس کی کارکردگی کا مکمل طور پر جائزہ لیں۔ چونکہ دارالعلوم کا حلقۂ ہمدردان بہت وسیع ہے، جن کا شمار بھی مشکل ہے۔ اس لئے یہ بھی طے کیا کہ ہر صوبے سے وہاں کے منتخب اور نمایاں حضرات کو دعوت دی جائے چنانچہ اس تجویز کے مطابق ۲۷، ۲۸ / نومبر ۸۳ء مطابق ۲۱، ۲۲ / صفر ۱۴۰۴ھ کو نمائندوں کا یہ اجتماع منعقد ہوا جس میں ملک کے تقریباً ہر صوبے کے مندوبین بڑی تعداد میں شریک ہوئے، اور انھوں نے دارالعلوم کے جملہ شعبوں کا بنظرِ غائر معائنہ فرماکر حسب ذیل تجویزیں متفقہ طور پر منظور کیں۔

تجویز نمبر ۱ ہمدردانِ دارالعلوم دیوبند کا یہ اجتماع اس بات پر اظہارِ مسرت کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ اور اس کے منتظمین نے یہ اہم اور عظیم الشان

نمائندہ اجتماع بلاکر ہم کو موقع دیا کہ ہم دارالعلوم اور اس کے تمام شعبوں اور انکی کارکردگی کا بچشم خود معائنہ کریں اور طلبہ اور اساتذہ سے ملاقات کرکے یہاں کے تعلیمی اور انتظامی حالات کا مکمل جائزہ لیں۔

چنانچہ یہاں کے دوروزہ قیام میں یہ دیکھ کر کافی اطمینان اور قلبی مسرت ہوئی کہ آجکل چوبیس سو سے زائد طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ جن میں سے ڈیڑھ ہزار طلبہ کو منجانب دارالعلوم مکمل امداد دی جارہی ہے۔ تعلیم کا سلسلہ خاطر خواہ طور پر جاری ہے۔ مطبخ میں کھانے کا انتظام اس ہوش ربا گرانی کے باوجود پہلے کے مقابلہ پر کافی بلند ہے۔ مدرسہ کا عام اہتمام و نظام، طلبہ و اساتذہ کا احساس فرض شناسی ان کا باہمی اتحاد و اشتراک عمل وہ چیزیں ہیں جو ہمیں نمایاں اور صاف طور پر نظر آئیں۔ جن پر ہم خدا کا ہزار ہزار شکر ادا کرتے ہیں۔

ان خوش کن اور اطمینان بخش حالات کی بنا پر ہمیں قوی امید ہے کہ دارالعلوم اور اس کے کارکنوں کے متعلق بعض حلقوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً جو خلافِ واقعہ باتیں اور ان کی بنیاد پر مخالفانہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، مسلمان اس کا کوئی اثر قبول نہیں کریں گے۔ اور حسبِ سابق دارالعلوم کی امداد و اعانت کرتے رہیں گے، بلکہ دارالعلوم کے لئے ترقیاتی اقدامات کو دیکھتے ہوئے اسمیں بیش از بیش اضافہ کریں گے۔

تجویز ۲ ہمدردانِ دارالعلوم کے اس نمائندہ اجتماع نے اس امر کو مسرت اور اُمنگ سے دیکھا کہ دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ نے سالِ رواں کیلئے اکیاون لاکھ روپئے کا حوصلہ مندانہ بجٹ منظور کیا ہے۔ اور ساتھ ایک نہایت اہم اور ضروری ترقیاتی منصوبے کی منظوری بھی دی ہے۔ اس منصوبے کے اہم اجزاء حسب ذیل ہیں:۔

(۱)۔ ایک عظیم الشان اور وسیع مسجد کی تعمیر، کیونکہ طلبہ کی روزافزوں کی کثرت تعداد کے باعث موجودہ مسجد کی عمارت ناکافی ہوگئی ہے۔ پنجوقتہ نمازوں کیلئے طلبہ کو آس پاس کی مسجدوں میں جانا پڑتا ہے جمعہ یا عیدین کی نماز تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اس مجوزہ مسجد کا نقشہ ایک نہایت قابل انجنیئر سے بنوالیا گیا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ اس مسجد کی تعمیر پر کم و بیش نوے لاکھ روپئے خرچ ہوں گے۔

(۲)۔ ایک دارالتربیت۔ عرصہ سے اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کیجارہی تھی اور ممالک غیر کے دیندار مسلمانوں کا تقاضا اور مطالبہ بھی تھا کہ دارالعلوم میں ایک ایسا دارالتربیت قائم کیا جائے۔ جس سے ان کے بچے اپنے معیارِ زندگی کے مطابق رہیں، اور ساتھ ہی ان کی دینی، اصلاحی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ انتظام ہو۔

(۳)۔ دارالعلوم کالونی ۔ آج کل شہر میں مکان کرایہ پر ملتے نہیں ہیں اور اگر اکا دکا کوئی مکان مل بھی جائے تو مدرسے سے دور ہونے کے علاوہ اس کا کرایہ دارالعلوم کے کارکن کیلئے ادا کرنا قابل برداشت ہے۔ اس صورت حال کے باعث اساتذہ و دیگر عملہ کی ایک بڑی تعداد اپنے اہل وعیال سے دور مدرسہ کے حجروں میں مسافرانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے ۔ اس بنا پر اس سال مجلس شوریٰ نے دارالعلوم کالونی کیلئے سردست بیس مکانوں کی تعمیر منظور کی ہے ۔

(۴)۔ رواق خالد ۔ رواق خالد کے نام سے گذشتہ جس دارالاقامہ کی ایک منزل زیر تعمیر ہوئی تھی اب طلبہ کی کثرتِ تعداد کے باعث ناکافی ثابت ہو رہی ہے ۔ اس بنا پر سخت اور فوری ضرورت ہے کہ اس دارالاقامہ کی دو بالائی منزلوں کی تعمیر جلد از جلد مکمل کرائی جائے ۔

نمائندہ اجتماع اس ترقیاتی منصوبے کو بنظرِ استحسان دیکھتا اور دارالعلوم کی اسے ایک اہم ضرورت تسلیم کرتا ہے ۔ اور اربابِ خیر مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس ترقیاتی منصوبے کو باحسنِ وجوہ کامیاب بنانے میں بقدرِ استطاعت جد وجہد کریں ۔

تجویز ۳ ہمدردانِ دارالعلوم کا یہ نمائندہ اجتماع اس بات پر اپنے قلبی رنج وغم اور افسوس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اب جب کہ دارالعلوم دیوبند اپنی سابقہ روایات کیساتھ حسبِ معمول مصروف عمل ہے ، اور اب وہاں کوئی خدشہ اور کوئی قابلِ تشویش و تردد امر نہیں ہے اب بھی وہ چند در چند مقدمات کے بارگراں کے نیچے دبا ہوا ہے ، یہ مقدمات ان تمام مسلمانوں کیلئے ننگ وعار ہیں اور حد درجہ اذیتِ قلبی کا باعث ہیں جو دین قیم اور اس کے حاملین کرام کے عزت و وقار کو دل اور جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں ۔ توی امید تھی کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کے بعد گذشتہ اختلافات کی یہ علامت بد جو دارالعلوم دیوبند کی روشن پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ تھی ختم ہو جائیگی ، لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا ۔

یہ نمائندہ اجتماع ان تمام حضرات سے جو اب بھی مقدمات کے جاری رکھنے کے حق میں ہیں درخواست کرتا ہے کہ وہ ان مقدمات کو ختم کرکے دارالعلوم کی فضا کو مکمل طور پر پرسکون بنانے کی کوشش کریں ، اسمیں صرف دارالعلوم کا فائدہ نہیں ہے بلکہ ان سب حضرات کا بھی فائدہ ہے جو ان مقدمات سے وابستگی رکھتے ہیں ۔

تجویز ۴ ہمدردان و بہی خواہانِ دارالعلوم کا یہ نمائندہ اجتماع اس حقیقت کا اعلان

ضروری سمجھتا ہے کہ دارالعلوم کے قریبی گذشتہ بحرانی دور میں مظلوم طلبا و دارالعلوم دیوبند کی باشندگانِ دیوبند نے ہر طرح کی مدد فرمائی ، بالخصوص جب کہ پولیس کے ذریعہ حدود دارالعلوم سے طلبہ کو نکال دیا گیا تھا اور یہ طلبہ حیران و پریشان تھے کہ وہ اس بے بسی کے عالم میں کہاں جائیں ؟

اس نازک موقع پر باشندگانِ دیوبند نے آگے بڑھ کر طلبۂ عزیز کا استقبال کیا ، اور ان کے قیام و طعام کا پورا پورا انتظام کیا ۔ یہ امداد نہایت بر وقت تھی باشندگانِ دیوبند کا اس امداد کیلئے جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہوگا ۔

یہ نمائندہ اجتماع باشندگانِ دیوبند کا اس امداد کیلئے شکر گذار ہے ، اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اور جملہ معاونین کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے ۔ آمین ۔

تجاویز تعزیت ۵ و ۶

ہمدردانِ دارالعلوم کا یہ نمائندہ اجتماع دارالعلوم کے سابق مہتمم اور برصغیر کے ممتاز و بلند پایہ عالم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے حادثۂ وفات حسرت آیات پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے ۔

مرحوم و مغفور کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے محاسن و مناقب اور فضائل و مکارم سے نوازا تھا ، علوم ظاہری میں وہ امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے مایۂ ناز تلمیذ تھے ۔ اور علوم باطنی میں ان کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے عظیم المرتبت شیخ کی خلافت حاصل تھی ۔

حضرت قاری صاحب مرحوم نے دارالعلوم دیوبند میں نصف صدی کے طویل عرصہ تک اس عظیم ادارہ کے فرائض اہتمام انجام دئے ۔ خوش قسمتی سے ان کو اُس دور میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اور حضرت شیخ التفسیر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح کی رفاقت کا فخر حاصل ہے ۔ اور ان کے دوش بدوش انھوں نے دارالعلوم کی شہرت و عظمت کو چار چاند لگائے ۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں حسنِ خطابت کی بے بہا دولت سے نوازا تھا اپنے جدامجد حضرت نانوتویؒ کے علوم حکمیہ پر ان کی گہری نظر تھی ، اور ان کی نہایت دلنشیں تشریح فرماتے تھے ۔ علوم ظاہری و باطنی کے علاوہ اللہ نے ان کو حسنِ صورت ، اور حسنِ سیرت کے محاسن سے بھی نوازا تھا ، محبت و شفقت ، شیریں زبانی ، دلجوئی ، اور انسانیت و مروت کے جذبات سے انھیں

بھرپور طور پر نوازا گیا تھا۔

بلاشبہ حضرت قاری صاحب کا انتقال ملّت اسلامیہ کا عموماً اور حلقۂ دارالعلوم کا خصوصاً ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں مقامِ عالی عطا فرمائے، اپنے صالح اور مقرب بندوں کے زمرے میں شامل کرے اور ان کے اہلِ خاندان بالخصوص تینوں صاحبزادگان کو صبرِ جمیل اور اجرِ جزیل عطا فرمائے۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً کاملۃً شاملۃً

تجویزِ تعزیت مولانا شمس الحق افغانیؒ

یہ نمائندہ اجتماع حضرت علامہ مولانا شمس الحق افغانیؒ کے ارتحال پُرملال پر بھی اپنے دلی رنج وقلق کا اظہار کرتا ہے حضرت علامہ مرحوم دارالعلوم کے نہایت قابل و فاضل فرزند تھے، اور بعد میں کئی سال یہیں رہ کر اپنے اساتذہ کی نگرانی میں تبلیغی وتدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ یہاں سے رخصت ہو کر وہ مختلف مدارس میں بحیثیت صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے تفسیر وحدیث کی تدریس میں بھی مصروف رہے۔ پھر ریاست قلات میں وزیرِ تعلیم بنادئے گئے اور سالہا سال تک اس منصب پر فائز رہے، اور پوری ریاست میں علوم دینیہ کی نشر و اشاعت اور ان کی تعلیم وتدریس کا بہترین نظم قائم کردیا۔ پھر اس اہم ترین عہدہ سے محض جذبۂ دینی کی بنیاد پر الگ ہو کر تعلیم وتدریس اور تبلیغ دین میں لگ گئے۔

مولانا مرحوم ایک بہترین مصنّف، بلند پایہ محقّق، اور اعلیٰ درجہ کے مناظر وخطیب تھے۔ ان ظاہری علوم وفضائل کے علاوہ سلوک وتصوّف اور ارشاد واحسان میں بھی بلند مقام کے مالک تھے۔ اس قحط الرجال میں علامہ افغانی مرحوم جیسے جامع صفات عالم کی رحلت سے حلقہ ہائے علمیہ میں جو خلاء پیدا ہوگیا ہے بظاہر اس کے پُر ہونے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزّت مولانا کو اپنے مقرب بندوں میں محسوب فرمائے اور بلند درجات سے نوازے۔ آمین۔

التحقیق المفید فی اجتماع الجمعۃ والعید

از

حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ اگر عید الفطر یا عید الاضحیٰ جمعہ کے روز واقع ہو جائے تو عید کی نماز ساقط ہو جاتی ہے جیسا کہ بعض اہل زمانہ کا خیال ہے اور کہتے ہیں احادیث میں اسی طرح وارد ہے، یا جمعہ ساقط نہیں ہوتا تو اس کی دلیل کیا ہے، مہربانی فرماکر اس کو واضح کریں تاکہ خلجان اور شک دور ہو۔ بینوا بالدلائل۔ اللہ تعالیٰ اس کا اجر عطا کرے گا۔

الجواب وھو الملھم للصدق والصواب

یہ تو ظاہر ہے کہ جمعہ کی فرضیت نص قطعی (قرآن عزیز) سے ثابت ہے اور اس کی فرضیت پر اجماع ہے اور چند شروط کے ساتھ اس کی ادائیگی ائمہ اربعہ کے نزدیک مسلّم ہے، مسئول میں جن احادیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اگر بالفرض وہ ثابت ہو جائیں تو اخبار آحاد میں داخل ہیں ان سے فرض قطعی کا نسخ نہیں ہو سکتا جو اپنے محل پر طے ہو چکا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ رضی اللہ عنہم اور ان کے متبعین و مقلدین سب اس بات پر متفق ہیں کہ عید کی نماز پڑھ لینے سے جمعہ ساقط نہیں ہوتا دونوں کا پڑھنا ضروری ہے کہ جمعہ فرض قطعی ہے اس کا منکر کافر ہے، نماز عید سنت یا واجب ادا کر لینے سے فرض قطعی کا سقوط نہیں ہوتا۔ سنت اس کو ساقط نہیں کر سکتی۔

تارک جمعہ کے بارے میں جو تشدیدات اور وعیدیں وارد ہیں وہ کتب احادیث میں موجود ہیں، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عمر، حضرت عبداللہ ابن مسعود، ابوالجعد ضمری، جابر بن عبداللہ، ابوقتادہ رضی اللہ عنہم کی احادیث مرفوعہ کو مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ

امام احمد، حاکم وغیرہ نے روایت کیا ہے جن میں بغیر عذر کے جمعہ چھوڑنے والے کے گھر میں آگ لگا دینے اور اس کے دل پر مہر لگا دینے کا ذکر ہے، عیدین کے تارک کیلئے یہ وعید نہیں ہے، پھر کیسے دونوں ایک دوسرے کے مساوی ہو سکتے ہیں۔ کہ ایک دوسرے کو ساقط کر دے۔ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ جامع صغیر میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے ناقل ہیں۔

محمد عن یعقوب عن ابی حنیفۃ رضی اللہ عنھم عیدان اجتمعا فی یوم واحد فالاول سنۃ والاٰخر فریضۃ ولا یترك واحد منھما انتھی۔ (جامع صغیر ص۲ مطبع علوی)۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں جب دو عیدیں (عید اور جمعہ) ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو اول سنّت ہے (یعنی اس کا وجوب حدیث سے ثابت ہے) اور دوسری عید (جمعہ) فرض ہے (کہ نص قطعی سے ثابت ہے) اور دونوں میں سے کوئی ترک نہ ہوگی، دونوں کو ادا کرنا ضروری ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے دونوں کو مدینہ منورہ میں ادا کیا ہے کہ عید کی نماز پڑھنے کے بعد جمعہ بھی پڑھا ہے، عید کی وجہ سے اُسے چھوڑا نہیں۔

محمد قال اخبرنا مالك اخبرنی الزھری عن ابی عبید مولیٰ عبد الرحمٰن قال شھدت العید مع عمر بن الخطاب (الیٰ قولہ) ثم شھدت العید مع عثمان بن عفان فصلی ثم انصرف فخطب فقال انہ اجتمع لکم فی یومکم ھذا عیدان فمن احب من اھل العالیۃ ان ینتظر الجمعۃ فلینتظرھا ومن احب ان یرجع فلیرجع فقد اذنت لہ فقال ثم شھدت العید مع علی وعثمان محصور فصلی ثم انصرف فخطب الخ (ثم) قال محمد وبھذا کلہ ناخذ وانما رخص

ابو عبید کہتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ کیساتھ عید کی نماز پڑھی پھر حضرت عثمان کیساتھ عید کی نماز میں حاضر ہوا تو انھوں نے عید کی نماز پڑھائی نماز سے فراغت کے بعد خطبہ پڑھا اور فرمایا آج اس دنیا میں تمہاری دو عیدیں (عید و جمعہ) جمع ہو گئیں پس اہل عوالی (دیہات) میں سے جس کو جمعہ کی نماز میں شرکت پسند ہو وہ ٹھہرے اور جو واپس جانا پسند کرے وہ اپنے گھر واپس چلا جائے میں اس کو جانے کی اجازت دیتا ہوں۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کیساتھ عید میں حاضر ہوا اس وقت حضرت عثمان رضؓ محصور تھے، حضرت علی رضؓ نے نماز پڑھائی

عثمان فی الجمعة لاهل العالیة لانهم لیسوا من اهل المصر وهو قول ابی حنیفةؒ انتهی۔
(موطا امام محمد ص۱۳۲ یوسفی لکھنؤ)

اور پھر خطبہ پڑھا۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں حدیث میں جتنے امور مذکور ہیں سب ہی ہمارے ماخوذ بہا ہیں۔ اور حضرت عثمانؓ نے اہل عوالی کو اس لئے اجازت دیدی کہ وہ شہر والے نہ تھے دیہاتی تھے جن پر جمعہ فرض نہیں تھا۔ یہی قول امام ابوحنیفہؒ کا ہے کہ وہ بھی اس باب میں جتنی احادیث موجود ہیں اور ان میں جو امور مذکور ہیں سب کے قائل ہیں۔

وبه قال مالكؒ فی روایة علی وابن وهب ومطرف وابن الماجشون و انكر روایة ابن القاسم بالمنع وبالجواز قال الشافعی وابوحنیفة (زرقانی ج۱ ص۳۲۵) وقال ابوالولید الباجی المالکی فی شرحه روی ابن وهب ومطرف وابن الماجشون عن مالكؒ ان ذلك جائز وبذلك قال ابوحنیفةؒ و الشافعیؒ۔
(مقالات ص۱۶۲)

علی اور ابن وہب اور مطرف وابن الماجشون کی روایت میں امام مالک اسی کے قائل ہیں ان حضرات نے ابن القاسم کی روایت ممانعت کا انکار کردیا کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے اور اس کے جواز کے امام شافعی اور امام ابوحنیفہ قائل ہیں کہ اہل قریٰ وعوالی کے لئے اجازت ہے نیز ابوالولید الباجی مالکی نے شرح موطا میں بیان کیا کہ ابن وہب اور مطرف اور ابن ماجشون نے امام مالک سے روایت کیا ہے یہ اذن اہل عوالی اور اہل قریٰ کیلئے جائز ہے کہ وہ جمعہ کیلئے نہ ٹھہرنا چاہیں تو جا سکتے ہیں اور اسی کے امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قائل ہیں۔

اس حدیث کی تخریج امام بخاریؒ نے کتاب الاضاحی میں کی ہے جس طرح یحییٰ اللیثی نے موطا میں تخریج کی ہے۔ حدیث مرفوع کے حصہ کو بخاری ومسلم نے کتاب الصوم میں روایت کیا ہے جس کی زرقانی نے شرح موطا میں تصریح کی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب الام میں فرماتے ہیں۔

قال الشافعی وان کان یوم الفطر یوم الجمعۃ صلی الامام العید حین تحل الصلوۃ ثم اذن لمن حضرہ من غیر اهل المصر فی ان ینصرفوا ان شاءوا الی اهلیهم ولا یعودوا الی الجمعۃ والاختیار لهم ان یقیموا حتی یجمعوا او یعودوا بعد انصرافهم ان قدروا حتی یجمعوا وان لم یفعلوا فلا حرج ان شاء اللہ تعالی۔ قال الشافعی ولا یجوز هذا لاحد من اهل المصر ان یدعوا ان یجمعوا الا من عذر یجوز لهم ترک الجمعۃ وان کان یوم عید وهکذا ان کان یوم الاضحی لا یختلف اذا کان ببلد یجمع فیہ الجمعۃ ویصلی العید ولا یصلی اهل منی صلوۃ الاضحی ولا الجمعۃ لانها لیست بمصر انتهی۔

(کتاب الام ص ۲۱۲ ج ۱)

جب عید الفطر کا دن جمعہ کا دن ہو تو عید کی نماز امام پڑھائے جس وقت نماز جائز ہو جاتی ہے۔ پھر جو شہر والے نہیں ہیں اُن کو اجازت دیدے کہ وہ اگر چاہیں تو اپنے اہل کی طرف واپس جائیں اور جمعہ پڑھنے کیلئے واپس نہ ہوں۔ اُن کو اختیار ہے کہ وہ جمعہ پڑھنے کیلئے ٹھیرے رہیں یا اپنے دیہات میں جانے کے بعد اگر قدرت ہو تو جمعہ پڑھنے کیلئے واپس آجائیں اور جمعہ ادا کریں اور اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو بھی انشاء اللہ ان پر تنگی نہیں ہے۔ اور کسی شہری کیلئے جائز نہیں ہے کہ بغیر کسی عذر شدید کے جمعہ ترک کر دے اگرچہ عید ہی کا دن کیوں نہ ہو۔ اسی طرح عید الاضحیٰ کا حکم ہے کہ جب ایسے شہر میں ہو جہاں جمعہ جائز ہوتا ہے جمعہ بھی پڑھے اور عید کی نماز بھی پڑھے اور غیر شہریوں کیلئے اجازت و اختیار ہے اور اہل منی عید الاضحیٰ اور جمعہ کی نماز نہ پڑھیں کہ منی شہر نہیں ہے۔

کتاب الام کی عبارت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی جمعہ دیہاتیوں پر واجب نہیں ہے بلکہ شہر والوں پر ہے اسی لئے منی میں جمعہ اور عید سے منع کر دیا کہ منی شہر اور مصر نہیں ہے جس سے ظاہر ہے کہ علی الاطلاق ان کے نزدیک بھی ہر گاؤں میں جمعہ جائز نہیں ہے بلکہ اسی گاؤں میں جمعہ ہوگا جس میں شہریت کے کچھ آثار پائے جائیں ورنہ غیر اہل مصر کو پڑھنے نہ پڑھنے کا اختیار دینا اور ببلد یجمع فیہ کی شرط لگانا کوئی زیادہ مفید و نتیجہ خیز نہ ہوگا۔

حافظ بدر الدین العینی بنایہ شرح الہدایہ میں فرماتے ہیں۔

وفی المحلی والاشراف صلی عثمان العید ثم خطب فقال انه قد اجتمع فی یومکم هذا

محلی اور اشراف میں ہے کہ حضرت عثمانؓ نے عید کی نماز پڑھائی پھر خطبہ پڑھا، پھر فرمایا

عیدان فمن احب من اهل العالیۃ ان ینتظر الجمعۃ فلینتظر ومن احب ان یرجع الی اهله فلیرجع فقد اذنت له و وانا مجمعون دلیل علی ان ترکها لا یجوز وقال ابن عبد البر سقوط الجمعۃ والظهر بصلوۃ العید متروك مهجور لایعول علیه وتاویل ذلك فی حق اهل العالیۃ ومن لاتجب علیه الجمعۃ اھ مختصراً۔

(بنایہ ص ۱۰۱/۲ من الجلد الاول)

اس تمہارے دن میں دو عیدیں جمع ہو گئیں پس اہلِ عوالی میں سے جو شخص پسند کرتا ہے جمعہ کے انتظار کو وہ جمعہ کا انتظار کرے اور جمعہ کی نماز تک ٹھہرا رہے اور جو اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہے چلا جائے میں نے اس کو جانے کی اجازت دیدی ہم جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔ پس حضرت عثمان رضؓ کا قول انا مجمعون اس امر کی دلیل ہے کہ جمعہ کا ترک جائز نہیں ہے۔ اور حافظ ابن عبد البر نے کہا کہ جمعہ اور ظہر کی نماز کا سقوط عید کی نماز کے سبب سے قول متروک و مہجور اور غیر معتمد ہے اعتماد کے قابل نہیں ہے۔ یہ اجازت اہل عوالی اور ان حضرات کیلئے ہے جن پر جمعہ واجب نہیں ہے حضرت عثمان رضؓ کے قول کے یہ معنی ہیں۔

ابن حزم کے محلی میں اس بارے میں یہ الفاظ ہیں۔

واذا اجتمع عید فی یوم جمعۃ صلی للعید ثم الجمعۃ ولابد ولا یصح اثر بخلاف ذلك۔ قال ابومحمد الجمعۃ فرض و العید تطوع والتطوع لایسقط الفرض اھ

(المحلی ص ۸۹ جلد ۵)

اور جب جمعہ کے دن عید ہو جائے تو عید کی اور جمعہ دونوں کی نماز پڑھنا ضروری ہے اور کوئی حدیث اس کے خلاف میں صحیح نہیں ہے جمعہ فرض ہے اور عید تطوع اور کوئی غیر فرض عبادت فرض کو ساقط نہیں کرتی لہذا عید کی نماز کی وجہ سے جمعہ ساقط نہ ہوگا۔

ابن حزم نے زید ابن ارقم کی روایت پر کلام کیا ہے یہ ابن حزم کا خیال ہے کہ عید کی نماز تطوع اور نفل ہے، حنفیہ کے نزدیک مواظبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے عید کی نماز واجب ہے اور وجوب سنت سے ثابت ہے یہی امام محمدؒ کے قول " والاولی سنۃ " کے معنی بیان کئے

گئے ہیں، نیز ایک قول حنفیہ کے یہاں بھی سنت مؤکدہ کا ہے سنت ہو یا واجب عید کی نماز جمعہ کو ساقط نہیں کرتی دونوں کو پڑھنا پڑے گا ولا یترك واحد منھما امام ابوحنیفہ اور امام محمدؒ نے قرآن وحدیث دونوں پر عمل کر دکھایا، ایک سے فرضیت ثابت کی اور دوسرے سے وجوب یا سنیت دونوں اپنی اپنی جگہ پر معمول رہیں۔

اس بیان سے ثابت ہو گیا کہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور ان حضرات کے متبعین سب کے سب اس امر پر متفق ہیں کہ عید کی نماز جمعہ کی نماز کو ساقط نہیں کرتی، نیز یہ کہ جمعہ کی فرضیت اہل امصار غیر معذورین رجال پر عامۃً ہے جس پر کتاب وسنت اور عمل متوارث اور اجماع امت دلیل ہے، یہ ائمہ ثلاثہ اور ظاہریہ کا مذہب ہے لہذا اس حکم سے عید کی نماز پڑھنے والے کو خارج کر دینا ممکن نہیں، مگر جب ہی کہ کوئی ایسی قوی دلیل ہو جو جمعہ کی فرضیت عامہ کی دلیل کا قوت میں مقابلہ کر سکے اور یہ معدوم ہے بلکہ دونہ خرط القتاد ہے۔

ہاں ائمہ متبوعین رضی اللہ عنہم میں سے ایک قول شاذ کی نسبت امام احمدؒ کی طرف کی جاتی ہے کہ عید کی نماز جمعہ کی نماز کی کفایت کرتی ہے اور جمعہ کی نماز کو ساقط کر دیتی ہے اور جمعہ کے قائم مقام عید کی نماز ہو جاتی ہے یہ قول شاذ ہے جو اُن کی طرف منسوب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امام احمد کے مذہب فقہی کی تدوین توجہ تام کے ساتھ ایسی نہیں ہوئی اور نہ خود انھوں نے اس طرف توجہ کی جس طرح باقی ائمہ کی فقہ مدون ہوئی اس لئے ایک ایک مسئلہ میں بکثرت ان سے روایتیں مروی ہیں چنانچہ ابن حمدان کی کتاب الرعایۃ الکبریٰ اور ابن مفلح کی کتاب الفروع سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

اس کثرت روایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمہور کے خلاف کسی قول معتمد کی امام احمدؒ کی طرف نسبت ہی دشوار ہو گئی کہ یہ نسبت صحیح بھی ہے یا نہیں، اسی بناء پر آپ ابن جریر اور حافظ ابن عبدالبر وغیرہ کو دیکھیں گے کہ مذاہب ائمہ کے خلاف بیان کرتے وقت اکثری حالات میں امام احمد رحمہ اللہ کے قول کو ذکر نہیں کرتے بلکہ ان کا مذہب خارج اور عراق میں تقریباً پانچویں صدی میں منتشر ہوا وہ بھی قاضی ابویعلی اور ان کے اصحاب کے ذریعہ سے ورنہ اتنی مدت تک ان کا مذہب فقہی عراق کے حدود میں محصور تھا۔ امام الکیا الہراسی شافعی نے جو امام غزالی کے ہم سبق، ہم عصر اور امام الحرمین کے شاگرد ہیں ایک کتاب امام احمد رحمہ اللہ کے مسائل منفردہ کے رد میں لکھی ہے جس میں تقریباً سو مسئلوں کا ذکر ہے جن کا رد کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں

الہراسی کے ترجمہ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے جس نے حنابلہ میں ایک آگ بھڑکادی اور اس کے رد میں کئی کتابیں لکھی گئیں۔

بات میں بات پیدا ہوتی ہے اس لئے عرض ہے کہ امام احمدؒ نے تین سال تک امام ابو یوسفؒ سے علم حاصل کیا ہے ثلاث فماطو من العلم فی ثلاث سنوات اور امام محمدؒ کی کتابوں سے مسائل دقیقہ کا استفادہ کیا اور اسد بن عمرو سے علم فقہ حاصل کیا اور حدیث روایت کی جو امام ابوحنیفہ کے شاگرد اور ان کے اصحاب میں داخل ہیں حنفی ہیں، اس وقت امام احمد عراقی حنفی فقہ کے حامل تھے پھر ۱۹۵ھ میں امام شافعیؒ جب عراق تشریف لائے تو ان کی خدمت میں فقاہت حاصل کی۔ اس طریق سے فقہاء امصار کی فقہ کے جامع ہیں، حدیث وسعت روایت کا جو مرتبہ ہے وہ سب پر ظاہر ہے ائمہ فقہ کے مسائل کے سلسلہ میں امام مرجع علماء زمانہ تھے یہی وجہ تھی احمد بن الفرج امام مالک اور اہل مدینہ کے مسائل ان سے دریافت کرتے تھے اور اسحاق بن منصور الکوسج جو امام احمد اور اسحٰق بن راہویہ کی فقہ کے راوی ہیں سفیان ثوری کے مسائل دریافت کرتے تھے امام المیمونی امام اوزاعی کے مذہب کو امام احمد سے معلوم کرتے تھے۔ اسماعیل بن سعید جرجانی شالنجی امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے مسائل ان سے پوچھا کرتے تھے۔

بایں ہمہ امام احمد اپنے فقہی مذہب کی تدوین کو پسند نہ کرتے تھے تاکہ لوگ مشقت میں نہ پڑ جائیں اور مجھ پر ذمہ داری عائد نہ ہو جائے۔ حتیٰ کہ جب امام کو معلوم ہوا کہ خراسان میں کوسج مذکور ان کی طرف منسوب کرکے مسائل بیان کرتے ہیں تو امام احمدؒ نے اپنے اصحاب کو جمع کرکے اُن کو شاہد اور گواہ بنایا اور اعلان کر دیا کہ میں نے ان مسائل سے رجوع کر لیا ہے۔

ابو یعقوب اسحاق بن منصور الکوسج کی کتاب جس میں امام احمد اور ابن راہویہ کے مسائل کو جمع کیا ہے آج بھی ظاہریہ دمشق کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ امام ترمذی اپنے جامع میں امام احمد اور اسحٰق بن راہویہ کا جو مذہب کسی مسئلہ میں بیان کرتے ہیں اسی کوسج کی کتاب پر اس کی بنیاد ہے۔ امام احمدؒ کا مسائل سے رجوع کسی ضعف کی وجہ سے نہ تھا بلکہ ورع اور تقویٰ اور خوف تبعات کی وجہ سے تھا اسی احتیاط نے ان کے مسائل میں کثرت اختلاف کو پیدا کر دیا حتیٰ کہ بعض مسائل میں امام احمدؒ سے دس دس قول مروی ہیں۔ یہ ساری ان کے راویوں کی ڈھائی ہوئی آفت ہے۔

ابوبکر بن الخلال حنبلی نے اپنے زمانہ میں مختلف بلاد و شہروں کا سفر کیا اور مسائل امام

کی جستجو کی اور اصحاب امام احمد اور شاگردوں کے شاگردوں سے مسائل دریافت کر کر کے چالیس جلدوں میں جمع کردیا جس میں ان کی مختلف روایتیں موجود ہیں۔ فقہاء حنابلہ کو روایات صحیحہ کے متمیز کرنے میں دشواری پیدا ہوگئی کون سی روایت یا کون سا قول امام احمد کا اس مسئلہ میں صحیح ہے۔ اس بارے میں سب سے اچھی تصنیف صاحب منتقی الاخبار عبدالسلام ابن تیمیہ الحرانی کی کتاب المحرر ہے (مقالات کوثری)۔ کتب حنابلہ میں امام احمد رحمہ اللہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ عید کی نماز پڑھنے کے بعد جمعہ کی نماز فرض کفایہ ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جس نے جمعہ نہیں پڑھا اس سے ظہر کی نماز ساقط نہیں ہوتی۔ یہی مذہب زید بن علی کا ہے، لیکن امام احمد یا زید بن علی کا یہ مذہب نہیں ہے کہ جس نے عید کی نماز پڑھ لی اس سے ظہر کی نماز فرض ساقط ہوجاتی ہے صرف جمعہ کی نماز کے متعلق ہے کہ وہ فرض کفایہ ہوجاتا ہے، اگر کوئی حنبلی اس قول پر عمل کرے تو اس پر کوئی دار وگیر اور روک ٹوک نہیں ہے۔ الحاصل ائمہ ثلاثہ اس پر متفق ہیں کہ عید کی نماز سے جمعہ ساقط نہیں ہوتا دونوں کو پڑھنا پڑے گا۔ رخصت ان لوگوں کے لئے ہے جن پر جمعہ فرض نہیں ہے۔ جو عوالی اور دیہات کے رہنے والے ہیں۔ امام احمد کی طرف سقوط کا جو قول منسوب ہے۔ شاذ ہے، اعتماد کے قابل نہیں ہے۔

(باقی آئندہ)

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا عدل و انصاف

حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کے بیشمار قبائل سے واسطہ پڑتا تھا وہ قبائل اور خاندان ایک دوسرے کے سخت دشمن ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قبائل کیساتھ ہمیشہ عدل و انصاف سے کام لیا اور اسلام کی دعوت دینے یا عدل و انصاف کرتے وقت کسی خاص قبیلے یا کسی خاص فرد کی طرفداری نہیں کی حتی کہ مسلم وغیر مسلم کا فرق و امتیاز بھی روا نہیں رکھا بلکہ سب کیساتھ مساوات کا سلوک کیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ مخزوم قبیلے کی ایک عورت نے چوری کی۔ بعض لوگوں نے اسکو سزا سے بچانے کیلئے حضورؐ کے نہایت ہی پیارے حضرت اسامہ بن زیدؓ سے فرمائش کرکے معافی کی درخواست پیش کی۔ آپ نے اس سفارش پر ناراض ہوکر فرمایا: "بنی اسرائیل اسی سبب سے تباہ ہوگئے کہ غریبوں پر حد جاری کرتے اور امیروں سے درگذر کرتے"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی موقع پر فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر میری لخت جگر فاطمہؓ بھی چوری کا ارتکاب کرے گی تو اس کے بھی ہاتھ کٹوا دیے جائیں گے۔

ماخوذ از مکتوب

دینی عربی مدارس کیلئے طریق کار و نصاب

از محدث کبیر حضرت علامہ سید محمد یوسف البنوری نور اللہ مرقدہٗ

تجویز نصاب کا مسئلہ بے حد اہم اور وقت کا شدید تقاضا ہے اور اہم ضرورت ہے۔ اور جیسے کچھ ہو سکے کوشش کر کے طے کرنے کی ضرورت ہے۔ اتفاق مجھے بھی عرصہ سے اس کا احساس ہے۔ اور شغف رہا ہے لیکن اس کی ضرورت ہے کہ سنجیدہ دماغ اور مخلص حضرات تجربہ کار اصحاب جمع ہو کر کوئی خاکہ تیار کریں۔ انفرادی کوشش نہ تو مفید ہو سکتی ہے نہ مؤثر نہ امت کیلئے قابل قبول۔ نصاب کے بارے میں تو میں بعد میں عرض کروں گا اور شاید اس مراسلہ میں اس کی نوبت نہ آئے لیکن میرے خیال میں نصاب میں زیادہ اہم چند باتیں ہیں جو تعین نصاب کیلئے اصول موضوعہ کا کام دیتی ہیں۔ اس لئے عرض کرتا ہوں اور یہ مقصد نہیں کہ وہ چیزیں پیش نظر آپ کی نہیں لیکن شاید زیادہ توجہ نہ ہو یا کم از کم لازم فائدۃ الخبر کی درجہ میں خیال رہا نہیں لیکن اصل نصاب کے اصلاح سے زیادہ قابل توجہ ہیں۔

(۱) نصاب کوئی بھی ہو۔ لیکن اساتذہ کے انتخاب میں زیادہ غور کی ضرورت ہے۔

(ا) مفوضہ کتابوں کی تدریس میں اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتے ہوں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ استعداد بہت اعلیٰ ہو۔

(ب) مخلص ہوں اور دل سے چاہیں کہ طلبہ کو علم آجائے۔

(ج) جن علوم کو پڑھاتے ہوں اس سے شغف اور طبعی مناسبت ہو۔ غرض یہ کہ محض وقت گذارنا یا معاش کی ضرورت کو پورا کرنا نہ ہو، استعداد، اخلاص، شوق و مناسبت، یہ تین باتیں مدرسین کیلئے معیار انتخاب ہوں۔

(۲) طلبہ کیلئے آسائشیں و راحت کا پورا خیال رکھا جائے۔ اگر مدرسہ میں سو طلبہ کیلئے وسعت اعت

نہ ہو تو بیس رکھے جائیں لیکن ان کی علمی نگرانی بہت سخت کیجائے۔ درسوں میں حاضری، رات کا مطالعہ امتحانات میں انتہائی سختی، کوئی تسامح نہ کیا جائے۔ مثلاً اگر سہ ماہی میں فیل ہو گیا تو ششماہی کیلئے تنبیہ کیجائے کہ اگر ششماہی میں فیل ہو گیا۔ تو سالانہ امتحان میں نہ لیا جائے گا۔ اس میں کوئی مراعات ہرگز نہ کی جائیں۔ اور یہی مراعات سم قاتل ہیں۔

(۳) اساتذہ کو کتابیں پڑھانے کیلئے اتنی دی جائیں کہ وہ آسانی سے اس کا مطالعہ کرسکیں اور اس کے متعلقات دیکھ سکیں اور ان کو صرف اس کتاب کے حواشی و شروح پر کفایت نہ کرنی چاہیئے بلکہ فن کی اعلیٰ کتابیں پیش نظر رکھنی چاہیئے۔

(۴) ہر درجہ کے مناسب طلبہ کو مطالعہ کیلئے کتابیں دینی چاہئیں اور ان میں امتحان ضروری ہو یعنی بغیر تدریس صرف مطالعہ سے وہ (اسکی معلومات) حاصل کریں اور امتحان دیں۔

(۵) طلبہ کی اخلاقی نگرانی بہت شدید ضروری ہے۔ اسلامی حلیہ، دینی وضع میں کوئی مسامحت برداشت نہیں کی جاسکتی بلکہ غبی محنتی کو برداشت کیا جائے، اور ذکی سست کو آزاد نہ رکھا جائے بلکہ مدرسہ میں قواعد وضوابط ایسے ہوں کہ نماز کی پابندی اور لباس پوشاک میں علمی وضع کی حفاظت ملحوظ ہو۔

(۶) مسابقت کے امتحانات مقرر ہوں اور انعامات دئے جائیں۔ اعلیٰ کامیابی پر سہ ماہی اور ششماہی وظیفہ دینا چاہیئے۔

(۷) ہر سال کے امتحانات میں ایک پرچہ امتحان کا محض عام استعداد اور قابلیت کا رکھنا چاہیئے جسکا کسی خاص کتاب سے تعلق نہ ہو۔ ہاں اس درجہ کی اہلیت ضروری ہے۔

(۸) عربی بولنے کی قابلیت مقاصد میں شامل کرنی چاہیئے۔ تین سال کے بعد تدریس کی زبان عربی ہونی چاہیئے

(۹) عربی ادب پر خاص معیار سے توجہ دینی ہو گی۔ تقریر اور تحریر کی تربیت کی جائے اور اس کے لئے بہت تفصیل طلب اہم تنبیہات کی حاجت ہے جو بعد میں عرض کروں گا۔

(۱۰) ہر زمانہ کا ایک فن ہوتا ہے۔ اس زمانے کا فن مخصوص تاریخ و ادب ہے۔ اس پر توجہ زیادہ کرنی ہو گی۔

(۱۱) قرآن کریم کا ترجمہ ابتداء سے شروع کرنا چاہیئے اور تین چار سال میں ختم کرنا چاہیئے بغیر کسی تفسیر محض ترجمہ ابتدائً زیر درس ہونا چاہیئے۔

ادبی قابلیت بڑھانے کیلئے مخصوص اجزاء وسورہ کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ اور لغوی ادبی تحقیق کے ساتھ پڑھانا چاہیئے۔

(۱۲) طلبہ کے مطالعہ کیلئے دارالمطالعہ مخصوص ہو۔ ان کے لئے مفید کتابیں اور عربی مجلات وجرائد رکھنے چاہئیں۔

(۱۳) مدرسہ کے سالانہ بجٹ میں ایک رقم مستقل بسلسلۂ اصلاح نصاب اور تبدیل کتب علیحدہ کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ نصاب کے مشکلات میں سب سے زیادہ مشکل مرحلہ ہمارے غریب مدارس کیلئے قلت سرمایہ کا ہے۔

(۱۴) تین نصابوں کی ضرورت ہے۔

(ا) ایک سہ سالہ نصاب جس میں فقہ، قرآن، حدیث، تاریخ، صرف، نحو، معانی، ادب، عقائد فرائض ہوں۔ ایک شخص جو صرف اپنی ضرورت کے لئے عالم بننا چاہتا ہے وہ حاصل کر سکے۔ علم و درس کا پیشہ نہیں بنا سکتا ہے۔ بلکہ تجارت وغیرہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔

(ب) مدرس وعالم بننے کیلئے نصاب زیادہ سے زیادہ ہشت سال۔

(ج) تیسرا نصاب درجہ تکمیل کا ہو۔ ایک سال کا اور دو سال کا۔ مفتی بننا محدث بننا ادیب و مؤرخ بننا، مبلغ بننا وغیرہ اس قسم کے چند شعبے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگر نصاب کوئی بھی ہو لیکن اگر ان امور کی رعایت کی جائے۔ تو انشاء اللہ اچھے عالم نکل سکیں گے۔ طلبہ میں تکثیر سواد کی کوشش نہ کرنی چاہیئے، بلکہ معیار انتخاب کے متعلق کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ چاہے جتنے بھی کم ملیں ذہین وذکی ومستعد طلباء کیلئے مختلف ترغیب کی وجوہ کا پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا۔ مثلاً خصوصی وظیفہ درجہ تکمیل میں پہونچنے کی ترغیب دینا بلکہ درجہ تکمیل میں باقاعدہ ایسا وظیفہ دیا جائے جو ضروریات زندگی کیلئے کفایت کرے۔

ایک اہم بات جو سلسلہ تعلیم میں ضروری ہے۔ اسے لکھنا بھول گیا ہوں۔ وہ یہ کہ ابتدائی کتابیں قابل اساتذہ کے پاس ہوں۔ مثلاً ہر بڑے مدرس کو ایک چھوٹی کتاب دی جائے اس میں طرفین کیلئے فائدہ ہے۔ طلباء کو مجرب استاد سے استفادہ کا موقع ملا۔ اور مدرس کا کام ہلکا کیا گیا۔ بجائے ایک بڑی کتاب چھوٹی کتاب دی گئی۔ جس میں اُسے زیادہ دماغ پاشی نہیں کرنی پڑے گی۔ اور جب مدرس مخلص ہوگا۔ تو یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ بڑی کتابیں کو پڑھانے والا چھوٹی کتاب کو پڑھانا اپنی توہین سمجھے گا۔

نصاب کے بارے میں ایک چیز قابلِ گذارش ہے کہ موجودہ نصاب میں سوائے چند کتابوں کے کوئی ایسی کتاب نہیں جس سے عربی قدماء کی تالیفات اس سے بہتر نہ مل سکیں نصاب کی ترمیم میں یہ بات پیش نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔ کہ کتابیں ایسی داخلِ درس ہوں کہ کتاب کی لفظی بحثیں کم ہوں۔ اور مصنف کے الفاظ کے مطالب بیان کرنے میں وقت زیادہ صرف نہ ہو۔ مثلاً اگر اختصار شدید سے کاغذ کم خرچ کیا گیا لیکن تفہیم میں دماغ اور وقت زیادہ ضائع کیا گیا۔ وقت اگر حفظ مسائل پر خرچ ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا ملکہ و بصیرت مختصرات کے ہونے سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ زیادہ تر کوشش اس کی ہو کہ تفہیم مقاصد میں وسائل میں پورا انشراح حاصل ہو۔ اگرچہ جزئیات کا استیعاب نہ ہو سکے۔ بعض عنوانِ درسیہ میں اگرچہ استقصاء مسائل زیادہ ہے۔ لیکن پہلا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور وہ زیادہ ضروری ہے۔

رہا معاشیات و اقتصادیات و سیاسیات کا داخلِ نصاب ہونا تو یہ مرحلہ اتنا مشکل نہیں۔ امت کو اس کی اتنی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے بہت مل جاتے ہیں۔ مشکل تو رسوخ فی العلم ہے۔ ہمیں صحیح العلم، راسخ العلم مخلص ذکی علماء کا تیار کرنا ہے۔ یہ چیزیں مطالعہ کی ہیں۔ بآسانی بعد الفراغ حاصل کی جاسکتی ہیں یہ چند باتیں اس وقت ایک مختصر فرصت میں بہت استعجال و ارتجال کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ نصاب کے اصلاح بارے میں عنقریب یہاں مدارس عربیہ گجرات، راندیر، ڈابھیل کے اربابِ حل وعقد کو جمع کرنا ہے۔ اور ان شاء اللہ کچھ نتائج حاصل ہوں گے۔ پھر عرض کروں گا اور شاید بعض جہات مزید روشنی میں مزید بحث و تمحیص سے آجائیں۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔

والسلام

محمد یوسف بنوری عفی اللہ عنہ

خطبۂ استقبالیہ

از حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم
مہتمم دارالعلوم دیوبند

ہمدردانِ دارالعلوم کے نمائندہ اجتماع منعقدہ ۲۱/۲۲/ صفر ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۷/۲۸/ نومبر ۱۹۸۳ء یکشنبہ دوشنبہ میں پڑھا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد و آلہ وصحبہ اجمعین۔ امّا بعد!

سب سے پہلے ہم خداوند رحمٰن و رحیم کی بارگاہ میں ہزار ہزار شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے ہمدردانِ دارالعلوم کے نمائندہ اجتماع کے انعقاد کی توفیق عطا فرمائی جسے مجلس شوریٰ نے دارالعلوم کے مفاد اور اس کی فلاح و بہبود کیلئے ایک تجویز کے ذریعہ ضروری قرار دیا تھا۔ پھر ہم سب خدام دارالعلوم صمیم قلب سے ان تمام مخلصین و معاونین اور کرم فرماؤں کا خیر مقدم کرتے ہوئے تہِ دل سے ان کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے دور دراز کے سفر کی صعوبت اور موسم سرما کی شدت سے بے نیاز ہو کر دارالعلوم دیوبند کی آواز پر لبیک کہا اور یہاں تشریف لے آئے۔

حضرات محترم! یہ بستی (دیوبند) جس میں آپ سب حضرات جمع ہیں بہت قدیم اور پرانی بستی ہے اور زمانہ قدیم سے برادرانِ وطن کی ایک زبردست تیرتھ گاہ ہونے کی وجہ سے مرکزیت کی حامل

رہی ہے۔ شیر شاہی شاہراہ اعظم (گرانٹ ٹرنک روڈ) جو پشاور سے کلکتہ تک چلی گئی ہے اسی بستی سے ہوکر گذرتی ہے، اس بستی میں قدامت کیساتھ مرکزیت کی شان پہلے ہی سے موجود تھی لیکن قدرت کو اس رسمی مرکزیت سے شرعی مرکزیت کا کام لینا تھا اور اس سرزمین سے علم و روحانیت کا ایک ایسا ہمہ گیر چشمہ جاری کرنا تھا جو صرف نہ برصغیر بلکہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ممالک کو بھی علوم نبوت سے سیراب کرے، جس کی پیشین گوئیاں روشن ضمیر اہل دل اسلاف پہلے سے کرتے آرہے تھے۔ چنانچہ جب ان پیشین گوئیوں کا وقت آیا تو اس بستی کے افق سے علم وعرفان کا ایک آفتاب عالمتاب طلوع ہوا جسے آج ہم دارالعلوم دیوبند کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

محترم حضرات! دارالعلوم کا قیام ایک ایسے نازک وقت میں عمل میں آیا جب ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہو رہا تھا اور اکابر رحمہم اللہ نے اپنے نور بصیرت سے محسوس فرمالیا تھا کہ اس مادی و سیاسی انقلاب کے پس پردہ الحاد و دہریت کا ایک ایسا فتنۂ عظیم انگڑائیاں لے رہا ہے جس سے اسلامی عقائد و اخلاق اور مذہبی اقدار کے تحفظ کی مؤثر کوشش نہ کی گئی تو سرزمین ہندوستان میں خداوند قدوس کے آخری دین کا چراغ بالکل ہی گل ہو جائیگا اور وہ مسلم معاشرہ جو صدیوں کی سعیٔ پیہم اور انتھک کوششوں کے بعد وجود میں آیا ہے تشتت وانتشار کی نذر ہو جائے گا۔ ملک کے طول و عرض میں پائے جانے والے علماء ربانیین اس سلسلے میں متفکر کہ خانوادۂ ولی اللہی کے ساختہ و پرداختہ چند اہل دل علماء اٹھے اور محض اللہ کے اعتماد اور بھروسے پر فرنگی بادصرصر کے بالمقابل "مدرسہ عربی" کے عنوان سے علم وعرفان کا ایک چراغ روشن کر دیا پھر حضرت قاسم العلوم و الخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی اور قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اسرارہما کی سعیٔ پیہم اور مجاہدانہ علمی و عملی سرگرمیوں کی بدولت اس چراغ توکل سے چراغ در چراغ روشن ہوتے رہے اور علم و نور کا یہ سلسلہ پھیلتے پھیلتے پورے برصغیر پر چھا گیا جس نے برٹش امپائر کی ظلمتوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

ان نفوس قدسیہ نے اپنی فراست ایمانی کے ذریعہ یہ محسوس کرلیا تھا کہ اقتدار کی بازیابی کی جد وجہد موجودہ حالت میں کارآمد نہیں ہو سکتی اس لئے ہمیں دین کے تحفظ کیلئے اپنی جد و جہد کے رخ کو دیگر ذرائع کی جانب موڑ دینا چاہیئے۔

چنانچہ ان حضرات نے انفرادی خانقاہوں اور علمی حلقہ ہائے درس کو اجتماعی شکل میں تبدیل کیا اور ایک منظم شکل میں جگہ جگہ مدارس عربیہ کی بنیادیں استوار کیں، ملک طول وعرض میں تنہا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کے بنا کردہ مدارس عربیہ کی تعداد دس سے زائد ہیں، ان تمام مدارس میں قضا و قدر کے فیصلے کے مطابق مرکزی حیثیت دارالعلوم دیوبند کو حاصل ہوئی اور جماعت دیوبند نے ہر میدان میں علوم و معارف کی گرانقدر خدمت انجام دی دین کا ہر طرح تحفظ فرمایا اور آج کے ہندوستان میں جہاں بھی کوئی علمی، عملی انجمن ہے وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ دارالعلوم دیوبند کے چراغ سے روشنی حاصل کر رہی ہے۔

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

ہمدردانِ ملت! دارالعلوم دیوبند کا عنصر غالب اگرچہ تعلیم و تدریس ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا نصب العین صحیح دین کا تحفظ اور صحیح دین کی اشاعت ہے اور یہاں کے اکابر اور فرزندوں کی مساعی سے اس برصغیر میں جو کارنامہ انجام پایا ہے وہ تاریخ عالم کا ایک انوکھا اور حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ یہاں کے نامور فضلاء و علماء کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے جنھوں نے علم و فن کی بھی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور سلوک و معرفت کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے علاوہ خالص دینی اور اسلامی اغراض و مقاصد کے تحت سیاسی میدانوں میں بھی قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ دین کی غلط ترجمانی کرنے والوں کا تعاقب کرکے ان پسپائی پر بھی مجبور کیا ہے۔ اس جماعت کے اولین سربراہوں میں حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہما اللہ نے اس جماعت کیلئے جو ہمہ جہت کردار وضع فرمایا تھا اس کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کے عہد میں بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا حضرت شیخ الہند کی اولوالعزمی سے مسلمانوں اور ملک و ملت کے تمام کاموں کو نشاۃ ثانیہ نصیب ہوئی، اور ان کی انقلاب آفریں شخصیت نے علم و عمل کے ہر میدان میں بے نظیر رجالِ کار پیدا کئے جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا احمد علی لاہوری، حضرت

علامہ ابراہیم بلیاوی، حضرت مولانا فخرالدین احمد مرادآبادی اور کتنے ہی نامور علمائے کرام ان کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوئے اور ان حضرات کے انفرادی اور اجتماعی کاموں سے دارالعلوم کا مقصدِ تاسیس پورا ہوا، تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان اکابر مرحومین کی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع، اتنا ہمہ گیر اور اتنا اثر انگیز ہے کہ ان میں ایک ایک فرد نے ایک ایک امت کے برابر کام کیا ہے۔

دانشورانِ ملت! چونکہ یہ عالم خیر و شر کی رزمگاہ ہے اسلئے ہر ادارے کو کم وبیش حوادث سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اس قانونِ فطرت کے مطابق دارالعلوم دیوبند بھی اپنی ایک سو بیس سال کی مدتِ حیات میں چھوٹے بڑے حوادث سے محفوظ نہیں رہا۔ چنانچہ ماضی قریب میں جو عظیم حادثہ پیش آیا اسے بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ جس کے نتیجہ میں دارالعلوم پانچ مہینے تک مسلسل بند رہا اور طلبہ واساتذہ اسی مادر درسگاہ کی در و دیوار کے پیچھے ایک کیمپ میں سخت ترین آلام و مصائب سے دوچار ہونے کے باوجود تعلیم و درس پر مجبور رہے، تاریخ دارالعلوم میں یہ سب سے ہولناک اور وحشت انگیز حادثہ تھا جس نے پوری اسلامی برادری کو تڑپا دیا کیونکہ ماضی میں کبھی ایسا وقت نہیں آیا تھا کہ ایشیا کی اس عظیم درسگاہ کے دروازے طلبہ واساتذہ کیلئے اتنی طویل مدت تک مکمل طور پر بند رہے ہوں اور اس کی فضا قال اللہ وقال الرسول کی جاں نواز صداؤں اور درس و تدریس کے دلربا زمزموں سے محروم رہی ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اکابر و مشائخ دیوبند کے اخلاص نیت نے اپنا اثر دکھایا کہ مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند اور اس کے محترم و مخلص معاونین کی مساعی جمیلہ بارآور ہوئیں اور دارالعلوم کے دروازوں کا قفل ٹوٹا اور طلبہ واساتذہ اپنی مادر علمی سے ہم آغوش ہوگئے، چنانچہ آج الحمدللہ ثم الحمدللہ دارالعلوم اپنی زرین، منفرد اور عظیم الشان روایات کے ساتھ باطمینان وسکون متحرک وفعال ہے۔ اور یہ بات صرف کہنے کی نہیں ہے بلکہ آپ سب حضرات جو یہاں تشریف فرما ہیں اس کا بچشم خود معائنہ فرمارہے ہیں۔

بایں ہمہ میں اس حقیقت پر اظہار افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگرچہ آج ہمارا قافلہ علم وعمل پوری توانائیوں کے ساتھ اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے تاہم ہمیں اپنے اس دیرینہ میر کارواں سے بچھڑ جانے کا غم ہے، جس کو بعض مفاد پرستوں کی دراندازیوں

نے ہم سے جدا ہونے پر مجبور کر دیا میرا اشارہ حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی ذاتِ گرامی کی طرف ہے جو بے شبہ برصغیر کے نامور اور ایک عظیم شخصیت تھے۔ مرحوم و مغفور کو دارالعلوم دیوبند سے جذباتی محبت اور قلبی رابطہ تھا۔ چنانچہ اختلافات کے زمانہ میں جب کبھی مجلس شوریٰ کے ارکان یا کسی اور جہت سے مصالحت کی کوشش کی گئی تو حضرت مرحوم نے اس کی تحسین و ستائش کی لیکن افسوس ہے کہ اغراض پسندوں نے اس قسم کی کسی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

موجودہ دارالعلوم، منصوبے اور آپ کی ذمہ داریاں۔

مجلس شوریٰ کی تحویل میں دارالعلوم کی تالابندی ختم ہونے کے بعد مسائل کی متعدد پیچیدہ گتھیاں تھیں کہ فوراً ہی طلبۂ عزیز کی تعداد بڑھ گئی تھی اور ان کے لئے ہر طرح کے انتظامات کرنا تھے، داخلی وخارجی اندیشوں سے دارالعلوم کے تحفظ کا مرحلہ تھا مگر اے خداوند قادر و قیوم کی نصرت کہیے کہ چاروں طرف سے مشکلات کے احاطہ کے باوجود دارالعلوم کا تعلیمی سلسلہ اور اس کا نظم ونسق بہتر ہوتا چلا گیا، دارالعلوم کھلنے کے بعد ایک دن بھی تعلیمی انقطاع کی نوبت نہیں آئی اور دارالعلوم کا سرمایہ اگرچہ بینکوں میں منجمد ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے آپ جیسے مخلص ہمدردوں کو دارالعلوم کی جانب متوجہ کر دیا اور بحمد اللہ دارالعلوم کی ہر ضرورت پوری ہوتی جارہی ہے۔

اس وقت دارالعلوم کے تمام شعبے فعّال ہیں، دو مرتبہ سالانہ امتحانات منعقد ہو چکے ہیں، اور طلباء کی تقریباً دوگنی تعداد کیلئے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی جارہی ہیں، اور امسال تو تعلیم وتدریس کا نظم انتہائی قابلِ اطمینان ہے۔ اس بہتری میں اساتذہ کرام کی بہترین کارکردگی لائقِ صد تحسین ہے اور امسال داخلہ کے امتحانات کے موقع پر معیارِ تعلیم کی بلندی کے لئے جو اقدامات کئے گئے اور انشاء اللہ آئندہ اور پیش رفت ہوگی ان سے بھی بڑی مدد ملی ہے، مگر ان تمام چیزوں کیساتھ دارالعلوم کے پیشِ نظر کچھ منصوبے اور کچھ مشکلات ہیں اور انہی چیزوں پر غور و فکر کیلئے ہمدردوں کا یہ نمائندہ اجتماع منعقد کیا گیا ہے۔

ترقی پذیر منصوبوں میں سب سے اہم مسئلہ طلباء عزیز کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مطابق اسباب ووسائل کی فراہمی ہے، اس وقت تقریباً ڈھائی ہزار طلبہ زیرِ تعلیم ہیں جن میں سے پندرہ سو کو امداد طعام وغیرہ مہیا کی جارہی ہے۔ پہلے امدادی طلبہ کی تعداد آٹھ سو نو سو رہا کرتی تھی، اب یہ تعداد پندرہ سو ہے اور ان کیلئے سہولتیں پہلے سے زیادہ فراہم کی جارہی ہیں، اور اسی

کے ساتھ معیارِ تعلیم کی بلندی اور تعلیم کے ساتھ تربیت کی بہتری کی بھی ضرورت ہے، پچھلے سال تک تربیت کی طرف پوری توجہ نہیں کی جا سکی لیکن امسال الحمدللہ یہ کام بھی قابلِ اطمینان طریقے پر شروع ہو گیا ہے۔

انہی منصوبوں میں دارالتربیت کا قیام بھی ہے، جس کا خاکہ ابتدائی طور پر تیار کر لیا گیا ہے اور انشاء اللہ مستقبل قریب میں اس کا عملی کام شروع کیا جانیوالا ہے۔

انہی منصوبوں میں ایک وسیع و عریض مسجد کی تعمیر کا بھی پروگرام ہے، موجودہ مسجد طلبائے عزیز کی موجودہ تعداد کے لئے قطعاً ناکافی ہے بارش اور سردی کے موسم میں شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجلس شوریٰ عرصۂ دراز سے اس کی ضرورت محسوس کر رہی تھی، اب بنامِ خدا یہ کام بھی شروع کیا جانے والا ہے اور انشاء اللہ آپ حضرات کے تعاون سے جلد ہی تکمیل تک پہنچ جائے گا۔

انہی منصوبوں میں طلبائے عزیز کی راحت رسانی کے ساتھ مدرسین اور کارکنان کی راحت رسانی بھی ہے، کوشش کی جا رہی ہے کہ جن ملازمین و مدرسین کے پاس رہائش کا انتظام نہیں ہے انھیں دارالعلوم کی طرف سے یہ سہولت بہم پہنچائی جائے، چنانچہ مجلسِ شوریٰ نے حالیہ اجلاس میں امسال بیس رہائشی مکانات تعمیر کرنے کی تجویز منظور کی ہے۔

انہی منصوبوں میں دارالعلوم کے کتب خانہ کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی جدوجہد بھی شامل ہے اس وقت بھی کتب خانہ کے اوقات میں توسیع کر دی گئی ہے مگر اس سے ضرورت پوری نہیں ہو رہی ہے، منصوبہ یہ ہے کہ اساتذہ کرام کیلئے ایک الگ دارالمطالعہ قائم کیا جائے اور طلبائے عزیز کی درسی کتابوں کے لئے ایک الگ دارالمطالعہ ہو، اور موجودہ کتب خانہ صرف خارجی مطالعہ کرنیوالوں کیلئے باقی رکھا جائے۔

انہی ترقیاتی منصوبوں میں عالم اسلام سے کتابوں کی فراہمی، فضلائے دارالعلوم کے علمی کارناموں کی اشاعت، ان سے مادرِ علمی کے مستقل روابط کا قیام، اور موقع بہ موقع مختلف عنوانات پر منعقد کئے جانے والے علمی سیمنار کا انعقاد بھی شامل ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ترقیاتی منصوبے فوری طور پر وجود میں نہیں آسکتے، جب کہ ان پر عمل درآمد میں دشواریاں بھی ہیں، ان دشواریوں میں مثلاً دارالعلوم کے خلاف مستقل پروپیگنڈے کی مہم کے اثرات کو ختم کرنا بھی ہے، اور دوسری دشواری یہ ہے کہ قحط الرجال

کے اس دور میں سب کام کرنے کے لئے بہترین افراد مہیا نہیں ہو پاتے، تیسرے یہ کہ ابھی تک بیرونی سطح پر دارالعلوم کا معاملہ بہت سے ہمدردوں کے ذہن میں صاف نہیں ہے اور اس اجتماع کا مقصد یہ ہے کہ دارالعلوم کے مخلص، بہی خواہ اور تمام فرزند اپنی آنکھوں سے دارالعلوم کا معائنہ فرمالیں اور دارالعلوم کی ترقی کیلئے جو منصوبے ان کے ذہن میں آئیں، ان سے کارکنان کو مطلع فرمائیں اور جو اشکالات انھیں موجودہ دارالعلوم کے بارے میں ہوں انھیں دور فرماکر دارالعلوم کی تعمیر جدید میں لگ جائیں، ملک کی فضا کو زیادہ سے زیادہ دارالعلوم کے حق میں سازگار بنانے کی کوشش کریں اور مقاصد دارالعلوم کو سامنے رکھتے ہوئے جن چیزوں کی ضرورت محسوس ہو ان کی نشاندہی فرمائیں۔

اور سب سے زیادہ اہم بات یہ کہ خداوند قدوس کی بارگاہ میں دارالعلوم کی فلاح و بہبود، مقاصد کی تکمیل، دینِ حق کی حفاظت اور ملتِ اسلامیہ کو شرور و فتن سے محفوظ فرمانے کے لئے دعائیں کریں۔

اس عرضداشت کے ساتھ میں اپنی تحریر کو ختم کرتا ہوں اور آخر میں پھر ان تمام ہمدرد و بہی خواہوں اور مادرِ علمی کے فرزندوں کا تمام خدام دارالعلوم کی جانب سے پُرخلوص شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے زحمتِ سفر برداشت کی اور ہم خدام کو دارالعلوم کی نسبت سے کچھ عرض و معروض کا موقع عنایت فرمایا۔

دعا ہے کہ خداوند قدوس ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس دارِ فانی میں ہم کو دینِ مبین کی خدمت کی سعادت سے بہرہ ور فرماکر آخرت کی فلاح نصیب فرمائے۔ آمین۔

ویرحم اللہ عبدا قال آمینا۔

قلم حزین محمد عثمان معروفی
۱۴۰۴ھ

مفتی محمد یٰسین صاحب مبارکپوری رحمۃ اللہ الماجد

وف ۱۹۸۳ء

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات — تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین صاحبؒ ابن شیخ عبد السبحان متوفی محرم ۱۳۶۷ھ محلہ پرانی بستی قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڈھ کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے ۱۳۲۲ھ کے لگ بھگ آپکی پیدائش ہوئی چراغ حسن سے سال ولادت برآمد کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی۔ اس وقت حضرت مولانا علی احمد صاحب کوٹریا پاری متوفی ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۱ء احیاء العلوم میں مدرس تھے جو بہت ہی ذی استعداد عالم تھے، حضرت مفتی صاحب آپ سے بہت مانوس تھے۔ پھر مولانا علی احمد صاحب احیاء العلوم سے جدا ہو کر مدرسہ ناصر العلوم گھوسی میں مدرس ہوگئے تو مفتی صاحب بھی ناصر العلوم میں چلے گئے اور وہاں پانچ سال تک تعلیم حاصل کی۔ مئو ناتھ بھنجن میں بھی کچھ دنوں تک رہ کر حضرت مولانا ابوالحسن صاحب مئوی متوفی ۱۳۶۱ھ سے پڑھا۔ ۶ر شوال ۱۳۴۲ھ کو بغرض تحصیل علم دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں تین سال تک بڑی محنت و جانفشانی سے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، کلام، ادب، منطق اور ہیئت و فلسفہ کی متوسطات اور انتہائی کتابیں پڑھ کر ۱۳۴۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ آپکے اساتذہ میں حضرت انور شاہ صاحب کاشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ، حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب متوفی ۱۳۷۴ھ اور حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی متوفی ۱۳۸۷ھ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور کے نمایاں اساتذہ یہ ہیں حضرت مولانا محمد محمود صاحب معروفی متوفی ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء، مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوری متوفی ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء، مولانا نعمت اللہ صاحب مبارکپوری متوفی ۱۳۶۲ھ اور مولانا علی احمد صاحب کوٹریا پاری۔ مئو ناتھ بھنجن میں حضرت مولانا ابوالحسن صاحب مئویؒ۔

فراغت کے بعد دار العلوم دیوبند سے آپ کو درج ذیل سارٹیفکٹ دیا گیا۔

۱۲۱۶ء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سارٹیفکٹ منجانب دار العلوم دیوبند۔

"ہم تصدیق کرتے ہیں کہ مولوی محمد یٰسین ولد شیخ عبد السبحان صاحب ساکن مبارکپور ضلع اعظم گڈھ ۶ر شوال المکرم ۱۳۴۲ھ کو بغرض تحصیل علوم عربیہ دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور تقریباً تین سال رہ کر علوم مندرجہ ذیل۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، کلام، ادب، منطق، فلسفہ، ہیئت کو نہایت محنت و شوق سے پڑھا۔ امتحانات سالانہ وغیرہ میں بہت اچھی کامیابی حاصل کرتے رہے۔ زمانۂ تعلیم میں اساتذۂ کرام و اراکین مدرسہ ان سے خوش و رضامند رہے وہ چال چلن کے نیک، ہونہار و مستعد شخص ہیں وہ اپنی لیاقت علمی و اخلاقی حیثیت سے اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کو دار العلوم کی جانب سے ایک سارٹیفکٹ دیا جائے اور اس میں ظاہر کر دیا جائے کہ جو خدمات علمیہ وغیرہ ان کے سپرد کی جائیں گی وہ ان کو نہایت مستعدی و خوش اسلوبی سے انجام دے کر ہمیشہ نیکنامی حاصل کرتے رہیں گے۔"

محمد طیب غفرلہٗ نائب مہتمم دار العلوم دیوبند
۱۴ر رجب المرجب ۱۳۴۵ھ

اس سارٹیفکٹ کے علاوہ جو سند فراغ دار العلوم سے عطا ہوئی اس کا نمبر ۱۲۸۵ اور تاریخ اجراء ۱۴ر ذو القعدہ ۱۳۴۵ھ ہے۔ اس سند پر بھی جلی خط میں "قادر علی الافادۃ والاستفادۃ" کی شہادت مرقوم ہے اور کتابوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ تفسیر بیضاوی، بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، ابو داؤد شریف، نسائی شریف، طحاوی، ابن ماجہ، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد، ہدایہ اخیرین، درمختار، توضیح، تلویح، مسلم الثبوت، امور عامہ، دیوان متنبی، حمد اللہ، قاضی، میرزاہد رسالہ مع غلام یحییٰ، صدرا، شمس بازغہ، تصریح، شرح چغمینی۔

فراغت کے بعد آپ بحیثیت مدرس چند ماہ کیلئے پٹنہ (بہار) تشریف لے گئے۔ اس کے بعد موضع ابراہیم پور میں جو مبارکپور سے جانب مشرق تین میل کے فاصلہ سے ہے چند ماہ کیلئے مدرس ہوئے وہاں فارسی اور ابتدائی عربی کی تعلیم تھی۔

۱۳۴۶ھ میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں مدرس منتخب ہوئے اور یہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے، شوریٰ کے ممبر، ناظم تعلیمات، صدر المدرسین اور مفتی جامعہ۔ ابتدائی کتابوں میں علم الصیغہ بہت عمدہ پڑھاتے تھے، جسے پڑھا دیتے اسے پورے طور پر صیغوں کی شناخت

ہوجاتی تھی۔ آخر میں آپ کے زیر درس صرف بخاری شریف جلد ثانی رہتی تھی۔ بقیہ اوقات میں افتاء کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ فتویٰ نویسی میں ملک کے اندر آپ کو ایک اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ فتویٰ کی عبارت ایسی آراستہ پیراستہ اور مہذب ہوتی تھی کہ کہیں ایک لفظ گھٹانے بڑھانے کی گنجائش نہیں، اگر ایک لفظ کہیں سے نکال دیا جائے تو جیسے عمارت کی ایک اینٹ نکل جانے سے پوری عمارت میں تزلزل آجائے۔ فتویٰ نویسی میں آپ کی ذات ایک سند بن گئی تھی اور آپ صرف "مفتی صاحب" کے نام سے متعارف ومشہور تھے۔ دور دراز مقامات سے استفتاء وسوالات کثرت سے آتے رہتے تھے اور شب و روز زبانی مسائل دریافت کرنے کیلئے قصبہ وبیرونِ قصبہ سے برابر لوگ آتے رہتے اور تشفی بخش جواب حاصل کر کے جاتے۔ آپ کو مسائل کا استحضار تھا۔ ہر سائل کو زبانی جواب دیتے مگر سائل کے اطمینانِ قلب کیلئے اسے حوالہ اور کتاب کی عبارت بھی ضرور دکھا دیا کرتے تھے۔ احیاء العلوم میں افتاء کا کام آپ نے ۱۳۵۰ھ سے شروع کیا اور ۱۳۶۱ھ سے باقاعدہ نقولِ فتاویٰ کا رجسٹر رکھا۔ احیاء العلوم کے سابق مہتمم حضرت مولانا شکر اللہ صاحبؒ جب بغرض علاج لکھنؤ میں مقیم تھے تو حضرت مفتی صاحبؒ عیادت کیلئے پہونچے وہاں مولانا شکر اللہ صاحبؒ نے حسب ذیل وصیت فرمائی جو ماہنامہ الفرقان بریلی ربیع الاول ۱۳۶۱ھ کے شمارہ سے منقول ہے "ہمیشہ دینی کام کرنا، تم سے مجھ کو بہت فائدہ پہنچا خصوصاً فتویٰ میں۔ مسائل میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مدظلہ سے ہمیشہ رجوع کرنا اور ان پر اعتماد کرنا۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب و حضرت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہما کو ہمیشہ ایک نظر سے دیکھنا، دونوں ملت کے مسلمہ بزرگ ہیں۔ میرے دل میں ان دونوں حضرات کی قدر و منزلت یکساں ہے" قصبہ میں آپ قاضی کی حیثیت رکھتے تھے۔ نکاح پڑھانا، نماز جنازہ اور جمعہ و عیدین کی امامت کی ذمہ داری آپ ہی کے سر تھی۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اطمینان قلب کے لئے ایک ایک بات کی تحقیق کئی کئی آدمی سے کرتے۔ نماز جماعت کیلئے اپنی گھڑی مسجد کی گھڑی سے ملائے رہتے تھے پھر بھی گاہے گاہے دوسروں سے وقت دریافت کرتے رہتے۔ آپ کا قیام شب و روز مدرسہ میں رہتا تھا، صرف دو ایک گھنٹہ کیلئے مکان پر چلے جاتے تھے۔ طلبہ کی تعلیم و تربیت کا حد درجہ خیال رکھتے تھے۔ جو طالب علم سامنے آجاتا پہلے اس سے پوچھتے کہ کیا پڑھتے ہو؟ پھر اس کی کتاب کا زبانی سوال اس سے ضرور کرتے اگر جواب دیدیا تو بہت

خوش ہوتے ورنہ اس کو محنت سے پڑھنے کی ترغیب دیتے، محنتی طلبہ سے بہت خوش رہتے۔ جو طالب علم نماز جماعت میں حاضر نہ ہوتا اس کو سزا دیتے۔ ۱۳۶۵ھ میں حج و زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ آپ فطرۃً نحیف الجثہ اور کمزور تھے، اکثر بیمار رہا کرتے تھے لیکن کتب بینی اور مدرسہ کا کام نہیں چھوڑتے تھے۔ اپنی درس گاہ میں کتابوں کے انبار میں بیٹھے کام کرتے رہتے تھے اس کے علاوہ دائیں بائیں تپائیوں پر کتابیں لدی رہتی تھیں مزید براں چند بڑی بڑی الماریاں کتابوں سے پُر تھیں جن میں بہت بڑا حصہ آپ کی ذاتی کتابوں کا تھا یعنی تنہا آپ کا کمرہ ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ اطراف کے مدارس میں ممتحن اور مقرر کی حیثیت سے بھی بلائے جاتے تھے، آپ کا وعظ نہایت مؤثر اور دل پذیر ہوتا تھا۔ جہاں جس قسم کا موقع و محل ہوتا اسی کے مناسب اور حسب حال آپ کی تقریر ہوا کرتی تھی۔ مزید براں آپ بہت سی خوبیوں کے مالک، سادگی و جفاکشی کے مظہر اور بلند اخلاقی و انکساری کے پیکر تھے۔ راقم الحروف کو بہت قریب سے دیکھنے اور ایک ساتھ قریب رہنے کے مواقع نصیب ہوئے کیونکہ شوال ۱۳۶۴ھ سے شعبان ۱۳۶۷ھ تک تین سال جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں تعلیم حاصل کرنے کے دور میں آپ سے شرح تہذیب اور جلالین شریف پڑھی پھر شوال ۱۳۸۹ھ سے محرم ۱۳۹۷ھ تک سوا سات برس آپ کے زیر سایہ احیاء العلوم میں خدمت تدریس انجام دی، اور شکوک و شبہات کا ازالہ آپ سے کرتا رہا۔ قصبہ پورہ معروف سے آپ کا خاص تعلق تھا وہاں آپ کی ایک صاحبزادی منسوب ہیں نیز وہاں کے مدرسہ معروفیہ اور اشاعت العلوم کے سالانہ امتحان و اجلاس میں شرکت کیلئے سال میں دو ایک بار تشریف لایا کرتے تھے تو ہم لوگوں کو مزید استفادہ کا موقع ملتا رہتا۔ ایک عرصہ کے بعد احیاء العلوم کے دو روزہ اجلاس عام منعقدہ ۲۳ / ۲۴ / جمادی الاخریٰ ۱۴۰۳ھ کے موقع پر مبارک پور میرا جانا ہوا، مدرسہ میں حضرت مفتی صاحب کی کمی محسوس ہوئی، معلوم ہوا کہ علیل ہیں اور دو ماہ سے مدرسہ نہیں آرہے ہیں۔ مزاج پرسی کیلئے دولت خانہ پر حاضر ہوا تو فرمایا کہ پہلو میں درد رہتا ہے۔ بس اب حسن خاتمہ کیلئے دعا کرو۔ تمام تر توجہ سفر آخرت کی طرف مرکوز تھی۔ قریب دس ماہ گھر پر آپ نے علالت کے ایام گذارے بالآخر شنبہ کی شب میں ساڑھے بارہ بجے ۲۱ / محرم ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۹ / اکتوبر ۱۹۸۳ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی وفات حسرت آیات کی خبر بجلی کی طرح اطراف میں پھیل گئی۔ بہت سے مدارس بند کر دئے گئے۔ مئو، کوپا گنج، گھوسی،

پورہ معروف، محمد آباد، خیر آباد، ولید پور، بھیرہ، ابراہیم پور، جہانا گنج، بہادر گنج، غازی پور، بنارس وغیرہ دوسرے اضلاع سے بھی آدمی اس کثرت سے مبارک پور میں امنڈ پڑے کہ مجمع میں کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا۔ غسل کے بعد آپ کی نعش ایک بار پھر جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے صحن میں لاکر رکھی گئی جہاں مشتاقان دیدار نے آخری دیدار کیا۔ بیس ہزار کے قریب مجمع تھا جسمیں ہزاروں علمائے کرام جمع ہو گئے تھے۔ بریلوی حضرات کے بعض علماء بھی جیسے مولانا ظفر ادیبی سابق استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور نماز جنازہ و تدفین میں شریک رہے سمودی عیدگاہ کے سامنے میدان میں تین بجے نماز جنازہ ادا کی گئی اور اپنے استاذ محترم سابق مہتمم جامعہ عربیہ احیاء العلوم، مجاہد حریت حضرت مولانا شکر اللہ صاحب متوفی ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء کی قبر کے سرہانے دفن کئے گئے ؎

خدا بخشے بہت ہی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

آپ کی عمر بیاسی (۸۲) سال کی تھی۔ "چراغ حسن" (۱۳۲۲ھ) سے ولادت اور "فروغ حسن" (۱۴۰۴ھ) سے رحلت کا سال برآمد کیا جا سکتا ہے ؎

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

بدعت ظلمت ہی ہے

یہ فقیر بدعتوں میں سے کسی بدعت میں بھی حسن و نورانیت کا مشاہدہ نہیں کرتا سب بدعتیں ظلمات و کدورت معلوم ہوتی ہیں . . . اگر آج عمل بدعت کو ضعف بصارت کی وجہ سے تر و تازگی کے عالم میں دیکھتے ہیں تو کل (قیامت) میں جب کہ نظر تیز ہو جائے گی جان لیں گے کہ خسارت و ندامت کے سوا اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوگا۔ (ملخصاً)

؎ بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت
کہ باکہ باختۂ عشق در شب دیجور

مکتوبات امام ربانی: مکتوب ۱۸۶/۱

حبیب الرحمٰن القاسمی

ملفوظات حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت

حضراتِ صوفیاء کرام کی مقدس جماعت نے برِصغیر میں تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ اسلامی ہند کا ایک روشن باب ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھیں انفاسِ قدسیہ کے نور سے ظلمت کدۂ ہند بقعۂ نور بنا اور انھیں پاکیزہ ہستیوں کی اصلاحی و تبلیغی سرگرمیوں سے برِصغیر میں ایک مضبوط و مستحکم مسلم معاشرہ وجود میں آیا۔ ان اکابر صوفیاء میں حضرت داتا گنج بخش ہجویری صاحب کشف المحجوب حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سنجری، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر، حضرت قاضی حمیدالدین ناگوری، حضرت نظام الدین اولیاء چشتی، حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی، حضرت شیخ صابر علی کلیری، حضرت شیخ رکن الدین ملتانی، حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی، حضرت شیخ جلال الدین بخاری معروف بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت آسمانِ سلوک و معرفت کے وہ تابندہ ستارے ہیں جن کے انوار و برکات سے آج بھی ایک عالم اکتسابِ فیض کر رہا ہے۔ زیرِ نظر مقالہ میں آخرالذکر بزرگ یعنی حضرت جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے ملفوظات و ارشادات کے کچھ اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات تصحیح عقائد و اخلاق اور تزئینِ اعمال و کردار میں کس قدر کوشاں رہتے تھے۔

مختصر سوانحی خاکہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی پیدائش ۱۴ شعبان ۷۰۷ھ موافق ۱۳۰۸ء کو مقام اوچ میں ہوئی اور آپ کے جدِ امجد شیخ جلال الدین

سرخ بخاری کے اسم گرامی پر جلال الدین آپ کا نام تجویز کیا گیا۔

حضرت مخدوم نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد شیخ احمد کبیر کی زیرِ نگرانی حاصل کی بعد میں شیخ جمال خنداںؒ محدث اوچ اور قاضی بہاء الدین اوچی سے اونچی کتابیں پڑھیں۔ وطن مالوف میں تعلیمی سلسلہ ختم کرنے کے بعد ملتان کا علمی سفر کیا۔ جہاں شیخ رکن الدین ملتانی کی خانقاہ سالکینِ تصوف اور طالبینِ علم دونوں کی تشنگی کو دور کرنے کی خدمت انجام دے رہی تھی، چنانچہ یہاں آپ نے ایک سال قیام کر کے باقی ماندہ کتابوں کی تحصیل کی۔ لیکن حضرت مخدوم کی علمی تشنگی ہنوز باقی رہ گئی تھی اس لئے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھا اور مختلف دیار و امصار کے شیوخ اور علماء سے اکتسابِ فیض کرنے کے ساتھ حرمین شریفین میں مستقل سات سال قیام کر کے وہاں کے اساتذہ اور شیوخ سے حدیث و تفسیر وغیرہ فنون کی تحصیل کی۔ حرمین شریفین کے شیوخ میں آپ شیخ عبداللہ یافعی اور شیخ عبداللہ مسطری سے بہت زیادہ متأثر تھے اور اپنی مجلس میں ان دونوں بزرگوں کا تذکرہ کثرت سے کرتے تھے۔

علمی تبحر حضرت مخدوم جملہ علوم دینیہ میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے اکثر تذکرہ نگاروں نے آپ کی اس خصوصیت کو وقیع اور شاندار الفاظ میں بیان کیا ہے۔

سلوک و طریقت تحصیل و تکمیلِ علوم کے بعد حضرت مخدوم نے راہِ سلوک میں قدم رکھا اور اپنے آباؤ اجداد کے طریق پر سلسلۂ سہروردی سے منسلک ہوئے۔ اولاً اپنے والد ماجد شیخ احمد کبیر اور چچا شیخ محمد بخاری سے ذکر و اذکار تلقین حاصل کی، پھر شیخ ابو الفتح رکن الدین ملتانی کی جانب رجوع کیا اور انھیں کی زیرِ تربیت سلوک کے مراحل طے کر کے خلافت و اجازت سے مشرف ہوئے۔ شیخ ملتانی کے علاوہ دیگر بیس مشائخ سے بھی آپ کو خلافت حاصل تھی۔ جس کا ذکر خود حضرت

مخدوم نے اپنے ملفوظات میں تفصیل سے کیا ہے۔

منصب شیخ الاسلامی بادشاہ محمد تغلق آپ کا بیحد معتقد اور آپکے علم وفضل کے بہت معترف تھا اس لیے اس نے حضرت مخدوم کے انکار وابار کے باوجود آپ کو شیخ الاسلامی کا عہدہ تفویض کردیا۔

شیخ الاسلامی کا منصب اس دور میں خاص اہمیت کا حامل تھا۔ علماء اور صوفیاً کو حکومت کی طرف سے جو وظائف اور روزینے دیئے جاتے تھے ان کے احکام شیخ الاسلام ہی جاری کرتے تھے۔ محمد تغلق کے عہد میں اس عہدہ کا مشاہرہ ساٹھ ہزار تنکے تھا مگر حضرت مخدوم نے اس مالی منفعت اور جاہ ومرتبت کو پائے استغنا سے ٹھکرادیا۔ اور شاہ وقت کی مرضی کے خلاف شیخ الاسلامی کے منصب سے استعفا دیکر حج کو چلے گئے اور پھر تقریبًا بارہ سال مسلسل سیر وسیاحت میں بسر کردیئے اور بارہ سال کے بعد جب وطن واپس تشریف لائے تو تبلیغ دین اور ارشاد وتلقین میں مصروف ہوگئے اور زندگی کے بقیہ ایام اس نیک مشغلہ میں گزار دیئے۔

وفات حضرت مخدوم نے کل اٹھتر سال اس دنیا میں قیام فرمایا ۱۰ ذی الحجہ ۷۸۵ھ مطابق ۱۳۸۴ء کو غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ علم وہدایت اور تبلیغ وارشاد کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ مزار اوچ سابق ریاست بھاولپور (پاکستان) میں ہے مزار کے دروازہ پر حسب ذیل تاریخ کندہ ہے

تاریک گشت جملہ جہاں بے جمال شاہ

تاریخ بود ہفت صد ہشتاد وپنج سال

اخلاق وعادات حضرت مخدوم اخلاق وعادات میں سنت کا بہت خیال رکھتے تھے، عجز وتواضع آپ کی عادت ثانیہ تھی مریدین ومتعلقین سے نہایت ملاطفت ومحبت سے پیش آتے تھے، جب گھر میں داخل ہوتے تو سلام ضرور کرتے، دوسروں کو بھی اس عمل کی تاکید فرماتے تھے، پیرانہ سالی کے باوجود اوظاف واوراد

کی پابندی میں کسی قسم کا فتور نہیں آنے دیتے تھے۔

علمی و دینی مآثر مخدوم جہانیاں جہاں گشت صرف صاحب ارشاد شیخ ہی نہیں تھے بلکہ علوم اسلامی میں ان کا درجہ بہت بلند تھا اس لئے ان کے ملفوظات مذہب و تصوف کے دائرۃ المعارف کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کے علمی مآثر میں انھیں ملفوظات کے سات مجموعے ہیں جن میں بعض عام طور پر دستیاب ہیں اور بعض بالکل نایاب ہیں۔ ہم بغرض اختصار یہاں صرف ان کے نام درج کر رہے ہیں۔

(۱) جامع العلوم (۲) سراج الہدایہ، (۳) مقرر نامہ، (۴) خزانۂ جلالی (۵) جواہر جلالی (۶) مظہر جلالی (۷) مناقب مخدوم جہانیاں۔

(۸) ملفوظات کے ان مجموعوں کے علاوہ آپ نے تصوف کی مشہور کتاب رسالہ مکیہ کا فارسی میں ترجمہ بھی فرمایا ہے۔ رسالہ مکیہ کے مصنف شیخ قطب الدین دمشقی حضرت مخدوم کے ہم عصر ہیں اور خود انھوں نے یہ رسالہ حضرت مخدوم کی خدمت میں بھیجا تھا یہ رسالہ حجم میں اگرچہ بہت مختصر ہے اپنے عالی مضامین کی بنا پر... عوارف المعارف اور کشف المحجوب کی طرح ہمیشہ محققین صوفیاء کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یہ رسالہ حضرت مخدوم کی خانقاہ میں باقاعدہ پڑھایا جاتا تھا۔

(۹) اربعین صوفیاء کے نام سے حضرت مخدوم نے ایک رسالہ اپنے قیام مکہ معظمہ کے زمانہ میں تالیف فرمایا تھا یہ رسالہ بھی ان کی خانقاہ میں طالبین و سالکین کو سبقاً سبقاً پڑھایا جاتا تھا حضرت مخدوم کے یہ کل نو علمی مآثر اور یادگار ہیں۔

ملفوظات وارشادات حضرت مخدوم جہانیاں کے زیر نظر ملفوظات انھیں سات مجموعوں سے ماخوذ ہیں جن کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ پاکستان کے ممتاز صاحب قلم محقق پروفیسر ایوب قادری ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے نہایت عرق ریزی سے ملفوظات کا ایک اچھا خاصا مستند ذخیرہ اپنی کتاب "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" میں جمع کر دیا ہے ہم اسی کتاب کے حوالہ سے اخذ کر کے اس مضمون میں تیس ملفوظات درج کر رہے ہیں۔

اتباع سنت (۱) ارشاد فرمایا کہ سالک کو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اپنے اوپر لازم کرلینی چاہیئے اس سے قرب و محبت حاصل ہوگی۔ قلندروں کی وضع اختیار کرنا بدعت و ضلالت ہے۔

(۲) آپ کا یہ بھی ارشاد ہے:۔ جو شخص گفتار، کردار اور رفتار میں متبع سنت نہیں ہے وہ ولی

نہیں ہے۔ اور فرمایا کہ سنت کی ایسی عادت ڈالنی چاہیے کہ موت کے وقت بھی اس میں کمی نہ آئے۔

(۳) ایک مرتبہ مجلس میں سنت کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے یہ واقعہ سنایا کسی شہر میں ایک بزرگ کی بڑی شہرت تھی حضرت شیخ بایزید بسطامی اپنے رفقاء سے ساتھ ان بزرگ کی ملاقات کو تشریف لے گئے جس وقت شیخ بسطامی ان کے مکان کے سامنے پہنچے وہ کسی ضرورت سے گھر کے اندر سے باہر نکل رہے تھے اتفاق سے انھیں تھوکنے کی ضرورت پیش آگئی اور چلتے ہوئے قبلہ کی جانب تھوک دیا یہ دیکھ کر شیخ بسطامی اسی وقت الٹے قدم بغیر ملاقات کئے واپس چلے آئے ساتھیوں نے اس طرح واپسی کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ میں نے ان سے سنت کی مخالفت دیکھی، رفقاء نے پوچھا وہ کیا تھی؟ فرمایا انھوں نے کعبہ معظمہ کی جانب تھوکا اگر ولی ہوتا جیسا کہ مشہور ہے تو ایسا نہ کرتا آدمی ولی نہیں ہوسکتا جب تک کہ گفتار، کردار اور رفتار میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو نہ ہو۔

طریقت بلا علم شریعت دھوکہ ہے

(۴) فرمایا کہ طریقت سالک کیلئے ایک سیدھی راہ ہے جو شریعت سے نکالی گئی ہے جیسے کسی چیز کا مغز اور خلاصہ کھینچ لیتے ہیں مثلاً گیہوں سے میدہ نکالتے ہیں کہ میدہ کی اصل وہی گیہوں ہے۔

(۵) ایک موقع پر فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کا علم موروث اولیاء کرام کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک انھیں فقہ، اصولِ فقہ اور علمِ کلام حاصل نہ ہو۔ طریقت درحقیقت علمِ شریعت پر موقوف ہے۔ جب تک شریعت اچھی طرح نہیں جانے گا اس وقت تک طریقت کو نہیں جان سکتا

(۶) ایک مجلس میں فرمایا کہ جو شیخ جاہل اور علم شریعت سے ناواقف ہو وہ طریقت کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ ایسے شیخ کو مرشد بنانا چاہیے جس کے علماء معتقد و مرید ہوں۔

(۷) ایک مرتبہ طریقت کے لئے علم شریعت کی ضرورت کو اس مثال سے سمجھایا کہ طریقت شریعت ہی سے ماخوذ مستنبط ہے جیسے کہ گھی دودھ سے نکالا جاتا ہے اگر دودھ نہ ہوگا تو گھی کیونکر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(۸) ایک موقع پر قسم کھا کر نہایت جلال کے عالم میں فرمایا کہ جاہل ہرگز شیخ و مرشد نہیں ہوسکتا ہاں وہ دین کا چور اور مسلمانوں کا رہزن ہوگا۔

(۹) شیخ کامل کی تعریف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ شیخ کامل کے لئے شرط ہے کہ وہ تفسیر و حدیث اور فقہ کا عالم ہو اور طریقت و حقیقت سے بھی مکمل آشنا ہو۔

علم کیساتھ عمل کی ضرورت

(۱۰) فرمایا جو علم آدمی کو گناہوں سے نہیں روکتا، عمل خیر اور عبادت

وریاضت پر نہیں ابھارتا وہ کل قیامت میں عذاب سے کیونکر بچا سکے گا۔

(۱۱) فرمایا کہ عالم بغیر عمل کے جاہل ہے۔ جو عالم اپنے علم پر عمل نہیں کرتا وہ شیطان کا مسخرہ ہے۔

(۱۲) ایک مجلس میں فرمایا کہ قیامت کی علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ علماء فاسق ہوں گے اور صوفیہ جاہل۔

منسب عمل بغیر عمل کے سودمند نہیں

(۱۳) ایک آپ کے پوتے حامد بن محمود قرآن حکیم کا درس دے رہے تھے حضرت نوح علیہ السلام سے متعلق آیت زیر درس تھی حضرت مخدوم نے آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا کس طرح حضرت نوح علیہ السلام کا سرکش بیٹا کنعان غرق ہوا اور اس کے نسب نے اسے کچھ فائدہ نہیں دیا۔ پھر بطور استشہاد کے درج ذیل آیت کریمہ پڑھی۔

فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم | جس دن صور پھونکا جائے گا تو ان کے نسب کا کام نہ آئیں گے

پھر حدیث پاک پیش فرمائی۔

من ابطاء عملہ لم یسرع بہ نسبہ، جس کے عمل نے اسے پیچھے ڈال دیا اسے اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔

اخلاص نیت

(۱۴) ایک مرتبہ فرمایا کہ خانۂ کعبہ کی راہ بہت دور ہے لہٰذا جو شخص خانۂ کعبہ کی زیارت کو جائے وہ اللہ کے لئے جائے۔ ایسی صورت میں وہ اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہو جائے گا۔ اور جو نفس کے لئے زیارت کرتا ہے وہ خدا سے دور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو ذکر کیا جائے خدا کے تقرب کے لئے کیا جائے نفس کے لئے نہ کیا جائے اس سے ظلمت پیدا ہوتی ہے۔

تعظیم قرآن کریم

(۱۵) ایک موقع پر فرمایا کہ جس وقت قرآن کی سورت پڑھو تو اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھو جو قرآن کریم یا تفسیر کا مطالعہ کرو تو عظمت کیساتھ کرو یہ نہیں کہ جب ذکر یا عبادت سے تھک گئے تو اس وقت قرآن کریم کی تلاوت کرنی شروع کردی یہ تو ایسا ہوا جیسے کوئی سیر و تفریح کو جائے۔

صلحاء کی علامت

(۱۶) ایک مرتبہ فرمایا کہ صالحین کی دس علامتیں ہیں۔ (۱) روزہ رکھنا (۲) تہجد پڑھنا، (۳) موت کو کثرت سے یاد کرنا (۴) جنازہ

متابعت کرنا (۵) قبرستان جانا (۶) یتیموں کی نگہداشت کرنا، (۷) بیماروں کی عیادت کرنا (۸) صدقہ وخیرات دینا (۹) اہل خیر سے محبت رکھنا (۱۰) ذکر الٰہی میں مداومت کرنا۔

سالک سے متعلق ہدایات (۱۷) فرمایا کہ سالک کو پہلے علم حاصل کرنا چاہئے۔ فرمایا کہ مشائخ عجم کا یہ طریقہ ہے کہ جس وقت کوئی طالب ان کی خدمت میں آتا ہے اگر وہ عالم ہوتا ہے تو اسے خانقاہ میں رکھ کر تربیت کرتے ہیں اور ذکر و شغل کی تلقین کرتے ہیں اگر وہ علم سے عاری ہوتا ہے تو اسے تحصیل علم کے لئے مدرسہ میں بھیج دیتے ہیں جب وہ علم حاصل کر لیتا ہے تو پھر اسے ذکر و شغل کی اجازت دیتے ہیں۔

(۱۸) فرمایا کہ سالک کو چاہئے کہ اللہ کی امانت کا ہمیشہ لحاظ رکھے پھر تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ آنکھ کی امانت یہ ہے کہ صرف دیکھنے کے لائق چیز کو دیکھے، ہاتھ کی امانت یہ ہے کہ صرف لینے کے لائق چیز کو لے، ناک کی امانت یہ ہے کہ صرف سونگھنے کے لائق چیز کو سونگھے، منہ کی امانت یہ ہے کہ صرف کھانے کے لائق چیز کھائے اور دل کی امانت یہ ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کو جگہ دے اور غیر حق سے اسے بچائے رکھے۔

(۱۹) فرمایا کہ سالک کے لئے واجب ہے کہ حلال کھائے، اور حلال پہنے کیونکہ اگر ایک دانہ حرام کا یا ایک تار حرام کا ہوگا تو سلوک درست نہ ہوگا۔

(۲۰) فرمایا کہ سالک کو واجب ہے کہ جو کچھ کرے خدا کے واسطے کرے اگر کھانا کھائے تو خدا کی عبادت کی نیت سے کھائے۔

(۲۱) فرمایا کہ سالک کو خلوت میں کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر کثرت سے کرنا چاہئے اس سے ترقی ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ سالک کے لئے یہ دس امور ضروری ہیں۔

(۱) کثرت نوافل (۲) تفکر و تدبر (۳) احتساب نفس (۴) قرآن کریم کی تلاوت کی کثرت (۵) قرآن کریم کے اوامر و نواہی کی رعایت (۶) حکم الٰہی کی اطاعت، (۷) اس بات کا ہر وقت دھیان کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ (۸) جو کچھ ملے اسے خدا کی رضا میں خرچ کر دے (۹) قناعت اختیار کرے (۱۰) حصول رب کی ہر وقت کوشش کرتا ہے۔

سماع سے متعلق حضرت مخدوم کا نظریہ (۲۲) ایک مرتبہ چند قوال حضرت مخدوم کی زیارت کو آئے اور کچھ اشعار

پڑھ کر تالیاں بجائی جائیں تو حضرت مخدوم نے انھیں اس حرکت سے منع فرمایا اور فرمایا کہ چاروں مذاہب فقہ میں یہ منع ہے۔

(۲۳) ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ مزامیر کا بجانا اور اس کا سننا گناہ اور طبل کا بجانا بھی گناہ ہے۔ مگر جنگ اور قافلہ میں اجازت ہے اسی طرح دف کا بجانا جائز نہیں مگر نکاح کے اعلان کے لئے درست ہے البتہ ائمۂ قضاۃ اور علماء متبوعین کے حق میں یہ بھی منع ہے

فضائل صحابہ (۲۴) فرمایا کہ حضرات انبیاء کے بعد بہترین انسان حضرت ابوبکر صدیق ہیں پھر حضرت عمر فاروق، پھر حضرت عثمان غنی اور پھر حضرت علی مرتضیٰ، صحابہؓ کا ذکر عیب و طعن سے نہیں کرنا چاہئے۔ انھیں بھلائی سے یاد کرنا چاہئے۔

فرمایا کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی سے بیزاری کا اظہار نہیں کرتے نبیؐ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم ۔ میرے صحابہ مثل ستاروں کے ہیں ان میں سے جس کی اقتدار کرو گے راہ پا جاؤ گے۔

احادیث میں صحابہؓ کرام کے فضائل بے شمار ہیں اور ہم سارے اصحاب کو دوست رکھتے ہیں اور ان کی متابعت اور پیروی کرتے ہیں۔

درجات تقویٰ (۲۵) ایک مرتبہ مجلس میں تقویٰ پر گفتگو کے ذیل میں تقویٰ کے تین درجے بیان فرمائے

(۱) تقوی عام:۔ کفر، گناہ اور بدعت سے بچنا، (۲) تقوی خاص، لایعنی باتوں سے پرہیز کرنا (۳) تقوی خاص الخاص. ماسوائے اللہ سے پرہیز کرنا۔

(۲۶) یہ بھی فرمایا کہ قبولیت عمل کے لئے تقویٰ شرط ہے

(۲۷) تین قسم کے لوگوں سے احتراز:۔ ایک موقع پر فرمایا کہ تین آدمیوں سے ڈرنا چاہئے۔ (۱) جاہل، جابر حاکم دنیادار عالم (۲۸) تواضع دلیل کمال ہے:۔ فرمایا کہ جس شخص میں کمال ہوتا ہے وہ تواضع اور انکساری اختیار کرتا ہے اور جو اس سے عاری ہوتا ہے وہ کبر و عجب اختیار کرتا ہے۔

(۲۹) حقیقی عید:۔ فرمایا کہ جس دن اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی نہ سرزد ہو اس دن کو عید سمجھنا چاہئے۔

(۳۰) کمال کی علامت:۔ فرمایا کہ جس وقت طالب کمال کو پہنچتا ہے تو ماسوائے خدا اور کوئی دل میں نہیں رہتا۔

کوائفِ دارالعلوم

از ——— ادارہ

دارالعلوم کے تعلیمی و تربیتی معیار کو بلند کرنے کی غرض سے ذمہ داران دارالعلوم نے متفقہ طور پر کچھ اصول وضوابط مرتب کئے اور طے کیا کہ ایک جلسۂ عام کر کے ان ضوابط کا طلبہ میں اعلان کر دیا جائے۔ چنانچہ اس تجویز کے مطابق مورخہ ۶ ربیع الاول کو دارالحدیث تحتانی میں یہ جلسہ منعقد کیا گیا۔ لیکن ڈھائی ہزار طلبہ میں سے تقریباً دو سو کی تعداد میں فاسد عنصر ان اصلاحی و تربیتی پروگرام کو قطعاً پسند نہیں کرتا تھا اس لئے اس نے اس جلسہ کو ناکام بنانے کی غرض سے ایک انتہائی خطرناک اور دہشت انگیز سازش کی اور حضرت مولانا وحید الزماں صاحب ناظم تعلیمات کی تقریر کے دوران بجلی کے تار کاٹ دیئے اور جنیریٹر روم پر ایک الگ سے تالا لگا دیا اور اس پر ایک پرچی آویزاں کر دی کہ جو شخص اس تالا کو ہاتھ لگائے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ بجلی کے تار کٹ جانے اور جنیریٹر روم کے بند ہونے کی بناء پر پورے دارالعلوم میں تاریکی چھاگئی اور اس تاریکی سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے اس فاسد عنصر نے مولانا وحید الزماں صاحب اور دیگر اساتذہ پر جو اس وقت اسٹیج پر بیٹھے تھے ٹماٹر اور ڈھیلے پھینکے جس کی بناء پر جلسہ کی کارروائی روک دی گئی اور اصلاحی پروگرام کا اعلان نہ ہوسکا۔ صبح کو اس صورتِ حال پر غور کرنے کی غرض سے دفتر اہتمام میں تمام اساتذۂ دارالعلوم کی ایک مجلس بیٹھی اور اس میں طے کیا گیا کہ

اس واقعہ کی پوری تحقیق و تفتیش کی جائے تاکہ مجرم کی نشاندہی ہو کر اس کے خلاف ضابطہ کی کارروائی عمل میں لائی جائے۔ اس مشورہ کے مطابق ایک چار نفری کمیٹی بنادی گئی جس نے اپنا تحقیقاتی کام شروع کر دیا۔ اور اس سلسلے میں اس نے سب سے پہلے جمعیۃ الطلبہ کے عہدیداران اور ارکان کو بلا کر ان کی معلومات حاصل کرنی چاہی تاکہ تحقیقاتی کمیٹی اور جمعیۃ الطلبہ کے باہمی تعاون سے مقصد تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ لیکن جمعیۃ الطلبہ کے ارکان نے نہ صرف یہ کہ معلومات فراہم کرنے سے گریز کیا بلکہ جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے ایک اعلان آویزاں کر دیا کہ طلباء دارالعلوم اس تحقیقاتی کمیٹی کا تعاون نہ کریں کیونکہ یہ کمیٹی جمعیۃ الطلبہ کو توڑنے کی سعی کر رہی ہے چونکہ یہ اعلان بالکل خلاف واقعہ تھا اور اس سے طلبہ میں ذہنی انتشار پیدا ہو جانے کا قوی خدشہ تھا اس لئے تحقیقاتی کمیٹی نے صورت حال کی وضاحت کی غرض سے یہ اعلان آویزاں کیا کہ جمعیۃ الطلبہ کے صدر کی جانب سے جو اعلان لگایا گیا ہے وہ خلافِ واقعہ ہے جمعیۃ الطلبہ کو توڑنے کا خیال تک بھی نہیں ہے۔ تحقیقاتی کمیٹی اپنا کام کر رہی ہے۔ اور جلد ہی مجرم کی تحقیق کر کے مکمل رپورٹ پیش کرے گی۔ لیکن یہ اعلان جیسے ہی آویزاں کیا گیا جمعیۃ الطلبہ کے دو عہدیداروں (محمد عثمان اور طیب الرحمٰن) نے اُسے دیوار سے اتار کر نذر آتش کر دیا۔ جس کی اطلاع دفتر تعلیمات کے اس چپراسی نے آکر دی جو اعلان کی نگرانی کیلئے وہاں متعین تھا۔ اس اطلاع پر مولانا وحید الزماں صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، مولانا عبد الخالق مدراسی وغیرہ اساتذۂ دارالعلوم موقع پر پہنچے اور ان افراد کو پکڑ لیا جنھوں نے یہ نازیبا حرکت کی تھی اس پر انھوں نے شور مچا کر اپنے پچاس ساٹھ حامیوں کو جمع کر لیا اور احاطہ مولسری میں جمع ہو کر نعرے لگانے شروع کر دئے۔ یہ صورت دیکھ کر اساتذہ وہاں سے ہٹ کر تعلیمات کے دفتر میں چلے آئے تاکہ یہ شور و شغب ختم ہو لیکن اس گروہ نے حضرت مولانا وحید الزماں صاحب اور بعض دیگر اساتذہ پر حملہ کرنے کی غرض سے دفتر تعلیمات کو محاصرہ میں لے لیا اور دروازے توڑنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت تک طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد یہاں پہنچ چکی تھی اس لئے یہ لوگ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چونکہ یہ ہنگامہ انتہائی ڈرامائی انداز میں کیا گیا تھا اس لئے اکثر طلبہ صحیح صورت حال کو سمجھ نہ سکے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں۔ اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ بعد نماز ظہر عام طلبہ کا اجتماع بلا کر صحیح صورتِ حال سے انھیں باخبر کر دیا جائے۔

نماز کے بعد مولانا عبدالرؤف صاحب استاذ دارالعلوم و امام مسجد دارالعلوم نے جلسے کا اعلان کیا اور مختصر سی بات صورت حال کی وضاحت میں بھی کہی جسپر شرپسندوں نے مسجد میں بھی شور مچانا شروع کردیا۔ بہرحال اعلان کے مطابق دارالحدیث فوقانی میں طلبہ جمع ہونا شروع ہوئے، حضرت مہتمم صاحب اور دیگر ذمہ داران واساتذہ بھی وہاں پہنچ گئے اور تقریر شروع ہونے والی ہی تھی کہ محمد عثمان انبیٹھوی صدر جمعیۃ الطلبہ، محمد عزیر پورنوی ناظم جمعیۃ الطلبہ اور ۲۵ ــ ۳۰ حمایتی جوتے اور لوہے کے چھڑ ہاتھوں میں لئے شور مچاتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور ہنگامہ کرنا شروع کردیا اس پر طلبہ نے انھیں روکنا چاہا تو انھوں نے طلبہ پر حملہ کردیا طلبہ نے اپنی مدافعت میں ان کے حملے کا جواب دیا اس طرح یہ جلسہ ہنگامہ کی نذر ہوگیا اور حضرت مہتمم صاحب اور دیگر اساتذہ وہاں سے ہٹ کر دفتر تعلیمات میں آگئے۔

دوسرے دن مجلس تحقیقات نے اپنی تحقیقات کو مکمل کرنے کی غرض سے طلبہ، اساتذہ اور ملازمین سے جو اس وقت دارالعلوم میں موجود تھے بیانات لئے جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ مورخہ ۱۴ر دسمبر ۱۹۸۳ء کے جلسہ کو درہم برہم کرنے کی سازش میں محمد عثمان انبیٹھوی، محمد عزیر پورنوی، طیب الرحمٰن ہزاری باغی، عبداللہ گورکھپوری، عبدالرشید فیض آبادی قطب الدین آسامی، ابوالکلام آسامی، ریاض الدین سیب ساگری، محمد رضی بھلتی، محمد فاروق مدھوبنی، نورالہدیٰ دربھنگوی، عبدالرؤف سہارنپوری ملوث ہیں۔ مجلس نے اپنی تحقیقات مجلس اساتذہ کے سامنے ظاہر کردی جسپر باتفاق فیصلہ کیا گیا کہ ان فاسد عناصر کو دارالعلوم سے فوراً الگ کردیا جائے طلبۂ دارالعلوم کی جانب سے بھی ضلعی اور صوبائی پیمانہ پر یہ مطالبہ شروع ہوگیا کہ ان شرپسند طلبہ سے دارالعلوم کو جلد از جلد پاک کیا جائے۔

اس فیصلہ کے مطابق مورخہ ۱۹ر دسمبر کو ان ۱۲ طالب علموں کا اخراج کردیا گیا اور انھیں اس فیصلے سے مطلع کرتے ہوئے کہہ دیا گیا کہ وہ جلد از جلد دارالعلوم کو خالی کردیں چنانچہ اس فیصلے کے مطابق وہ ۱۲ افراد رات میں دارالعلوم چھوڑ کر چلے گئے۔

صبح کو اطلاع ملی کہ ان شرپسندوں نے شہر میں دارالعلوم مخالف طاقتوں سے رابطہ قائم کرلیا ہے اور وہ کسی بڑی سازش کو مرتب کرنے میں مصروف ہیں لیکن ذمہ داران دارالعلوم نے اس اطلاع کو افواہ پر محمول کیا اور اس پر کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ اور حسب معمول اسباق جاری ہوگئے۔ ۲۱ر دسمبر کو نماز ظہر کے متصل جب کہ اکثر اساتذہ دارالعلوم سے باہر تھے، یہ

مخرج طلبہ ٹیکسی پر سوار دارالعلوم کے گیٹ پر پہنچے، ان کے ہمراہ پچاسوں کی تعداد میں انجانے افراد بھی تھے اور سب کے ہاتھوں میں ریوالور اور طمنچے تھے، یہ لوگ دارالعلوم کے شمالی دروازے سے فائر کرتے ہوئے دارالعلوم میں گھس آئے اور متفرق ٹولیوں میں بٹ کر کچھ دفتر تعلیمات کی چھت پہنچ گئے کچھ مسجد کی چھت پر، کچھ مدنی گیٹ کی چھت پر اور کچھ دارجدید کے احاطے میں پھیل کر اندھادھند فائرنگ شروع کردی، کچھ طلبہ نے ابتدا میں مزاحمت کی مگر ان کی فائرنگ سے مرعوب ہوکر سب کے سب اپنے اپنے حجروں میں چلے گئے اور یہ دہشت پسند اور تخریب کار گروہ چھتوں پر چڑھ کر جمعیۃ الطلبہ زندہ باد، دارالعلوم ہمارا ہے، نعرے لگانے اور مدنی گیٹ سے باہر کھڑے مجمع پر پتھر و بارود گولے برسانے شروع کردئے جس سے یہ مجمع سمٹ کر دور ہٹ گیا۔ اس کے بعد انھوں نے مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر پہنچ کر اعلان شروع کردیا کہ دارالعلوم اب ہمارے قبضہ میں ہے۔ فائرنگ اور اعلان کی آواز سن کر شہر کے بہت سے ہمدردانِ دارالعلوم موقع پر پہنچ گئے۔ مدنی گیٹ سے باہر حضرت مولانا ارشد مدنی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی طلبہ کی ایک جمعیۃ کیساتھ متحیر کھڑے تھے اور دارالعلوم کے اندر سے کھڑکیوں سے طلبہ انھیں آواز دے کر بلا رہے تھے کہ آپ حضرات اندر آکر ہماری جانیں بچائیں، ان کی چیخ و پکار اور آہ و زاری سن کر ان دونوں حضرات نے اپنی جان پر کھیل کر دارالعلوم میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا، ان کے ساتھ طلبہ اور اس شہر کی ایک جماعت بھی کسی طرح سے دارالعلوم میں داخل ہوگئی۔ انھیں وہاں دیکھ کر طلبہ کے اندر بھی ہمت آئی اور وہ بھی اپنے اپنے حجروں سے نکل کر ان کے ساتھ ہوگئے۔ چونکہ اس ڈیڑھ گھنٹہ کی اندھادھند فائرنگ میں شرپسندوں کا یہ گروہ اپنے ساتھ لایا ہوا میگزین ختم کرچکا تھا اس لئے اوپر سے سنگ باری کا سہارا لیا مگر دو ہزار طلبہ کی بھاری اکثریت کے مقابلے میں وہ زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے اور مختلف سمتوں سے بھاگنے کی کوشش میں لگ گئے۔ ان میں سے ۱۴ افراد کو طلبہ نے پکڑلیا اور بقیہ بھاگنے میں کامیاب ہوگئے، چونکہ طلبہ میں ان کی جانب سے بیجا اشتعال تھا جو فطری تھا۔ اس لئے ان گرفتار مجرموں پر وہ ٹوٹ پڑے مگر حضرت مولانا ارشد مدنی، مولانا حبیب الرحمٰن اور دیگر اساتذہ نے ان مجرموں کو اپنے محاصرہ میں لے کر ان کی جان بچائی۔ مولانا ارشد صاحب کو بھی چوٹ

لگی، مگر انھوں نے اپنی جان سے بے پرواہ ہو کر ان مجرموں کی جان بچائی۔

اس ہنگامہ میں ان چودہ مجرموں کے علاوہ ۶ - ۷ طلبہ بھی زخمی ہوئے، مگر ان تمام زخمیوں کی حالت اطمینان بخش ہے، بلکہ ان میں سے اکثر صحت یاب ہو کر دارالعلوم آچکے ہیں۔

یہ ہنگامہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو گھنٹے میں ختم ہو گیا، اور بحمد اللہ دوسرے دن سے حسب معمول دارالعلوم کا سارا تعلیمی و انتظامی نظام پر امن ماحول میں جاری ہو گیا ہے۔

البتہ یہ دہشت پسند مجرمین بعض مسلم دشمن سیاسی پارٹیوں کا سہارا لیکر ملک میں دارالعلوم، اور اس کے اساتذہ اور انتظامیہ کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کرتے پھر رہے ہیں۔

دارالعلوم کے مخلصین اور عام مسلمانوں سے ہماری اپیل ہے کہ وہ ان پروپیگنڈوں سے بالکل متاثر نہ ہوں، اور مناسب سمجھیں تو تحقیق حال کیلئے خود دیوبند تشریف لاکر صحیح معلومات حاصل کریں ●●●

ترسیل زر کا پتہ

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

دارالعلوم دیوبند

ادبیات

ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

ماہر القادری

تیرا نطق وحیٔ یزداں، تری بات شرحِ قرآں
ترا نام دل کی تسکیں، ترا ذکر راحتِ جاں

ہوئی تیری آمد آمد، تو برائے خیر مقدم
کہیں کھل گئے گلستاں کہیں ہو گیا چراغاں

ہے جہانِ جزو و کُل میں ترے دم قدم سے رونق
تُو فروغِ بزمِ ہستی، تُو بہارِ باغِ امکاں

وہ ہے خوش نصیب جس کو ملی عزتِ غلامی
ترے در کے سب سلامی وہ فقیر ہو کہ سلطاں

تری ذات سے محبت ترے حکم کی اطاعت
یہی زندگی کا مقصد، یہی اصل دین و ایماں

جاں افزا لوحِ تواریخ

قطعۂ تاریخ

۱۴۰۴ھ

مفتیِ یٰسین دیں کے ایک تھے ماہِ مبیں
گنجِ اسرار و حکم علم و معارف کے امیں

شیخِ وقت، استاذِ علماء، مفتیِ دینِ متیں
صدرِ احیاء العلوم و مرجعِ علمائے دیں

موتِ عالِم موتِ عالَم کا ہوا ہم کو یقیں
اب نظر آتا نہیں تیرا کوئی مسند نشیں

ناز کرتا تھا مبارکپور تیری ذات پر
تیری رحلت سے ہوا ہر شخص آزردہ حزیں

یاس و حسرت سے تجھے سب دیکھتے ہی رہ گئے
چھوڑ کر تو اس جہاں کو جا بسا خلدِ بریں

تھی تری فتویٰ نویسی ملک میں ضرب المثل
تو سلف کا ایک تھا زندہ نمونہ بالیقیں

کون سلجھائیگا اب فتوے کی الجھی گتھیاں
جامعہ کی گریہ زاری تو نے کیا دیکھی نہیں

حل ہوا کرتے تھے تیرے پاس مشکل مسئلے
گفتگو علماء کو تھی تیری شراب الصالحین

ہے چراغِ حسن الیٰسین فروغِ حسن موت
سالِ رحلت لکھ دے دانشمند عثمان حزیں

۱۳۲۲ھ ۱۴۰۴ھ ۱۹۸۳ء

قلم حزیں محمد عثمان معروفی

۱۴۰۴ھ

فہرست کتب مکتبہ دار العلوم دیوبند (شعبہ نشر و اشاعت دار العلوم دیوبند)

نام کتب	قیمت	نام کتب	قیمت	نام کتب	قیمت
فتاویٰ دار العلوم جلد ۱	۲۴/-	دیوان المتنبی	۱۱/-	انتصار الاسلام	۹/-
〃 〃 〃 ۲	۱۷/-	تاریخ دار العلوم جلد ۱	۴۰/-	مصابیح التراویح	۶/۵۰
〃 〃 〃 ۳	۲۵/-	〃 〃 ۲	۴۰/-	تفسیر معوذتین	۳/-
〃 〃 〃 ۴	۳۱/-	〃 انگریزی ۱ / ۲	۱۲۵/- ۱۷۵/-	اسلامی عقائد اور سائنس	۲/-
〃 〃 〃 ۵	۳۰/-	سوانح قاسمی جلد اول	۴۰/-	مودودی مذہب	۲/۵۰
〃 〃 〃 ۶	۳۶/-	〃 〃 دوم	۳۸/-	مودودی دستور و عقائد	۲/۵۰
〃 〃 〃 ۷	۳۳/-	〃 〃 سوم	۱۲/-	نظریۂ دور قرآن پر ایک نظر	۴/-
〃 〃 〃 ۸	۲۸/-	مخطوطات جلد اول	۱۹/-	مکتوبات	۳/-
〃 〃 〃 ۹	۳۱/-	〃 دوم	۲۱/-	مکتوبات ثلاثہ	۳/۵۰
〃 〃 〃 ۱۰	۲۲/-	قبلہ نما	۳۸/-	دو ضروری مسئلے	۱/-
〃 〃 〃 ۱۱	۱۱/-	دینی دعوت کے قرآنی اصول	۶/۵۰	جماعت اسلامی کا دینی رخ ۱	۳/۵۰
مقدمہ ابن الصلاح	۱۱/-	ناقابلِ فراموش واقعات	۲۶/-	〃 〃 〃 ۲	۲/۵۰
الغنیۃ الحدیث	۱۲/-	المنار الانوار	۷/-	〃 〃 〃 ۳	۲/۵۰
مشکوٰۃ الآثار	۱۱/-	مثنوی فروغ	۴/۵۰	〃 〃 〃 ۴	۴/-
النحو	۴/-	براہین قاسمیہ	۱۰/-	اجتماع گنگوہ	۱/-
نفحۃ الادب	۶/-	حکمتِ قاسمیہ	۵/-	در منثور اول	۱/-
تفسیر مدارک التنزیل	۸/-	مدارج سلوک	۱۶/-	〃 دوم	۱/-
الاشباہ والنظائر	۳۰/-	جائزہ تراجم قرآنی	۱۱/-	اعفاء اللحیہ	۱/-
عقیدۃ الطحاوی	۱۱/-	قرآن محکم	۵/-	ایمان و عمل	۳/-
حسامی	۲۴/-	حجۃ الاسلام	۱۰/-	دار العلوم دیوبند کا ایک فتویٰ	
ملا حسن	۱۲/-	اسرائیل	۴/-	اور اس کی حقیقت	۱/۵۰
مقامات حریری	۲۵/-	قرآنی پیشین گوئی	۳/۷۵	ماثورہ دعائیں	۱/۵۰

Regd. No. SHN-13-NP-21-83

DARUL-ULOOM MONTHLY
DEOBAND [U.P.]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالعلوم دیوبند
کے ترقیاتی منصوبے

(۱) رواق خالد کی دوسری منزل اور مزید جدید دارالاقامہ کی تعمیر جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو

(۲) **دارالتربیت** (دارالاطفال) کا قیام اور اس کی تعمیر

(۳) ایک وسیع مسجد کی تعمیر جس میں اضافہ شدہ تمام طلبہ کی گنجائش ہو (قدیم مسجد ناکافی ہو چکی ہے)

(۴) علمی و دینی اجتماعات کے لئے ایک وسیع ہال کی تعمیر۔ —— (۵) ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر

(۶) مہمان خانہ کی توسیع —— (۷) نئی درسگاہوں کی تعمیر —— (۸) **لائبریری کی تعمیر جدید**

(۹) اساتذۂ دارالعلوم کی علمی ترقی کے لئے عالم اسلام سے علمی کتابوں کی فراہمی کا انتظام

(۱۰) تمام دنیا میں پھیلے ہوئے فضلاء دارالعلوم سے روابط اور اُن سے متعلق معلومات۔

(۱۱) نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم پر تمام ذمہ دارانِ مدارس عربیہ کا اہم کنونشن طلب کرنا۔

(۱۲) تعلیم و تربیت کے نئے اصول و ضوابط کی ترتیب اور اُن کا اجراء۔

اس ادارے کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے

دستِ تعاون بڑھانے کی شدید ضرورت ہے

مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی امداد روانہ فرمائیں —————— شکریہ

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب) دارالعلوم دیوبند یوپی

تاج پرنٹرز لوہاری سرائے سہارنپور

دار العلوم دیوبند کا علمی دینی اصلاحی ماہنامہ

دار العلوم

زیر سرپرستی

مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند

مدیر مسئول

ریاست علی بجنوری

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی و اصلاحی

ماہنامہ

دارالعلوم

شمارہ نمبر ۴	جنوری ۱۹۸۴ء مطابق ربیع الثانی سنہ ۱۴۰۴ھ	جلد نمبر ۶۸

سالانہ زرِ اشتراک

ہندوستان سے -/۲۵ روپے

سعودی عرب، کویت، ابوظہبی وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل -/۹۰ روپے

جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل -/۱۰۵ روپے

امریکہ، کناڈا، وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل

-/۱۱۶ روپے

پاکستان سے ذریعہ ریل -/۴۵ روپے

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

مجلسِ ادارت

طابع وناشر

دارالعلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مطبوعہ:- محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند

ضروری گذارش:- اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینہ یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو چکی ہے۔ بذریعہ سرخ نشان اس کی آپ کو بار بار اطلاع بھی دی جا چکی ہے لہٰذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی پی ہی سے زرِ اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے۔ اگلا شمارہ -/۳۱ روپے کے مطالبہ میں وی، پی کر دیا جائے گا۔

(مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

۱۔ ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اوّل فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

۲۔ پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۴۵/- روپے مولانا عبد الستار صاحب مقام کرم علی والہ تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیجدیں اور انھیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو رسالہ دار العلوم کے حساب میں جمع کریں۔

خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط وکتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

دار العلوم دیوبند جو اپنی عظیم خدمات اور حیرت انگیز کارناموں کی بنا پر ملت اسلامیہ کا دھڑکتا ہوا دل اور برصغیر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا بجا طور پر علم بردار سمجھا اور مانا جاتا ہے۔ ماضی قریب میں تقریباً دو ڈھائی سال تک خود اپنوں ہی کی چیرہ دستیوں کا شکار رہا کہ محض بیجا اور ناروا خواہشات کی تکمیل کیلئے اس کے اقدار و روایات کو پامال کرنے کی کوشش کی گئی جس پر پوری امت چیخ اٹھی اور ملت کے اس عظیم سرمایہ کی حفاظت و صیانت کے لیے حرکت میں آگئی۔ بالآخر خدا خدا کرکے انتشار کے یہ بادل چھٹے اور یہ افسوسناک صورت حال ختم ہوئی۔ اور دار العلوم اپنے مقصد و منہاج کے مطابق نونہالانِ ملت کی تعلیم و تربیت اور اشاعتِ دین کی خدمت میں مصروف ہوگیا۔

دار العلوم کی مجلسِ شوریٰ اور انتظامیہ نے مکمل دلسوزی اور دیدہ وری کے ساتھ تعلیم و تربیت کے نظام کو بہتر سے بہتر اور مستحکم بنانے کے اقدامات کئے۔ بینکوں میں محفوظ سرمائے کے منجمد ہوجانے کے باوجود طلبۂ عزیز کی ضروریات پوری کرنے اور انھیں زیادہ سے زیادہ سہولیات بہم پہنچانے پر پوری توجہ صرف کی گئی۔ مجموعی طور پر طلبۂ عزیز نے بھی ان اصلاحات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اطمینان و سکون کے ساتھ تعلیم تحصیل میں لگ گئے۔ اور صرف ڈیڑھ دو سال کی قلیل مدت میں دار العلوم کے ماحول میں امن و سکون اور علمی و دینی چرچا نمایاں طور پر محسوس ہونے لگا۔

لیکن دوسری طرف ایک مخصوص حلقہ کے لئے دار العلوم کا یہ امن و سکون اور اس کی علمی و دینی سرگرمیاں سوہانِ روح بنی ہوئی تھیں اس لئے یہ حلقہ دار العلوم اور اس کی انتظامیہ کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مسلسل مشغول رہا۔ دار العلوم اور اس کے مخلص کارکنوں پر متعدد فرضی اور خلاف واقعہ مقدمات دائر کرنے کے ساتھ مختلف من گھڑت پروپیگنڈوں کے ذریعے ناواقف اور سادہ لوح مسلمانوں کو دار العلوم سے بدگمان اور منحرف بنانے کی تدبیریں بھی کی جاتی رہیں حتیٰ کہ خوفِ خدا سے بے نیاز ہوکر یہ فتویٰ بھی صادر کردیا گیا اور اشتہارات کے ذریعہ اسے ملک کے طول و عرض میں پھیلایا گیا کہ دار العلوم کو زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں دینا درست نہیں۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر دار العلوم کی مجلسِ شوریٰ نے فیصلہ کیا کہ دردمندانِ ملت اور بہی خواہ

دارالعلوم کو دعوت دی جائے کہ وہ دیوبند آکر دارالعلوم اور اس کی علمی و دینی سرگرمیوں کا بچشم خود معائنہ کریں۔ چنانچہ ۲۱/۲۲ صفر المظفر ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۷/۲۸ نومبر ۱۹۸۳ء کو دارالعلوم کی دعوت پر ملک کے ہر صوبہ سے علماء و فضلاء کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ، یونیورسٹیوں اور جامعات کے سربراہان و اساتذہ صوبائی و مرکزی وزراء، پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبران اور تجار وغیرہ ہزاروں کی تعداد میں تشریف لائے اور اپنے دو روزہ قیام کے دوران گھوم پھر کر دارالعلوم کے حالات کا مکمل جائزہ لیا اور اطمینانِ خاطر حاصل کیا۔ اس طرح مخالفینِ دارالعلوم نے اپنی مسلسل اور طویل سازشوں کا جو جال ملک کے طول و عرض میں بچھا رکھا تھا اس کا ایک ایک تار بکھر کے رہ گیا

اس محاذ پر ناکامی کے بعد ان طالع آزماؤں نے اپنی مخالفانہ جد و جہد کے رُخ کو بدل دیا۔ اب تک ان کی تمام تر کوششوں کا میدان بیرونِ دارالعلوم مسلم عوام تھے جنھیں وہ اپنے دام فریب میں نہ لا سکے تو انھوں نے اپنی سازشوں کا جال خود دارالعلوم کے اندر پھیلانا شروع کر دیا۔ اور بدقسمتی سے طلبہ کی جماعت میں سے انھیں چند ایسے مفسد پسند مہرے ہاتھ آگئے جن کے ذریعہ وہ اپنی ناپاک سازش کو بروئے کار لانے میں کسی حد تک کامیاب ہوگئے۔ ۱۴/ دسمبر کے اصلاحی جلسہ کو درہم برہم کرنے کی دہشتناک سازش ۱۷/ دسمبر کو حضراتِ اساتذہ کرام کی ریکارڈ توڑ بے حرمتی کا افسوسناک سانحہ، اور ۲۱/ دسمبر کو دن دھاڑے دارالعلوم پر جان لیوا مسلح حملہ یہ سارے ہنگامے اور اس ترتیب کے ساتھ کہ ہر بعد کا ہنگامہ پہلے سے سنگین تر یہ کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ سوچی سمجھی اسکیم اور لعین دین کی بنیاد پر ایک انتہائی سنگین سازش کا شاخسانہ ہے جس کے ذریعہ نہ صرف دارالعلوم کے پُر امن علمی ماحول کو تباہ و برباد کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کی عظمت و حرمت کو بھی داغدار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ بغیر کسی پشت پناہی در پردہ طاقت اور کامل یقین دہانی کے یہ دس بارہ مخرج طلبہ دن کی روشنی میں علم دین کے اس عظیم مرکز اور اسلام کے سنگین قلعہ پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ جہاں سو پچاس نہیں بلکہ دو ہزار سے زائد ایسے نوجوان طالبانِ علم موجود تھے۔ جنھوں نے دو دن قبل ان کو ناقابل معافی باغیانہ حرکتوں کی بنا پر انتہائی غم و غصہ اور نفرت کے ساتھ اپنی جماعت سے الگ کر دیا تھا اور آج بھی انھیں کسی طرح برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

یہ خطرناک حملہ اس قدر اچانک اور شدید تھا کہ طلبہ پٹتے رہے۔ انھیں اپنی مدافعت کا موقع بھی نہ مل سکا اور خوف و ہراس کے عالم میں اپنے زخمی بھائیوں کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا چھوڑ کر اپنی جان

بچانے کے لئے اپنے کمروں میں گھس کر اندر سے کواڑ بند کر لئے۔ میدان خالی دیکھ کر حملہ آور بلوائیوں کے حوصلے بلند ہوگئے اور اوپر چھتوں پر چڑھ کر مورچے سنبھال لئے۔ تاکہ باہر سے مظلومین طلبہ کی کوئی مدد نہ آسکے، صدر گیٹ اور معراج گیٹ پر موجود ان بلوائیوں کے حمایتیوں اور سازشی گروہ کے نمائندوں نے انھیں ہدایت دی کہ لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کر دو کہ اب دار العلوم پر ہمارا قبضہ ہے اور فوراً دفتر اہتمام اور خزانے کے تالے توڑ کر ان پر بھی قبضہ کر لو، ان کی ہدایت کے مطابق لاؤڈ سپیکر پر اعلان شروع ہوگیا اور دفتر اہتمام اور خزانہ کے تالے توڑنے کی کوشش بھی جاری ہوگئی۔ اسی کے ساتھ دار العلوم میں محصور بعض حضرات اساتذہ اور طلبہ کو مغلظ گالیاں دیکر یہ ہدایت بھی کی گئی کہ انھیں تلاش کر کے انکا کام تمام کر دو۔ ڈرے اور سہمے ہوئے طلبہ اپنے کمروں کی کھڑکیوں سے چیخ چیخ کر مدنی گیٹ کے باہر کھڑے اساتذہ اور طلبہ سے فریاد کر رہے تھے کہ خدارا آپ حضرات ہماری مدد کے لئے جلد از جلد اندر آجائیں اور ایک طالب علم تو بدحواسی کے عالم میں کسی طرح کھڑکی کی سلاخیں توڑ کر باہر نکلنے میں کامیاب بھی ہوگیا اس نے باہر آکر اندر کی جو وحشت انگیز اور دردناک داستان سنائی اس سے دل لرز اٹھے۔ چونکہ پولیس حضرت مہتمم صاحب کی تحریر کے بغیر کسی قسم کی کارروائی کے لئے تیار نہیں تھی اس لئے جان ہتھیلی پر رکھکر یہ فیصلہ کیا گیا کہ دار العلوم اور طلبۂ دار العلوم کی حفاظت کے لئے کسی طرح اندر گھسنا چاہئے۔ چنانچہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی اور راقم الحروف پچیس ۲۵، تیس ۳۰ طلبہ کو ساتھ لیکر بہزار دقت اندر پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ ہم نے اندر پہنچ کر کمروں میں بند طلبہ کو آوازیں دیں کہ تم باہر نکل آؤ ہم اندر تمہاری مدد کیلئے آگئے ہیں۔ ہماری آواز سنکر طلبا اپنے حجروں سے نکل پڑے چونکہ بلوائیوں کی اکثر تعداد چھتوں پر تھی اس لئے ان کا محاصرہ کر لیا گیا ظاہر ہے کہ ۵۰۔۶۰ افراد دو ڈھائی ہزار طلبہ کے مقابلے میں کب ٹھہر سکتے تھے بالآخر وہ بھاگنے پر مجبور ہوئے جن میں سے چند تو طلبہ کے ہاتھ لگ گئے باقی فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ ان گرفتار شدہ بلوائیوں کے خلاف طلبہ کے اندر انتہائی اشتعال تھا اس لئے وہ اُن پر ٹوٹ پڑے اگر موقع پر موجود حضرات اساتذہ اور بعض طلبہ ان کو بچانے کی کوشش نہ کرتے تو ان میں سے ایک بھی نہ بچتا ان مجرمین کو بچانے میں حضرت مولانا ارشد مدنی صاحب اور خود راقم الحروف کو چوٹیں بھی آئیں مگر ان سب سے بے نیاز ہو کر انھیں بچایا گیا۔

چونکہ دار العلوم پر قبضہ کی سازش خدا کے فضل و کرم سے ناکام ہوگئی اس لئے یہ سازشی گروہ ان حملہ آوروں کو آلۂ کار بنا کر اخباروں اور اشتہاروں کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں دار العلوم کے اساتذہ اور انتظامیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا پھر رہا ہے۔ حالانکہ خدا شاہد ہے کہ حملہ خود

(بقیہ بر صفحہ ۳۲)

التحقیق المفید فی اجتماع الجمعة والعید

از حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب سابق مفتی اعظم دار العلوم دیوبند

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کی حدیث صحیح بخاری کی کتاب الاضاحی میں اور موطا امام مالکؒ اور موطا امام محمدؒ میں موجود ہے۔ جن بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ عید کی نماز جمعہ کی بھی کفایت کرتی ہے اور جمعہ ساقط ہو جاتا ہے۔ ان روایات وآثار سے استدلال کیا ہے جو صحیحین میں نہیں بلکہ سنن ابوداؤد وغیرہ میں ہیں، جن کی صحت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر صحیح بھی ہو جائیں تو اپنے منطوق ومفہوم میں نص قطعی نہیں ہیں بلکہ دوسرے معنیٰ کا احتمال موجود ہے اور تعارض دفع کرنے کیلئے اس احتمال کا اعتبار کرنا ضروری ہوگا۔ سنن ابی داؤد کے متعلق ذیل کا قول ملحوظ رہے

قال النووی فی سنن ابی داؤد احادیث ظاهرة الضعف لم يبينها مع انه متفق على ضعفها وقال ابن رجب قد اخرج ابوداؤد لمن قد قيل فيه انه متروك ولمن قيل فيه انه متهم الكذب الخ (رسالة ابی داؤد فی وصف تالیفہ للسنن)

امام نووی نے بیان کیا کہ سنن ابی داؤد میں بہت سی احادیث ظاہرة الضعف ہیں جن کو ابوداؤد نے بیان نہیں کیا۔ باوجودیکہ ان کے ضعیف ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے اور ابن رجب حنبلی کا قول ہے کہ ابوداؤد نے ایسے راویوں کی احادیث کی سنن میں تخریج کی ہے جن کے بارے میں متروک کہا گیا ہے اور ایسے راوی بھی جو متہم بالکذب ہیں۔ (دیکھئے رسالہ ابوداؤد مطبوعہ مصر)

* * * * *

* * * * *

وہ احادیث یا تو واہیة الاسانید ہیں یا قرائن واحوال خارجیہ کی بنا پر اہل بوادی اہل دیہات کے ساتھ خاص ہیں۔ جن پر جمعہ واجب نہیں جیسا کہ حضرت عثمان کی حدیث میں موجود ہے کہ اہل عوالی کو انھوں نے اجازت دیدی تھی اور کسی نے نکیر نہیں کی۔ سنن ابی داؤد میں ہے۔

حدثنا محمد بن كثير اخبرنا اسرائيل ثنا عثمان بن المغيرة عن اياس بن ابی رملة الشامی قال شهدت معاوية يسأل زيد بن ارقم بل شهدت مع رسول الله عيدين اجتمعا فی يوم قال نعم، قال كيف صنع؟ قال صلی العيد ثم رخص فی الجمعة، فقال من شاء ان يصلی فليصل انتهی۔

اس حدیث کی سند میں ایاس بن ابی رملہ راوی مجہول ہے حافظ ذہبیؒ میزان الاعتدال میں ناقل ہیں۔ (ایاس بن ابی رملة۔ د، س، ق) فی حدیث زید بن ارقم حین سأله معاویة۔ قال ابن المنذر لایثبت هذا فان ایاسا مجهول۔ الخ (میزان ص۱۳۱)

(ترجمہ) ایاس جو ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ کے رجال میں داخل ہیں اور زید بن ارقم کی حدیث میں واقع ہوئے ہیں۔ ابن المنذر نے کہا یہ حدیث ثابت نہیں اسلئے کہ ایاس مجہول ہیں الخ۔

حافظ ابن حجرؒ تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں۔

ایاس بن ابی رملة الشامی سمع معاویة یسأل زید بن ارقم عن اجتماع العید والجمعة روی عنه عثمان بن المغیرة، قلت ذکره ابن حبان فی الثقات وقال ابن المنذر ایاس مجهول قال ابن القطان هو کما قال الخ

(ترجمہ) ایاس بن ابی رملہ شامی نے حضرت معاویہؓ کو سنا کہ وہ زید بن ارقمؓ سے اجتماع عید وجمعہ کے بارے میں دریافت کر رہے تھے۔ عثمان بن المغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔ ابن حبان نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے۔ ابن المنذر نے کہا ایاس مجہول ہیں۔ (تہذیب ص۳۸۶ ج۱) ابن القطان نے بیان کیا کہ ایاس ایسے ہی ہیں جیسا کہ ابن المنذر نے کہا ہے کہ ایاس مجہول ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے تقریب میں بھی نقل کیا ہے کہ مجہول ہیں۔ جب ابن المنذر کا یہ قول ہے کہ یہ حدیث ثابت واضح نہیں جس کی تصدیق ابن القطان نے بھی کی جو کتاب الوہم والایہام میں بھی موجود ہے۔ اور ایاس ہی اس روایت کے ساتھ منفرد ہیں اور وہ بجز عثمان بن المغیرہ کے اور کوئی روایت نہیں کرتا تو ایاس مجہول العین والصفة دونوں ہیں، لہٰذا اس حدیث سے ایک فرض قطعی کے سقوط پر استدلال صحیح نہیں۔ ابن حبان کے ثقات میں ذکر کرنے سے ایاس کا ثقہ ہونا یا جہالت سے خارج ہونا ثابت نہیں ہو سکتا کہ وہ مجاہیل کی توثیق میں اپنے شیخ ابن خزیمہ کے مقلد ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ لسان المیزان میں لکھتے ہیں۔

قال ابن حبان من کان منکر الحدیث علی قلته لایجوز تعدیله الا بعد السبر ولو کان ممن یروی المناکیر ووافق الثقات فی الاخبار لکان عدلا مقبول الروایة اذ الناس فی اقوالهم علی الصلاح والعدالة حتی یتبین منهم مایوجب القدح، هذا حکم الرواة من المشاهیر فاما المجاهیل الذین لم یروعنهم الا الضعفاء فهم متروکون علی الاحوال کلها۔ قلت هذا الذی ذهب الیه ابن حبان من ان الرجل اذا انتفت جهالة عینه کان علی العدالة الی

ان یتبین جرحه مذهب عجیب والجمهور علیٰ خلافه وهٰذا هو مسلك ابن حبان فی کتاب الثقات الذی الفه فانه یذکر خلقا ممن نص علیهم ابوحاتم وغیره علیٰ انهم مجهولون وکان عند ابن حبان ان جهالة العین بروایة واحد مشهور وهو مذهب شیخه ابن خزیمة ولکن جهالة حاله باقیة عند غیره - انتهیٰ -

(لسان المیزان ص۱۴ ج - ا -)

ابن حبان نے کہا جو شخص کسی کے ساتھ منکر الحدیث ہو۔ بغیر امتحان وسبر کے اس کی تعدیل جائز نہیں ہے۔ اور اگر وہ ان لوگوں میں سے ہو جو احادیث منکرہ روایت کرتے ہیں اور اخبار میں اس نے ثقات کی موافقت کی ہے تو وہ عادل ومقبول الروایۃ ہوگا اس لئے کہ لوگوں سے جب تک کوئی ایسی چیز سرزد نہ ہو جو ان میں قدح پیدا کر دے وہ اپنے اقوال میں صلاحیت وعدالت پر ہوتے ہیں۔ یہ حکم تو مشہور راویوں کا ہے۔ لیکن وہ مجہول راوی جن سے ضعفاء ہی روایت کرتے ہیں وہ جمیع احوال میں متروک ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جو مذہب ابن حبان کا ہے کہ جب کسی راوی کی جہالت عین منتفی ہو جائے اور اس میں جرح ظاہر نہ ہو وہ عدالت پر باقی رہے گا۔ مذہب عجیب ہے۔ جمہور محدثین اسکے خلاف ہیں۔ کتاب الثقات میں یہی مسلک ابن حبان کا ہے کہ وہ ایک جماعت کو اس میں ذکر کرتے ہیں جن کو ابوحاتم وغیرہ نے صراحۃً مجہول کہا ہے۔ ابن حبان کے نزدیک ایک مشہور راوی کے روایت کرنے سے جہالت عین مرتفع ہو جاتی ہے۔ یہی مذہب ان کے شیخ ابن خزیمہ کا ہے۔ لیکن دوسرے محدثین کے نزدیک جہالت پھر بھی باقی رہتی ہے۔ روایت کی قبولیت کیلئے جس کا دفعیہ ضروری ہے ابن حبان کے نزدیک عادل وہ راوی ہے جس میں جرح معروف نہ ہو۔ اس لئے کہ جرح تعدیل کی ضد ہے، پس جس میں جرح نہ کی گئی ہو وہ عادل ہے، جبتک جرح ظاہر نہ ہو کہ جو شئے غائب ہو لوگ اس کے مکلف نہیں ہیں۔

وقد افصح ابن حبان بقاعدته فقال العدل من لم یعرف فیه الجرح، اذ التجریح ضد التعدیل، فمن لم یجرح فهو عدل حتی یتبین جرحه، اذ لم یکلف الناس ما غاب عنهم وقال فی ضابط الحدیث الذی یحتج به اذا تعری راویه من ان یکون مجروحًا او دونه مجروح اذ کان عنده منقطعا او مرسلا او کان المتن منکرًا - الخ - (لسان ص۱۴ ج ا)

حافظ ابن حجر نے ایوب عن ابیه کے ترجمے میں ابن حبان کا قول کتاب الثقات سے نقل کیا ہے

ایوب عن ابیه عن کعب بن سور مجهول الخ وذکره ابن حبان فی الثقات وقال وروی عنه

مهدی بن میمون لا ادری من هو و لا ابن من هو وهذا القول من ابن حبان یؤیدما ذهبنا الیه من انه یذکر فی کتاب الثقات کل مجهول روی عنه ثقة ولم یجرح ولم یکن الحدیث الذی یرویه منکرا۔ هذه قاعدته وقد نبه علیٰ ذالک الحافظ صلاح الدین العلائی والحافظ شمس الدین ابن عبد الهادی وغیرهما۔ انتهیٰ

(لسان المیزان ص۲۹۲ ج۱)

ایوب عن ابیه عن کعب بن سور مجہول ہے۔ اس کو ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے اور کہا مہدی ابن میمون اس سے روایت کرتے ہیں میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور کس کا بیٹا ہے۔ ابن حبان کا یہ قول اس قول کی تائید کرتا ہے جس کی طرف ہم گئے ہیں کہ ابن حبان کتاب الثقات میں ہر ایسے مجہول راوی کو ذکر کرتے ہیں جس سے کسی ثقہ نے روایت کی ہو اور اس پر جرح نہ کی گئی ہو تو جو حدیث وہ روایت کرتا ہے وہ منکر نہ ہوگی، یہ ان کا قاعدہ ہے، اس پر حافظ صلاح الدین علائی اور حافظ شمس الدین ابن عبد الہادی وغیرہ نے تنبیہ کی ہے

جب یہ ثابت ہے اپنے شیخ ابن خزیمہ کی طرح کتاب الثقات میں ابن حبان مجاہیل کو ثقہ کہدیتے ہیں تو ایاس بن ابی رملہ کے ثقہ کہنے سے ایاس ثقہ نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا اس حدیث کی اسناد حسن بھی نہیں ہوسکتی چہ جائیکہ وہ صحیح الاسناد۔ ابن خزیمہ یا حاکم کے کہنے سے ہوجاتے۔ تحسین و تصحیح دونوں کا اعتبار نہیں امام نسائی یا ابو داؤد کا اس پر سکوت کرنا اس کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ مذکور حدیث احتجاج کے قابل ہے بلکہ اگر دلیل ہو تو اس امر کی ہوگی کہ یہ حدیث اگر دوسری سند سے وارد ہوجائے تو صالح الاعتبار ہے اور ظاہر ہے کہ صلاحیت للاعتبار اور صلاحیت للاحتجاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے، خصوصاً ایسی حالت میں کہ جس امر کی فرضیت قطعیہ کتاب و سنت اور اجماع و عمل متوارث سے ثابت ہوچکی ہو اس کے ساقط کرنے کے لئے ایسی حدیث سے استدلال کرنا جس کی اسناد حسن بھی نہیں کہاں تک اصول کے مطابق ہوسکتا ہے۔ حدیث کی تصحیح کی نسبت جو علی بن المدینی کی طرف بعض حضرات نے کردی ہے کہ انھوں نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے یہ غلط ہے بلکہ ان کو اشتباہ ہوگیا، ابو موسیٰ المدینی کی رائے کو غلط قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن القیم نے کتاب الفروسیہ میں اس کو بسط سے بیان کیا ہے نیز تعلیق خصائص مسند احمد لابی موسیٰ المدینی میں اس پر مفصل بحث کی ہے (مقالات منہ) ابو داؤد کے شیخ محمد بن کثیر العبدی ابو عبداللہ البصری گو صحاح ستہ کے رجال میں اور بخاری کے شیوخ میں داخل ہیں حتیٰ کہ امام بخاری نے تریسٹھ حدیثیں اپنی صحیح میں روایت کی ہیں، لیکن ابن معین نے اُن کے بارے میں

یہ کہا ہے کہ یہ ثقہ نہیں ہیں۔ ابن قانع نے ضعیف کہا ہے اور ابن العین نے ابن الجنید کی روایت کے مطابق ان کو ضعیف قرار دیا ہے اور ساتھ ہی یہ کہا ہے

لم یکن النسائی ان یکتب عنہ (تہذیب ص۱۸ ج۱) نیز اسرائیل بن یونس گو رجال ستہ میں داخل اور اثبت فی ابی اسحاق ہیں مگر علی بن المدینی نے ان کو ضعیف کہا ہے اور عبدالرحمٰن ابن مہدی کا قول ہے لص یسرق الحدیث (تہذیب ص۲۶۳ ج۱) ابن حزم نے بھی ضعیف کہا ہے گو بخاری و مسلم نے ان کی بعض احادیث کو منتخب کیا ہے، لیکن حدیث مذکور منتخب شدہ حدیثوں میں داخل نہیں ہے اور ایاس بن ابی رملہ کی جہالت ایسی ہے جو کسی طرح دور نہیں ہو سکتی جو حدیث میں قادح ہے اس کے موجود ہوتے کوئی بھی صحیح ثابت نہیں کر سکتا۔ پھر یہ حدیث عثمان رض کی حدیث کا کیسے مقابلہ کر سکتی ہے۔ جس کی تخریج بخاری نے اپنی صحیح میں کی ہے، جس میں تصریح اہل العوالی کی موجود ہے کہ ان کو اجازت دی گئی تو حدیث اہل عوالی کے ساتھ خاص ہے اور چونکہ انھوں نے مجمع صحابہ اور تابعین میں اہل عوالی کو اجازت دی

--- اور کسی نے حضرت عثمان پر نکیر نہیں کی اس لحاظ سے صحابہ کے درمیان یہ متفق علیہ مسئلہ ہو گیا کہ غیر اہل امصار کے ساتھ حکم رخصت خاص ہے کہ ان پر جمعہ فرض نہیں ہے۔ لہٰذا بعد میں کوئی خلاف بھی کرے تو صحابہ کے اتفاق سابق پر اثر انداز نہ ہوگا۔ نیز رخصت دینے کا حکم اجتہادی اور معلوم بالرائے نہیں ہے اسلئے یقیناً کہا جائے گا کہ حدیث عثمان رض مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ چنانچہ اصول میں مبرہن ہو چکا ہے، علاوہ ازیں عمر بن عبدالعزیز کی مرسل روایت زیادہ قوی اس کو کر دے گی جس کو امام شافعی رح نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح حدیث موصول ابی ہریرہ رض کی اس کو اور زیادہ قوی کر دے گی جس کو بیہقی نے روایت کیا ہے، اگرچہ اس میں کچھ ضعف ہے، لیکن تقویت کیلئے کافی ہے۔

حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں بیان کیا ہے کہ مسند امام احمد میں بہت سی احادیث ایسی واقع ہوئی ہیں جو اپنے متن و اسناد کے اعتبار سے محکم نہیں ہیں۔ اور سیر النبلاء میں امام ذہبی رح نے کہا ہے کہ مسند احمد میں احادیث ضعیفہ کا ایک مجموعہ ہے جن کا نقل کرنا تو جائز ہے۔ ان سے استدلال و احتجاج کرنا جائز نہیں اور احادیث معدودہ مسند میں موضوع احادیث کے مشابہ ہے لیکن وہ دریا کے مقابلہ میں بمنزلہ ایک قطرہ کے ہے اور زین الدین عراقی نے کہا ہے کہ مسند میں احادیث کثیرہ ضعیف ہیں اور تھوڑی احادیث موضوع ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ امام احمد کا انتقال تہذیب مسند سے پہلے ہوا تھا اسلئے مسند میں احادیث ضعیفہ اور موضوعہ باقی رہ گئیں اس کے متعلق حافظ ابن حجر رح کے "القول المسدد

فی الذہبان مسند احمد سے بھی نشاندہی ہوسکتی ہے۔

عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے مرسل کو امام شافعیؒ نے کتاب الام میں روایت کیا ہے۔

اخبرنا الربیع قال اخبرنا الشافعی قال اخبرنا ابراهیم بن محمد قال اخبرنا ابراهیم بن عقبة عن عمر بن عبدالعزیز قال اجتمع عیدان علی عهد رسول اللهؐ فقال من احب ان یجلس من اهل العالیة فلیجلس فی غیر حرج الخ۔ (کتاب الام ص۲۱۲ ج۱)

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز سے روایت ہے انھوں نے کہا آنحضرتؐ کے عہد مبارک میں ایک روز میں دو عیدیں جمع ہوگئیں تو آپ نے فرمایا اہل العالیہ میں سے جو شخص ٹھہرنے اور بیٹھنے کو جمعہ کے لیے پسند کرتا ہے وہ بیٹھ جاتے۔ اس پر کسی قسم کی تنگی نہیں ہے جمعہ پڑھ کر جاتے یا جمعہ سے پہلے چلا جائے دونوں اختیار ہیں۔

السنن الکبریٰ میں امام بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث موصولاً و مرسلاً دونوں طریق سے روایت کی ہے

عن زیاد بن عبدالله عن عبدالعزیز بن رفیع عن ابی صالح عن ابی هریرة قال اجتمع عیدان علی عهد النبیؐ فقال انه قد اجتمع عیدکم هذا والجمعة وانا مجمعون فمن شاء ان یجمع فلیجمع، فلما صلی العید جمع۔ وعن بقیة عن شعبة عن المغیرة ابن مقسم الضبی عن عبدالعزیز بن رفیع عن ابی صالح عن ابی هریرة به رواه ایضاً عبدالعزیز بن منیب المروزی عن علی بن الحسین بن شقیق ثنا ابوحمزة عن عبد العزیز موصولاً وهو فی التاریخ ورواه سفیان الثوری عن عبد العزیز فارسله (ثم روی مرسله) ویروی عن سفیان بن عیینة عن عبد العزیز موصولاً مقیداً باهل العوالی، وفی اسناده ضعف وروی ذالك عن عمر بن عبد العزیز عن النبیؐ مقیداً باهل العالیة الا انه منقطع (ثم ذکره باسناده ثم قال) وروی ذالك باسناد صحیح عن عثمان بن عفانؓ مقیداً باهل العالیة موقوفاً علیه اه (السنن ص۳۱۸ ج ۳)

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے عہد مبارک میں ایک دن میں دو عیدیں جمع ہوگئیں۔ آپؐ نے فرمایا آج عید اور جمعہ جمع ہیں اور ہم تو جمعہ ادا کریں گے، پس جو شخص جمعہ پڑھنا چاہے جمعہ ادا کرے شعبہ وغیرہ نے حدیث موصول روایت کی ہے۔ مگر سفیان ثوری نے عبدالعزیز سے روایت کی تو ارسال کیا ہے مگر سفیان ابن عیینہ نے عبدالعزیز سے موصولاً روایت کیا ہے وہ مقید باہل العوالی ہے مگر

اس کی اسناد میں ضعف ہے اور یہ عمر بن عبدالعزیز سے بھی مروی ہے مگر منقطع ہے۔ پھر اس کو امام شافعیؒ کے طریق سے روایت کیا جسکو میں کتاب الام سے نقل کر چکا ہوں، پھر کہا کہ حضرت عثمان سے باسناد صحیح ثابت ہے کہ انھوں نے اہل عوالی کو رخصت اور اجازت دی، پھر امام بیہقی نے اس کو باسنادہ روایت کیا۔ اس کے بعد پوری حدیث مرفوع حبان بن موسیٰ کے طریق سے بطولہ روایت کی اور آخر میں یہ کہا کہ اس کو بخاری نے اپنی صحیح میں حبان بن موسیٰ سے بطولہ روایت کیا ہے۔

لیکن تعجب ہے کہ حدیث زید بن ارقم کی تخریج امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں کی باوجودیکہ اس میں علت قادحہ موجود ہے کہ ایاس مجہول ہے پھر بھی بیہقی نے اس میں کچھ کلام نہیں کیا اور خاموشی سے گذر گئے اسی بنار پر صاحب جوہر نقی نے تعریضاً یہ کہا کہ :-

لم یذکر البیھقی لھذا الحدیث علۃ ومقتضاہ الاکتفاء بالعید فی ھذا الیوم وسقوط فرضیۃ الجمعۃ وھو مروی عن عطاء ولم یقل بہ الشافعی ولا الجمھور وما روی ان الرخصۃ مقیدۃ باھل العوالی فقد ذکر البیھقی فیما بعد ان اسنادہ ضعیف او منقطع او موقوف فظھر انہ لم یذکر لحدیث ابن ارقم علۃ ولا معارضًا

(جوھر نقی ص ۳۱۸ ج ۳)

بیہقی نے زید بن ارقم کی حدیث کی کوئی علت ذکر نہیں کی جس کا تقاضا یہ ہے کہ اس دن میں عید کی نماز کافی ہے اور جمعہ کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ قول عطار بن ابی رباح سے بھی مروی ہے۔ امام شافعی اور جمہور علمار ائمہ اس کے قائل نہیں ہیں اور یہ روایت کہ رخصت اہل عوالی کے ساتھ مقید ہے تو بیہقی نے بعد میں ذکر کیا ہے کہ اس کی اسناد ضعیف یا منقطع یا موقوف ہے جس سے یہ امر ظاہر ہوگیا کہ ابن ارقم کی حدیث کے لئے نہ کسی علت کو بیہقی نے ذکر کیا نہ کسی معارض کو پیش کیا (حالانکہ اس میں علتِ قادحہ موجود ہے جس کی تفصیل گذر چکی اور جمہور علمار اور ائمہ کا مذہب معلوم ہو چکا کہ وہ سقوط فرضیت جمعہ کے قائل نہیں۔ خود امام شافعیؒ تصریح فرمادی کہ عید کی نماز پڑھ لینے سے جمعہ ساقط نہ ہوگا۔ اس کو پڑھنا پڑے گا۔ ہاں جن پر جمعہ فرض نہیں ہے اجازت ورخصت اُن کے لئے ہے جو حدیثِ عثمانؓ اور مرسل عمر بن عبدالعزیزؒ اور حدیث ابی ہریرہ سے ثابت ہے اور یہ اپنی جگہ پر ثابت شدہ امر ہے کہ جب کسی ایسی حدیث پر علمار امت کا عمل ہو کہ اس میں کچھ ضعف پایا جاتا ہو تو فقہار، محدثین کے عمل سے اس میں قوت پیدا ہوجاتی ہے

اور ضعف جاتا رہتا ہے۔ یہاں تو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بلا نکیر اس پر صحابۂ کرام کا اتفاق ہو چکا ہے۔ جس وقت راوی حدیث ابو ہریرہؓ بھی موجود تھے جس کو خلاف لاحق باطل نہیں کر سکتا۔ قوتِ حدیث ضعیف کی بیسیوں مثالیں جامع ترمذی میں موجود ہیں۔ اکثر مقامات پر قائلین کے نام بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ اس صورتِ حال پر حدیث ابو ہریرہؓ کا ضعف دور ہو کر حدیث قوی قابلِ استدلال ہو گئی۔ (۱)

اس توضیح و تشریح سے یہ واضح ہو گیا کہ شوکانی نے "نیل الاوطار ص۱۶۱ ج ۳" میں حدیث کی تصحیح کی جو نسبت علی بن المدینی کی طرف کی ہے غلط ہے۔ علی ابن المدینی جیسا شخص جبل حدیث جس کے سامنے امام بخاری جیسا شخص یہ کہہ اٹھے "ما استصغرت نفسی الا عند علی بن المدینی" کیسے حدیث ابن ارقم کو صحیح کہہ سکتا ہے جبکہ اس کی اسناد میں ایاس بن ابی رملہ مجہول شخص موجود ہے جس کا اقرار در ہم پیدا ہو گیا کہ ابو موسیٰ المدینی کی تصحیح کو علی بن المدینی کے ذمہ لگا دیا گیا جس کی تفصیل ما سبق میں گذر چکی ہے۔

(باقی آئندہ)

تفہیم القرآن

ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

از ـــــــ جمیل الرحمٰن قاسمی

جماعتِ اسلامی کے تحت پیدا شدہ فتنۂ مودودیت اس دور کا ایک عظیم فتنہ ہے۔ جو کبھی تجدید احیائے دین کے نام سے ابھرا، اور کبھی اقامتِ دین اور حکومتِ صالحہ کے نعرے سے مسلمانوں میں ضلال کے جراثیم کی اشاعت کرنیوالی یہ نقاب پوش جماعت جس وقت میدانِ عمل میں دوڑ بھاگ کرنے لگی اسی وقت اکابر علماء و مشائخ کبار اور ارباب بصیرت نے اس سے نہ صرف اپنی بیزاری کا اظہار فرمایا بلکہ اس کی اصلاح کیلئے اپنی تمام کوششیں صرف کردیں۔ صالحین امت کی ایک جماعت۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ تھانوی، شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنیؒ، قطب العالم حضرت شاہ عبدالقادرؒ رائپوری، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ کاندھلوی، مفتی اعظم مولانا کفایت اللہؒ دہلوی، مفتی پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی، محدث کبیر مولانا الشیخ یوسف البنوریؒ، مفسر قرآن مولانا احمد علیؒ لاہوری، فقیہ الہند مفتی مہدی حسن صاحبؒ شاہجہاں پوری، فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی مدظلہٗ العالی جو دورِ شرف و مجد کے درِ تابندہ اور آسمانِ علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ جن کے خلوص و تقویٰ، جن کی دیانت و امانت اور جن کی سلامتی علم و فہم کی قسم کھائی جاسکتی ہے اور جن کی مقبولیت ان کے اوراق زندگی سے عیاں اور ان کے پیشانی کے آثار و انوار سے واضح ہے سبھی نے اس فتنہ کے ضلال کی نشاندہی فرمادی اور ان حضرات نے اپنے رسوخِ علم، حذاقت و تجربہ اور صفائی باطن کی بدولت اس کو عصرِ حاضر کا سب سے بڑا فتنہ قرار دیا۔

ایک سلیم الطبع انسان جب اس فرقے کی دعوتی کتابیں، اس کے لٹریچر کا سرسری مطالعہ کرتا ہے تو اسے اس جماعت کے نزدیک قرآن کا مطلوب، انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور تخلیقِ انسانی کا عظیم مقصد سوائے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے اور کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی۔

مودودی صاحب کی تمام تصنیفات میں تفہیم القرآن کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی دوسری تصنیف کو حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فرقہ اپنے پیش کردہ مشن کیلئے اس تصنیف کو ایک ایسا بے مثل سرمایہ تصور کرتا ہے جس سے آجتک اس امت کا دامن خالی رہا ہے۔ قرآنی آیات کی ایسی تفسیر کی گئی ہے جس سے ملت کی چودہ سو سالہ تاریخ شرما گئی۔ قلم کی گلکاریوں میں ایسا گم ہوئے کہ حقیقت کا حسن کھو بیٹھے۔ اپنے دعوتی نقطۂ نظر کیلئے ایسا مجبور ہوئے کہ آیتوں کو اپنے گرد گھما دیا۔ اور تفسیر بالرائے کرنے سے ذرا بھی نہ جھجکے۔ قرآن فہمی کیلئے سب سے پہلے انھوں نے چار لفظوں الٰہ، رب عبادت اور دین کو قرآن کی بنیادی اصطلاح قرار دی اور ایک طے شدہ مقصد کے تحت ان الفاظ کی ایسی تشریح کی جس سے مزعومہ پہلو اجاگر ہو سکے، خواہ ان کی تفسیر سے صحابۂ کرام کے اقوال ٹکرائیں یا متقدمین کی تمام تفسیروں پر خط تنسیخ کھینچ جائے۔ ظاہر ہے کسی بھی طبع زاد نظریئے کو سامنے رکھکر قرآن کی تفسیر کرنا، اور اس تفسیر کو نہ صرف قرآن کی روح ثابت کرنا بلکہ یہ دعویٰ کرنا کہ زمانۂ نبوی علیہ السلام کے بعد اتنیک لوگ اس حقیقت سے ناآشنا رہے۔ کتنا ادعائے باطل ہے۔ پیش نظر مضمون میں مودودی صاحب کی اس اہم تصنیف تفہیم القرآن کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جو موصوف کی تفسیری من مانی اور تفسیر بالرائے کے مذموم چہرے سے نقاب کشائی کرتا ہے۔ اور ہر قاری کو یہ جاننے میں مدد ملے گی کہ مودودی صاحب تفسیر جیسے محتاط اور عظیم الشان کام میں اپنے آپ کو صراط مستقیم پر کہاں تک ثابت قدم رکھ سکے ہیں؟ پیش نظر مضمون کی ابتدا علم تفسیر کی تعریف، اسکے شرائط اور تفسیر بالرائے کی اصولی بحث سے ہوتی ہے۔ درمیان میں مودودی فرقہ کا نقطہ نظر اور اسی نقطۂ نظر کے تحت قرآنی آیات کی تفسیر دکھلائی گئی ہے۔ جو قرآن کے معنوی انحراف کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے۔

علم تفسیر:-

صاحب بحر المحیط ابو الحیان اندلسی نے تفسیر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

هو علمٌ يبحث فيه عن كيفية النطق بالفاظ القرآن ومدلولاتها احكامها الافرادية والتركيبية ومعانيها التى تحمل عليها حالة التركيب وتمات ذالك،	وہ ایک ایسا علم ہے جسمیں قرآن مجید کے الفاظ کی کیفیت نطق سے الفاظ کے مدلولات، اس کے احکام افرادی و ترکیبی اور اُن کے ان معانی سے جن پر الفاظ بحالت ترکیب محمول کئے جاتے ہیں بحث کی جاتی ہے۔ اور ان کے علاوہ چند اور تتمات بھی ہیں جن سے اس علم میں بحث کی جاتی ہے۔

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی اس قول کو احیاء العلوم للغزالی کی شرح میں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ ابوالحیان کے اس قول میں علم جنس ہے اور اس کے بعد جو قیود آتی ہیں وہ بمنزلہ فصل ہیں چنانچہ یبحث عن کیفیۃ النطق بالفاظ القرآن سے مراد علم قرأت ہے۔ ومدلولاتھا سے مراد انھیں الفاظ قرآن کے مدلولات ہیں اس کا مصداق متنِ علمِ لغت ہے۔ جس کے بغیر الفاظ قرآن کے مدلولات کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ احکامھا الافرادیۃ والترکیبیۃ، اس کیلئے علم تصریف بیان، اور بدیع کی ضرورت ہے۔ معانیھا الخ سے مراد یہ ہے کہ مفسر کو معانی پر الفاظ کی دلالتِ حقیقی اور دلالتِ مجازی سے واقفیت ہو کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ترکیب اپنے ظاہر کے اعتبار سے کسی چیز کی اقتضار کرتی ہے۔ لیکن اس کے لئے کوئی مانع ہوتا ہے تو اب لفظ سے کوئی معنیٔ مجازی مراد لینے پڑتے ہیں۔ پھر آخر میں ابوحیان نے جو تتمات کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ مفسر کو نسخ اور سببِ نزول وغیرہ کا علم ہونا چاہئے۔ تاکہ قرآن میں جو باتیں مبہم ہیں وہ معلوم ہو سکیں۔[1]

علم تفسیر کی مذکورہ تعریف سے یہ بات ذہن نشین ہو گئی ہو گی کہ تفسیر قرآن کا معاملہ ایسا آسان کام نہیں ہے کہ ہرکس وناکس کو طبع آزمائی کی اجازت دیدیجائے۔ خواہ وہ اس کا اہل ہو یا نہ ہو۔ دنیا کے عام قواعد وضوابط کے مطابق اس کے لئے بھی کچھ شرائط واصول ہیں جن پر پورا اترنے کے بعد ہی ایک شخص قرآن مجید میں غور وفکر، تدبر وتامل اور تفہیم وتشریح کا مجاز ہو سکتا ہے۔

شرائط تفسیر! پہلی شرط!

صاحب روح المعانی نے علم تفسیر کیلئے پہلی شرط لغتِ عرب کے جاننے کو قرار دیا ہے۔

الاوّل:- علم اللغۃ لان بہ یعرف شرح مفردات الفاظ ومدلولاتھا بحسب الوضع ولا یکفی الیسر اذ قد یکون اللفظ مشترکاً وھو یعلم احد المعنیین والمراد الآخر فمن لم یکن عالماً بلغات العرب لا یحل لہ التفسیر کما قالہ المجاھد[2]

تفسیر قرآن کیلئے پہلی شرط لغتِ عرب کا جاننا ہے کیونکہ الفاظ مفردہ کی شرح اور ان کے وضعی مراد کو اسی کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے۔ اور پھر اس میں معمولی علم کافی نہ ہوگا کیونکہ بسا اوقات ایک لفظ کئی معنیٰ میں مشترک ہوتا ہے۔ اور یہ صرف ایک ہی معنیٰ کو جانتا ہے جبکہ مراد دوسرا معنیٰ ہیں تو ایسی صورت میں

---

[1] - احیاء العلوم للغزالی ص۱۳۳ ج ۲ بحوالہ فہم قرآن مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ص۲۲

[2] روح المعانی ص۵ جزء اوّل۔

تعیین معنٰی میں دشواری ہوگی۔ لہٰذا جو شخص لغاتِ عرب کا ماہر نہ ہو اسکے لئے تفسیر کی کوئی گنجائش نہیں

گویا لغتِ عرب کے جاننے سے مراد عربی زبان کی صرف اتنی استعداد نہیں ہے کہ کوئی شخص عربی سے اُردو میں یا کسی اور زبان میں ترجمہ کر سکے۔ بلکہ اس کیلئے ذوقِ عربیت کی پختگی ضروری ہے۔ اور حضرت امام شافعیؒ کے بقول جب تک اسمیں کسی عربی عبارت کو عربی کے ہی انداز فہم و تعبیر کے مطابق سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہو گی وہ قرآن مجید کے بلیغ اسلوب بیان اور اس کے مخصوص انداز تعبیر سے واقف نہیں ہو سکے گا۔ اور اسی بنا پر قرآنی مفہوم و مطالب کے بہت سے گوشے اور پہلو ایسے ہوں گے جو اس کی عقل و فہم کی گرفت میں نہ آسکیں گے۔ [1]

دوسری شرط :-

الثانی معرفة الاحکام التی للکلم العربیة من جهة افرادها و ترکیبها و یوخذ ذٰلك من علم النحو [2]

دوسری شرط کلمات عربیہ کے احکام کو مفرد و مرکب ہونے کی حیثیت سے پہچاننا ہے اور اس کا حصول علم نحو سے کیا جاتا ہے۔

تیسری شرط :-

الثالث، علم المعانی والبیان والبدیع یعرف بالاول خواص تراکیب الکلام من جهة افادتها المعنی وبالثانی خواصها من حیث اختلافها و بالثالث وجوه تحسین الکلام وهو الرکن الاقوم واللازم الاعظم فی هٰذا الشان کما لا یخفیٰ ذٰلك عن من ذاق طعم العلوم ولو بطرف اللسان [3]

تیسری شرط علم معانی، بیان اور فن بدیع کا جاننا ہے۔ پہلی چیز سے تو ترکیب کلام کی خاصیتوں کو ان کے افادہ معنٰی کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے اور دوسری چیز یعنی بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترکیب یعنی تعبیر و اسلوب کی تبدیلی سے کن خصوصیات کلام کا علم ہوا۔ اور تیسری چیز سے کلام کے وجوہ تحسین کو پہچانا جاتا ہے اور یہی تیسری شرط کلام عرب میں اہم ترین اور اصل الاصول ہے جس کی حقیقت ایک ادنی ترین علم رکھنے والے پر بھی عیاں ہے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

کسی زبان کے ادب و بلاغت کا ذوق ایک نعمت خداداد ہے تاہم اس کے استوار ہونے میں اس زبان کے علوم صرف و نحو، معانی و بلاغت سے بڑی مدد ملتی ہے۔ جب تک اسلام عرب میں محدود رہا اس وقت تک علوم عربیہ میں سے نہ کوئی علم مدوّن ہوا تھا اور نہ ہی کسی علم کی ضرورت تھی قواعد

---

[1] بحوالہ فہم قرآن [2] روح المعانی ص۵، [3] روح المعانی ص۵، [4] روح المعانی ص۵،

زبان سے بختہ ہیں نہ کہ زبان قواعد سے یہی وجہ ہے کہ عہد صحابہ کرام میں قرآن مجید کی تفسیر کے متعلق اختلاف بہت کم نظر آتا ہے۔ لیکن جب قرآن کی اشاعت عربی نہ جاننے والے ممالک میں ہوئی اور وہ لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے تو اب ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کو قرآن فہمی کے قابل بنانے کیلئے عربیت کے علوم و فنون کو مدوّن کیا جائے۔ چنانچہ صرف و نحو اور دوسرے علوم و فنون کی تدوین عمل میں آئی۔ جب تک معاملہ اہل زبان میں محدود رہا کسی علم و فن کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ لیکن جب اُن سے گذر کر عجمی اقوام تک اس کی رسائی ہوئی تو محض قرآن مجید کو صحیح پڑھنے اور اس کو صحیح سمجھنے کیلئے تمام علوم و فنون کی بنیاد پڑی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کوئی شخص عربیت کے تمام علوم کامل طور پر حاصل نہیں کر لیتا اسے حق نہیں کہ قرآن کی کسی آیت کے متعلق اپنی ذاتی رائے پیش کر سکے۔ اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ خود مریض ہے تو اطباء پر اعتماد کرے اور ان کے تجویز کئے ہوئے نسخہ کو اپنے لئے پیغام شفاء سمجھے

چوتھی شرط:-

الرابع تعیین مبھم وتبیین مجمل وسبب نزول ونسخ ویؤخذ ذالک من علم الحدیث الخ

علم تفسیر کی چوتھی شرط مبہم کی تعیین، مجمل کی توضیح، سبب نزول اور نسخ کا جاننا ہے۔ یہ سب چیزیں علم حدیث سے حاصل کی جاتی ہیں۔

ظاہر ہے ایک مفسر کو علوم حدیث پر جب تک مہارت تامّہ حاصل نہ ہو اس کے لئے قرآن کا افہام و تفہیم نہ صرف یہ کہ دشوار ہے بلکہ ناممکن ہے۔ جن چیزوں کا تذکرہ اس شرط کے ضمن میں ہو رہا ہے وہ سب اسی مبارک علم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس علم کی حفاظت کے سلسلے میں ائمہ حدیث نے جس احتیاط اور جگر سوزی سے کام لیا ہے اس کی نظیر مذاہب عالم کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ محدثین کرام نے الفاظ حدیث کی حفاظت کی۔ اور اسی حفاظت حدیث کے سلسلے میں پچاس سے زیادہ علوم ایجاد اور تجویز کئے۔ جن کی تفصیل اصول حدیث کی کتابوں میں ملتی ہے پھر چونکہ احادیث رجال کے واسطے سے نقل ہوئی ہیں اس لئے جرح و تعدیل کے اصول بھی وضع کئے گئے۔ رجال کے طبقات مقرر ہوئے اور ان کے سوانحی خاکے مرتب کئے گئے اور ایک لاکھ سے زیادہ اشخاص کے کوائف کا ایک ذخیرہ دنیا کے سامنے محفوظ ہو گیا۔

مسلمانوں نے نہ صرف اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کی ایک ایک حرکت و سکون کو جمع کیا بلکہ حدیث و سنّت رسول کی حفاظت کے واسطے ایک لاکھ سے اوپر اشخاص کو زندہ جاوید

بنادیا۔ آج کسی مذہب کے پاس نہ تو ان کی آسمانی کتاب محفوظ ہے۔ اور نہ اُن کے نبی و رسول کی زندگی، صرف مسلمانوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی آسمانی کتاب بھی محفوظ ہے اور ان کے نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا نہ صرف ہر ورق بلکہ ایک ایک سطر محفوظ ہے۔

اب اگر کسی شخص کو حدیث کے اسناد، ان کی صحت، اُن کے رجال اور محدثین عظام کے وضع کردہ اصول پر اعتماد نہ ہو بلکہ ہر چیز کو وہ اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہو تو اُس کے بارے میں کیا خیال کیا جا سکتا ہے کہ تفسیر قرآن کی اس شرط کو پوری کرنے والا ہے؟

حدیث رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں مودودی صاحب کا نقطۂ نظر!!

"یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہئے۔ اس سلسلے میں یہ بات جان لینے کی ہے کہ کسی روایت کے سنداً صحیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا نفس مضمون بھی ہر لحاظ سے صحیح اور جوں کا توں قابل قبول ہو۔" (رسائل و مسائل حصہ دوم ص۱۱)

(بعنوان چند احادیث پر اعتراض اور اس کا جواب)

بخاری و مسلم شریف کی ایک صحیح حدیث پر مودودی صاحب کا جارحانہ قلم ملاحظہ فرمائیں۔

"بدقسمتی سے حدیث کی ایک روایت میں یہ بات آگئی ہے کہ حضرت ابراہیم اپنی زندگی میں تین مرتبہ جھوٹ بولے ہیں۔ ان میں سے ایک جھوٹ" تو یہ ہے (اس کا اشارہ قال بل فعلہ کبیرھم ھذا الخ کی طرف کر رہے ہیں) اور دوسرا جھوٹ سورہ صافات میں حضرت ابراہیمؑ کا قول انی سقیمؑ ہے اور تیسرا "جھوٹ" ان کا اپنی بیوی کو بہن کہنا ہے جس کا ذکر قرآن میں نہیں بلکہ بائبل کتاب پیدائش میں آیا ہے۔ ایک گروہ روایت پرستی میں غلو کر کے اس حد تک پہونچ جاتا ہے کہ اسے بخاری و مسلم کے چند راویوں کی صداقت زیادہ عزیز ہے اور اس بات کی پرواہ نہیں کہ اس ایک نبی پر جھوٹ کا الزام عائد ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ اس ایک روایت کو لیکر پورے ذخیرۂ حدیث پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ساری ہی حدیثوں کو اٹھا کر پھینک دو کیونکہ ان میں ایسی ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ نہ ایک یا چند روایات میں

کسی خرابی کے پائے جانے سے یہ لازم آتا ہے کہ ساری ہی روایات ناقابل اعتماد ہوں اور نہ فن حدیث کے نقطۂ نظر سے کسی روایت کی سند کا مضبوط ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کا متن خواہ کتنا ہی قابل اعتراض ہو مگر اُسے ضرور آنکھیں بند کر کے صحیح مان لیا جائے۔ سند کے قوی اور قابل اعتماد ہونے کے باوجود بہت سے اسباب ایسے ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے ایک متن غلط صورت میں نقل ہو جاتا ہے اور ایسے مضامین پر مشتمل ہوتا ہے جن کی قباحت خود پکار رہی ہوتی ہے کہ یہ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے سند کے ساتھ ساتھ متن کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ اور اگر متن میں واقعی کوئی قباحت ہو تو پھر خواہ مخواہ اس کی صحت پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ حدیث جس میں حضرت ابراہیم کے "تین جھوٹ" بیان کئے گئے ہیں صرف اسی وجہ سے قابل اعتراض نہیں ہے یہ ایک نبی کو جھوٹا قرار دے رہی ہے۔ بلکہ اس بنا پر بھی غلط ہے کہ اس میں جن تین واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تینوں ہی محل نظر ہیں۔ ان میں سے ایک "جھوٹ" کا حال ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ کوئی معمولی عقل و خرد کا آدمی بھی اس سیاق و سباق میں حضرت ابراہیم کے اس قول (بل فعلہ کبیرھم ھذا) پر لفظ جھوٹ کا اطلاق نہیں کر سکتا، کجا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معاذ اللہ اس سخن ناشناسی کی توقع کریں (یا انی سقیم) والا واقعہ تو اس کا جھوٹ ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ حضرت ابراہیم فی الواقع اس وقت بالکل صحیح و تندرست تھے اور کوئی ادنیٰ سی شکایت بھی ان کو نہ تھی۔ یہ بات نہ قرآن میں کہیں بیان ہوئی ہے اور نہ اس زیر بحث روایت کے سوا کسی دوسری معتبر روایت میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اب رہ جاتا ہے بیوی کو بہن قرار دینے کا واقعہ تو وہ بجائے خود ایسا مہمل ہے کہ ایک شخص اس کو سنتے ہی یہ کہہ دے گا کہ یہ ہرگز واقعہ نہیں ہو سکتا۔ قصہ اس وقت کا بتایا جاتا ہے جب حضرت ابراہیم اپنی بیوی سارہ کے ساتھ مصر گئے ہیں۔ بائبل کی رو سے اس وقت حضرت ابراہیم کی عمر ۷۵ اور حضرت سارہ کی عمر ۶۵ برس سے کچھ زیادہ ہی تھی اور اس عمر میں حضرت ابراہیم کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ شاہ مصر اس خوبصورت

خاتون کو حاصل کرنے کی خاطر مجھے قتل کر دے گا۔ چنانچہ وہ بیوی سے کہتے ہیں کہ جب مصری تمہیں پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے جانے لگیں تو تم بھی مجھے اپنا بھائی بتانا اور میں بھی تمہیں اپنی بہن بتاؤں گا۔ تاکہ میری جان تو بچ سکے (پیدائش باب ۱۲) حدیث کی زیر بحث روایت میں تیسرے "جھوٹ" کی بنیاد اسی صریح لغو اور مہمل اسرائیلی روایت پر ہے۔ کیا یہ کوئی معقول بات ہے کہ جس حدیث کا متن ایسی باتوں پر مشتمل ہو اس کو بھی ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے پر صرف اس لئے اصرار کریں کہ اس کی سند مجروح نہیں ہے؟ اسی طرح کی افراط پسندیاں پھر معاملے کو بگاڑ کر اس تفریط تک نوبت پہونچا دیتی ہیں جس کا مظاہرہ منکرین حدیث کر رہے ہیں۔" (تفہیم القرآن سورہ انبیاء ص ۱۶۸ تا ۱۶۷ ج ۳ حاشیہ ۶۰)

کتنی معصوم بدقسمتی ہے مودودی صاحب کی کہ انھوں نے جب اپنی عقل کی کسوٹی پر اس حدیث کو پرکھا تو پوری نہ اتر سکی۔ اور بڑی بیباکی سے یہ قاعدہ گھڑ لیا کہ کسی روایت کے سنداً صحیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ نفس مضمون بھی ہر لحاظ سے صحیح ہو"

تعجب ہے وہ کتاب جو علماء امت کے نزدیک اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ مودودی صاحب کا اس پر اعتماد تو نہ رہا۔ اور بائبل جس کے محرّف ہونے کی شہادت خود قرآن نے دی اس پر اس درجہ اعتماد باقی ہے کہ صحیح احادیث کے پرکھنے کا معیار اس کو مقرر کیا۔ زیر بحث حدیث کے تیسرے واقعہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔" اور رہ جاتا ہے بیوی کو بہن قرار دینے کا واقعہ تو وہ بجائے خود ایسا مہمل ہے کہ ایک شخص اس کو سنتے ہی یہ کہہ دے گا کہ یہ ہرگز واقعہ نہیں ہو سکتا۔ قصہ اس وقت کا بتایا جاتا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سارہ کے ساتھ مصر گئے ہیں بائبل کی رو سے اس وقت حضرت ابراہیم کی عمر ۷۵ اور حضرت سارہ کی عمر ۶۵ برس سے کچھ زیادہ ہی تھی الخ۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "حدیث کی زیر بحث روایت میں تیسرے جھوٹ کی بنیاد اسی صریح لغو اور مہمل اسرائیلیت پر ہے۔"

غور فرمایئے اس واقعہ میں کونسی بات لغو اور مہمل ہے کیا اہل عقل کے نزدیک زوجیت اور اختیت میں کوئی منافات ہے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ رشتہ کی بہن بھی ہوں اور زوجہ بھی؟ کیا اخوت اسلامی کے ناطے بہن کہنے کی چنداں گنجائش نہیں ہے؟ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

نے انّك لعلیٰ خلق عظیم فی کتاب اللہ سے ظاہر فرما دیا ہے۔ کیا اس عمر کے پہونچ جانے کے بعد حسن جمال میں فرق نہ آنا بعید از قیاس ہے۔

حدیث ثلاث کذبات اور حضرات محدثین کا نقطۂ نظر!!

اس بخاری شریف کی حدیث میں بصراحت تین کذب تبلائے گئے ہیں۔ پہلا واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو کسی مجمع میں شرکت کی دعوت دی گئی تو ستاروں کیطرف دیکھکر فرمایا ارشاد ہے۔

فنظر نظرۃ فی النجوم فقال انی سقیم ؁ سو ابراہیم نے ستاروں کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا۔ اور کہہ دیا میں بیمار ہونے کو ہوں۔

لوگوں نے انھیں معذور سمجھا اور انھیں یقین اسلئے آگیا کہ حضرت ابراہیم نے ستاروں کو دیکھنے کے بعد ایسا فرمایا تھا۔ انھوں نے سمجھا کہ علم نجوم کی رو سے ابراہیم ایسا فرمارہے ہیں اور وہ لوگ نجوم پر اعتقاد رکھتے تھے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب لوگ چلے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بتخانہ تشریف لے گئے اور بتوں سے مخاطب ہوکر فرمانے لگے۔ تم کھاتے اور بولتے کیوں نہیں؟ جب کوئی جواب نہ ملا اور نہ ایسا ممکن ہی تھا تو حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے توڑ پھوڑ شروع کردی اور اس کام سے نمٹ کر تبر بڑے بت کے کاندھے پر رکھ دیا۔ جب وہ لوگ فارغ ہوکر معبودانِ باطل کے حضور پہونچے دیکھا معاملہ خراب ہوچکا ہے اور معبودین ٹکڑے ٹکڑے ہوئے پڑے ہیں تو عالم بدحواسی میں بے ساختہ یہ کلمات زبان پر آئے۔

مَن فعل ھذا بآلھتنا پ۱۷ ع ۵ یہ ہمارے بتوں کے ساتھ کس نے کیا ہے؟

اس پر قوم کے بعض افراد نے جن کے کانوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہ الفاظ وتاللہ لاکیدن اصنامکم بعد ان تولوا مدبرین (پ۱۷ ع ۵) اور خدا کی قسم میں تمہارے ان بتوں کی گت بناؤں گا جب تم چلے جاؤ گے۔

پہونچ چکے تھے بتوں کا یہ حال دیکھکر آپسمیں کہا ہو نہو یہ حرکت تو ابراہیم کی معلوم ہوتی ہے اس کو حاضر کرکے تفتیش کی جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام حاضر کئے گئے اور پوچھا گیا۔

ءانت فعلت ھذا بآلھتنا یا ابراھیم پ۱۷ رکوع ۵ کیا ہمارے بتوں کے ساتھ تم نے یہ حرکت کی ہے اے ابراہیم؟

توحضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا -

بل فعلہ کبیرھم ھذا فاسئلوھم ان کانوا ینطقون پ ۱۷ ع ۵

نہیں، بلکہ ان کے اس بڑے نے کی سوان سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں -

اشکال یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ فرمانا بھی خلاف واقعہ تھا -

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو باپ نے خفا ہو کر گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور یہ کہا کہ میں تمہیں سنگسار کر دوں گا جس کو قرآن کریم میں ان آیات میں بیان کیا گیا ہے -

قال اراغب انت عن الھتی یا ابراھیم لئن لم تنتہ لارجمنک واھجرنی ملیا قال سلٰم علیک ساستغفرلک ربی انہ کان بی حفیا پ ۱۶ ع ۶ -

باپ نے کہا کیا تم میرے معبودوں سے پھرے ہوئے ہو اے ابراہیم اگر تم باز نہ آئے تو میں ضرور تم کو مارے پتھروں کے سنگسار کروں گا - اور ہمیشہ کیلئے مجھ سے برکنار رہو - کہا میرا اسلام لو - میں تیرے لئے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا بیشک وہ مجھ پر مہربان ہے

باپ سے رخصت ہو کر جب روانہ ہوئے تو ان کی بیوی سارہ ساتھ تھیں - راہ میں ایک ظالم اور جابر حکمراں کی حکومت تھی اور اس کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی خوبصورت عورت مرد کے ساتھ اس کی قلمرو سے گذرتی تو وہ مرد و عورت دونوں کو گرفتار کرا لیتا تھا اور اگر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساتھ چلنے والا مرد اس کا شوہر ہے تو اُسے قتل کرا دیتا اور عورت کو اپنے تصرف میں لاتا اور اگر شوہر نہ ہوتا تو اُسے قتل نہ کرتا - حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کا یہ قانون معلوم تھا - جب اس مقام پر پہونچے اور حکومت کی طرف سے ان کو روک کر حاضری کا حکم دیا گیا تو حضرت ابراہیمؑ نے وہاں پہونچ کر حضرت سارہ کو اپنی بہن ظاہر کیا اور واپس آکر حضرت سارہ کو بھی صورت حال سے مطلع فرما دیا - حدیث پاک میں اس قصے کو ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے -

وقال بینا ھو ذات یوم و سارۃ اذ اتی علی جبار من الجبابرۃ فقیل لہ ان ھھنا رجلا معہ امرأۃ من احسن الناس فارسل الیہ فسألہ عنھا فقال من ھذہ قال اختی فاتی سارۃ فقال یا سارۃ لیس علی وجہ

اور فرمایا - اس اثنار میں جب ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سارہ جا رہے تھے کہ اچانک ان کا گذر ایک ظالم بادشاہ سے ہوا - اس کو بتلایا گیا کہ یہاں ایک مرد ہے اس کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت عورت ہے اس نے

الارض مومن غیری وغیرك وان هذا سألنی فاخبرته انك اختی فلا تكذبینی (بخاری شریف صـ۴۷۴ ج۱)

ان کے پاس قاصد بھیج دیا اور سارہ کے بارے میں دریافت کیا۔ اور پوچھا یہ کون ہے؟ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا میری بہن ہے۔ پھر حضرت ابراہیم سارہ کے پاس آئے اور فرمایا۔ سارہ روئے زمین پر میرے اور تمہارے علاوہ کوئی مومن نہیں ہے اور اس انسان نے مجھ سے سوال کیا تھا تو میں نے یہ بتایا کہ تم میری بہن ہو۔ پس تم میری تکذیب نہ کرنا۔

اس واقعہ میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں: ایک تو یہ کہ حضرت ابراہیمؑ خود غلط بتلا کر آئے ہیں اور پھر حضرت سارہ کو بھی اس غلط بیانی کی تلقین فرمارہے ہیں۔ بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب یہ تین کذب منسوب ہیں۔

حضرات محدثین نے ان تمام چیزوں پر کذب کا اطلاق صورت کے اعتبار سے کیا ہے حقیقت کے لحاظ سے نہیں۔ یہ تینوں چیزیں از قبیل معاریض ہیں جن کو توریہ کہا جاتا ہے اور توریہ کا کذب سے کوئی واسطہ نہیں۔

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اگر کذب کا الزام آسکتا ہے تو صرف ان ہی واقعات کی بنا پر آسکتا ہے۔ اور یہ کذب نہیں ہے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دامن کذب سے بالکل پاک و صاف ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں اس کی تشریح اس طرح موجود ہے

ثنتین منهن فی ذات الله (بخاری صـ۴۷۴ ج۱) دو ان میں سے اللہ کے واسطے ہیں

سب کچھ خداوند قدوس کیلئے کیا ہے۔ اس میں اپنی ذات کیلئے کچھ نہیں ہے۔ اور ایسا فعل جس میں صرف خداوند قدوس کی ذات مقصود ہو۔ عبادت شمار ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ اس میں کذب کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ جسمانی امراض میں سقم کا انحصار نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے معنیٰ قریب کو چھوڑ کر معنیٰ بعید یعنی سقم روحانی کو بطور توریہ استعمال فرمایا۔

دوسری بات یعنی بل فعله کبیرهم کی حقیقت بھی وہی فی ذات اللہ ہے اور اس میں شائبہ کذب نہیں ہے۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے لطیف توریہ فرمایا ہے کیونکہ آپ یہ فرمارہے ہیں کہ اُن کے بڑے نے کیا ہے۔ بظاہر اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنے معبودین زخم خوردہ سے پوچھو اس بڑے بُت سے پوچھو۔ لیکن اس کے یہ معنیٰ بھی ہوسکتے ہیں کہ ہاں میں کہتا ہوں بلکہ جو اُن کا

بڑا ہے اس نے کیا ہے ۔ یہ زخم خوردہ معبودین اس کی شہادت دیں گے اگر یہ بول سکتے ہیں تو ان سے پوچھا جائے مجھ سے سوال کرنے کا حق کیا ہے؛ مطلب یہ ہے کہ میں نے کیا ہے اب تم سے جو کچھ ہو سکے کر لو ۔ جو تمہارے الٰہ سے خوف نہ کرتا ہو وہ تم سے کیا خوف کرے گا ۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے زبردست چیلنج ہے ۔ اور کافروں پر اتمام حجت کر رہے ہیں اور صاف فرما رہے ہیں ۔

قال افتعبدون من دون الله ما لا ینفعکم شیئا ولا یضرکم اف لکم ولما تعبدون من دون الله افلا تعقلون ۔

(پ ۱۷ ، رکوع ۵)

ابراہیمؑ نے فرمایا کہ تو کیا خدا کو چھوڑ کر تم ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہونچا سکے اور نہ کچھ نقصان پہونچا سکے ۔ تف ہے تم پر اور ان پر جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو کیا تم نہیں سمجھتے ؟

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

تیسرا کذب یعنی جس میں اپنی رفیقۂ حیات حضرت سارہ کو اپنی بہن ظاہر فرمایا تھا ۔ سو اہل عقل کے نزدیک تو زوجیت اور اختیت میں کوئی منافات نہیں ہے ۔ یعنی رشتہ کی بہن بھی ہوں اور زوجہ بھی ہوں چنانچہ حضرت سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چچا زاد بہن بھی ہیں ۔ یعنی ہاران اکبر کی صاحبزادی ہیں جو کہ آپ کے چچا تھے اور زوجہ بھی ایک تو نسبی رشتہ ہے اور دوسرا رشتہ اسلامی اخوت کا ہے جس کو خود حضرت ابراہیمؑ نے انك اختی فی کتاب الله سے ظاہر فرمایا ہے ۔

بہر حال ان تینوں چیزوں پر کذب کا اطلاق الزام کے طور پر نہیں ہے بلکہ اظہار برأت اور نزاہت کیلئے ہے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دامن تقدس کذب سے پاک وصاف ہے ان کے یہاں جھوٹ کا کیا کام ہے ۔ لے دے کے ان کی زندگی میں تین چیزیں ایسی نکلتی ہیں جنھیں بنظر سرسری کذب کہا جا سکتا ہے ۔ مگر وہ بھی کذب نہیں ۔

(ایضاح البخاری جزء ۳ ص ۲۵۳ تا ۲۵۸ ملخصاً)

احادیث پاک سے بے اعتمادی کا کھلا ہوا اعلان !

مودودی صاحب نے تفہیمات میں بعنوانِ مسلکِ اعتدال ایک طویل مضمون تحریر فرمایا ہے جس کا تراشا ہدیہ ناظرین کیا جا رہا ہے ۔ مضمون کی ابتدا میں مودودی صاحب نے منکرین حدیث کا تذکرہ کیا ہے ۔ پھر اس کے بعد احادیث کے پورے ذخیرے کو بے اعتمادی ، شکوک وشبہات کی

ڈگری میں ڈھالنے کے لئے بڑی جدوجہد فرمائی ہے لکھتے ہیں۔

"یہ تو اس گروہ کے متعلق تھا جو احادیث کی اصولی طینت کی بنا پر انھیں بالکلیہ رد کر دینا چاہتا ہے۔ اب دوسرے گروہ کو لیجئے جو دوسری انتہا کی طرف چلا گیا ہے۔ یہ لوگ محدثین کی اتباع میں جائز حد سے بھی زیادہ تشدد اختیار کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک ایک حدیث کو چھانٹ کر وہ بتا چکے ہیں کہ کون کس حد تک قابل اعتبار ہے اور کون کس حد تک ناقابل اعتبار۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیئے ہیں۔ انھیں کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور حجیت کا مرتبہ دیں۔ مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلے میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں جسے وہ صحیح قرار دے گئے ہیں اسے صحیح تسلیم کریں اور جس کی صحت میں وہ قدح کر گئے ہیں۔ اس سے بالکل استناد نہ کریں۔ ان کے معروف کو معروف ان کے منکر کو منکر مانیں۔ رواۃ کے عدل وضبط اور ثقاہت کے متعلق جن جن آراء کا وہ اظہار کر گئے ہیں۔ ان پر گویا ایمان لے آئیں۔ ان کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار ہے ٹھیک اسی معیار کی ہم بھی پابندی کریں مثلاً مشہور کو شاذ پر، مرفوع کو مرسل پر اور مسلسل کو منقطع پر لازماً ترجیح دیں اور ان کی کھینچی ہوئی حد سے ایک سر مو تجاوز نہ کریں۔ یہی وہ مسلک ہے جس کی شدت نے بہت سے کم علم لوگوں کو حدیث کی کلی مخالفت یعنی دوسری انتہا کی طرف دھکیل دیا ہے۔"

"محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلم کہ نقد حدیث کیلئے جو مواد انھوں نے فراہم کیا ہے وہ صدر اوّل کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس میں ہے کہ کلیۃً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کیلئے جو حدیں فطرۃً اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے۔ مزید براں یہ ظن غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت تھا نہ کہ بلحاظ درایت، ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع نہ تھا۔ اسلئے فقیہانہ نقطۂ نظر سے احادیث سے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے۔ بس اُن کے کمالات کا جائز اعتراف

کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ بھی تحقیقات انھوں نے کی ہیں اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں ایک بلحاظ اسناد اور دوسری بلحاظ تفقہ۔ اس مطلب کی توضیح کے لئے ہم ان دونوں حیثیتوں کے نقائص پر تھوڑا سا کلام کریں گے۔

کسی روایت کے جانچنے میں سب سے پہلے جس چیز کی تحقیق کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ روایت جن لوگوں کے واسطے سے آئی ہے وہ کیسے لوگ ہیں اس سلسلے میں متعدد حیثیات سے ایک ایک راوی کی جانچ کی جاتی ہے۔ وہ جھوٹا تو نہیں ہے؟ روایتیں بیان کرنے میں غیر محتاط تو نہیں؟ فاسق اور بدعقیدہ تو نہیں؟ وہمی یا ضعیف الحفظ تو نہیں؟ مجہول الحال یا معروف الحال؟ ان تمام حیثیات سے رواۃ کے احوال کی جانچ پڑتال کرکے محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے مگر ان میں کونسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو؟ اول تو رواۃ کی سیرت اور ان کے حافظہ اور اُن کی دوسری باطنی خصوصیات کے متعلق بالکل صحیح علم حاصل ہونا مشکل۔ دوسرے خود وہ لوگ جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے۔ انسانی کمزوریوں سے مبرّا نہ تھے۔ نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں اُن کے ذاتی رجحانات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔ یہ امکان محض امکانِ عقلی نہیں ہے بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ بارہا یہ امکان فعل میں آگیا ہے[1]"

پھر آگے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں۔

"یہ تو فن رجال کا معاملہ ہے اس کے بعد دوسری اہم چیز سلسلہ اسناد ہے۔ محدثین نے ایک ایک حدیث کے متعلق یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے آیا وہ اس کا ہمعصر تھا یا نہیں۔ ہمعصر تھا تو اس سے ملا بھی تھا یا نہیں۔ اور ملا تھا تو آیا اسی نے یہ خاص حدیث خود اس سے سنی یا کسی اور سے سن لی؟ اور اس کا حوالہ نہیں دیا۔ ان سب چیزوں کی تحقیق انھوں نے اسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے، مگر لازم نہیں کہ ہر روایت کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہوگئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو۔ اور انھیں یہ نہ معلوم ہو کہ بیچ میں کوئی ایسا مجہول الحال راوی چھوٹ گیا ہے جو ثقہ نہ تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو روایتیں مرسل یا متصل یا منقطع ہیں اور اس بناء پر پایۂ اعتبار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں ان میں سے بعض ثقہ راویوں سے آئی ہوں اور بالکل صحیح ہوں (باقی ملاحظہ ہو)

---

[1] تفہیمات مولانا مودودی شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی دارالعلوم پٹھان کوٹ۔ جلد چہارم بعد نظر ثانی [illegible]

از مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے گرامی

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک بےنظیر تھی، آپ کے یہ اسماء بھی بے مثل ہی تھے۔ آپ سے پہلے کسی کے ذہن میں ان اسماء کا خطور بھی نہ ہوا تھا حتیٰ کہ جب آپ کی ولادت کا زمانہ نزدیک آگیا، کاہنوں، منجموں اور اہل کتاب نے نام لے لیکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارتیں دیں تو لوگوں نے اس نبی منتظر کی طمع میں اپنی اولاد کے نام محمد و احمد رکھے تھے۔ ان کی کل تعداد چھ تک ہے۔ ساتواں کوئی شخص ثابت نہیں ہوتا۔ سہیلیؒ صرف تین ہی کے نام بتلاتے ہیں۔

(۱) محمد بن سفیان بن مجاشع، (۲) محمد بن احیحۃ بن الحلاج (۳) محمد بن عمران بن ربیعہ

سہیلیؒ سے پہلے ابو عبداللہ بن خالویہ کا خیال بھی یہی تھا۔ حافظ ابن حجرؒ آٹھویں صدی میں جب پھر اس کے درپے ہوئے تو انھوں نے ان کی تعداد بیس ۲۰ تک پہنچادی اور تکرار و اوہام حذف کرنے کے بعد منقح تعداد پندرہ ۱۵ قرار دی جس میں سب سے زیادہ مشہور محمد بن عدی بن ربیعہ ہیں ان کا واقعہ بغوی، ابن سعد، ابن شاہین اور ابن السکن وغیرہم نے اس طرح بیان کیا ہے۔

کہ خلیفہ بن عبداللہ نے محمد بن عدی سے پوچھا تمہارے والد نے تمہارا نام زمانہ جاہلیت میں محمد کیسے رکھ دیا۔ انھوں نے جواب دیا اس کے متعلق جیسا تم نے مجھ سے پوچھا ہے ایسا ہی میں نے اپنے والد سے پوچھا تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ میں قبیلہ بنی تمیم کے تین اور شخصوں کے ہمراہ ابن حنفیہ غسانی کی ملاقات کے لئے ایک مرتبہ شام کی طرف روانہ ہوا۔ ہم ایک ایسے چشمہ پر جا کر اترے جو گرجا کے قریب تھا۔ گرجا کا منتظم ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا ایک نبی مبعوث ہونیوالے ہیں

تم دونوں ڈکر ان کو قبول کر لینا، ہم نے کہا اُن کا نام ؟ اس نے کہا ان کا نام محمد ہوگا
جب اس سفر سے ہم واپس آئے تو اتفاقاً ہم سب کے یہاں لڑکے پیدا ہوئے
اور اس لئے ہم سب نے اپنے اپنے لڑکوں کا نام محمدؐ رکھ دیا۔"

اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ نے اور اشخاص کے نام بھی بہ تفصیل تحریر کئے ہیں دیکھو!
فتح الباری باب اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ حافظ سہیلیؒ فرماتے ہیں کہ تورات میں آپ کا جو اسم مبارک مذکور ہے وہ احمد ہے مگر حافظ ابن قیمؒ اس رائے سے متفق نہیں۔ وہ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ تورات میں آپؐ کی آمد کی پیشگوئی اسم محمدؐ کے ساتھ بھی صاف موجود ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن قیمؒ اسم "محمد" کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ محمد وہ ہے جس میں بکثرت تعریف کے اوصاف پائے جائیں۔ محمود بھی اسم مفعول کا صیغہ ہے مگر جو مبالغہ باب تفعیل میں ہوتا ہے وہ ثلاثی مجرد میں نہیں ہوتا، اس لئے محمدؐ، محمود سے زیادہ بلیغ ہے محمدؐ اس کو کہتے ہیں جس کی اتنی تعریف کی جائے جتنی کسی اور بشر کی نہ کی جائے۔ اسی لئے تورات میں آپؐ کا نام محمدؐ ہی ذکر کیا گیا ہے کیونکہ آپؐ کے اوصاف حمیدہ آپؐ کی امت اور آپ کے دین کے فضائل و کمالات کا اتنی کثرت سے اس میں ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ و السلام جیسے اولوالعزم رسولؑ کو بھی آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہونے کی آرزو ہونے لگی۔

احمد:۔ یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے، اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنیٰ میں مستعمل ہو سکتا ہے پہلی صورت میں اس کے معنیٰ ہیں " **احمد الحامدین لربہٖ**" یعنی تمام تعریف کرنے والوں میں اپنے پروردگار کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا۔ دوسری صورت میں اس کے معنی ہیں " **احق الناس واولاھم بان یحمد**" تمام لوگوں میں سب سے زیادہ تعریف کے قابل اور ثناء کا مستحق اس بناء پر محمد و احمد میں فرق یہ رہے گا کہ محمدؐ وہ ہے جس کی تعریف اپنے اوصافِ جمیلہ کی وجہ سے سب سے زیادہ کی جائے اور احمد وہ ہے جس کی تعریف سب سے بہتر اور عمدہ کی جائے۔ پس محمد بلحاظ کمیت ہے اور احمد بلحاظ کیفیت۔

دونوں ناموں کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ اپنے خلق و خصائل کی وجہ سے اس کے مستحق ہیں کہ سب سے زیادہ اور سب سے کامل تعریف آپ کی ہو۔ اس تحقیق کے بعد ان دونوں مفہوموں کے لحاظ سے سطح عالم پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اسماء جتنی حقیقت اور جتنی صداقت کے ساتھ آپؐ کی ذاتِ مبارک پر چسپاں ہیں اتنے کسی اور پر نہیں اگر یہاں اسم تفضیل کو اسم مفعول کے معنیٰ میں لیجئے

تو خالق سے مخلوق تک انبیاء علیہم السلام سے لیکر جن و ملک تک حیوانات سے لیکر جمادات تک غرض ہر ذی روح اور غیر ذی روح سب ہی نے آپؐ کی تعریفیں کی ہیں اور آج بھی اربوں انسانوں کی زبانیں دن میں نہ معلوم کتنی بار آپ کی تعریف کے لیے متحرک رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ کفار میں بھی ایک معقول طبقہ ایسا ہے جو اگرچہ آپؐ کا دین تسلیم نہیں کرتا۔ مگر آپؐ کی دیانت، عدل و انصاف، صداقت و راستبازی ہوش و خرد کا ثنا خواں ہے۔ اسلئے اگر اپنے خیال میں آپ ذرا علیحدہ ہو کر ازل سے ابد تک کی دنیا کی طرف کان لگائیں تو جس کی سب سے زیادہ اور سب سے بہتر تعریف آپ کے کان سنیں گے وہ مبارک ہستی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ہوگی۔

نہ دانم آں گل رعنا چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغ ہر چمنے گفتگوئے او دارد

اس لئے محمد یا احمد (بمعنیٰ اسم مفعول) نام کی مستحق جتنی کہ آپ کی ذات ہو سکتی ہے اتنی کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر احمد کو اسم فاعل کے معنیٰ میں لیجئے تو بھی اسم مبارک کی سب سے زیادہ مستحق آپؐ ہی کی ذات پاک ہے۔ کیونکہ جس قدر خدا کی تعریف آپؐ نے کی ہے۔ اتنی کسی بشر نے نہیں کی اور اسی طرح اپنی امت کو بھی موقعہ بموقعہ خدا کی اتنی حمد سکھائی کہ کتب مقدسہ میں اس امت کا لقب ہی حمادون پڑ گیا۔ یعنی خدا کی بہت تعریف کرنے والی امت

صحیحین میں ہے کہ محشر میں جب شفاعت کے لئے آپ تشریف لے جائیں گے تو آپ پر خدا کی حمد و ثنا کا دروازہ کھولا جائے گا جو اس سے پیشتر کسی پر نہیں کھولا گیا تھا۔ پس سب انبیاء تو حماد ہیں اور ان حمادوں میں آپؐ احمد ہیں۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ پہلے آپ احمد تھے پھر محمدؐ ہوئے کیونکہ سب سے پہلے آپؐ نے خدا کی تعریف کی۔ پھر آپؐ کے بعد مخلوق نے آپ کی تعریف کی۔ اسی طرح محشر میں سب سے پہلے آپ ہی خدا کی حمد کریں گے۔ جب آپ کی سفارش سے حساب شروع ہو جائے گا تو پھر اہل محشر آپ کی حمد کریں گے۔ اس لئے آپ پہلے احمد ہیں اور بعد میں محمدؐ۔ بلحاظ وجود بھی پہلے آپ احمد ہیں اور بعد میں محمدؐ۔ اسی وجہ سے کتب سابقہ میں آپؐ کی بشارت اسم احمد سے مذکور ہے اور جب عالم وجود میں تشریف لے آئے تو محمدؐ کے نام سے پکارے گئے۔

خلاصہ یہ کہ احمد بمعنی محمدؐ ہو یا بمعنیٰ احمد الحامدین یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ حمد کو ہر پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت بڑی خصوصیت حاصل ہے۔ اسی بنا پر سورۃ الحمد

خصکر آپ کو ہی بعثت ہوئی (آپ کی ہی امت کا لقب عالمون ہوا اور محشر میں لواء الحمد (حمد کا جھنڈا) بھی آپ کے ہی ہاتھوں میں ہوگا۔ اور آپ کے لئے مخصوص مقام کا نام مقام محمود ہے۔ آپ کی شریعت میں بھی کھانے کے بعد، پینے کے بعد، دعا کے بعد سفر سے واپسی کے بعد غرض بہت سے مختلف مواقع پر خدا کی حمد سکھائی گئی۔

پھر یہ مختلف اور متنوع تعریفیں جب ہر زمانہ میں بے شمار انسانوں کی زبانوں سے ہوئی ہیں وہ درحقیقت آپ ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہیں، اس لئے ان تمام تعریفوں کو بجا طور پر آپ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اب سوچو کہ جتنی خدا کی تعریف فضاء عالم میں آپ کے ذریعہ سے گونجی ہے اور اس کے ساتھ جتنی کثرت کے ساتھ خدا کی غیر متناہی مخلوق نے آپ کی تعریفیں کیں۔ اتنی کسی اور ذات کی نہیں ہوئیں۔ اس لئے احمد و محمد نام پانے کیلئے بھی آپ ہی کی ذات منتخب ہونی چاہئے۔ اسی لئے آپ سے پہلے بھی جس نے یہ نام رکھا آپ کی اتباع میں رکھا اور بعد میں بھی جس نے اس نام کو اختیار کیا آپ ہی کے اتباع میں کیا۔

اللّٰھمّ صلِّ وسلّم وبارک علیہ۔

شیخ اکبرؒ یہاں ایک اور عجیب نکتہ لکھ گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حمد ہمیشہ آخر میں ہوتی ہے۔ جب ہم کھانے کے فارغ ہو لیتے ہیں اور سفر ختم کر کے گھر واپس آتے ہیں تو خدا کی حمد کرتے ہیں۔ اسی طرح جب دنیا کا طویل و عریض سفر ختم کر کے جنت میں داخل ہوں گے تو خدا کی حمد کریں گے۔ واٰخر دعوانا اس دستور کے مطابق مناسب ہے کہ جب سلسلۂ رسالت ختم ہو تو یہاں بھی آخر میں خدا کی حمد ہو۔ اس لئے جو نبی سب سے آخر میں آئے ان کا نام محمدؐ رکھا گیا۔ بیشک جو ذات پاک کہ حسن و خوبی کی تمام رعنائیوں اور زیبائشوں کا مجموعہ ہے اس کے اسماء بھی اسمائی حسن و خوبی کا مجموعہ ہونے چاہئیں۔

(بقیہ صفحہ ۲۷ کا) سے اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو کلیۃً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اسی حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنتِ نبوی اور آثار صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے۔ اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس قابل نہیں کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے (بحوالہ مذکور ص ۲۹۴، ۲۹۵)

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے والا شخص کبھی بھی تفسیر قرآن میں صحیح موقف اختیار نہیں کر سکتا۔ جس جگہ بھی اسے بظاہر عقل سے ٹکرانے والی حدیث نظر آئے گی خواہ وہ سنداً اور متناً کتنی ہی قوی اور مضبوط ہو اس پر بے اعتمادی کی مہر لگا کر اپنی عقل کو امام بنا دے گا۔

نصاب تعلیم و نظام تربیت

از پروفیسر حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی

ہماری دینی تعلیم کا اصل سرمایہ "علوم معاد" ہیں جن کا مبنیٰ و منبع وحی الٰہی اور سینۂ نبوت ہے۔ اور جن کا گنجینہ ہمارے پاس کتاب و حدیث (سنت) کی صورت میں محفوظ ہے۔ اور چونکہ حکمتِ الٰہی نے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دورۂ نبوت قیامت بلکہ ابدالآباد تک ممتد و مستمر فرما دیا ہے اس لئے "کتاب و سنت" کا یہ خزینہ تا قیام قیامت جملہ جن و انس کی ہدایت یابی کا واحد ذریعہ ہے جس میں علوم ہدایت اور طریقۂ ہدایت کو منحصر فرما دیا گیا۔ کتاب و سنت کی اس "امانت" کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت مسلمہ کو الٰہی حفاظت کی ضمانت کے ساتھ سپرد فرما کر تشریف لے گئے اور امت کا عموماً اور علمائے امت کا خصوصاً یہ فریضۂ منصبی قرار دیا گیا کہ "علوم نبوت" کی اس الٰہی امانت کو کمالِ حفاظت و اتقان کے ساتھ دوسروں کی طرف منتقل کرتے رہیں اور "اصل امانت" میں کسی خیانت و کمی بیشی کا ارتکاب نہ ہونے پائے۔ اس اعتبار سے "علوم دینیہ" کے اصل ماخذوں (قرآن و سنت) کو ہر قسم کی تحریف و ترمیم، تغیر و تبدل، تنسیخ و اضافہ سے محفوظ فرما دیا گیا۔ اور ان علوم کی تحصیل کا مقصود منشار الٰہی اور مراد نبوت کو زیادہ سے زیادہ سمجھ کر اس کے افہام و تفہیم، توضیح و تشریح، تعلیم و تعلم، تعمیل و اتباع اور تبلیغ و دعوت قرار پایا۔ امت کے علوم دینیہ کے یہ لامتناہیہ کے ذخائر اسی "تفقہ فی الدین" کے آثار و نتائج ہیں۔ جو علوم قرآنیہ و علوم حدیث علوم فقہ، علوم تصوف و اخلاق، علوم کلامیہ اور دیگر علوم اسلامیہ کی صورت میں ظاہر ہوئے اور انشاء اللہ تا قیامت ہوتے رہیں گے۔ اور دین کی اس امانت کے "انتقال" کے فریضہ کی ادائیگی ہوتی رہے گی۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی حجت بندوں پر پوری ہو

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (الانفال ۴۲)

تاکہ جس کو برباد (گمراہ) ہونا ہے وہ نشان آئے پیچھے برباد ہو اور جس کو زندہ (یعنی ہدایت یافتہ) ہونا ہے وہ بھی نشان آئے پیچھے زندہ ہو۔

(ترجمہ از تفسیر بیان القرآن از حضرت تھانوی)

اور ارشاد نبوت

فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ — تم میں جو حاضر ہیں غائب تک (میرا پیغام) پہنچا دیں۔

(صحیح بخاری باب خطبۃ ایام المنیٰ۔ البدایۃ والنہایہ ج ۵ ص۱۹۳ بحوالہ ترمذی، حدیث حسن صحیح)

کے ارشاد نبوی کی تعمیل ہوتی رہے۔

ظاہر ہے کہ دین ایک اٹمٹ حقیقت اور قرآن وحدیث لازوال وغیر متبدل حقائق ہیں۔ لیکن زمانہ ہر آن تغیر پذیر و انقلابات کا محل ہے، ہر جدید دور کے تقاضے نئے نئے مسائل پیدا کرتے رہتے ہیں۔ انسانی افکار وخیالات بدلتے رہتے ہیں۔ نفسیات میں فرق آجاتا ہے۔ علوم دنیاوی کی ترقیات جدید ایجادات واکتشافات دنیا کا رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ اور ہر جدید ہر قدیم کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور اس تغیر آباد عالم" میں ان لازوال علوم کی امین وحامل امت کو نئے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور علوم نبوت کی محافظ و داعی ہونے کی حیثیت سے ہر زمانہ کے تقاضوں اور اس کی للکار وتحدی (چیلنج) کا مقابلہ اس صورت سے کرنا پڑتا ہے، کہ "اصل علوم نبوت" پر آنچ نہ آنے پائے۔ چنانچہ ہر دور میں اساطین امت نئے زمانے کے تقاضوں کو مدنظر رکھنے کے باوجود تعلیمی خاکوں میں جو رنگ بھرا اور حذف واضافہ، حک وترمیم کا جو عمل بھی اختیار فرمایا۔ انھوں نے اس میں اصل امانت یعنی "منصوص ومنقول" علوم معاد کی لفظاً ومعناً کلی حفاظت کی۔ اور اس کی روح کی بقا کا پورا پورا اہتمام فرمایا۔ اور کسی صورت "علوم نبویہ" کے مقام وحیثیت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ یہ علوم مطاع ومراد ومقصود رہے۔ باقی علوم سے انتفاع ان کے خادم، وسیلہ، مددگار آلہ وذریعہ کی حیثیت سے رہا۔ یعنی اصل علوم دینیہ رہے۔ باقی علوم کی حیثیت ثانوی رہی۔ دوسرے علوم میں تغیر وتبدل ہوتا رہا۔ لیکن اصل اپنی جگہ قائم ودائم رہے کہ۔

گر من وتو ہلاک شویم چہ باک!
کہ اندر ہلاکئ من وتو سلامت اوست

چنانچہ تیسری صدی اور مابعد کے زمانہ میں جب یونانی وہندی، ایرانی علوم تراجم کے ذریعے مسلمانوں میں در آئے اور ان کا ایک طبقہ ان سے متأثر ہونے لگا تو اس کے ازالے کے لئے علمائے امت نے ان علوم کا ازالہ فرما کر "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے اصول کے مطابق فلسفہ ومنطق ودیگر عقلی علوم کو داخل نصاب کر لیا۔ اور پھر ان علوم میں خداداد ذہانتوں سے بیش بہا اضافے کئے۔ حضرت

سید الملۃ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ ارقام فرماتے ہیں ۔ " یہ معقولات کا بے پایاں دفتر جو عربی میں افلاطون وارسطو کے تراجم سے وجود میں آیا تھا ۔ اس کو امام غزالی کی کوششوں نے درس میں شامل کیا تو اس سے دو مقصود تھے ایک یہ کہ معتزلہ اور باطنیہ کی تعلیم واشاعت سے یہ علوم عقلیہ عوام میں رواج پذیر ہو گئے ۔ اور علمائے دین کی طرف سے ان علوم کی ناواقفیت کے سبب سے لوگوں کو بے التفاتی تھی ۔ وہ دور ہو جائے اور دوم یہ کہ جو مذہبی شکوک وشبہات ان کی وجہ سے پھیل رہے تھے ۔ ان کا ازالہ ہو جائے ۔ (معارف ج ۶ ۱۹۵۵ ص ۲۴۳)

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ ہی نے سب سے پہلے فقہ کے خادم کی حیثیت سے اپنی کتاب "المستصفیٰ" میں منطق کا استعمال فرمایا ۔ اور پھر منطق ہماری کتابوں میں سرایت کرتی چلی گئی اس طرح فلسفہ نے علم کلام وتصوف ودیگر علوم میں بار پالیا ۔ اس طرح فلسفہ ومنطق ہمارے دینی نصاب میں داخل ہو گئے ۔ ظاہر ہے کہ دور غزالی سے پہلے بھی دینی علوم تھے جو فلسفہ ومنطق کے بغیر اپنی حیات آفریں تعلیمات سے انسانیت کو زندگی بخش رہے تھے ۔ عوارض زمانہ کی وجہ سے امام غزالی اور دیگر علمائے کرام نے ان علوم عقلیہ کو داخل درس کیا مقصود دین کی خدمت ، حمایت یا لا دینی علوم سے حفاظت تھی ۔ تاہم کسی دور میں بھی علمائے ربانیین نے ان علوم کو بالذات دینی علوم نہیں سمجھا ۔ اور نہ اصل دین کا ان پر مدار جانا ۔ عوارض کی بنا پر ان کی ضرورت مسلم سمجھی گئی ۔ جب بھی وہ عوارض باقی نہیں رہیں گے ۔ ان کی ضرورت نہیں رہے گی ۔ یا جس قدر عوارض کم ہو جائیں گے اسی کے بقدر ان کی ضرورت میں کمی ہو جائے گی ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں فلسفہ ومنطق اور دیگر علوم عقلیہ ومعاش کے نصاب اور کتابوں میں کمی بیشی اور تغیر وتبدل ہوتا رہا ۔ کہ جیسے یہ انسانی علوم ہر دم تغیر پذیر ہیں ۔ اسی طرح ان کے "مادۂ علم ومتن" میں تبدیلی ہوتی رہی ۔ اور آئندہ ہوتی رہے گی ۔ اور یہ ایک فطرتی حقیقت وعملی ضرورت بھی ہے کہ ارتقاء پذیر اور ہر آن متبدل علوم کے نصاب میں تبدیلی ہوتی رہے چنانچہ اہل نظر سے یہ بات مخفی نہیں کہ ہمارا نصاب تعلیم بے شمار مراحل وتغیرات سے گذرا ۔

چونکہ مسلمانوں کے دور عروج میں دینی ودنیاوی تعلیم کی تفریق نہ تھی اور ایک ہی نصاب رائج تھا ۔ اس لئے ہمارا نصاب تعلیم مختلف ادوار ومختلف مقامات میں تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ علوم معاد وعلوم معاش (جس میں علوم عقلیہ بھی شامل تھے) دونوں پر مشتمل تھا

آج سے تقریباً دوسو سال پہلے ملا نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس زمانے کی دینی و دنیاوی ضرورتوں کو دیکھ کر جو نصاب تعلیم مرتب فرمایا۔ اُسے کچھ ایسی مقبولیت نصیب ہوئی کہ ہندو پاک کے اکثر مدارس میں درس نظامی کے نام سے تقریباً وہی نصاب نافذ ہے۔ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ دور جو تغیرات کی شبک رفتاری کا سب سے بڑا دور ہے۔ درس نظامی اپنی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس طرح اصول کے اعتبار سے غالباً اسلامی تاریخ کا معمر ترین نصاب ہے۔ جو تغیر و تبدل کی انقلابی اور بنیادی تبدیلیوں سے محفوظ چلا آرہا ہے۔ علوم دینیہ کی بحث تو علیحدہ ہے لیکن "علوم عقلیہ" کی جو عمارت قائم کردی گئی تھی۔ زمانہ کے علی الرغم وہ انھیں بنیادوں پر مضبوط سے مضبوط تر اور بلند تر ہوتی گئی۔ مثلاً منطق کو لیجئے ملا نظام الدین صاحب نے جو کتابیں نصاب میں رکھی تھیں وہ فقط سلم العلوم ــــ میرزاہد، اور ملا جلال تھیں۔ لیکن حوادث زمانہ کی وجہ سے ان کی تعداد پندرہ[1] تک پہنچ گئی جو کسی نہ کسی صورت میں مختلف مدارس میں رائج ہیں۔

---

[1] علامہ حکیم سید عبدالحئیؒ صاحب نزہۃ الخواطر اپنے رسالہ "ہندوستان کا نصاب درس اور اسکے تغیرات" میں ارقام فرماتے ہیں: "اس زمانے میں جو نصاب رائج ہے، وہ درس نظامیہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے، کیونکہ درس نظامی میں منطق میں مندرجہ ذیل کتابوں کا اضافہ بغیر غور و فکر کے خود بخود ہوگیا ہے۔ غلام یحیی، ملاحسن، حمداللہ، قاضی مبارک اور بعض مقامات پر شرح سلم عبدالعلی بحرالعلوم اور حاشیہ عبدالعلی بر میرزاہد رسالہ، اور کہیں کہیں شرح سلم ملامبین بھی ــ

اس اضافے کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ مولوی محمد فاروق صاحب چڑیاکوٹی اپنے استاذ مفتی محمد یوسف صاحب سے نقل کرتے ہیں کہ اُن کے بچپن میں شرح سلم علی العموم رائج نہیں تھی۔ بلکہ قاضی مبارک کے شاگرد مولوی مدن وغیرہ اپنے شاگردوں کو سلم کے ساتھ شرح مسلم قاضی مبارک بھی پڑھاتے تھے۔ اور ملاحسن کے شاگردوں کو شرح سلم ملاحسن پڑھاتے تھے اور بحرالعلوم کے خاندان میں شرح سلم بحرالعلوم رائج تھی۔ اور احمداللہ کے تلامذہ اپنے استاذ کی شرح پڑھاتے تھے۔ اور پڑھانے میں ایک دوسرے پر نوک جھونک بھی ہوتی رہتی تھی۔ اسلئے ایک دوسرے کی کتاب کا دیکھنا ضروری تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ سب کتابیں درس میں داخل ہوگئیں۔ جن کو ہم اگر کہنا چاہیں تو صحیح طور پر ناخواندہ مہمان یا سبزۂ خودرو سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ (بقیہ بر صفحہ ۳۶)

یہی حال حکمت، ہیئت و فلسفہ اور قدیم ریاضیات کا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس دور میں یہ نصاب تجویز کیا گیا تھا۔ اس دور کی دینی اور دنیوی ضروریات کے لئے کافی تھا۔ اور طلبہ کی استادوں کو جلا بخشتا اور اس دور کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ اور وقت کا مفید نصاب تھا۔ یہ اس کا کمال ہی تو تھا کہ دوسو سال تک بے شمار فقید المثال نابغۂ روزگار علمی شخصیتوں کو پیدا کرتا رہا۔ اور اب بھی اگر زمانے کے اثرات و ضرورتوں نے نئے تقاضے پیدا نہ کر دیئے ہوتے اور اساتذہ و طلبہ تک کا رنگ نہ بدل گیا ہوتا۔ تو اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن دور حاضر نے بے شمار نئے تقاضے پیدا کر دیئے۔ طبیعتوں میں انقلاب آگیا۔ اذواق اور افکار بدل گئے۔ نئے علوم، نئی معلومات، نئی طبیعیات، جدید ریاضیات جدید اکتشافات و ایجادات نے فکر و نظر میں تبدیلی پیدا کر دی اور دنیا کا رنگ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ بقول سید الملۃ رحؒ

"اب یورپ کے اثر سے دنیا میں انقلاب آگیا ہے۔ یونانی علوم عقلیہ کا چہ بچہ اب سمندر بن گیا ہے۔ اب نئے علوم، نئے مسائل اور نئی تحقیقات ہیں اور جو پرانے علوم بھی ہیں وہ بڑھ کر اب بحر ناپیدا کنار ہو گئے ہیں۔ ریاضیات کو چھوڑ کر علوم عقلیہ کا جو سرمایہ صرف شفا، اشارات اور نجات کے چند اوراق میں محدود تھا۔ اور ایک ایک علم ایک ایک فصل میں آجاتا تھا۔ اب بڑھ کر دفتر اور کتب خانہ ہو گیا ہے۔ طبیعیات۔ حرکیات، سکونیات، جوہریات، معدنیات، حیوانات، نفسیات، بشریات وغیرہ جن کی بحثیں گذشتہ زمانہ میں چند صفحوں سے زیادہ نہ تھیں۔ اب وہ مستقل علوم ہو گئے ہیں۔"

(معارف ص ۲۴۳ ج: ۴ ۵)

ایسی حالت میں کیا قدیم عقلی علوم اور اس کے قدیم نصاب پر اکتفا، کفایت کر سکتا ہے؟

(ص ۲۴۴ قدیم اسی طرح) منطق کی کتابیں ضرورت سے بہت زیادہ ہو گئی ہیں۔ شروع سے لیجئے تو صرف پندرہ کتابیں صرف منطق کی اس نصاب میں ہیں۔ صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، قال اقول، میزان منطق، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، ملا حسن، حمد اللہ، میر زاہد، رسالہ، غلام یحییٰ، میر زاہد ملا جلال، قاضی مبارک۔ منطق کی کتابیں جو درس میں داخل ہیں۔ ان میں خلط مبحث ہے

(ص ۲۲، ص ۲۳)

ضرورت ہے کہ عقلی علوم کے نصاب کا پورے غور وفکر سے جائزہ لیا جائے۔ اور جو کتابیں ہمارے دینی علوم کے قدیم ذخیرہ سے استفادہ کے لئے کلیتہً لابدی نہیں ہیں انھیں خارج کر دیا جائے مثلاً منطق و قدیم فلسفہ و ہیئت کی تعلیم اسی قدر نصاب میں شامل ہو۔ جو ہماری دینی کتب میں ان علوم کی مصطلحات کو سمجھنے کے لئے کافی ہو۔ جو طلبہ قدیم فلسفہ و منطق وغیرہ سے دلچسپی رکھتے ہوں ان کے لئے علیحدہ کتابیں "تخصص کے درجے میں رکھی جاسکتی ہیں۔ عام طالبعلم کو اس کا پابند نہ بنایا جائے۔ مزید براں متأخرین کی مغلق مشکل موجز کتابوں کی بجائے متقدمین کی کتابوں کو ترجیح دی جائے۔ اور ان کی تعداد بھی ضرورت کے بقدر ہو۔ حقیقت ہے کہ قدیم فلسفہ و منطق و ہیئت وغیرہ کی اصطلاحات وطرز اگر ہمارے دینی علوم فقہ و کلام وغیرہ کی کتابوں میں سرایت نہ کر گیا ہوتا تو اس "دفتر پارینہ" کو محض یادگار قدیم" کی حیثیت سے گوارا کیا جاتا۔ لیکن چونکہ ان علوم کی ایک دو جامع کتابیں ہی نصاب میں برداشت کی جاسکتی ہیں۔ لیکن جس کثرت سے متأخرین کی کتابیں ہمارے نصاب میں داخل ہو چکی ہیں ان کا جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ اسی دراز نفسی کا مدعا یہ ہے کہ معقولات" کے علوم میں حک و ترمیم و اضافہ کا عمل اسی طرح اختیار کیا جائے۔ اولاً جن علوم کی دورِ حاضر میں ازبس ضرورت نہیں رہی ان علوم کی کتابوں کو اس حد تک نصاب میں باقی رکھا جائے۔ کہ قدیم دینی وعلمی وفنی ذخائر کتب سے استفادہ کی استعداد و قوت باقی رہے اور چونکہ طبائع میں وہ پہلی سی ہمت وجفاکشی، محنت وجستجو اور ذوق علم نہیں رہا اس لئے اصل فن اور مغز سخن پر مشتمل ایسی کتابوں کو داخل نصاب کیا جائے جو ژولیدگی بیان، خلط مبحث، تعقیدات لفظی، دوراز کار ابحاث، گنجلک و انتہائی موجز مغلق عبارات سے پاک ہوں۔ وقت اور نکتہ آفرینی کے بجائے سہولت ووضوح ضرورت وقت بھی ہے اور علم الناس نفسیات بشری کے سب سے بڑے رمز آشنا حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی کی تعمیل بھی۔

یسروا ولا تعسروا — آسانی پیدا کرو اور سختی مت کرو

(بخاری شریف جلد ۲ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسروا ولا تعسروا الخ ص ۹۰۴)

علوم عربیہ

مروجہ علوم عقلیہ پر اس ژولیدہ بیان کودک ناداں کی یہ چند گذارشات تھیں جو علوم معاد یا علوم دینیہ کے لئے عربی

بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں۔ علوم قرآنیہ ہوں یا علوم حدیث ۔علوم فقہ ہوں یا دیگر علوم دینیہ ہر ایک میں امعان نظر، کمال ورسوخ بغیر علوم ولغات عربیہ اور فنون ادب کی مہارت کے ممکن نہیں معمولی عربی دانی ایک درجہ تک مفید ہو سکتی ہے ۔لیکن قرآن کریم (جس کی صفت "قرآناً عربیاً" اور جس کی شان "لاتنقضی عجائبہ" ہے کے حقائق ومعارف ، اس کا اعجاز وجوہ اعجاز اور ان کے اثبات، اس کے الفاظ ومحاورات ومعانی، اس کی بلاغت، اس سے احکام و مسائل کا استخراج واستنباط بغیر علوم عربیہ اور ادبیات عربیہ کی مہارت کے ممکن نہیں، ہمارے حضرت الاستاذ علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے شیخ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا یہ قول نقل فرماتے تھے کہ۔

"میری اعجاز القرآن پر تقریر وہی سمجھ سکتا ہے جسے جاہلی شعراء کے دس ہزار اشعار یاد ہوں"

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قرآن دانی کے لئے عربی ادب ولغت وزبان دانی کی کس قدر ضرورت ہے ۔ یہی حال دوسرے علوم دینیہ کا ہے ، کہ فنون ادب میں مہارت اور عربی زبان دانی کے کمال کے بغیر ہر قدم پر لغزش پا کا اندیشہ ہے ۔جس کی مثالیں اس دور میں کمیاب نہیں۔اسی طرح عربی میں مؤثر تصنیف وتالیف بغیر زبان دانی، مہارت فن اور ادیبانہ ممارست کے مشکل ہے ۔ اس لئے "دینی نصاب تعلیم" کا تصور عربی کی اعلیٰ وعمیق تعلیم کے بغیر ممکن نہیں مزید برآں موجودہ دور میں جب کہ تمام دنیا مواصلات کی آسانی دکثرت کی وجہ سے انتہائی قریب ہو گئی ہے ۔ اسلامی ممالک کے درمیان عربی زبان نے ایک عالمگیر ومشترک زبان کی حیثیت حاصل کر لی ہے ۔ علماء کے لئے قدیم عربی میں دسترس بلکہ جدید اور روزمرہ کی عربی میں تقریر وتحریر ومحادثہ میں حذاقت بھی ضروری ہو گئی ہے کہ اگر قدیم عربی زبان وفنون ادب میں مہارت "علوم دینیہ" میں کمال ورسوخ کے لئے لابدی ولازمی ہے تو جدید عربی "عرب ممالک" سے تعلقات اور ان جدید الفاظ وزبان کو جاننے کیلئے ضروری ہے ۔جنھیں تمدنی، معاشرتی اقتصادی، سیاسی تقاضوں نے وجود بخشا ہے اور جنھیں ضروریات زندگی کی نئی چیزوں، نئے آلات، نئے طریقوں، جدید علوم وفنون نے جنم دیا ہے ۔ جدید دور میں رہتے ہوئے دین ودعوت کے عالمگیر تقاضوں وذمہ داری کے پیش نظر علماء کے لئے "جدید عربی" ایک اہم ضرورت بن چکی ہے زبان دانی کا ابلاغ میں جو مقام ہے ۔ اہل نظر اس سے ناواقف نہیں افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم

کے وارثین کے لئے زبان و کلام کی تنگ دامانی عذر نہیں بن سکتی، غرض عربی قدیم ہو یا جدید اس میں مہارت اور فنون ادب میں دسترس دینی تعلیم کا ایک اہم تقاضا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ نصاب تعلیم میں عربی زبان وادب، انشاء و تحریر، خطابت و تقریر، محادثہ و تکلم کو وہ اہمیت ومقام دیا جائے جو وقت کی ضرورت و تقاضا ہے۔ تاہم یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہئے کہ بقول سیدالملۃ قدس سرہٗ "ادبی ولسانی عربی ہماری دینی تعلیم و مدارس کا مقصود بالذات نہیں بلکہ بالعرض ہے" مقصود تو علوم دینیہ ہیں۔ اور یہ ادبیات ان کی رونق کا سامان اور علوم دینیہ کی تقریر و تحریر، تالیف و تصنیف، اظہار و بیان کا آلہ۔ ظاہر ہے کہ آلہ کو کبھی آلہ اور اصل کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔ غرض صرف رسوخ علم دین اور خدمت دین ہے، دگر ہیچ ہے

غرض زمسجد و میخانہ ام وصال شماست

جز ایں خیال ندارم خدا گواہ من است،

یہاں یہ بات بھی بے محابا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ "دور زوال" کے اسالیب ادب اور مقاماتی طرز نگارش سے بھی جتنا جلد رہائی پاسکیں بہتر ہوگا۔ اہل علم سے مخفی نہیں کہ احادیث نبویہ،، کا اسلوب بیان، فصحاء عرب کا طرز کلام، خطبائے عرب کے خطبات اپنے اندر جو برنائی شیریں، فصاحت و بلاغت وجاذبیت و تاثیر رکھتے ہیں بلکہ تیسری و چوتھی صدی ہجری بلکہ قرون مابعد کے بعض ادباء میں دور زوال سے پیشتر جو زور بیان، روانی، برجستگی اور فصاحت پائی جاتی ہے (مثلاً ہم جاحظ[1]، ابن مقفع، ابن قتیبہ وغیرہ کا نام لے سکتے ہیں) وہ بدیع الزماں ہمدانی کے مقاماتی اسلوب اور حریری کی مرصع و مسجع عبارات آرائیوں میں کہاں میسر آسکتی ہے۔ جدید نثری ادب بھی اپنے اسالیب میں قدیم[2] سے مشابہ ہے" مقاماتی ادب " کی طرح پُر تکلف نہیں، ترصیع وتنسیق سے عاری اور طبعی، پُر کشش وسلیس ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے نصاب میں قدیم وجدید جملہ اصناف نثر کی بھرپور نمائندگی ہو۔ اور منتخبات کا ایسا گرانمایہ سرمایہ ادب طلبہ کے مطالعہ میں آئے جو ہر دور کے ادب کی عکاسی کرتا ہو۔ بلکہ ادب کے ساتھ دینی اقدار کی بھی پرورش کرتا ہو۔ یا کم از کم دین کے مخالف نہ ہو۔

لہ جاحظ کی کتاب البیان والتبیین کو بعض اساتذۂ فن نے نثر کا حماسہ کہا ہے۔ ۲ہ اس باب میں مخدومی حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی مختارات فی الادب العربی وغیرہ ایک اچھی مثال ونمونہ ہے۔

اسی طرح علوم آلہ میں، صرف ونحو میں، تسہیل واختصار کی راہ اختیار کی جائے اور ادق ومشکل کتابوں کے بجائے واضح وآسان کتابیں نصاب میں داخل کی جائیں۔ ممالک عربیہ کی جدید کتابوں سے استفادہ کیا جائے۔ اور جہاں ہمارے غیر اہل زبان ہونے کی وجہ سے حذف و اضافہ کی ضرورت ہو۔ وہاں اس کا اہتمام کیا جائے۔ علوم بلاغت میں بھی متأخرین کی مغلق کتابوں کی بجائے متقدمین کی سہل واضح کتابوں یا جدید معیاری کتابوں کو داخل درس کیا جائے غرض ہمارا عربی ادب کا نصاب نظر ثانی محتاج ہے۔ حماسہ ابو تمام اور سبع معلقات کے علاوہ دیگر کتب کی تبدیلی پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔

علوم دینیہ علوم معاد یا علوم دینیہ ہمارے دینی مدارس وتعلیم کا اصل سرمایہ ومقصود ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ جہاں تک فن حدیث کا تعلق ہے کتب عشرہ یا تسع کا داخل نصاب ودرس ہونا بہت ہی باعث سعادت و برکت ہے۔ جس کے اثرات ظاہر وباہر ہیں۔ خدا کرے کہ ہمارے اسلاف کی طرح یہ علم اپنی پورے مالہ وماعلیہ کے ساتھ عمق وبسط سے پڑھایا جاتا رہے۔ تاکہ ہند وپاک میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے اس علم شریف کا جو علَم اس خطہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اسی طرح بلند رہے۔ نصاب میں اصول حدیث ورجال کی کتابوں میں اضافہ ہونا چاہئے۔

قرآن کریم کے علوم نہایت اہم ہیں۔ ضرورت ہے کہ قرآن پاک کی تعلیم پر مزید وقت صرف کیا جائے۔ جلالین وبیضاوی کے ڈھائی سپارے کفایت نہیں کرسکتے، دورۂ حدیث کی طرح دورۂ تفسیر کا تمام بڑے عربی مدارس میں اہتمام کیا جائے۔ جنہیں مختلف مہم اور امہات تفاسیر کو سامنے رکھکر پورے قرآن کریم کی تفسیر کرادی جاتے۔ مختلف تفاسیر سے استفادہ کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے مختلف اجزاء کے لئے مختلف تفاسیر کا متعلقہ حصہ نصاب میں رکھا جاسکے تاکہ مختلف تفاسیر کے مطالعہ کا ذوق اور قرآنی علوم کا شوق طلبہ میں پیدا ہو۔ ہمارے حضرت والا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے آج سے چھتیس ۳۶ سال سے پہلے ایک جگہ پر ارقام فرمایا تھا۔

"دنیا کے نظری وعلمی واعمالی، نفسی وآفاقی حالات میں جو انقلاب آگیا ہے۔ قرآنی علم کلام، قرآنی علم اجتماع، قرآنی علم عمران، قرآنی علم اخلاق، قرآنی آثار واخبار اور قرآنی اسرار واعلام کی تحقیقات میں عظیم الشان تبدیلیاں پیش آگئی ہیں۔ آج نئے سرے سے نئی صورتوں سے نئی تعبیروں سے اور نئی تقریروں سے اس

اس زمانہ کے نوجوانوں پر قرآن کو پیش کرنا اور اس کے نئے خدشوں اور اعتراضوں کا جواب دینا صرف جلالین اور بیضاوی سے ممکن ہی نہیں . . .

اس زمانہ میں قرآن پاک کے متعلق جو سوالات دنیا کے سامنے ہیں۔ ان سے تغافل سے نوجوانوں کی نئی نسل کی بربادی کس طرح ہورہی ہے۔ کیا اب بھی وقت نہیں کہ قرآن پاک کے طریق تعلیم و مباحث تعلیم میں نئی ضروریات کی تکمیل کی طرف کوشش مبذول کی جائے۔ اور دوسری طرف اس کام کو نامستند، غیر معتمد، غیر معتدل، مؤلین و مفسرین کے ہاتھوں سے بچایا جائے۔"

(معارف نمبر ۲ صفحہ ۸۲ ج ۴۵)

عصر جدید اپنی مسحورکن تہذیب و تمدن، علوم و نظریات، ایجادات و اکتشافات کے ساتھ سرعت و برق رفتاری سے جدید مسائل و حالات پیش کرتا جاتا ہے۔ اور دین حق جو صرف اسلام ہے اس کے لئے فکر و نظر اور عملی زندگی میں ہر روز نئے مسائل پیدا کرتا جاتا ہے عقائد و پورا نظام زندگی اس کے تابڑ توڑ حملوں کی زد میں ہے۔ اور یہ حملے صرف مذاہب و ادیان کی طرف سے نہیں بلکہ معیشت و معاشرت و اقتصادیات و سیاسیات، تہذیب و تمدن، سائنس، ٹیکنالوجی ہر رخ سے ہیں۔ بحمد للہ تعالیٰ اسلام زندہ ہے۔ اور زندہ رہے گا۔ لیکن عالم اسباب میں ہمیں ایسے رجال کار پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جو غزالیؒ و رازیؒ، مجدد سرہندی و شاہ ولی اللہ وغیرہ کی طرح نہ صرف ان اعتراضات کا جواب دیں بلکہ اسلام کی حقانیت کو ہر اعتبار سے ثابت کر سکیں۔

ظاہر ہے کہ اس کے لئے ہمیں ایسے متکلمین و فقہاء کی ضرورت ہوگی۔ جو سلف کی راہ سے سرمو تجاوز نہ کرتے ہوئے احقاق حق و ابطال باطل کر سکیں اور علماء راسخین کی طرح اسلامی اصولوں کے مطابق "تجدد و مداہنت" سے بچتے ہوئے مسائل کا شافی و وافی جواب دے سکیں فقہ و عقائد و کلام کی موجودہ نصابی کتابیں اس ضرورت کے لئے کافی نہیں ہوسکتیں۔ اس کے لئے جس ہمہ جہتی مطالعہ، رسوخ علم، ایمان و پختگی، وسعت نظر، فقاہت و مجتہدانہ بصیرت کی ضرورت ہے۔ وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ علوم قرآن و حدیث کے عمیق و وسیع علم کے علاوہ فقہ و اصول فقہ، کلام و علم کلام و عقائد کی قدیم و جدید کتب کا مطالعہ، حالات زمانہ اور عصری علوم سے گہری واقفیت ضروری ہے۔ مزید برآں تربیت ایسے محقق و ماہر فنون علماء ربانیین کی چاہئے۔ جن کے لئے دین کے عقائد و حقائق علم و خبر نہ ہوں بلکہ حال و حقیقت اور نظر و مسلمات بن چکے ہوں۔ علوم جدیدہ کی چکاچوند و تلمیع انہیں متاثر نہ کرسکے بلکہ ہر حال میں حق کی حمایت

ان کا شیوہ ہو اور دین کی صحیح تمثال پیش کرنا ان کا وطیرہ۔

عام نصاب میں تو اس کی گنجائش مشکل ہے۔ لیکن ابتدار ایسی ہو کہ "تخصص" میں اس رُخ پر تکمیل ہو سکے۔

محولہ بالا گذارشات سے نصاب تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت تو ظاہر ہو چکی ہے مزید برآں ہماری دینی تعلیم اور دینی مدارس علوم نبوت کے وارث ہیں اور فرائض سہ گانہ نبوت (تلاوت قرآن یعنی دعوۃ بالقرآن تزکیہ و تعلیم کتاب و حکمت اس کی اصل میراث ہے، میراثِ نبوت کے کسی ایک چیز کا فقدان یا کمی یا اس سے اہمال و اعراض، دینی تعلیم کی شایانِ شان نہیں۔ دین اور علوم دین کا بنیادی مقصد ہی للّٰہیت و معرفت ربانی تعلق الٰہی و احوال مع اللہ، حب و خشیت رحمانی، دل کی اصلاح، باطن کی تعمیر، تزکیہ نفس، اخلاص و تقویٰ نسبتِ احسانی، یادِ سبحانی، طلب و قرب رضائے حق، اعتماد و اتکال علی اللہ، تفویض و توکل، زہد و قناعت اور دنیا سے بے رغبتی ہے۔

اس مقصود حقیقی کی یافت یا تلاش و جستجو آج کس حد تک ہے۔ اس کی سنگینی کا احساس اور اس کا مداوا و علاج ہماری دینی تعلیم کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اہل دل حضرات کی صحبت اور محقق اہل حق صوفیہ کی کتابوں اور ملفوظات کا شوق و رغبت طلبہ کے دلوں میں پیدا کیا جائے کہ تزکیہ کی راہ کشادہ ہو سکے۔ پرانے بزرگوں کی مسندیں ایک ایک کر کے خالی ہوتی جارہی ہیں۔ نئے حضرات میں ... جگہ کون پُر کر رہا ہے؟

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں ✲ کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی

ہمارے مدارس علوم دینی و دنیوی کے عظیم الشان ادارے بن جائیں۔ علوم جدیدہ و قدیم کے سمندر ہوں، علوم باطلہ کے ابطال کے مضبوط قلعے ہوں۔ لیکن اہل مدرسہ کے دل کمال یقین و ایمان معرفت و للّٰہیت، اخلاص و تقویٰ، حب الٰہی، خشیتِ ربانی اور فکر آخرت و طلب رضائے حق سے سرشار نہ ہوں۔ تو کیا یہ مدرسے پھر کامل دینی مدارس کہلائے جا سکتے ہیں؟

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

لہ آیت ربانی "فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ" (سورۃ ق رکوع ۳) اسکی نوید ہے۔ ترجمہ: ما تو آپ قرآن کے ذریعے سے (عام تذکیر سے سب کو اور خاص تذکیر نافع صرف) ایسے شخص کو نصیحت کرتے رہیے جو میری وعید سے ڈرتا ہو۔ (تفسیر بیان القرآن از حضرت تھانویؒ)

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور انکے ایک شاگرد رشید

از: مولانا عبدالمجید خطیب ویلوری۔ استاد باقیات الصالحات

دین کی حفاظت وصیانت اور علوم دین کی نشر واشاعت ایک شرعی فریضہ ہے اس فریضے کو علمائے راسخین نے تاریخ اسلامی کے ہر دور میں نہایت حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا ہے اسلام اور مسلمانوں کے دور عروج میں انھوں نے جاہ ومنصب سے بے نیاز اور داد وستائش سے بے پرواہ ہوکر علوم دین کی تشکیل وتدوین کا بیڑا اٹھایا اور اپنی بے لوث خدمات کے ذریعے اسلامی تعلیمات کو عام کیا۔ اور جب کبھی ملتِ اسلامیہ زوال وادبار کا شکار ہوئی یا اس کا ملی تشخص متأثر ومضمحل ہوتا نظر آیا۔ تو اُن مبارک ومسعود ہستیوں نے اپنی درماندگی اور بے سر وسامانی کے باوجود تعمیرِ ملت کی تدبیریں کیں اور دعوت واصلاح کے ذریعہ مردہ دلوں کو حیاتِ نو سے آشنا کیا اور جہل سے تیرہ وتاریک دماغوں کو روشن وتابناک بنایا۔ اسلام کے خلاف دشمنانِ اسلام کے فکری حملوں کا دفاع انھیں علمائے ربانیین کا کارنامہ ہے۔ دین کے چشمۂ صافی کو بدعات وخرافات سے پاک رکھنے تجدید دین کے ذریعے اس کو جائز عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور ہر دور میں اس کو تر وتازہ اور سربلند رکھنے کا سہرا انھی علماء ہی کے سر ہے، غرض تاریخ اسلامی کا کوئی دور علمائے راسخین کی خدمات جلیلہ اور مساعئ جمیلہ سے خالی نہیں ہے انھیں محسن ومخلص علماء میں سے برصغیر کے دو عالم دین مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مولانا عبدالوہاب پیش نظر مقالے کا موضوع ہیں۔

ان میں سے ایک شمالی ہند کے ہیں اور دوسرے جنوبی ہند کے لیکن ان میں باہم استادی اور شاگردی کا رشتہ تھا، دونوں کے درمیان مکمل علمی وفکری ہم آہنگی تھی، اعتماد وخلوص، مہر ومحبت اور ہمدردی وغم گساری کا تعلق تھا دونوں کے پیش نظر دین اور علوم دین کی خدمت کا بلند نصب العین تھا ان دونوں نے اپنی حیات مستعار کا بیشتر حصہ اسی نصب العین کیلئے وقف رکھا فکر معاش اور ذاتی مفاد سے بالاتر ہوکر ملتِ اسلامیہ کے مفاد کی فکر کی، راستے کی مشکلات

مصائب کو جھیلا۔ غیر معمولی عزم وہمت، صبر و استقامت کا ثبوت دیا اور اپنے پیچھے بطور صدقہ جاریہ یا باقیات الصالحات کے ایسے عظیم علمی ادارے چھوڑے ہیں۔ جن سے آج بھی طالبانِ علوم فیض یاب ہو رہے ہیں۔

مولانا رحمت اللہ، ایک ممتاز خانوادے کے چشم وچراغ تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت عثمان غنی رضؓ سے جا ملتا ہے، جدِ اعلیٰ "شیخ عبدالرحمٰن گازرونی" سلطان محمود غزنوی کی فوج ظفر کے ساتھ "قاضی عسکر" کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور فتح پانی پت کے بعد یہیں سکونت پذیر ہوگئے، قاضی موصوف کی گیارہویں پشت میں "خواجہ محمد جلال الدین" مشہور و معروف صاحب کرامت بزرگ گذرے ہیں۔ جو "کبیر الاولیاء" کے لقب سے ملقب تھے، حضرت کبیر الاولیاء کی اولاد میں "حکیم عبدالکریم" دربارِ اکبری سے وابستہ تھے، شہرت "حکیم نابینا" کے نام سے تھی۔ حکیم نابینا کے بلند اقبال صاحبزادے "حکیم محمد حسن" شہنشاہ اکبر کے معالج خاص تھے، علاج و معالجے کا یہ تعلق دورِ جہانگیری میں کمال تقرب کا ذریعہ بنا۔ بارگاہ جہانگیری سے "مقرب خان" کا خطاب اور منصب گورنری کا اعزاز عروج و ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوا، گجرات، دکن، دہلی، اور آگرہ یکے بعد دیگرے متعدد صوبوں کے گورنر ہوتے شاہجہاں نے صوبہ بہار کا گورنر نامزد کیا۔ آخر کار ان خدمات کے صلے میں "کیرانہ" کا علاقہ جاگیر کی حیثیت سے عطا ہوا، جہاں انھوں نے اپنے دورِ حکمرانی کے وسیع تجربات کو سمیٹ کر ایک مختصر و مستحکم نظام اقتدار قائم کیا، محل، دربار، تالاب، باغ، کچہری، وغیرہ مظاہر اقتدار کے ذریعے ریاست و حکومت کا سماں پیدا کر دیا۔

حکیم محمد حسن مقرب خاں کے ایک بھائی "شیخ عبدالرحیم" بھی "شاہی معالج" کی حیثیت سے مغل دربار سے وابستہ اور عطائے خسروانہ سے بہرہ ور تھے، ان دونوں بھائیوں کے جاہ و اقتدار نے خاندان کے اکثر افراد کو پانی پت کی سرزمین سے اٹھا کر "کیرانہ" لا بسایا۔

شیخ عبدالرحیم کی ساتویں پشت میں "مولانا رحمت اللہ" پیدا ہوئے۔ سنِ ولادت ۱۲۳۳ھ ہے۔ جاہ و منصب، علم و ہنر اور اصلاح و سعادت کے اعتبار سے ایک مشہور و ممتاز اور نامور خاندان کے اس چشم وچراغ نے ابتداءً گھر سے ہی روشنی حاصل کی۔ ابتدائی عربی اور فارسی تعلیم اپنے خاندان کے بزرگوں سے پائی، مزید تعلیم کے لئے اپنے والد "خلیل اللہ" کے ساتھ دہلی کا رُخ کیا۔ مولانا محمد حیات سے جو بقول "سرسید" علم و فضل میں رشک اقران و اشباہ تھے، عربی کی متوسط کتابیں پڑھیں پھر دہلی سے لکھنؤ پہنچکر "مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد مولانا مفتی اسعد اللہ آشفتہ مرادآبادی سے

"میر زاہد" اور "مسلم الثبوت" کا درس لیا، مصنف "لوکاریتم" سے ریاضی اور حکیم فیض محمد سے طب کی تحصیل کی۔ امام بخش صہبائیؒ سے استفادہ کیا اور حضرت شاہ عبد الغنی کے شاگرد خاص "عارف باللہ شیخ عبدالرحمٰن چشتی سے بھی اکتساب فیض کیا۔ بلکہ خود حضرت شاہ صاحب سے دورۂ حدیث کی سعادت حاصل کی، غرض اپنے دور کے بہتر و برتر ممتاز و ماہر اساتذہ و شیوخ سے تعلیم و تربیت پائی۔

تحصیل و تکمیل کے بعد دہلی میں مہاراجہ "ہندو راؤ" کے ہاں میر منشی کی خدمت انجام دی، "والد ماجد شیخ خلیل اللہ" بھی انھیں مہاراجہ کے ہاں جائیداد کے نگراں تھے، والد کے انتقال کے بعد خانگی ذمہ داریوں نے اس ملازمت سے سبکدوش ہوکر وطن ہی میں فروکش ہونے پر مجبور کردیا۔ وطن "کیرانہ" میں سکونت پذیر ہوکر خدمتِ دین کی خاطر مسجد میں درس و تدریس کا کام شروع کیا، بہت جلد مولانا کے درس کا شہرہ دور دور جاپہنچا۔ اگرچہ "کیرانہ" میں تعلیم و تدریس کی مدّت مختصر اور دربار کیرانہ کے فیض یافتگاں کا دائرہ محدود ہے لیکن اس مختصر سی مدّت کے اندر جن چند منتخب طالبانِ علوم کو اپنے فیضانِ علمی سے نہال و سرشار کیا وہ بجا طور پر مولانا سے انتساب علمی کے سزاوار بلکہ خود مولانا کے لئے باعثِ افتخار قرار دئے جاسکتے ہیں۔ مولانا شاہ شرف الحق صدیقی مولانا شاہ ابوالخیر مولانا نور احمد امرتسری، مولانا حافظ الدین دہانوی، مولانا احمد الدین چکوالی "محمدیہ" کے مصنف مولانا عبدالسمیع رامپوری جیسی ممتاز و برگزیدہ بیرونی شخصیتوں کے علاوہ خود "کیرانہ" کے مولانا قاری شہاب الدین عثمانی، مولانا امام علی عثمانی، اور مولانا بدرالاسلام عثمانی دربار کیرانہ کے فیض یافتگاں کی فہرست کے چند اہم اسمائے گرامی ہیں۔

تیرہویں صدی ہجری کی چھٹی دہائی مولانا کی خدمت تدریس کا زمانہ ہے اسی زمانے میں آپ نے اپنے استاذ حضرت شاہ عبدالغنی کی خواہش اور فرمائش پر پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" کی تردید میں ایک کتاب "ازالۃ الاوہام" لکھنی شروع کی جو یکم رمضان ۱۲۶۹ھ کو زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آئی۔ اس تصنیف کے ساتھ مولانا نے خدمتِ دین کے ایک ایسے میدان میں قدم رکھا جس نے آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں کو عالم آشکارا کرکے شہرت دوام عطا کی، انگریزی استعمار کے سہارے، برصغیر میں دراندازِ مسیحی علماء اسلام کیلئے زبردست چیلنج بنے ہوئے تھے، اسلام پر مختلف شکوک و شبہات اور اعتراضات وارد کرکے اس کی صداقت و حقانیت کو مشتبہ بنانے کی بھرپور کوشش کررہے تھے۔ مسیحی مبلغین کا یہ جارحانہ اقدام کسی ہنگامی صورت حال کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ مسلمانوں کے ساتھ عیسائی اقوام کی آویزش ایک طویل تاریخی تسلسل

دکھتی ہے۔ انھوں نے صدیوں تک مسلمانوں کے ساتھ جدال و قتال کا بازار گرم رکھا لیکن اس قسم کی معرکہ آرائیوں سے نہ تو مسلمانوں کے وجود کو ختم کیا جا سکتا تھا نہ اسلام کا پرچم سرنگوں ہو سکتا تھا۔ بلکہ صلیبی جنگیں ہمیشہ مسلمانوں کے لئے حیات تازہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ اس صورت حال نے انھیں نئی تدبیریں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد سیاسی سطح پر قوم پرستی کی جو تحریک برپا ہوئی۔ اس کا رخ ملتِ اسلامیہ کی طرف کر دیا گیا۔ وہ امت جو اپنے عزم و اتحاد کی بنا پر فاتح عالم بن کر سامنے آئی۔ جس نے ہر قسم کی عصبیتوں کو پامال کر کے ملی وحدت کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔ اب وہ اپنے حریفوں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر باہم بعد و منافرت کا شکار ہو گئی۔ ترکی، عربی، ایرانی وغیرہ خانوں میں بٹ کر اپنی قوت و شوکت کو خود اپنے ہاتھوں ختم کر دیا۔ قومیت کی بنیاد پر ملت کے شیرازے کو پارہ پارہ کر کے اس کے مختلف بکھرے ہوئے جتھوں پر حکمرانی کرنا نسبتاً آسان تھا۔ سو انھوں نے بڑی آسانی کے ساتھ عالم اسلام کے ایک بڑے حصے پر اپنی بالادستی قائم کر لی۔ لیکن سیاسی عسکری بالادستی ان کا اصل منصوبہ نہیں تھی۔ بلکہ اس بالادستی کے بعد مختلف الجہات جدید تعلیمی، ثقافتی اور اقتصادی منصوبوں کو بروئے کار لا کر ملی تشخص کو نقصان پہنچانا۔ ان دشمنانِ اسلام کا اصل مدعا تھا۔

برصغیر انیسویں صدی میں طوائف الملوکی کا شکار تھا۔ قومیت کا حربہ استعمال کرنے سے جو متوقع نتائج برآمد ہوئے۔ وہ اس حربہ کے بغیر ہی حاصل تھے۔ انھوں نے منصوبہ بند طریقہ پر آہستہ آہستہ قدرتی دولت سے مالا مال انسانی آبادی سے بھرپور ایشیا کے اس عظیم قطعے کو اطراف و اکناف سے اپنے جنگل میں لینا شروع کیا۔ کلکتہ، مدراس، گوا ساحلی علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کر کے ملک کے داخلی حصوں پر اپنا اقتدار جمانا شروع کر دیا۔ مغل حکومت بے دست و پا اس غیر ملکی اقتدار کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ انیسویں صدی کے نصفِ آخر کے بعد انگریزی استعمار کا یہ سیلاب لال قلعے کی سنگین دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ مسلم اقتدار کے سقوط اور انگریزوں کے سیاسی اور عسکری غلبے کے اس نازک اور فیصلہ کن مرحلہ میں مسیحی مبلغین کی ایک بڑی کھیپ پوری شد و مد کے ساتھ اس مہم میں لگی ہوئی تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے عزیز از جان مذہبِ اسلام کی بھی بے توقیری ہو عیسائی حکام اور افواج ملک پر مکمل تسخیر و اقتدار کے لئے موقعہ کی تاک میں تھے اور ان کے مبلغین مذہبِ اسلام کو نیچا دکھا کر دینِ عیسویت کو فروغ دینے کی تدبیریں کر رہے تھے۔ اسلام کے خلاف پیہم اعتراضات و شبہات کا طوفان برپا تھا۔ مسیحی مبلغین کا سرغنہ پادری، فنڈر، پوری جسارت کے

دلیری کے ساتھ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر مذہب عیسائیت کی تبلیغ کرنا اور اسلام کے خلاف زہر اگلنا میزان الحق اس پادری " فنڈر " کا کارنامہ تھا جس میں اس نے اسلام اور بانیٔ اسلام پر متعدد اعتراضات کئے تھے۔ مولانا رحمت اللہ نے اس میزان الحق کے جواب میں " ازالۃ الاوہام " لکھی جو بڑی تقطیع کے ۵۴۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں اسلام پر کئے گئے اعتراضات کا مدلل جواب دینے کے ساتھ ساتھ تثلیث اور بشارت کے مزعومہ نظریات کا معقول پیرائے میں جائزہ لیکر دین عیسویت کی صداقت کو للکارا ہے اس کتاب کی اشاعت کے ایک عرصہ بعد مولانا محمد علی مونگیری نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا! باوجودیکہ اس کو چھپے ہوئے سینتیس ۳۷ برس ہو چکے مگر کسی نے ایک مبحث کا بھی پورے طور پر جواب نہیں دیا۔

اس قلمی کارنامے کی اہمیت مسلّم لیکن مسیحی تبلیغی ادارے جس وسیع پیمانے پر منادیوں اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ اسلام دشمن تحریک چلا رہے تھے۔ اس کا ازالہ ایک ازالۃ الاوہام سے ممکن نہ تھا۔ مولانا نے مؤثر پیرائے میں اس فتنے کا انسداد کرنے اور براہِ راست اس تحریک پر کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔ مسیحی علماء میں ممتاز حیثیت کے مالک میزان کے مصنف پادری " فنڈر " کو برسرِ عام مناظرے کی دعوت دی، مراسلت کے ذریعہ شرائط طے ہوئے۔ ۱۰ را پریل ۱۸۵۴ء، ۱۱ ر رجب ۱۲۷۰ھ کو اکبر آباد آگرہ میں مناظرہ شروع ہوا۔ یہ مناظرہ صرف دو دن ہونے پایا تھا کہ پادری فنڈر کے چھکے چھوٹ گئے تیسرے دن پادری فنڈر میدانِ مناظرہ سے مفرور تھا۔ ایک ممتاز ومؤقر مسیحی مبلغ کی یہ شکست وہزیمت اس حد تک عالم آشکارا ہوئی کہ مکۃ مکرمہ کے شیخ رفاعی خولی تحریر فرماتے ہیں

" میں نے اس مناظرے کا حال " مکۃ مکرمہ " میں ان بے شمار لوگوں سے سنا جو اس مناظرے کے بعد حج کیلئے یہاں آئے یہاں تک کہ یہ بات تواتر معنوی کی حد تک پہنچ گئی کہ " پادری فنڈر " اسمیں مغلوب ہوا تھا "

—— بقیہ اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں ——

(بقیہ اداریہ صـ۵ کا) ان کی جانب سے کیا گیا دار العلوم کی عظمت وحرمت کو تاراج کرنے کی کوشش اسی ناعاقبت اندیش گروہ نے کی اور اب اُلٹے دار العلوم اور اس کی انتظامیہ کو بدنام کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ بھرپور تیاریوں کے ساتھ دوبارہ حملہ کرنے کی برابر دھمکیاں بھی دیرہے ہیں۔ فالی اللہ المشتکیٰ وھو المولیٰ ونعم النصیر

فہرست کتب مکتبہ دار العلوم دیوبند و شعبہ نشر و اشاعت دار العلوم دیوبند

نام کتب	قیمت	نام کتب	قیمت	نام کتب	قیمت
فتاویٰ دار العلوم دیوبند جلد ۱	۲۴/-	دیوان المتنبی	۱۱/-	انتصار الاسلام	-/
〃 〃 ۲	۱۷/-	تاریخ دار العلوم جلد ۱	۴۰/-	مصابیح التراویح	۰
〃 〃 ۳	۲۵/-	〃 〃 ۲	۴۰/-	تفسیر معوذتین	-/
〃 〃 ۴	۳۱/-	انگریزی ترجمہ ۱ / 〃 ۲	۱۲۵/- ۱۷۵/-	اسلامی عقائد اور سائنس	-/
〃 〃 ۵	۳۶/-	سوانح قاسمی جلد اول	۴۰/-	مودودی مذہب	۵۰/
〃 〃 ۶	۳۶/-	〃 〃 دوم	۳۸/-	مودودی دستور و عقائد	۰
〃 〃 ۷	۳۳/-	〃 〃 سوم	۱۲/-	نظریہ دو قرآن پر ایک نظر	-/
〃 〃 ۸	۲۸/-	مخطوطات جلد اول	۱۹/-	مکتوبات	/
〃 〃 ۹	۳۱/-	〃 دوم	۲۱/-	مکتوبات ثلاثہ	۵
〃 〃 ۱۰	۲۲/-	قبلہ نما	۳۸/-	دو ضروری مسئلے	/
〃 〃 ۱۱	۱۱/-	دینی دعوت کے قرآنی اصول	۶/۵۰	جماعت اسلامی کا دینی رخ ۱	۵۰
مقدمہ ابن الصلاح	۱۱/-	ناقابل فراموش واقعات	۲۶/-	〃 〃 〃 ۲	۵۰
الغیۃ الحدیث	۱۲/-	المنار الانوار	۷/-	〃 〃 〃 ۳	۰
مشکوٰۃ الآثار	۱۱/-	مثنوی فروغ	۴/۵۰	〃 〃 ۴	-/
النحویہ	۴/-	براہین قاسمیہ	۱۰/-	اجتماع گنگوہ	-/
نفحۃ الادب	۶/-	حکمت قاسمیہ	۵/-	در منثور اول	-
تفسیر مدارک التنزیل	۸/-	مدارج سلوک	۱۶/-	〃 دوم	-
الاشباہ والنظائر	۳۰/-	جائزہ تراجم قرآنی	۱۱/-	اعفاء اللحیہ	۰
عقیدۃ الطحاوی	۱۱/-	قرآن محکم	۵/-	ایمان و عمل	-/
حسامی	۳۴/-	حجۃ الاسلام	۱۶/-	دار العلوم دیوبند کا ایک فتویٰ	
ملاحسن	۱۲/-	اسرائیل	۴/-	اور اس کی حقیقت	۰
مقامات حریری	۲۵/-	قرآنی پیشین گوئی	۲/۵۰	ماثورہ دعائیں	۰

Regd. No. SHN-13-NP-21-84

DARUL-ULOOM MONTHLY

DEOBAND [U.P.]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالعلوم دیوبند کے ترقیاتی منصوبے

(۱) رواق خالد کی دوسری منزل اور مزید جدید دارالاقامہ کی تعمیر جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو -

(۲) دارالتربیت (دارالاطفال) کا قیام اور اس کی تعمیر

(۳) ایک وسیع مسجد کی تعمیر جس میں اضافہ شدہ تمام طلبہ کی گنجائش ہو (قدیم مسجد ناکافی ہو چکی ہے)

(۴) علمی و دینی اجتماعات کے لئے ایک وسیع ہال کی تعمیر ——— (۵) ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر

(۶) مہمان خانہ کی توسیع ——— (۷) نئی درسگاہوں کی تعمیر ——— (۸) لائبریری کی تعمیر جدید

(۹) اساتذۂ دارالعلوم کی علمی ترقی کے لئے عالم اسلام سے علمی کتابوں کی فراہمی کا انتظام

(۱۰) تمام دنیا میں پھیلے ہوئے فضلاء دارالعلوم سے روابط اور اُن سے متعلق معلومات

(۱۱) نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر تمام ذمہ داران مدارس عربیہ کا اہم کنونشن طلب کرنا۔

(۱۲) تعلیم و تربیت کے نئے اصول و ضوابط کی ترتیب اور اُن کا اجراء۔

اس ادارے کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے

دستِ تعاون بڑھانے کی شدید ضرورت ہے

مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی امداد روانہ فرمائیں ——— شکریہ

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب) دارالعلوم دیوبند یوپی

این بجے پرنٹرس دیوبند

دار العلوم دیوبند کا علمی، دینی، اصلاحی ماہنامہ

دار العلوم

زیر سرپرستی

مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند

مدیر مسئول

ریاست علی بجنوری

نگرانِ اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم

دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی ماہنامہ

جلد نمبر ۶۵ — فروری ۱۹۸۴ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ — شمارہ نمبر ۵

سالانہ زرِ اشتراک

ہندوستان سے -/۲۵ روپے

سعودی عرب، کویت، ابوظہبی وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل -/۹۰ روپے

جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل -/۱۰۵ روپے

امریکہ، کناڈا وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل

-/۱۱۶ روپے

پاکستان سے ذریعہ ریل -/۴۵ روپے

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

طابع و ناشر

دارالعلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مطبوعہ

محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند

ضروری گذارش: اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینہ یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو چکی ہے۔ بذریعہ سرخ نشان اس کی آپ کو بار بار اطلاع بھی دی جا چکی ہے۔ لہٰذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی پی ہی سے زرِ اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے۔ اگلا شمارہ -/۳۱ روپے کے مطالبہ میں وی پی کر دیا جائے گا۔

(مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی وپاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

۱۔ ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

۲۔ پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۴۵/- روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والہ تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیج دیں اور انھیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں۔ خط وکتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز .... حبیب الرحمٰن قاسمی

پبلسٹی اور پروپیگنڈے کی طاقت کا استعمال ہر دور میں کسی نہ کسی حد تک پایا جاتا رہا ہے اور اسلام دشمن جماعتوں نے اس کے ذریعے سے اسلام اور رجالِ اسلام کو کافی نقصان پہونچایا ہے اور اسی پروپیگنڈے کے زور پر دجل وفریب کی ایسی ایسی سازشیں رچاتی ہیں کہ ان کے تصور ہی سے روح تھرّا جاتی ہے۔ تاریخ اسلامی کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ خلیفہ ثالث امیر المومنین سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت رشیدہ اور خود انکی مقدس ذات کے خلاف سبائیوں نے جو فتنہ برپا کیا تھا جس نے بالآخر ملتِ اسلامیہ کی متحد ومنظم طاقت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹکڑیوں میں تقسیم کردیا اس طاغوتی طوفان کی پشت پر پروپیگنڈے ہی کی طاقت تھی۔

دورِ حاضر میں تو اس فن نے خاصی ترقی کرلی ہے اور مکاری وعیاری کے ایسے ایسے کرتب ایجاد ہوگئے ہیں کہ بڑے بڑے مدعیانِ علم ودانش بھی اس کے چکر میں غیر محسوس طور پر آجاتے ہیں۔ آج پروپیگنڈے کے ذریعے کھلی ہوئی ضلالت اور گمراہی کو ھدایت اور حق کوشی، ظلم اور استبداد کو عدل وانصاف، اختلال وانتشار کو اتحاد و اتفاق اور بے رحمی وقساوت کو ترحم اور نرم دلی کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے اور اس فنکاری سے پیش کیا جاتا ہے کہ دنیا اُسے باور ہی کرلیتی ہے۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے انقلابِ ایران ہی کو دیکھ لیجئے جو ایک خالص شیعی انقلاب ہے جس کی بنیاد ضد، ہٹ دھرمی اور قتل وغارت گری پر قائم ہے لیکن پروپیگنڈے اور پبلسٹی کے ذریعہ باور کرایا جارہا ہے کہ یہ اسلامی انقلاب ہے، اور عوام کو تو چھوڑ دیجئے وہ تو کالانعام ٹھہرے اہلِ علم ودانش کا ایک اچھا خاصا طبقہ پروپیگنڈے کے دام صدرنگ میں گرفتار ہوکر اسے اسلامی انقلاب ہی یقین کربیٹھا ہے اور اپنی تقریروں وتحریروں میں برملا اس کا اظہار بھی کرتا رہتا ہے۔

لیکن پروپیگنڈے کے اثر سے آزاد ہوکر حقائق وواقعات کے آئینے میں اس انقلاب کے خدوخال کا معائنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی انقلاب کے نام سے شیعیت تقیہ کا لبادہ اوڑھ کر ایک بار پھر عالم اسلام کو اپنے مکروفریب کے ذریعہ تباہی وبربادی کے غار میں ڈھکیلنا چاہتی ہے۔

کسی نظام یا انقلاب کے صحیح رخ کو جاننے اور اس کی اصل حقیقت تک پہونچنے کا سیدھا اور معقول راستہ

یہ ہے کہ اس کے قائد و رہبر کے افکار و نظریات کو دیکھا جائے جس کی قیادت و سربراہی میں یہ انقلاب برپا کیا گیا ہے کیونکہ ہر انقلاب کا اصل محور اور مرکز اسکے اپنے قائد کے افکار ہی ہوتے ہیں جس کے گرد یہ گردش کرتا ہے انقلاب ایران کو اس معیار پر پرکھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے امام انقلاب علامہ خمینی کے معتقدات اور افکار و نظریات کی چھان بین اور تحقیق کیجائے اور پھر اس کسوٹی پر رکھ کر اس انقلاب کو جانچا جائے۔ اس سلسلے میں اجمالی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ علامہ خمینی فرقہ اثنا عشریہ سے تعلق رکھتے ہیں لہذا جو اعتقادات اس فرقے کے ہیں وہی علامہ خمینی کے بھی ہونگے اور چونکہ علامہ ہی اس انقلاب کے بلا شرکت غیرے امام و پیشوا ہیں اس لئے یہ انقلاب ان کے نظریات و خیالات کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ جو انقلاب اثنا عشری معتقدات کے جلو میں پروان چڑھے گا اور جو نظام شیعی افکار و نظریات کی بنیادوں پر استوار ہوگا اسے شیعی انقلاب تو کہہ سکتے ہیں اسلامی انقلاب قطعاً نہیں کہہ سکتے۔

ممکن ہے تشکیکی ذہن رکھنے والے افراد یا جو لوگ کہ ایرانی و مغربی پروپیگنڈوں سے متأثر ہو کر اسے اسلامی انقلاب مان چکے ہیں۔ انھیں اس مجمل گفتگو سے اطمینان نہ ہو اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود علامہ خمینی کی کتابوں سے چند اقتباسات پیش کر دئے جائیں تاکہ خود ان کی تحریر سے انکے خیالات و نظریات واضح ہو جائیں اور ایک طالب حقیقت کو دلائل و شواہد کی روشنی میں صحیح نتیجہ تک پہونچنے میں آسانی و سہولت ہو۔

(۱) ۔ علامہ خمینی یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ایران کی انقلابی حکومت میں سربراہی اور قیادت کا تعلق امام معصوم کے نائب اور قائمقام ہی سے رہے۔ جو شخص امام معصوم کی نیابت سے مشرف نہ ہوا سے حکومت کا سربراہ اور قائد نہیں بنایا جاسکتا۔ چنانچہ وہ اپنی مشہور تالیف "الحکومۃ الاسلامیہ" میں لکھتے ہیں۔

(۲) والحکومۃ التی یتحدث عنہا یجب ان یباشر المسئولیۃ فیہا نواب الامام المعصوم الغائب (الحکومۃ الاسلامیہ ص۱۱۲)

جس حکومت کے بارے میں گفتگو کیجا رہی ہے اس میں ضروری ہے کہ قیادت امام معصوم غائب کے نائب اور قائمقام کو سونپی جائے

اور علامہ خمینی کے نزدیک امام معصوم کا مقام و مرتبہ کیا ہے اُسے بھی انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے، لکھتے ہیں۔

ان من ضروریات مذہبنا ان لائمتنا مقاما لا یبلغہ ملک مقرب ولا نبی مرسل (الحکومۃ الاسلامیہ ص۵۲)

ہمارے ضروریات مذہب میں سے (یہ عقیدہ ہے کہ) ہمارے ائمہ ایسے بلند ترمقام پر فائز ہیں جہاں تک کسی مقرب فرشتے اور رسول کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی۔

گویا کہ امام معصوم کا درجہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور ملائکہ المقربین سے بھی بلند ہے۔ کیا یہ عقیدہ اسلامی عقائد اور کتاب و سنت کی نصوص سے میل کھاتا ہے۔؟

ایک دوسرے موقع پر ائمہ معصومین کی عظمت شان کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "وان الائمۃ الذین

لاتتصور فيهم السهو والغفلة: ائمہ وہ ہستیاں ہیں جن کے بارے میں سہو وغفلت اور بھول چوک کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیا خدائے بزرگ و برتر کے علاوہ کوئی ہستی ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ سہو اور غفلت سے بھی بری ہے؟ یہ ہیں ائمہ جن کا نائب بقول امام خمینی ایران کی انقلابی حکومت کا سربراہ ہوسکتا ہے۔ پھر بتایا جائے اس سربراہ کی سرکردگی میں جو نظام قائم ہوگا وہ اسلامی نظام ہوگا یا شیعی؟

(۳)۔ علامہ خمینی واضح الفاظ میں اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ زمانۂ نبوت اور خلافت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور کے علاوہ کسی عہد میں بھی اسلام اپنی صحیح اور مکمل شکل میں منصۂ شہود پر نہیں آسکا۔ اسی کے ساتھ وہ اس کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ آج تک ہماری جماعت کو حکومت حاصل نہیں ہوسکی۔ ملاحظہ ہو درج ذیل عبارت:۔

ولم تسنح فرصة لائمتنا للاخذ بزمام الامور وكانوا بانتظارها حتى آخر لحظة من الحياة فعلى الفقهاء العدول ان يتحينوا هم الفرص وتنتهزوها من اجل تنظيم وتشكيل حكومة رشيدة (الحكومة الاسلامية ص۱۳)	ہمارے ائمہ کو آج تک یہ موقعہ نہ مل سکا کہ وہ زمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لیں بلکہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس کے منتظر رہے لہٰذا فقہاء عادل کو اس موقع (انقلاب ایران) کو غنیمت سمجھ کر حکومت رشیدہ کی تنظیم و تشکیل کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔

خمینی صاحب کے نزدیک خلفاء راشدین ثلثہ اور دیگر سلاطین اسلام کی حکومت انکی اپنی حکومت نہیں تھی بلکہ وہ غیروں کی حکومت تھی اور غیر راشدہ حکومت تھی اب قسمت سے انقلاب ایران نے اسکا موقع دیا ہے کہ اپنی حکومت قائم کی جائے۔

خمینی صاحب کے نزدیک حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت اسلامی حکومت تو دور کی بات ہے اسلامی حکومت کے مشابہ بھی نہیں تھی۔ لکھتے ہیں:۔

ولكن حكومة معاوية تمثل الحكومة الاسلامية و تشبيهها من قريب ولا بعيد (الحكومة الاسلامية ص۷۱)	(حضرت امیر) معاویہ کی حکومت اسلامی حکومت نہیں تھی اور نہ اسے کسی طرح سے اسلامی حکومت کی مشابہت ہی حاصل تھی۔

ظاہر ہے کہ جب ان کے نزدیک خلفاء راشدین ثلاثہ کے دور خلافت میں اسلام اپنی مکمل شکل میں ظہور پذیر نہ ہوسکا اور نہ انکی حکومت حکومتِ رشیدہ تھی تو پھر حضرت سیدنا امیر معاویہ کی حکومت کا ذکر ہی کیا۔ یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ خمینی صاحب جس حکومت کا نعرہ دیرہے ہیں وہ خلفاء راشدین اور دیگر سلاطینِ اسلام کی حکومتوں کے منہاج و مقصد سے مختلف ہوگی کیونکہ وہ انھیں اسلامی حکومت تصور ہی نہیں کرتے تو پھر جو حکومت خلفاء راشدین کے طرز سے مختلف ہوگی اسے اسلامی حکومت یا انقلاب کو اسلامی انقلاب کہنا کسی طرح سے بھی درست ہوسکتا ہے؟ مگر پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر بھولے بھالے عوام ہی نہیں بلکہ ارباب فکر و فن بھی اس شیعی اور خالص خمینی انقلاب کو اسلامی انقلاب کہنے لگے ہیں۔

فالی اللہ المشتکی واللہ المستعان

التحقیق المفید فی اجتماع الجمعۃ والعید

از حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب (۳) سابق مفتی اعظم دار العلوم دیوبند

حدیث میں مذکورہ قوادح مکشوفہ کے موجود ہوتے ہوئے اس پر صحت کا حکم کرنا آفتاب نیم روز کا انکار کرنا ہے۔ اسی طرح سبل السلام شرح بلوغ المرام میں الامیر الصنعانی کا قول بھی صحیح نہیں ہے کہ زید بن ارقم کی حدیث کی تصحیح ابن خزیمہ نے کی ہے وقد صححہ ابن خزیمۃ ولم یطعن غیرہ فیہ فیصلح مخصصا العام الکتاب والسنۃ الخ (سبل السلام) حدیث صحیح نہیں چنانچہ گذر چکا تاکہ تخصیص عالم الکتاب والسنۃ ممکن ہو سکے۔ جو حضرات خبر واحد سے تخصیص کتاب (قرآن) کے قائل ہیں ان کے نزدیک بھی تخصیص کے لئے خبر واحد کا صحیح ہونا شرط ہے، مجہول الاسناد حدیث سے وہ بھی تخصیص کے قائل نہیں ہیں۔ لہذا زید بن ارقم کی حدیث سے عموم کتاب و سنت کی تخصیص نہیں ہو سکتی اور جمعہ کی فرضیت عمومی ساقط نہیں ہو سکتی پھر مزید براں یہ ہے کہ علامہ شوکانی اس کے قائل ہیں کہ خواہ کوئی شخص عید کی نماز پڑھے یا نہ پڑھے عید کے دن جمعہ کا ترک اس کے لئے جائز ہے کہ رخصت عام ہے ثم رخص فی الجمعۃ سے استدلال ہے جو ضعیف اور مجہول الاسناد حدیث کا ٹکڑا ہے۔

شوکانی کی عبارت یہ ہے:-

فیہ ان صلوٰۃ الجمعۃ فی یوم العید یجوز ترکھا وظاھر الحدیثین عدم الفرق بین من صلی العید ومن لم یصل وبین الامام وغیرہ لان قولہ لمن شاء یدل علی ان الرخصۃ تعم کل احد۔

(اس قول میں دلیل اس امر کی ہے کہ عید کے روز جمعہ کا ترک جائز ہے، اور دونوں حدیثوں کے ظاہر سے عدم فرق ظاہر ہے کوئی عید کی نماز پڑھے یا نہ پڑھے۔ امام ہو یا غیر امام رخصت سب کو شامل ہے۔ اسلئے کہ قول من شاء اس پر دلالت کرتا ہے کہ رخصت ہر ایک شخص کو شامل ہے)

دیکھا آپ نے جس جمعہ کی فرضیت نص قطعی کتاب و سنّت و اجماع سے ثابت ہے بغیر عذر کے جس کے ترک پر سخت وعیدیں وارد ہیں۔ انا مجمعون موجود ہوتے ہوئے۔ ثم رخص فی الجمعة پر اس کو قربان کر دیا، حضرت عثمانؓ نے اہل عوالی کو رخصت دی جو بسند صحیح ثابت ہے جس کو بخاریؒ نے بھی روایت کیا ہے جس پر صحابہ نے نکیر نہیں کیا، اتفاق کیا، جس سے حدیث ضعیف بھی قوی ہو جاتی ہے اس کے لئے شوکانی نے یہ کہہ دیا کہ وقول عثمانؓ لا یخصص قوله صلی الله علیه وسلمؐ باوجودیکہ حضرت عثمان خلیفہ راشد امام وقت تھے۔ سفیان بن عیینہ کے طریق میں عوالی کی قید حدیث ابوہریرہؓ میں موجود ہے جو حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ضعیف نہ تھی اسی کے مطابق اہل عوالی کو رخصت ملجا رہی دی۔ اس امام راشد کے قول کا تو اعتبار نہیں۔ حالانکہ تخصیص نہیں، اس کی تائید کی بلکہ اس پر عمل کیا لیکن ابن الزبیر جو ان کے بہت بعد امام ہوئے ان کے قول کا اعتبار ہے اور اس سے ترک جمعہ جائز ہو گیا۔ نیل کی یہ عبارت ہے۔

ان الترخیص عام لکل احد ترک ابن الزبیر الجمعة وهو الامام اذ ذاک وعدم الانکار علیه من احد من الصحابة الخ

یہی صورت اور یہی تقریر حضرت عثمانؓ کے واقعہ میں جاری ہے، دونوں میں وجہ فرق کیا ہے۔ احادیث باب جمہور کا اس وقت رد کر سکتی ہیں کہ صحیح ثابت ہوں اور اپنے مفاہیم میں قطعی ہوں کسی تاویل صحیح کی محتمل نہ ہوں، یہاں ایسا نہیں ہے۔ الحاصل مذکور تقریر حدیث سے شوکانی کا توہم صحت حدیث اور تصوّر و تخیّل عدم تخصیص اور زعم رخصت عمومی وغیرہ سب ختم ہو گیا۔ امام شافعیؒ نے حدیث عثمان اور مرسل عمر بن عبد العزیزؒ سے اپنی اصل و قانون کے مطابق استدلال کیا اور اس کو ماخوذ بقرار دیا ہے، پس وہ اعتراض امام شافعی پر وارد نہیں کیا جا سکتا جس کو الامیر الصنعانی نے سبل السلام میں امام شافعیؒ پر وارد کرنا چاہتے ہیں۔

صحیح ابن خزیمہ قرنوں سے دنیا سے مفقود ہے ہاں اس کے باب التوحید کا وجود ہے۔ پس ایسی تصحیح پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا جو معدوم کتاب کی طرف نسبت کی جاتی ہے جب تک سند متصل سے تصحیح کا ثبوت نہ ہو۔ علاوہ ازیں تصحیح احادیث میں ابن خزیمہ کا تساہل مشہور ہے۔ چنانچہ لسان المیزان کی عبارت اس کی طرف مشیر ہے جو ماتقدم میں گذر چکی ہے۔

پھر شوکانی اور امیر صنعانی دونوں مسلک اہل بیت پر اور نہ فقہ میں ائمہ سنت کے طریق پر ہیں بلکہ دونوں اس میں مضطرب ہیں۔ ان کے احوال کے معلوم کرنے کے لئے الاشفاق علی احکام الطلاق

کے صفحہ ۵، ۶، ۷ کا مطالعہ ضروری ہے نیز ابراز الغی اور تذکرۃ الراشد اور غیث الغمام علی امام الکلام کا مطالعہ کرنا چاہئے نیز مقالات کوثری ص۱۶۶ بھی پڑھنا چاہئے تاکہ حقیقت حال ظاہر ہو سامیر صنعانی کا میلان رفض کی طرف ہے جس کا ثبوت تراویح کی بحث سے ہوتا ہے۔

ابوداؤد کی دوسری حدیث

حدثنا محمد بن طریف البجلی ثنا اسباط عن الاعمش عن عطاقال صلی بنا یوم عید فی یوم جمعۃ اول النھار ثم رحنا الی الجمعۃ فلم یخرج الینا فصلینا وحدانا وکان ابن عباس بالطائف فلما قدم ذکرنا ذلک لہ فقال اصاب السنۃ۔ام

نسائی کی روایت میں ہے

فاخر الخروج حتی تعالی النھار ثم خرج فخطب ثم نزل فصلی الخ

سند میں اسباط مطلقاً وارد ہے۔ اس نام کے دو شخص ہیں۔ اور دونوں رجال ابوداؤد میں داخل ہیں ۱۔ ایک اسباط بن محمد القرشی دوسرے اسباط بن نصر الھمدانی گو اسباط القرشی صحاح ستہ کے رجال میں داخل ہیں۔ چنانچہ میزان و تہذیب سے ظاہر ہے۔ لیکن کوفی محدثین اُن کو ضعیف کہتے ہیں۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ ثقہ ہیں مگر ان میں ضعف بھی ہے۔ عبداللہ بن المبارک سے جب الحسن بن عیسٰی نے اسباط و ابن فضیل کے متعلق دریافت کیا تو خاموش ہو گئے۔ پھر چند یوم کے بعد ابن المبارک نے کہا اے حسن تمہارے دونوں اصحاب کو ہمارے اصحاب پسند نہیں کرتے ہیں۔ میزان و تہذیب کی عبارت حسب ذیل ہے:۔

وثقہ ابن معین ثم قال والکوفیین یضعفونہ رواھا ابن العلائی عن یحیی وقال بن سعد ثقۃ فیہ بعض الضعف وقال العقیلی وربما یھم وقال حسن بن عیسی سألت ابن المبارک عن اسباط وابن فضیل فسکت فلما کان بعد ایام رأنی فقال یاحسن صاحبک لااری اصحابنا یرضونھما۔ (میزان الاعتدال ص۸۲ ج ۲)

(ابن معین نے اس کی توثیق کی ہے اور کوفی محدث اس کی تضعیف کرتے ہیں جس کو ابن العلائی نے یحیٰی سے روایت کیا ہے۔ ابن سعد نے کہا ثقہ ہے اس میں کچھ ضعف بھی ہے، عقیلی نے کہا وہ بسا اوقات احادیث میں وہم کرتا ہے حسن بن عیسٰی نے ابن المبارک سے اسباط اور ابن الفضیل کے بارے میں دریافت کیا تو ابن المبارک نے سکوت کیا پھر چند روز بعد مجھکو دیکھکر ابن المبارک نے کہا اے حسن! تمہارے دونوں اصحاب کو ہمارے اصحاب پسند نہیں کرتے) حافظ ابن حجرؒ تہذیب میں فرماتے ہیں

قلت قال الدوری عن ابن معین لیس به باس وکان یخطیٔ عن سفیان وقال الغلابی عنہ ثقۃ والکوفیون یضعفونہ وقال البرقی عنہ الکوفیون یضعفونہ وھو عندنا ثبت فیما یروی عن مطرف والشیبانی وقد سمعت انا منہ وقال العقیلی ربما یھم فی الشیئ وقال العجلی لاباس بہ وقال ابن سعد کان ثقۃ صدوقا الا ان فیہ بعض الضعف الخ (تھذیب ص۲۱۱ ج۱)

(میں کہتا ہوں اور دوری نے ابن معین سے روایت کیا کہ ان میں کچھ حرج نہیں لیکن سفیان سے روایات کی وہ ثقہ ہیں اور کوفہ کے محدث ان کو ضعیف کہتے ہیں۔ اور برقی نے ابن معین سے روایت کیا کہ کوفی ان کی تضعیف کرتے ہیں اور وہ ہمارے نزدیک ان روایتوں سے ثبت ہیں جن کو مطرف اور شیبانی سے روایت کرتے ہیں۔ اور میں نے ان سے احادیث سنی ہیں عقیلی کہتے ہیں کہ بسا اوقات بعض احادیث میں وہم کرتے تھے عجلی نے کہا لاباس بہ ہیں اور ابن سعد نے کہا ثقہ صدوق ہیں لیکن ان میں کچھ ضعف بھی ہے) ان عبارتوں سے یہ ثابت ہوا کہ اسباط بن محمد القرشی مختلف فیہ ہیں تو ان کی روایات میں وہم وخطا کا پایا جانا ممکن ہے کہ یہ دونوں وصف ان میں تھے ضعف بھی ان میں ہے۔ کوفہ والے ان کو ضعیف ہی کہتے ہیں۔ پھر ایسی روایت سے جمعہ کی فرضیت قطعیہ کیسے ساقط کی جاسکتی ہے میرے نزدیک مذکورہ سند ابی داؤد میں اسباط بن محمد القرشی ہیں جو اعمش سے روایت کرتے ہیں۔ دوسرے اسباط بن نصر ہیں۔ وہ بھی مختلف فیہ ہیں بلکہ اکثر محدثین ان کی تضعیف کرتے ہیں تہذیب میں ہے۔

قال حرب قلت لاحمد کیف حدیثہ قال ما ادری وکانہ ضعفہ وقال ابوحاتم سمعت ابا نعیم یضعفہ وقال احادیثہ عامیۃ سقط مقلوب الاسانید وقال النسائی لیس بالقوی قلت علق لہ البخاری حدیثا فی الاستسقاء وقد وصلہ الامام احمد والبیہقی فی السنن الکبیر وھو حدیث منکر اوضحتہ فی التعلیق وسیاتی فی ترجمۃ مسلم انکار ابی زرعۃ علیہ اخراجہ لحدیث اسباط ھذا وقال الباجی فی الضعفاء روی احادیث لایتابع علیھا عن سماک بن حرب وقال بن معین لیس بشیٔ وقال مرۃ ثقۃ وقال موسیٰ بن ھارون لم یکن بہ باس الخ تھذیب ص۲۱۲ ج۱)

(محدث حرب نے کہا میں نے امام احمد سے دریافت کیا کہ اسباط کی حدیث کیسی ہے تو کہا میں نہیں جانتا گویا انھوں نے اس کو ضعیف کہا۔ ابوحاتم نے کہا میں نے ابونعیم سے سُنا وہ اسباط کو کہتے تھے اور کہا ان کی احادیث عامیہ ساقط مقلوب الاسانید ہیں۔ نسائی نے کہا قوی نہیں ہیں باب استسقاء

میں امام بخاری نے ان کی ایک حدیث تعلیقاً ذکر کی ہے۔ جس کو امام احمد اور بیہقی نے موصولاً روایت کیا ہے وہ حدیث منکر ہے جس کی وضاحت میں نے تعلیق میں کی ہے۔ امام مسلم کے ترجمہ میں آرہا ہے کہ محدث ابوزرعہ نے امام مسلم پر اعتراض و انکار کیا کہ اس اسباط کی حدیث کی تخریج انھوں نے اپنی صحیح میں کیوں کی۔ ساجی نے کتاب الضعفاء میں بیان کیا ہے کہ سماک بن حرب سے جتنی احادیث اسباط نے روایت کی ہیں ان پر کوئی ان کا..... متابع نہیں ہے۔ ابن معین نے کہا اسباط حدیث میں کچھ نہیں اور ایک مرتبہ کہا ثقہ ہیں۔ موسیٰ بن ہارون نے کہا اسباط میں کچھ حرج نہیں۔

حدیث کی سند میں دونوں میں کوئی بھی حدیث کو صحیح کہہ دینا صحیح نہیں ہے، پھر اعمش مدلس ہیں جو عنعنہ سے روایت کرتے ہیں اور مدلس کی روایت بذریعہ عن معتبر نہیں، باوجودیکہ ابن خزیمہ تصحیح احادیث میں متساہل مشہور ہیں، چنانچہ ماسبق میں لسان المیزان کی عبارت ان کے بارے میں گذر چکی ہے اس روایت کو رد کر دیتے ہیں جس میں اعمش نے عنعنہ کیا ہو۔

علاوہ ازیں مذکورہ روایت پوری حدیث نہیں ہے بلکہ نسائیؒ کی حدیث میں بطریق عبدالحمید بن جعفر عن وہب بن کیسان فاخرالخروج حتی تعالی النہار ثم خرج فخطب فاطال الخطبۃ ثم نزل فصلی رکعتین۔ بلکہ روایت میں یہ لفظ ہیں۔ ابن الزبیرؓ نے پڑھائی ہے تو آنحضرتؐ کے زمانہ مبارک میں آنحضرتؐ عید کی جس طرح اور جس وقت پڑھتے تھے اس کے خلاف ہے۔ نیز ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طریق کے خلاف ہے، اس لئے کہ حضرت ابن الزبیر نے نماز عید کے لئے نکلنے کو اتنا مؤخر کیا کہ دن بہت چڑھ گیا۔ پھر نکلے اور پہلے خطبہ پڑھا اور خطبہ طویل کر دیا، یہ تینوں امر سنت رسول اور ابی بکر و عمر اور حضرت عثمان کے خلاف ہیں۔ آپ عید کی نماز سویرے اور جلد ادا فرماتے تھے۔ خطبہ کو نماز عید سے مؤخر کرتے تھے، خطبہ بہت طویل نہ دیتے تھے تو اس فعل و عمل سے جو سنت کے خلاف ہے فرضیت قطعیہ کو جو کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ کیسے ساقط کیا جا سکتا ہے اور عمومی فرضیت ثابتہ کی تخصیص اس فعل سے کی جا سکتی ہے وہ بھی ایسی حالت میں کہ مخالفین کے نزدیک افعال صحابہ حجت نہیں ہیں اور ان سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں کیا جا سکتا وہ بھی عبداللہ بن الزبیر کے فعل سے جو خلفاء راشدین کے زمانہ سے بہت دور کے امام ہیں وہ بھی ایسی صورت میں کہ اُن سے جو روایات اس بارے میں مروی ہیں ان میں اضطراب ہے۔ یا للعجب ع

کہاں چھوٹی ہے ہمت کس جگہ جی ہار بیٹھے ہیں۔

نیل میں شوکانی نے یہ تو فرمادیا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کے قول سے آنحضرتؐ کے قول کی تخصیص نہیں ہوسکتی مگر فعل ابن الزبیر سے سقوط فرضیت جمعہ کے قائل ہوگئے۔ الترخیص عام لکل احد ترک ابن الزبیر للجمعۃ وھوالامام اذ ذاک (نیل) اس کے تو ثبوت کی ضرورت ہے کہ ابن الزبیرؓ نے جمعہ یا ظہر کی نماز کو چھوڑا بھی یا نہیں، صرف دعویٰ سے کامیابی نہیں ہوتی۔ کیوں نہیں ہوسکتا ہے کہ حضرت ابن الزبیرؓ نے جو دو رکعت نماز پڑھائی ہے وہ جمعہ کی نماز ہو جس پر قرائن شاہد ہیں۔ اوّل یہ کہ نماز کیلئے بہت دیر میں مکان سے نکلے۔۔۔ یہاں تک کہ دن بہت چڑھ گیا۔ "اخر الخروج حتی تعالی النہار" روایت میں موجود ہے، دوسری روایت میں بکرۃ کا لفظ موجود ہے جس کے معنی قبل الزوال کے ہیں۔ ابن جریج کی روایت میں ہے فجمعھا جمیعًا فصلاھما رکعتین بکرۃ الخ۔ دونوں نمازوں کو انھوں نے جمع کردیا اور زوال سے پہلے دونوں کو پڑھا یعنی دونوں کو دو رکعتوں میں ادا کردیا جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ عید کی نماز کا تداخل جمعہ کی نماز میں کردیا، دونوں نمازوں کے لئے دو ہی رکعتیں پڑھیں اس پر اور کچھ زیادہ نہیں کیا، ایک نماز کو دوسری نماز میں مدغم کردیا، اسی بنا پر عید کی نماز کے لئے نکلنے میں تاخیر کی۔ دوسرے دونوں رکعتوں کے ادا کرنے سے پہلے خطبہ پڑھا، پھر دو رکعت نماز پڑھائی۔ ثم خرج فخطب فاطال الخطبۃ ثم نزل فصلی رکعتین الخ پھر نکلے اور طویل خطبہ پڑھا پھر منبر سے اتر کر دو رکعت نماز پڑھائی، عید کی نماز میں خطبہ بعد نماز ہوتا ہے جو سنت متوارثہ ہے اور جمعہ کا خطبہ نماز سے پہلے ہوتا ہے جس پر توارث ہے اسی توارث کے مطابق حضرت ابن الزبیر رضؓ نے خطبہ نماز سے مقدم کیا اور جمعہ کی نماز پڑھی اور عید کی نماز اسی میں داخل سمجھ لی۔ تیسرے ابن جریج کی روایت میں ہے فجمعھما فصلاھما رکعتین، دونوں کو جمع کردیا اور دونوں کے لئے دو رکعت پڑھیں۔

ان جملہ امور سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ حضرت ابن الزبیرؓ نے جمعہ کی نماز پڑھی، عید کی نماز مستقبل طور پر نہیں پڑھی بلکہ جمعہ کی نماز میں اسے داخل سمجھ لیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عید کی نماز کو جمعہ کی نماز کی وجہ سے ساقط سمجھ لیا گیا یہ اُنکا اجتہاد ہے دوسرے مجتہد پر حجت نہیں ہوسکتا اور اگر بالفرض عید ہی کی نماز پڑھی جس میں خطبہ کو مقدم کردیا اور سنّت کے خلاف بہت تاخیر کرکے نماز پڑھی تو ابن الزبیرؓ جیسے شخص سے بسا بعید معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ اور ابوبکر صدیق اور حضرت عمر و عثمانؓ اور حضرت علی رضؓ کے طریق کو چھوڑ کر بنی امیہ کی سنّت پر گامزن ہوں جہاں خطبہ وغیرہ میں تقدیم و تاخیر ہوتی تھی جن کے ابن الزبیر مخالف تھے۔ ع

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے۔

جمعہ کی نماز قبل الزوال کے جواز کے بعض حضرات قائل ہیں اور احادیث سے استشہاد کرتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے نزدیک براہین ودلائل حدیثیہ کے اعتبار سے یہ جواز بہت ہی ضعیف وکمزور ہے اور قبل زوال نماز جمعہ نہیں ہوتی، مگر حضرت ابن الزبیرؓ کے فعل مذکور کو اس پر محمول کیا جائے تو امر مستبعد نہیں ہے کہ حضرت ابن الزبیرؓ بھی جواز نماز جمعہ کے قبل الزوال کے قائل ہوں جمعہ کی نماز پڑھی جو فرض مستقل اور قطعی ہے اور عید کی نماز ساقط کردی اور جمعہ کی نماز کو اس کے قائم مقام سمجھ لیا اور اس پر اکتفاء کیا کہ عید کی نماز فرض نہیں ہے۔ بلکہ واجب یا سنت یا بقول ابن حزم تطوع ہے۔ اگر جمعہ کے روز نہ پڑھی جائے تو ابن الزبیرؓ کے نزدیک چنداں مضائقہ نہیں ہے۔ احادیث میں انا مجمعون کے موجود ہوتے ہوئے کہ ہم تو جمعہ کی نماز ادا کریں گے حضرت ابن الزبیرؓ کیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کی مخالفت کرسکتے تھے۔ آنحضرتؐ تو جمعہ کی نماز پڑھیں اور ابن الزبیرؓ نہ پڑھیں پھر خلیفہ کہلانے کے کیسے مستحق ہوسکتے ہیں۔ ع

این خیال ست ومحال ست وجنوں۔

خلافِ رسول کی نسبت ابن الزبیرؓ کی طرف نہیں کیجا سکتی۔ لہٰذا ماننا چاہئے کہ یہ ابن الزبیر کی نماز جمعہ کی نماز تھی۔ عید کی نماز نہ تھی۔

حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد اصحاب السنۃ کہ ابن الزبیر نے سنت پر عمل کیا، اسکے یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ جمعہ کی نماز سے پہلے جو انھوں نے خطبہ پڑھا یہ سنت کے مطابق عمل کیا کہ جمعہ کی نماز سے پہلے خطبہ ہے بعد کو نماز بھی عمل متوارث ہے کہ تقدیم خطبہ نماز جمعہ پر ہو جب یہ احتمال ہے تو پھر ایسے محتمل کلام سے سقوط جمعہ پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے کہ مشہور قاعدہ ہے لذاجاء الاحتمال بطل الاستدلال، احتمال ناشئ عن الدلیل استدلال کو باطل کردیتا ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ حضرت ابن الزبیرؓ نے جمعہ کی نماز پڑھی عید کی نماز نہیں پڑھی یا اسکو اسی میں مدغم کردیا۔ ورنہ اصاب السنۃ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ عید میں تقدیم خطبہ سنت نہیں ہے، جمعہ کی نماز انا مجمعون ہوتے ہوئے نہ پڑھنا سنت نہیں ہے، زوال سے قبل تعالی النہار کے بعد بہت تاخیر کرکے عید کی نماز پڑھنا سنت نہیں ہے۔ عید وجمعہ دونوں نمازوں کو جمع کرنا سنت نہیں ہے، پھر کیسے ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ اصاب السنۃ سنت کے مطابق عمل کیا، یہاں تو ابن الزبیرؓ کا فعل سنت متوارثہ کے خلاف ہے اصاب السنۃ کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔

علاوہ ازیں نسائی کی سند روایت میں عبدالحمید ابن جعفر واقع ہے، سفیان ثوری اس کو

ضعیف کہتے ہیں، نسائی نے کتاب الضعفاء میں کہا ہے لیس بالقوی قوی نہیں ہیں۔
علی بن المدینی کہتے ہیں۔ قدری ہے۔ انھوں نے متہم بالقدر قرار دیا ہے، یحیٰ بن سعید سے بھی ایک روایت تضعیف کی مروی ہے۔ ابوحاتم کا قول ہے کہ یہ احتجاج کے قابل نہیں ہے لایحتج بہ۔ اگرچہ عبدالحمید کی بعض روایات کی تخریج امام مسلم نے اپنی صحیح میں کی ہے اور سنن اربعہ کے رجال میں داخل ہے۔ چنانچہ تہذیب ص۱۱۲ ج ۶ میں اقوال مذکورہ منقول ہیں۔ میزان الاعتدال میں حافظ ذہبی ناقل ہیں۔

وقد نقم علیہ الثوری خروجہ مع محمد بن عبد اللہ وقال ابوحاتم لا یحتج بہ وقیل کان یرمی بالقدر واللہ اعلم۔ نعم قال علی بن المدینی کان یقول بالقدر وکان عندنا ثقۃ وقال وکان سفیان یضعفہ انتہٰی۔ میزان ص۹۳ ج ۲)

(محمد بن عبداللہ کے ساتھ ان کے خروج پر سفیان ثوری نے عیب لگایا اور برا سمجھا، ابوحاتم نے کہا یہ حجت کے قابل نہیں۔ متہم بالقدر ہیں۔ علی بن المدینی نے کہا کہ قدر کے قائل تھے، ہمارے نزدیک ثقہ ہیں، سفیان ثوری ان کو ضعیف کہتے اور تضعیف کرتے ہیں، پس اس بناء پر ان کی حدیث حجت کے درجہ سے گری ہوئی ہے، خصوصاً ایک فرض قطعی کے ساقط کرنے میں ایسی روایت بطریق اولیٰ قابل احتجاج نہ ہوگی۔ اسی طرح مستدرک حاکم میں جو زیادتی ہے کہ ابن الزبیرؓ نے یہ کہا کہ میں نے حضرت عمرؓ کو اسی طرح دیکھا ہے قابل احتجاج نہیں ہے اس لئے کہ عبدالحمید بن جعفر اس طریق میں بھی موجود ہیں۔ نیز اگر یہ فعل حضرت عمرؓ کا مشہور و معروف ہوتا تو ابن الزبیرؓ کے فعل پر لوگ معترض نہ ہوتے اور انکار نہ کرتے، حالانکہ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا اور اس کا انکار کر دیا۔

احباب وقارئین توجہ فرمائیں

مفتی عبدالواحدؒ میموریل اکیڈیمی نے مفتی مرحوم کی سوانح حیات مدوّن کرنے کا فیصلہ کیا ہے قارئین ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، مفتی مرحوم کے تلامذہ، ہمعصر ساتھیوں، رشتہ داروں اور متعلقین سے گذارش ہے کہ اگر ان کے پاس اس سلسلے میں کسی قسم کا مواد ہو تو ارسال فرمائیں ہم شکریہ کے ساتھ متعلقہ مواد لوٹا دیںگے، پتہ ذیل پر رابطہ قائم کریں: (۱) مفتی عبدالشکور کاشمیری مدرسہ نصرت العلوم محلہ فاروق گنج نزد گھنٹہ گھر۔ گوجرانوالہ منجانب :۔ (مولانا) زاہد الراشدی، (مولانا) قاضی حمید اللہ (سرپرست)، احمد حسین زید (جنرل سیکرٹری) اور عہدیداران مفتی عبدالواحدؒ میموریل اکیڈیمی۔ دفتر جامع مسجد شیرانوالہ باغ۔ گوجرانوالہ

از

قرآن حکیم اور جدید سائنس

ایک حقیقت پسندانہ اہم تبصرہ

از جناب کریم الدین صاحب مقیم حال جدہ

تمہید! زیر تبصرہ کتابچہ مشہور فرانسیسی ڈاکٹر جناب موریس بکائی صاحب کے ایک لکچر کا اردو ترجمہ ہے۔ جو بات اس میں نیز ڈاکٹر صاحب کی ضخیم کتاب "بائیبل قرآن اور سائنس" (جو انگریزی اور اردو میں بھی دستیاب ہے) میں احقر کو خصوصاً کھٹکی، وہ اُن کا یہ خیال ہے کہ مفسرین قرآن سائنس سے ناواقفیت کی بنا پر قرآن مجید کی تکوینی آیات کی صحیح اور شافی تفسیر نہ کر سکے۔ یہ خیال انتہائی غلط اور منجملہ فتن قرب قیامت کے ایک فتنہ ہے، جس سے اس لکچر کے مترجم صاحب سب سے پہلے متأثر ہوتے اور ان کے علاوہ نہ معلوم کتنے مسلمانوں کا ذہن اس کتابچہ نیز کتاب سے بگڑا ہوگا۔ اس لئے بطور تبلیغ اس زہر کا تریاق یعنی تبصرہ ذیل سپرد قلم کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ قارئین کرام توجہ سے مطالعہ فرمائیں گے۔ اور اپنے اہل تعلق کو بھی اس کے مندرجات پر مطلع ہونے کا موقع دیکر ماجور ہوں گے اس تبصرہ میں ڈاکٹر صاحب یا مترجم صاحب کی باتیں نمبر وار بحوالہ صفحہ شروع میں آلٹے اور سیدھے واوین (Inverted commas) تبصرہ کے درمیان لکھکر ان پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

(۱) صفحہ ۳: "ایک عیسائی ہونے کے باوجود ڈاکٹر بکائی نے قرآن مجید کا معروضی مطالعہ کرکے ایسے حقائق دریافت کئے ہیں جن کی تصدیق جدید سائنس نے کردی ہے، جو علمی پسماندگی اور سائنسی علوم سے ناواقفیت کی بنا پر ہمارے مسلمان مفسرین (قدیم ہوں یا جدید) کی نظروں سے اوجھل رہے"۔ قدیم مفسرین میں صحابۂ کرام رض اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں، جن کے لئے "علمی پسماندگی" کا قائل ہونا بڑی مذموم جسارت اور بدعقیدگی ہے، خصوصاً جب کہ علم سے مراد شرعاً علم دین ہی لیا جاتا ہے کیونکہ وہی ورثۃ الانبیاء ہے۔ مولانا روم رح فرماتے ہیں ؎

علم نبود جز بعلم عاشقی ❊ ما بقی تلبیس ابلیس شقی!

علم دین فقہ است و تفسیر و حدیث ❊ ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث

پھر مشہور حدیث "تابیر نخل" سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے زاید از دس سال بعد تک بھی، جب کہ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ جیسی آیتیں بھی نازل ہو چکی تھیں — علم النباتات (BOTANY) کے ایک معمولی سے مسئلہ یعنی نباتات میں جنسیات کے وجود "(SEX IN PLANTS) اور مصنوعی بار آوری" (ARTIFICIAL-POLLINATINO) سے بھی ناواقف تھے تاہم اس سے آپ کے کار منصبی (دعوت و تبلیغ اسلام) میں ذرہ برابر نقص لازم نہیں آتا۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ قرآن مجید کی ہر آیت کی صحیح تفسیر پر قادر تھے جیسا کہ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ سے ظاہر ہے۔ پس ثابت ہوا کہ قرآن کی کسی بھی آیت کی صحیح اور بقدر ضرورت قابلِ فہم تفسیر کرنے کے لئے علوم جدیدہ سے واقفیت ضروری نہیں۔

(۲) صفحہ ۴۔ مصنف کے نزدیک قرآن میں بعض ایسے حقائق بھی ہیں جنھیں ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ انسانی علم خدا تعالیٰ کے علم کے سامنے بہر حال محدود ہے۔ اور شاید آئندہ چل کر نئی خلائی اور سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ان حقائق کو سمجھنا آسان ہو جائے"۔ مصنف نے اکثر قرآنی حقائق (متعلقہ تخلیق کائنات) سمجھ لئے ہیں، اس طور پر کہ اُن کے خیال سے سائنس سے اُن کی تصدیق ہو جاتی ہے (اُن کے خیال سے اس لئے کہا کہ احقر کے نزدیک بعض حقائق کی موجودہ سائنس پر پوری تطبیق نہیں ہوتی)، اور انھوں نے مان لیا ہے کہ قرآن حضور کا کلام نہیں ہو سکتا، ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ان پر واضح ہو گئی ہے کہ بر خلاف قرآن کے بائبل سائنس کی کسوٹی پر کھری نہیں اُترتی اس تحقیق کا جو انھوں نے غیر معمولی لگن کے ساتھ کی، بڑا مقتضا یہ تھا کہ وہ ایمان لے آتے مگر اس لکچر کے وقت تک وہ مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے جس سے قرآنِ پاک کی ان آیتوں کی تفسیر بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے — وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۔ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۔ دراصل ایمان لانے کے اسباب و وجوہ میں بڑا دخل توفیقِ الٰہی ہی کو ہے، اور کچھ ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے بیان کردہ ایسے جملہ حقائق کو علوم جدیدہ پر پورے طور سے منطبق کر دینے پر بھی متحقق ہو سکے، البتہ ہمیں اُن کو توفیق دے جانے کی دُعا کرنا چاہئے۔ (بحمد اللہ ڈاکٹر صاحب مسلمان ہو چکے ہیں جس کا علم احقر کو اس تبصرہ لکھنے کے بعد ہوا)

(۳) صفحہ ۵۔ یہ لکچر قرآن کو سمجھنے کی ایک نئی جہت اور تفسیر کے ایک نئے پہلو سے ہمیں آگاہ کرتا ہے اسے نقطۂ آغاز سمجھ کر آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ اگر ایک غیر مسلم سائنداں پہلی بار قرآن کا مطالعہ کر کے

یہ حقائق دریافت کر سکتا ہے تو ہمارے اپنے علماء اور سائنسدان ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟"

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا، آیات قرآنی کی صحیح تفسیر اس نئی جہت اور اس نئے پہلو پر منحصر نہیں، اس لئے یہ چیز غیر ضروری ہے۔ پھر یہ کام کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جو محض عالم ہو یا نرا سائنسدان، بلکہ وہی کر سکتا ہے جو عالم ہونے کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ میں بھی اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتا ہو۔ جو بظاہر ممکن نظر نہیں آتا۔ اگر خصوصی کوشش کے نتیجہ میں کوئی ایسا عالم تیار بھی کر لیا جائے تو تفسیر بالرائے کی وعید جو احادیث میں آئی ہے، اُسے اس قسم کی تفسیریں کرنے سے مانع ہوگی۔ جیسی ڈاکٹر صاحب نے کی ہیں یا تجویز فرمائی ہیں (مثلاً سِتَّةِ اَیَّامٍ کو چھ ادوار سمجھنا، آسمان سے مراد زمین کے علاوہ عالم بالا یعنی ستاروں سیاروں اور کہکشانوں کا مجموعہ لینا۔ سات کے عدد کو جو آسمانوں اور ایک سورۃ میں (مطابق حدیث) زمینوں کے لئے بھی آیا ہے محض علامت جمع سمجھ کر بہت سے آسمانوں اور زمینوں کے وجود کا قائل ہونا۔ لفظاً مُوسِعُونَ کا ترجمہ محض سائنسی نظریہ سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے بجائے "وسیع القدرت" کے "پھیلانے والے" کرنا، کیونکہ سائنسی نظریہ کے مطابق کائنات برابر پھیلتی جا رہی ہے۔ آیت ۳۳ سورۂ رحمٰن یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ..... إِلَّا بِسُلْطَانٍ۔ سے خلائی تسخیر کا اشارہ نکالنا۔ آسمانِ دنیا سے مراد نظام شمسی لینا۔ مَا بَيْنَهُمَا (زمین اور آسمان کے درمیان) ایک طرح کے مادے کے پل مراد لینا جو باضابطہ فلکیاتی نظاموں سے باہر ہیں (Cosmic EXTRA- GALACTIC MATEVIAL۔ یہ دعویٰ کرنا کہ قرآن میں کواکب سے مراد سیارے ہیں نباتات میں جنسیات کے وجود کی بنا پر لفظ اَزْوَاج سے نر و مادہ کے جوڑے مراد لینا حالانکہ اس کے معنیٰ مقابل قسموں کے ہیں۔ سائنس کے نظریہ "زندگی کی ابتداء پانی میں ہوئی"، کو قرآن کی آیت "ہم نے پانی سے ہر جاندار شے کو بنایا" کے مترادف سمجھنا، وغیرہ وغیرہ) اور اگر بالفرض اس نے تفسیر بالرائے کی وعید کے علی الرغم اس قسم کی آیتوں کی تفسیروں کو ڈاکٹر صاحب کی طرح کھینچ تان کر علوم جدیدہ پر منطبق کر بھی دیا تو اُن کو سمجھنے والے کتنے مسلمان مل سکیں گے؟ یقیناً عوام تو اُس کو پڑھ کر گمراہ ہی ہوں گے کیونکہ وہ اس کو تو سمجھ نہ سکیں گے اور صحیح اور عام فہم تفسیر اُن کے سامنے نہ ہوگی اسلئے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تفسیر پڑھنے ہی سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کش ہو جائیں اور طرح طرح کی گمراہیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا رہیں۔ غرض مترجم صاحب کی تجویز نہ قابل عمل ہے نہ مفید، بلکہ موجودہ لادینی ماحول میں سخت مضر بھی ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے ساری کائنات کو، جس کی وسعت کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا، صرف سحابیہ (NEBULA) سے بنا ہوا ثابت کر دیا، اور یہ نہیں بتلایا کہ وہ سحابیہ اتنی مقدار میں کہاں سے آیا تھا

جس سے یہ خطرہ کچھ بعید از امکان نہیں کہ قاری کہیں مادّہ کو قدیم نہ سمجھنے لگے۔ پس سلامتی اسی میں ہے کہ ہمارے علماء اور سائنسداں آیاتِ قرآنی کی تفاسیر کو علوم جدیدہ پر منطبق کرنے کی خطرناک کوشش نہ کریں۔ آگے چل کر احقر اس کوشش کی خرابیاں انشاء اللہ بتلائے گا۔

(۴) صفحہ ۵۔ "کیا دوسرے علوم وفنون کی طرح قرآن کو دریافت کرنے کا شرف بھی مغرب کو حاصل ہونے والا ہے؟" "قرآن کو" دریافت کرنے" کا مطلب اگر مترجم صاحب کے نزدیک اس کی تکوینی آیات کو علومِ جدیدہ کے عین مطابق ثابت کرنا ہی ہے تو یہ کام اہلِ مغرب ہی کو کرنے دیجیے، شاید وہ اس تحقیق سے اسلام کے قریب آسکیں، لیکن مسلمانوں کو ایسا کرنا مناسب نہیں۔ کیونکہ اوّل تو یہ تطبیق پورے طور سے ممکن نہ ہوگی جیسے حقیقت آسمان، مستقرِ شمس، پیدائشِ حیاۃ فی الماء، پیدائشِ جبال وغیرہ میں قرآنی آیات کا مفہوم متعلقہ سائنسی تفصیلات کی طرف مشیر نہیں۔ اور اگر کھینچ تان کر دونوں میں تطبیق پیدا کر بھی دی گئی تو عوام کے لئے ایسی تفاسیر ناقابلِ فہم ہونگی۔ اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، مُضر اور گمراہ کن بھی ہوسکتی ہیں۔ دوسرے ایسا کرنا قطعی بے ضرورت بھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ایسی آیتوں سے علوم جدیدہ کی تعلیم تو مقصود ہے نہیں اور جس مقصد کے لئے اُن کا نزول ہوا ہے وہ ان کی معمولی تفاسیر سے (جو ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ناکافی اور غلط ہیں) بھی بخوبی حاصل ہے، پھر ایک دشوار اور پُرخطر راہ میں قدم رکھنے سے کیا فائدہ؟ اگر یہ کہا جائے کہ سائنسی معلومات سے خدا کی عظمت وقدرت کا زیادہ انکشاف ہوکر ایمان ویقین میں ترقی ہوتی ہے، تو یہ بات نظری طور پر تو درست معلوم ہوتی ہے لیکن عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر سائنسداں خدا کے وجود کے بھی قائل نہیں، جس کی وجہ غیر خدا پرستانہ ماحول، جذبۂ خدا پرستی سے خالی اساتذہ اور لادینی تعلیمات پر مشتمل کتابیں ہیں۔ بھلا جو طلباء اسکولوں اور کالجوں میں یہ پڑھیں کہ ہمارے بزرگ بندر تھے وہ تخلیقِ آدمؑ کے قرآنی قصّہ پر کیسے ایمان لائیں گے؟ جو یہ سمجھتے ہوں کہ ابھی سورج اربوں سال موجودہ حالت پر باقی رہے گا وہ کیسے قیامت کو قریب سمجھ سکتے ہیں؟ جو لوگ پہاڑوں کو زمین کے بالائی پوسٹ (CRUST) کے ٹھنڈا ہونے پر سکڑنے کے نتیجہ میں بنا ہوا سمجھیں اُن کی سمجھ میں یہ بات کیونکر آئے گی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خصوصی طور پر زمین کی میخیں بنایا ہے تاکہ وہ ہمیں لیکر ہلنے نہ لگے؟

میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو علوم جدیدہ نہ پڑھنے چاہئیں، نہیں بلکہ حتی الامکان دیندارانہ ماحول میں خوب پڑھے جائیں، لیکن قرآن مجید کی موجودہ تفاسیر کی تصحیح کے لئے نہیں،

بلکہ مفید ایجادات کے لئے جس میں افسوس ہے کہ مسلمان دنیا کی متمدن اقوام سے بہت پیچھے ہیں۔ اور اس وجہ سے بھی دنیا میں کمزور ۔۔۔۔۔ ہیں، حتّٰی کہ جینے کے حق سے بھی محروم کئے جارہے ہیں۔

(۵) صفحہ ۸ "میرے خیال میں اسلام اور سائنس کے درمیان قرب کی بہترین وضاحت پیغمبر اسلام کی مندرجہ ذیل حدیث سے ہوتی ہے۔ "علم حاصل کرو خواہ (آپ کو) چین کیوں نہ جانا پڑے" یہ حدیث گویا انسان کے لئے علم سیکھنے اور اس میں اضافہ کرنے کی صلائے عام ہے" علماء محققین۔ مثلاً حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے نزدیک حدیث "اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّيْنِ" میں علم سے مراد علم دین ہے جو اُس زمانہ میں چین میں نہ تھا۔ جبکہ سائنس کسی نہ کسی حد تک تھا۔ لفظ وَلَوْ (اگرچہ) فرض کرنے کے مفہوم میں آتا ہے یعنی بالفرض اگر چین میں بھی علم دین ہو تو وہاں سے بھی اُسے حاصل کرو۔ حضرت مولاناؒ نے اپنے بعض مواعظ میں اس حدیث پر کافی بحث کرکے یہی مطلب واضح فرمایا ہے۔ اگر حدیث کا وہ مطلب ہوتا جو ڈاکٹر صاحب نے سمجھا ہے، یا بعض مسلمان بھی غلطی سے ایسا ہی سمجھتے ہیں، تو کم از کم ابتدائے اسلام میں مسلمان ضرور دوسرے ملکوں میں ایسے علوم سیکھنے جایا کرتے، مگر تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی تاہم دنیوی علوم سیکھنے کے لئے سفر کرنا بھی جائز ہے اگرچہ حدیث مذکورہ اس کی مؤید نہیں۔

(۶) صفحہ ۸ "اور قرآنی متن کی بہتر تشریح و تفہیم کے لئے بعض خالص سائنسی معلومات کو استعمال کیا جاتا ہے"۔ ہم اوپر ثابت کرچکے ہیں کہ قرآن کی کسی بھی آیت کی صحیح اور عام فہم تفسیر کرنے کے لئے علوم جدیدہ سے واقفیت ضروری نہیں۔ پس ڈاکٹر صاحب کا یہ قول کہ سائنسی معلومات کے ذریعہ قرآنی متن (یعنی اس کی تکوینی آیات) کی بہتر تشریح و تفہیم ہوتی ہے، صحیح نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کسی آیت کی بہتر تشریح وہی کہلائی جاسکتی ہے جس سے اس کے نزول کا مقصد بآسانی پورا ہوسکے، جو یقیناً، سائنس پڑھانا نہیں ہے بلکہ اظہارِ عظمتِ قدرت کے ذریعہ مخاطبین کو توحید کا قائل بنانا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خود بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں، جیسا کہ ان کے قول "قرآن بنیادی طور پر ایک عظیم اور مقدس مذہبی کتاب ہے اور بذاتِ خود ہم اس سے کبھی سائنسی مقصد کی توقع نہیں کرسکتے، مثلاً جب انسان کو امر تخلیق اور متعدد طبیعی مظاہر پر غور و فکر کی دعوت دیجاتی ہے تو بظاہر اس دعوت کا مقصد باری تعالیٰ کی قدرتِ مطلق پر زور دینا ہوتا ہے (پمفلٹ زیر تبصرہ ص ۱۲)" سے ظاہر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا زمانہ نزول قرآن میں یا ہمارے اس سائنسی ترقی کے زمانہ میں بھی قرآن کا (مثلاً) سورج کو سراجِ وہّاج، اور چاند کو محض نورانی فرمانا اس مقصد کے لئے کافی ہے۔

یا اس کی طویل سائنسی تشریح و تفصیل؟ اوّل الذکر کی تصدیق صرف مشاہدہ سے ہو جاتی ہے کیونکہ سورج تیز روشنی اور جھلسا دینے والی گرمی پہنچانے میں بھڑکتے ہوئے چراغ کی مانند ہے اور چاند ہلکی اور ٹھنڈی روشنی دیتا ہے اس لئے اُسے نورانی کہنا ہی مناسب ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اپنے خالق کے وجود اور اس کی توحید پر دلالت کرتی ہیں۔ اب اُن کے متعلق آخر الذکر یعنی سائنسی تشریحات کو لیجئے تو پہلے تو مخاطب کو یہ بتلانا پڑے گا کہ تخلیق کائنات سے قبل فضاء بسیط سحابیہ (NEBULA) سے پُر تھی جو دُھویں سے مشابہ ایک چیز تھی جس میں ہائیڈروجن اور ہیلیم گیسوں کے ذرّات ملے ہوئے تھے جو متحرک اور ناقابل تصور درجہ حرارت پر تھے۔ کسی حادثہ یا دھماکے کے نتیجہ میں اس سحابیہ میں انشقاق پیدا ہوا جس سے وہ لاتعداد ستاروں کے مجموعوں (GALAXIES) میں منقسم ہو گیا۔ ان میں سے ایک مجموعہ میں ہمارا سورج بھی ہے جس کا کچھ حصہ ٹوٹ کر آٹھ یا نو سیارے بن گئے جو مختلف مداروں میں مختلف چال سے سورج کے گرد گھومنے لگے۔ ان سیاروں میں ایک ہماری زمین بھی ہے۔ پھر زمین سے ایک ٹکڑا علیحدہ ہو کر چاند یا تحتی سیارہ بن کر زمین کے گرد ساڑھے انتیس دن میں اوسطاً دو لاکھ چالیس ہزار میل کے فاصلہ پر رہ کر ایک چکر پورا کرنے والا ہُوا۔ زمین سے سورج بلحاظ وزن تین لاکھ گنا اور بلحاظ حجم تقریباً تیرہ لاکھ گنا ہے۔ اندرونی احتراق کے نتیجہ میں، جو اس میں برابر ہوتا رہتا ہے، اس سے تیز روشنی اور گرمی خارج ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے اس کو "سراج وہاج" کہنا مناسب ہوا۔ اور چاند چونکہ خود روشن نہیں بلکہ سورج کی روشنی جو اس پر پڑتی ہے اسی کو زمین کی طرف منعکس کرتا ہے یعنی اس کی روشنی سورج سے مستعار ہے اس لئے اُسے صرف نورانی کہہ سکتے ہیں۔ اس پر اگر مخاطب یہ سوالات پیش کرے کہ سحابیہ، سورج اور زمین میں مذکورہ حوادث کیوں واقع ہوئے؟ جب زمین سورج کا ہی ٹکڑا تھی تو اس میں اندرونی احتراق کی خاصیت سورج والی کیوں باقی نہ رہی۔ یا جب چاند زمین کا ہی ایک ٹکڑا تھا تو اس میں زمین کے خواص مثلاً کرۂ ہوا، باد، باراں، نباتات و حیوانات وغیرہ کیوں نہ پیدا ہوئے وغیرہ؟ مجھے یقین نہیں کہ اس قسم کے سوالات واشکالات جو اس تشریح کے متعلق پیدا ہوں گے۔ سائنس سے اُن کے جوابات شافی مل سکیں گے، اور بالآخر ایک منصف سائنسداں بھی یہی کہنے پر مجبور ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے یوں ہی چاہا اور زبان حال سے

ہر چہ دانا کند کند ناداں ⁂ لیک بعد از خرابی بسیار

کا مصداق ہوگا۔ اب ڈاکٹر صاحب اور قارئین کرام خود فیصلہ کرلیں کہ کیا سائنسی تشریح و تفہیم جو سیدھی سادی اور صحیح تفاسیر کے مقابلہ میں "بہتر" سمجھی جانے کی کسی درجہ میں بھی مستحق ہے؟ پھر یہ بات

بھی کچھ بے وزن نہیں کہ بعض سائنسی نظریات جن کی بنیاد ظن وتخمین پر ہوتی ہے کبھی غلط ثابت ہوتے ہیں یا کم از کم ان کی صحت مشکوک ہوجاتی ہے مثلاً یہ نظریہ کہ چاند زمین کا ٹکڑا ہے مشکوک ہوگیا ہے کیونکہ چاند کی بعض چٹانیں (جو وہاں پہونچنے پر دستیاب ہوئی ہیں) طبقاتی جانچ کرنے پر زمین کی چٹانوں سے زیادہ پرانی ثابت ہوئی ہیں۔ ایسی صورت میں سائنسی معلومات پر مبنی بعض آیتوں کی تشریح وتفہیم کو عام تفاسیر سے بہتر تو کجا اپنی جگہ صحیح بھی نہیں سمجھا جاسکتا۔

دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹتے ہیں یا دن کو رات پر سے اُتار لیتے ہیں۔ اس کا سیدھا سادہ مطلب تو رات ودن کا توارد ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے وسیع القدرت ہونے اور اس کی توحید پر دلالت ہوتی ہے۔ لیکن اگر ان آیتوں کی سائنسی تشریح وتفہیم کی جائے تو مخاطب کو پہلے یہ سمجھانا پڑے گا کہ کرۂ زمین (جس کا گیند کی طرح تقریباً آٹھ ہزار میل قطر کا ایک کروی جرم ہونا اُس نے تسلیم کرلیا ہو) کا نصف حصہ ہمیشہ سورج کے سامنے رہتا ہے اور وہاں دن اور دوسری طرف نصف حصہ میں رات ہوتی ہے۔ پھر اس کو یہ بتلانا پڑے گا کہ کرۂ زمین اپنے محور پر ایک دن رات یعنی چوبیس ۲۴ گھنٹہ میں ایک چکر لگاتا ہے جس سے روشن حصہ تاریکی میں اور تاریک حصہ روشنی میں آتا رہتا ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹنا یا دن کو رات پر سے اُتار لینا فرماتے ہیں۔ اس پر اگر مخاطب یہ سوال کرے کہ زمین کی محوری گردش کی وجہ کیا ہے اور اس گردش کی رفتار اتنی ہی کیوں ہے کہ چوبیس گھنٹہ میں ایک چکر پورا ہو؟ تو پھر سائنسداں کو یہی کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح چاہا۔

تیسری مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا ہے کہ ہم رات کو دن میں داخل کردیتے ہیں جس سے دن بڑھ جاتا ہے اور دن کو رات میں داخل کردیتے ہیں جس سے رات بڑھ جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہر شخص کو مشاہد ہے۔ سائنس اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ زمین اپنے بیضاوی مدار میں سورج سے تقریباً ۹ کروڑ چھتیس ۳۶ لاکھ میل کے فاصلہ پر رہتے ہوئے ایک سال (۳۶۵ ¼ دنوں) میں ایک چکر لگاتی ہے۔ یہ گردش اس کی محوری گردش مذکورہ بالا کے علاوہ ہے۔ پھر ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس کا محور سطح مدار پر عموداً واقع نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ۶۶ ½ درجہ کا زاویہ بناتا ہے، نیز یہ جھکاؤ ہمیشہ ایک ہی سمت میں رہتا ہے جس کے نتیجہ میں سورج کی شعاعیں کبھی خط استوا پر سیدھی پڑتی ہیں کبھی خط سرطان پر اور کبھی خط جدی پر جس سے دن رات گھٹتے بڑھتے اور موسم بدلتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ توجیہ عوام کی سمجھ سے بالاتر ہے اور اس میں بھی محور کے جھکاؤ کی کوئی وجہ سائنس سوا اس کے

نہیں بتلا سکتا کہ خدا نے ہی جھکا رکھا ہے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ سورۃ رحمٰن آیت ۱۹، ۲۰ میں ہے "اسی نے دو دریاؤں کو (صورۃً) ملایا کہ باہم ملے ہوئے ہیں (مگر حقیقۃً) ان دونوں کے درمیان ایک حجاب (قدرتی) ہے کہ دونوں (کے پانی اپنے رنگ اور ذائقہ کے ساتھ الگ الگ رہتے ہیں اور ایک دوسرے میں داخل ہونے کیلئے) بڑھ نہیں سکتے" یہ کیفیت دو ندیوں کے سنگم پر یا کسی دریا کے سمندر میں گرنے کے مقام پر مشاہدہ سے ہر شخص کو معلوم ہو جاتی ہے اور غور و فکر کرنے والے بآسانی اس سے اللہ تعالیٰ کی عجیب و عظیم قدرت اور توحید پر استدلال کر سکتے ہیں۔ سائنسی معلومات کے اعتبار سے یہ حجاب یا برزخ "سطحی تناؤ" (SURFACE TENSION) کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ جس کو آج کل سائنس سے ناواقف لوگ سمجھانے سے بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اور سمجھنے والوں کو بھی یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ پانی میں یہ خاصیت اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کی ہے۔

اس مختصر سے تبصرہ میں گنجائش نہیں ورنہ میں ہر تکوینی آیت کے متعلق یہ دکھلاتا کہ اس کی جو تفسیر ممتاز مفسرین (خصوصاً حضرت تھانویؒ) نے کی ہے وہ اس کے مقصد نزول کے اعتبار سے بہترین اور ہر زمانہ کے لوگوں کے لئے بآسانی قابل فہم ہے اور سائنسی معلومات سے اس کی بہتر تشریح و تفہیم نہیں ہوتی ---------- کیونکہ ایسی تشریح و تفہیم زمانۂ نزول قرآن میں تو سبھی کے لئے ناقابل فہم تھی اور آج بھی غیر سائنسدانوں یعنی عوام کے لئے ایسی ہی ہے۔

اور یہ تو ان سائنسی معلومات کا ذکر ہے جن کی طرف قرآنی آیات میں اشارے ملتے ہیں مگر بعض آیات کو تو سائنسی نظریات و انکشافات پر منطبق کرنا بالکل ہی غلط ہے۔ (مثلاً قرآن سے ہر شے میں نر و مادہ کے جوڑوں کا وجود ثابت کرنا، زندگی کا آغاز پانی سے ہوا سمجھنا وغیرہ) جن کی کچھ تفصیل نمبر (۳) میں اوپر آچکی ہے اور آئندہ بھی آئے گی۔ آخیر میں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ سائنس سے بعض مظاہر قدرت کی توجیہ بیشک ہوتی ہے۔ لیکن جیسے مٹھائی کھانے کے خواہشمند کو اس کے بنانے کا طریقہ معلوم کرنے کے درپے ہونا بیکار ہے، اسی طرح قرآنی آیتوں کی بقدر ضرورت صحیح تفاسیر کے لئے ان توجیہات میں پڑنا غیر ضروری ہے خصوصاً جبکہ وہ عام فہم بھی نہ ہوں۔ البتہ تبلیغ اسلام میں ان سے مدد لی جاسکتی ہے

(۷) صفحہ ۱۰۰ "اگر ہم قرآن مجید کی پرانی تفاسیر کو دیکھیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ باوجودیکہ وہ تمام اصحاب تفسیر اپنے اپنے زمانہ میں علم و دانش میں بہت ممتاز گردانے جاتے تھے، لیکن ان آیات کے معانی سمجھنے میں مکمل طور پر ناکام رہے ہیں" جو تفسیر میں ایسی آیات کی اسلاف نے کی ہیں وہ کافی

ہیں، پس وہ ناکام قطعی نہیں رہے۔ اگر ان کو ناکام سمجھا جائے تو ناکامی کا یہ سلسلہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچے گا۔ جس کا کوئی مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

(۸) صفحہ ۱۱۔ ایک عام اور اوسط درجہ کے سائنس داں کے لئے جس نے ان مضامین پر کوئی خصوصی ریسرچ (RESEARCH) نہیں کی یا تخصیص حاصل نہیں کی، جن کی تفصیل قرآن میں دی گئی ہے، قرآن کی ان متعلقہ آیات کا مفہوم سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسی تمام آیات قرآنی کو سمجھنے کیلئے آج بھی ضروری ہے کہ ایک شخص کے پاس علم کا مکمل انسائیکلوپیڈیا ہو جس کے ذریعہ وہ علم کی ہر شاخ پر حاوی ہو سکتا ہو۔" تبھی تو ہم کہتے ہیں کہ ایسی آیات کی معمولی عام فہم تفسیر ہی کافی ہیں جن سے وہ مقصد پورا ہو جائے جس کے لئے وہ نازل فرمائی گئی ہیں۔ اگر سائنسی تفسیر ہی مقصود ہوتیں تو ہرگز ایسی آیات کا نزول عرب کے امی لوگوں پر نہ فرمایا جاتا۔ یقیناً کسی سے ایسی بات کہنا جس کا مطلب زائد از ہزار سال بعد سمجھ میں آنے والا ہو، ایک فعل عبث بلکہ نادانی ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ اس کی نسبت کہتے ہیں۔

(۹) صفحہ ۱۱" قرآن مجید میں بعض ایسے بیانات کی مثالیں بھی ملتی ہیں جنھیں جدید سائنس ابھی تک ثابت نہیں کر سکی، تاہم اب تک اس سلسلہ میں جو شواہد دستیاب ہوئے ہیں، وہ سائنس دانوں کو ان کی امکانی صداقت باور کرانے کے لئے کافی ہیں۔ اس کی ایک مثال قرآن مجید کا یہ ارشاد ہے کہ زندگی کا آغاز پانی سے ہوا۔ دوسری مثال قرآن مجید میں موجود بیان ہے کہ کائنات میں اور کہیں ہماری طرح کی زمینیں یا دنیائیں بھی موجود ہیں۔" احقر کے مطالعہ قرآن کی حد تک کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس کا یہ مطلب ہو کہ زندگی کا آغاز پانی سے ہوا، اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب (بائیبل قرآن اور سائنس) میں تین حوالے دئے ہیں: آیت ۳۰ سورۂ انبیاء، آیت ۵۳ سورۂ طٰہٰ اور آیت ۴۵ سورۂ نور، ہر ایک کا تفسیری ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

آیت ۳۰ سورۂ انبیاء" اور ہم نے پانی سے (نباتات ہی کو نہیں بلکہ) ہر جاندار کو بنایا ہے (خواہ حدوثاً خواہ بقاءً، خواہ بواسطہ یا بلاواسطہ، جیسا دوسری آیت میں ہے، وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ)

آیت ۵۳ سورۂ طٰہٰ" اور آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہم نے اس (پانی) کے ذریعہ سے اقسام مختلفہ کے نباتات پیدا کئے"۔

آیت ۴۵ سورۂ نور ۲۴ اور اللہ نے ہر چلنے والے جاندار کو (بری ہو یا بحری ایک طرح کے) پانی سے پیدا کیا۔

ان تینوں آیتوں میں سے کوئی بھی اس نظریہ کی تصدیق نہیں کرتی کہ "زندگی کا آغاز پانی سے ہوا" خصوصًا جبکہ سائنس کا نظریہ یہ بھی ہے کہ جو حیات پہلی بار پانی میں پیدا ہوئی تھی وہی دائمًا ہر جاندار چیز میں جاری وساری ہے، یوں کھینچ تان کر مطابقت پیدا کرنا دوسری بات ہے۔

رہی دوسری مثال تو قرآن میں صرف ایک جگہ آسمانوں کی طرح زمینیں بھی دس ساٹھ پیدا کرنا آیا ہے جس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ بالکل ہماری دُنیا کی طرح آباد ہیں۔ البتہ ربُّ العٰلمین سے ان کے دنیائیں ہونے کی طرف اشارہ ضرور ملتا ہے، "اگر عالَم" کے معنی ہماری دنیا جیسی دُنیا لیا جائے۔ جو کہ مفسرین نے نہیں لیا، اور سائنس سے بھی ابھی تک اس کی تصدیق نہیں ہوئی ہے۔ بہرحال ہمیں اس چکّر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ دنیا میں کہاں ہیں اور کیسی ہیں، جتنا قرآن نے بتلا دیا اسی پر ایمان لانا کافی ہے۔

(۱۰) صفحہ ۱۵: ہم قرآن کے ایسے بیانات کا جائزہ لیں گے جو آج محض سائنس کی صداقتوں کو ظاہر کرتے دکھائی دیتے ہیں جبکہ پچھلے زمانہ میں ان سے جو مطلب اخذ کیا جاتا تھا وہ یا تو عام قسم کا ہوتا تھا یا پھر سرے سے ان بیانات کو "ناقابلِ فہم خیال کیا جاتا تھا" قرآن کا کوئی بیان بجز متشابہات کے ایسا نہیں ہے جو واضح المراد نہ ہو، اسی لئے جگہ جگہ قرآن کو کتابِ واضح" کہا گیا ہے۔ پس جو مطلب کسی بیان کا پچھلے زمانہ میں اخذ کیا جاتا تھا (جسے آپ عام قسم کا کہتے ہیں) وہی کافی ہے، البتہ اس کی تفصیلات ناقابلِ فہم ہوسکتی ہیں مگر ان کے دَرپے ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "سورج اپنے مستقر کی طرف چل رہا ہے۔ اس بات پر ایمان لانے میں کیا پریشانی ہے؟ لیکن اگر آپ یہ جاننے کے درپے ہوں کہ کس چال سے چل رہا ہے، کیسے راستے پر چل رہا ہے۔ اس کا مستقر کہاں ہے، وغیرہ وغیرہ، تو یہ پریشانی آپ خود پیدا کر رہے ہیں۔ اور غلطی سے ان تفصیلات کو آیت کی صحیح تفسیر سمجھ کر بلاوجہ اسلاف کی معاذ اللہ تجہیل بھی کر رہے ہیں۔"

(۱۱) صفحہ ۱۸: جدید مفسرین کے نزدیک (ستۃ ایام) ایام سے مراد طویل ادوار یا زمانے ہیں نہ کہ محض چوبیس گھنٹوں پر مشتمل عام دن" یہ جدید مفسرین کا قیاس اور ایک غیر ضروری جرأت ہے بھلا جو خدا "کن" کہہ کر ہی کسی چیز کو پیدا کرنے پر قادر ہو وہ چھ دن کی مقدار وقت یعنی ۱۴۴ گھنٹہ میں زمین و آسمان وغیرہ کو کیوں پیدا نہیں کر سکتا؟ آیت ۹ سورۂ حٰمٓ سجدہ میں اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں: آپ فرما دیجئے کہ کیا تم لوگ ایسے خدا کی توحید کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو (باوجود اس کی اتنی بڑی وسعت کے) دو روز (کی مقدار وقت) میں پیدا کر دیا۔" اس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ ایام سے مراد معمولی چوبیس گھنٹے کے دن ہی ہیں نہ کہ طویل المدت ادوار کیونکہ اول الذکر میں اظہار عظمت قدرت زیادہ ہے۔

(۱۲) صفحہ ۱۹۔ آیت ۳۰ سورۂ انبیاء کی جو تفسیر ڈاکٹر صاحب نے کی ہے اور آج کل کے تجدد پسند مفسرین (مثلاً مولانا مودودیؒ) نے بھی اختیار کی ہے یعنی "کیا ان کافروں کو یہ علم نہیں کہ آسمان اور زمین (پہلے) ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، پھر ہم نے دونوں کو علیحدہ کر دیا؟" نامناسب اور غیر منطقیانہ ہے نامناسب تو یوں کہ جو چیز زائد از ہزار سال بعد اہل سائنس کو معلوم ہوئی (کہ ساری کائنات کا مادہ ایک ہی ہے یعنی سحابیہ یا "NEBULA") اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ کیا یہ کافر لوگ نہیں دیکھتے یا نہیں جانتے، معاذ اللہ بالکل بیجا ہے۔ کافر تو درکنار مسلمان بھی نہ صرف اس وقت کے بلکہ آج چودہ سو سال بعد تک کے بھی اس بات کو ایسے یقین کے ساتھ نہیں جانتے جس کو دیکھنا کہہ سکیں۔ اور غیر منطقیانہ یوں ہے کہ جب آسمان اور زمین بنے ہی نہ تھے اس وقت یہ کہنا کہ دونوں ملے ہوئے تھے صحیح نہیں۔ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ کرتے اور پجامے پہلے ملے ہوئے تھے (روئی کی شکل میں) پھر علیحدہ کئے گئے یا کہے کہ خون اور پاخانہ پہلے ملے ہوئے تھے (روٹی کی شکل میں) پھر علیحدہ علیحدہ کئے گئے۔ ظاہر ہے کہ اظہار مدعا کا یہ طریقہ بلکہ غیر منطقی بلکہ بیہودہ ہے، تو کیا ڈاکٹر صاحب اور دوسرے اس قسم کے مفسرین اللہ تعالیٰ سے معاذ اللہ ایسی بیہودگی کی امید کرتے ہیں؟ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ!

دراصل اس قسم کے مفسرین نے رَتْقٌ اور فَتْقٌ کے مناسب معنیٰ اختیار کرنے میں ٹھوکر کھائی رتق کے معنی ملانا اور جوڑنا بھی ہیں اور بند کرنا بھی۔ اسی طرح فتق کے معنیٰ علیحدہ کرنا بھی ہیں اور کھول دینا بھی۔ یہاں دوسرے معانی اختیار کرنا ہی مناسب ہے، اور آیت کی صحیح تفسیر جو قرآن کے مخاطبین اولین کے لئے بھی قابلِ فہم تھی اور آج ہمارے لئے بھی، یہ ہے:- (بقیہ صفحہ ۳۰)

لہ سورۂ قٓ آیت ۳۸ میں فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ کے بعد وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ بھی آیا ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہے کہ چھ دن کی مقدار وقت میں ہی پیدا کیا نہ کہ چھ ادوار میں جو کہ سائنسدانوں کے نزدیک کروڑوں سال پر پھیلے ہوتے ہیں کیونکہ کسی کام کو مدت طویلہ میں انجام دینے میں تکان کا احتمال عادۃً نہیں ہوتا۔

مدارسِ عربیّہ اور اُن کا نصابِ تعلیم

از مولانا محمد ابوبکر غازی پوری

سائنس اور ٹکنالوجی کی زبردست ترقی نے آج ہمارے سامنے بہت سے مسائل کھڑے کردیئے ہیں یہ مسائل اتنے گوناگوں ہیں کہ ہر شخص حیران و پریشان ہے کہ ان مسائل سے آخر نمٹا کیوں کر جائے اہل علم اور ارباب دانش اپنی اپنی کوششیں کررہے ہیں لیکن ابھی تک زندگی کی موجودہ دشواریوں کا جن کا تعلق اقتصادیات سے بھی ہے اور تعلیم سے بھی عقائد اور مذہب سے بھی ہے اور صنعت و حرفت سے بھی، ان دشواریوں کا خاطر خواہ حل سامنے نہیں آرہا ہے۔

ان گوناگوں مسائل میں سے جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے مدارسِ عربیہ کے موجودہ تعلیمی نظام اور تعلیمی نصاب کا بھی مسئلہ ہے۔ بعض لوگوں کو موجودہ تعلیمی طریقہ اور زیر تعلیم نصاب سے سخت اختلاف ہے، ان کے نزدیک یہ طریقۂ تعلیم بھی قابلِ غور ہے اور جو اس وقت ان مدارس میں نصاب پڑھایا جاتا ہے اس پر بھی انھیں سخت اعتراض ہے۔

کچھ لوگ ہیں جن کے نزدیک نہ طریقۂ تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور نہ یہ نصاب جس کا عرفی نام درس نظامی ہے اس میں کسی قابلِ لحاظ تبدیلی کی ضرورت ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ نصاب اپنے اندر آج بھی وہی صلاحیت رکھتا ہے جو صلاحیت اس میں کل تھی، علم میں رسوخ اور استعداد میں پختگی اور علمی و ادبی صلاحیت میں جلا اسی نصاب سے پیدا ہوتا رہا ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کل کیلئے مفید تھا اس کی افادیت آج نہ ہو۔

یہ دونوں ہی گروہ مخلص ہیں اور ان کے اخلاص میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں ہے، ہر ایک کا اپنا اپنا تجربہ ہے جس کے پیش نظر وہ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ مقصود دونوں ہی کا

مدارس عربیہ کی خیرخواہی اور ان طلبہ کی خیرخواہی ہے جو ان مدارس میں تعلیمی زندگی گذارتے ہیں۔

ابھی چند روز پہلے دارالعلوم دیوبند کے نمائندہ اجتماع میں جس میں ارباب علم اور اہل دین اور ذمہ داران مدارس عربیہ کی بڑی تعداد شریک تھی یہ مسئلہ زیر بحث تھا، اور دارالعلوم کے بعض ذمہ دار اساتذہ نے اس سلسلہ میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور بڑے پُرجوش انداز میں تبدیلی نصاب پر گفتگو کرکے ذمہ داران مدارس عربیہ سے گذارش کی کہ وہ اس بارے میں اپنی اپنی رائے سے مطلع کریں۔

دارالعلوم دیوبند ایک ایسا مرکز ہے جس سے ہندوستان کے بیشتر مدارس عربیہ ذہنی وعلمی ربط رکھتے ہیں، اسی مرکز سے ان مدارس کو آب حیات ملتا ہے۔ اس مرکز کے ہی ڈھانچے میں یہ مدارس ڈھلے ہوتے ہیں اور ان سب مدارس میں دیوبند ہی کا نصاب تعلیم اور وہیں کا طرز تعلیم رائج ہے۔ اگر دیوبند کے اس مرکز سے تبدیلی نصاب اور طریقہ تعلیم میں تغیر کی آواز بلند ہوتی ہے، تو اس آواز سے ان مدارس کا متأثر ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ ان مدارس کیلئے مرکز سے کٹ کر زندگی گزارنا دشوار ہوگا۔

اس لئے میرا اپنا خیال ہے کہ دارالعلوم کو اس سلسلہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اگر صرف یہ ایک مدرسہ کی بات ہوتی تو تشویش کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن یہ ہندوستان کے سارے ہی مدارس کا مسئلہ ہے اور دیوبند ان کا مرکز ہے یہاں کی کسی بھی آواز کی صدائے بازگشت ان مدارس میں سنائی دے گی۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پوری سنجیدگی اور کامل متانت سے اس مسئلہ پر غور کیا جائے، جوش سے زیادہ ہوش کا یہ مقام ہے، اور تبدیلی نصاب پر غور کرنے سے پہلے ان مدارس کی تعلیمی سرگرمیوں اور ان کی کارکردگیوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ جہاں درس نظامی کے علاوہ دوسرا نصاب پڑھایا جاتا ہے، ان مدارس سے پڑھ کر فارغ ہونیوالے فضلاء کی علمی صلاحیتوں کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے کہ وہ کہاں تک قوم وملت کو اپنے وجود سے مستفید کررہے ہیں۔ یہ نئے نصاب ان طلبہ میں علمی وادبی اور تدریسی وتعلیمی صلاحیت کہاں تک پیدا کررہے ہیں، ان نصابہائے تعلیم سے افرادسازی کا کام کیا پُرانے نصاب اور پُرانے طرز تعلیم سے عمدہ طریقہ پر انجام پارہا ہے؟ تعلیم کے ان گوشوں پر نگاہ رکھنا ضروری ہے، اور بلا کسی تحزب وتعصب کے نہایت ہوشمندی کے ساتھ ان دونوں ہی قسم کے نصاب کا جائزہ لینا اور ان کی تاثیر وعمل کو پرکھنا ضروری ہے نئے اور پُرانے طریقہ تعلیم دونوں کو سامنے رکھکر دیکھنا یہ ہے کہ فی الواقع ہمارے مدارس اور ان مدارس کے طلبہ کیلئے کونسا طرز مفید ہوسکتا ہے۔

نیز اس پر بھی نگاہ رکھنی بہت ضروری ہے کہ جن صلاحیتوں کے نمود و پختگی کا تعلق مشق و تمرین یا مدرس کی محنت و سعی سے ہے اس کو ہم نصاب تعلیم یا طرز تعلیم سے نہ جوڑیں، مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ لوگوں کو عام شکایت ہے کہ درس نظامی میں جو ادب عربی و انشاء کا حصہ ہے ان سے طلبہ میں عربی میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے بعض لوگوں کو نفحۃ الیمن، مقامات حریری، دیوان متنبی، حماسہ وغیرہ کتابوں پر سخت اعتراض ہے، اور جن مدارس میں یہ کتابیں داخل نصاب ہیں ہندوستان کا ایک حلقہ ان پر زبردست تنقید کرتا ہے، اور اس کی زبان پر موروثی ادب اور تقلیدی ادب جیسے طعن آمیز کلمات آتے رہتے ہیں -

لیکن میں عرض کروں گا کہ اس اعتراض میں کوئی جان نہیں ہے، اس لئے کہ کسی بھی زبان میں لکھنے بولنے کا تمام تر دار و مدار مشق و تمرین پر ہے، علمی و ادبی لیاقت اور گیرائی و گہرائی سے اس کا تعلق نہ ہونے کے برابر ہے، ایک شخص جس کی علمی صلاحیت کمزور ہے، ادب و زبان میں اس کا کوئی امتیازی مقام نہیں، لیکن محض مشق و تمرین کی وجہ سے اس کے اندر بولنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اور کسی ماہر فن کی تربیت میں رہ کر اس میدان کا وہ ایک ممتاز فرد بن جاتا ہے، اپنا بیس سالہ تجربہ یہ ہے کہ ادب و انشاء کی اس صلاحیت کا تعلق نصاب تعلیم یا طرز تعلیم سے قطعاً نہیں ہے، نہ مقامات اور دیوان متنبی اس کو اس میدان میں آگے بڑھنے سے مانع ہیں اور طٰہٰ حسین اور احمد امین اور متجددین ادباء کی کتابوں کے پڑھ لینے سے ادب و انشاء کی یہ صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے، اگر طالب علم میں ذوق ہے اس کی مشق و تمرین جاری ہے اور کسی صاحب ذوق کی اس کو صحبت میسر آگئی ہے۔ تو وہ بلا تکلف لکھنے بولنے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کرلے گا، مگر یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ جن کے اندر لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے وہ صاحب ذوق عربی کے ادیب بھی ہوں۔ اور قدماء عرب کے کلام کو سمجھنے اور سمجھانے کا بھی ان میں سلیقہ پیدا ہو گیا ہو، وہ قرآن و حدیث کے ادبی رموز کے اداشناس بھی ہوں اور ان کو زبان و ادب کی فنی مہارت و استعداد بھی حاصل ہوگئی ہو -

یہ صلاحیت و استعداد اگر اس کی کوئی قیمت ہے تو انھیں مقامات حریری اور دیوان متنبی اور حماسہ اور سبع معلقہ سے پیدا ہوگی، طرح طرح کی جو آج کل ادبی کتابیں وجود میں آگئی ہیں۔ تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ ان سے فائدہ اتنا نہیں جتنا نقصان ہے -

آپ ان مدارس کا اور ان مدارس کے فضلاء کا جہاں نصاب قدیم کے خلاف علم بغاوت بلند ہے اور جہاں مقاماتِ حریری اور دیوانِ متنبی کا نام لینا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ گہری نظر سے جائزہ

لے لیجئے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس نئے نصاب کی کارکردگی کیا ہے، ان کی ادبی صلاحیت جن کا ان مدارس میں بڑا شور و غوغا بلند رہتا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے، عجیب بات ہے کہ جو چیز محض مشق و تمرین سے متعلق تھی لوگوں نے اس کا پیوند نصاب کی کتابوں سے لگا دیا ہے۔

جن بزرگوں نے درس نظامی کو مدارسِ عربیہ کیلئے قبول کیا تھا ان کا مقصود ان علوم و فنون میں جن پر یہ درس نظامی مشتمل ہے۔ مہارت و رسوخ پیدا کرنا بطور ذریعہ کے بھی تھا اور بطور مقصود کے بھی تھا، اس نصاب کا وہ حصّہ جو دینیات پر مشتمل ہے اس حصّہ میں کامل دستگاہ بہم پہونچانا تاکہ اس کے ذریعہ سے قرآن و حدیث میں کامل درک بصیرت پیدا ہو سکے یہ تو اصل مقصود تھا اور اس نصاب کا جو حصّہ معقولات پر مشتمل ہے ان میں دستگاہ بہم پہونچانا یہ بطور ذریعہ کے تھا۔ اسلئے کہ ان علوم میں کامل دستگاہ بہم پہونچائے بغیر ہم قدماء محققین کے علمی افادات سے استفادہ آسانی سے نہیں کر سکتے، اور یہ ایسی بدیہی حقیقت ہے کہ جس کا انکار کوئی صاحب رائے جس کی نگاہِ علوم اسلامیہ اور اس کی پوری تاریخ پر ہے نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ ابن حزم، ابن رُشد، ابن تیمیہ، امام رازی، امام غزالی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہ کی کتابوں سے کامل استفادہ وہی کر سکتا ہے، جو اس درس نظامی کا پڑھنے پڑھانے والا ہوگا اور اس کے معقولات کے حصّہ کو بھی اس کے منقولات کے حصّہ کی طرح ہم ہضم کرنے والا ہوگا۔ ان اکابر کی تحقیقات اور ان کی علمی نگارشات سے استفادہ طٰہٰ اور احمد امین کی کتابوں کا پڑھنے والا یا النحو الواضح یا اس جیسی معیار کی کتابوں کا پڑھنے والا یا جدید علم کلام کے عنوان سے جو موضوع سامنے آیا ہے اس پر لکھی جانے والی کتابوں کا مطالعہ کرنے والا نہیں کر سکتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ منطق و فلسفہ اور قدیم علمِ کلام کے مباحث موجودہ زمانہ میں بیکار ہو چکے ہیں اگرچہ یہ بات سراسر غلط ہے آج جس منطق و فلسفہ سے ہم ... بھاگ رہے ہیں۔ یورپ اسکی طرف کامل یکسوئی سے متوجہ ہے اور انھیں کتابوں کو پڑھکر ہمارے ہی ہتھیار سے مسلح ہو کر ہم پر حملہ کر رہا ہے اور ہم اپنے انھیں ہتھیاروں کو اتار کر پھینکنے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں اور بجائے اس کے ہم اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتے کہ ہم نے ان ہتھیاروں کا استعمال ہی نہیں سیکھا ہے اور اپنے اندر اتنی قوت پیدا نہیں کی ہے کہ ہم ان کا بوجھ برداشت کریں۔ سرے سے ہم ان ہتھیاروں کی افادیت ہی کے منکر ہیں۔ بہر حال اگر یہ بات تھوڑی دیر کے لئے تسلیم بھی کر لی جائے کہ منطق و فلسفہ یا علمِ کلام کی پرانی کتابیں یا فقہ کی کنز الدقائق اور شرح وقایہ جیسی کتابیں یا ادب کی مقامات حریری اور متنبی جیسی کتابیں عصری مزاج کے مطابق نہیں ہیں۔ اور ان سے

جو فائدہ حاصل ہونا چاہئے وہ نہیں ہو رہا ہے تو براہِ کرم ہمارے سامنے ان مدارس میں سے کسی ایک بھی مدرسہ کو سامنے لائیے جہاں یہ نصاب قدیم نہیں پڑھایا جاتا ہے اور بتلائیے کہ اس مدرسہ کے فضلاء میں سے کتنے ہیں جن کی علمی صلاحیت لائق اعتبار ہے۔

آج مدارس عربیہ کو اچھے اساتذہ کی ضرورت ہے، کیا یہ جدید نصاب والے مدارس اساتذہ کی فراہمی کا کام انجام دے رہے ہیں، حدیث و تفسیر پڑھانے والے ان مدارس سے کتنے پیدا ہو رہے ہیں۔ جانے دیجئے حدیث و تفسیر و فقہ کو، ادب عربی کے سلسلے میں عرض ہے کہ ان مدارس کے فضلاء میں عربی ادب ہی کی تدریس کی کتنی صلاحیت ہوتی ہے، کتابوں کے سمجھنے اور سمجھانے کی استعداد ان میں کتنی ہوا کرتی ہے۔ ذرا غور سے جائزہ لیجئے اور انصاف سے فیصلہ کیجئے تو حقیقت واضح ہو جائے گی۔

اساتذہ و مدرسین خواہ کتنی ہی قلیل تعداد میں پیدا ہو رہے ہوں یہ انھیں مدارس میں پیدا ہوتے ہیں جو اپنے اسی پرانے نصاب کو گلے سے لگاتے ہوئے ہیں، افراد سازی یہی نصاب کر رہا ہے۔ صلاحیت اسی نصاب سے پیدا ہوتی رہی ہے اور اب بھی اسی نصاب سے پیدا ہو رہی ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ علمی انحطاط عام ہے، اور یہ انحطاط ہر جگہ ہے ذوق و شوق جو طلبہ میں پہلے تھا اب نہیں ہے، لیکن اس کا تعلق نصاب سے ہرگز نہیں ہے، اس لئے آپ کوئی تدبیر اس انحطاط کو ختم کرنے کیلئے کر سکیں تو ضرور کیجئے اور یہی کام کرنے کا ہے، نصاب کی تبدیلی سے اگر کوئی سمجھ رہا ہے کہ طلبہ کی علمی و ادبی صلاحیت میں وہ انقلاب برپا کر دے گا تو یہ محض خواب ہے وہمی و خیالی تصور ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، تبدیلی نصاب سے یہ تو ضرور ہوگا کہ جو کچھ بھی افراد تیار ہوتے ہیں اور جتنی بھی استعداد بنتی ہے یہ سلسلہ بھی رک جائے گا، لیکن اس کا کوئی ثمرۂ طیب نہ حاصل ہو سکے گا۔ آج جو دو چار پڑھنے پڑھانے والے مل بھی جاتے ہیں کل انکا بھی پایا جانا دشوار ہوگا۔ اور چاہے تلاش کرنے سے دو چار عربی و اردو کے جاں نثار آپ کو مل جائیں، لیکن ٹھوس علمی صلاحیت کے افراد کا ملنا دشوار ہوگا، اور اہل علم میں محدث، فقیہ، مفسر اور دوسرے علوم اسلامیہ کے ماہرین کا المناک فقدان ہوگا۔

مدارس عربیہ کا مطمع نظر کبھی یہ بھی نہیں رہا ہے کہ ان میں پڑھے پڑھائے جانے والے علوم کسب معاش کا ذریعہ بنائے جائیں۔ اگر کسی کے ذہن میں خدانخواستہ یہ تصور ان مدارس کیلئے ابھرتا ہے تو غلط ہے اور یہ ان مدارس کے مقصد اصلی کے بالکل خلاف ہے، ان مدارس کا مقصود ایسے افراد کا

پیدا کرنا ہے جن کی زندگی کا مقصد دین وعلمِ دین کی خدمت ہو، اور جو اسلام کی عملی زندگی کا نمونہ ہوں تاکہ اسلام کو غلبہ حاصل ہو اور کلمۂ حق کی آواز پورے عالم میں گونج جائے۔

اگر یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا ہے تو ان مدارس کے لئے ہماری ہر کوشش لایعنی اور بلا وجہ ہے۔ نصاب کی تبدیلی ان مدارس کا اصل مسئلہ آج نہیں ہے، بلکہ ان مدارس کی اصل دشواری یہ ہے کہ جس مقصد کیلئے ان مدارس کو قائم کیا گیا تھا آج یہ مقصد پورا نہیں ہو رہا ہے۔ دین کی فضا ان مدارس سے غائب ہے۔ دینی شعور ودینی بیداری اور عمل کا جذبہ شریعت کے ساتھ کامل ربط ایثار اور خدا ترسی تواضع اور للٰہیت جو ان مدارس کے فیض یافتوں کے امتیازی اوصاف تھے، یہ اوصاف آج ان مدارس کے طلبہ میں نہیں پیدا ہوتے ہیں اس مرض کا علاج ڈھونڈھنا ہے اور یہی کام اصل میں کرنے کا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲۲ کا) "کیا ان کافروں کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ آسمان اور زمین (پہلے) بند تھے (یعنی نہ آسمان سے بارش ہوتی تھی اور نہ زمین سے کچھ نباتات اگتی تھی، اسی کو بند ہونا فرمادیا چنانچہ ایسا وقت اب بھی کبھی کبھی کہیں آجاتا ہے، اور بعض خطّے تو ایسے بھی زمین پر ہوں گے، جہاں نہ کبھی بارش ہوتی ہو نہ نباتات اگتی ہو) پھر ہم نے دونوں کو کھول دیا کہ آسمان سے بارش ہونے لگی اور زمین سے نباتات اُگنے لگی۔ پس فتق یعنی کھلنا تو امر شاہد ہے اور رتق یعنی بند ہونا جو فی الحال ہوتا ہے وہ بھی مشاہد ہے، اور جو ابتدائی تھا وہ دلیل عقلی سے اُس وقت بھی خصوصاً اہل عرب کی، کہ ریگستان ہے۔ سمجھ میں آسکتا تھا اور ہمارے زمانہ میں تو علوم جدیدہ اس کی مکمل تائید کرتے ہیں کہ کرہ زمین بننے کے بہت عرصہ بعد بارش ہونے اور نباتات اُگنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اور اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ (یعنی کیا نہیں دیکھا ان لوگوں نے؟) میں دیکھنا مشاہدہ اور استدلال عقلی اور نقلی سب کو شامل ہے یعنی معلوم کرلینے کو خواہ وہ کسی بھی ذریعہ سے ہو۔) (بیان القرآن۔ خط کشیدہ جملہ کا اضافہ احقر نے کیا ہے)

حضرت مولانا تھانویؒ نے ذیلی فوائد میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ رتق وفتق کی یہی تفسیر دُرِّ منثور میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اور یہی ایسی ہے جو اس زمانہ کے لوگوں کی سمجھ میں آسکتی تھی۔

(بقیہ اگلے شمارے میں)

دوسری قسط) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفہیم القرآن

ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

از مولانا جمیل الرحمٰن پرتاب گڈھی

علم تفسیر کی چوتھی شرط میں چار چیزیں ذکر کیگئی ہیں۔ تعیین مبہم، اجمال کی تفصیل، سبب نزول اور نسخ۔ ان سب کی قدرے تفصیل اس طرح ہے کہ اگر کسی مبہم آیت کی تعیین اور اجمال کی تفصیل مطلوب ہو تو سب سے پہلے خود قرآن سے مدد لیجاتے۔ کیونکہ

القرآن یفسر بعضہ بعضاً — قرآن بعض بعض کی تفسیر کرتا ہے۔

ہاں اگر کسی مجمل آیت کی تشریح قرآنی آیات نہیں کرتی ہیں تو سنّت نبوی کا سہارا لیا جائیگا شلاً قرآن مجید طہارت کے سلسلے میں بیان کرتا ہے

وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا وَاِنْ کُنْتُمْ	اور اگر تم ناپاک ہو تو خوب پاک ہوجاؤ اور اگر
مَرْضٰی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَاءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ	تم بیمار ہو یا مسافر ہو یا تم میں سے کوئی قضاء
مِنَ الْغَائِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ	حاجت سے فارغ ہو کر آیا ہو یا تم نے عورتوں سے
(الآیہ)	مباشرت کی ہو۔

لمستم کی تعیین مراد میں علمار کرام کا شدید اختلاف ہے ایک گروہ تو ملامست سے محض بدن چھونا مراد لیتا ہے۔ اس نے اپنے استدلال میں کہا کہ جب تک کسی لفظ کے حقیقی معنیٰ مراد لینے میں دشواری نہ ہو مجازی معنیٰ کیطرف جانا درست نہیں۔ اور یہاں حقیقی معنیٰ لینے میں کوئی عذر نہیں ہے

اور دوسرے گروہ نے ملامست سے مباشرت مراد لی ہے اس نے اپنے استدلال میں قرآن کے طریقۂ بیان اور اسلوب ادا سے مدد لی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کا زن و شوہر کے تعلقات بیان کرنے میں ایک خاص اسلوب ہے کہ وہ ان مواقع پر تفصیل سے کام نہیں لیتا۔ مثلاً ایام حیض میں

مجامعت سے منع کرنا منظور تھا تو فرمایا گیا۔

فاعتزلوا النسآء فی المحیض — عورتوں سے بحالت حیض الگ رہو۔

طلاق کے احکام میں ہے۔

لاجناح علیکم ان طلّقتم النساء مالم تمسّوھن (البقرۃ) — اگر تم عورتوں کو ان کے چھونے سے قبل طلاق دو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

یہاں لفظ مسّ سے مراد مباشرت ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَاِن طلّقتموھُنّ من قبل ان تمسّوھن وقد فرضتم لھنّ فریضۃً فنصف ما فرضتم الّا ان یعفون (البقرۃ) — اور اگر تم نے ان کے چھونے سے پہلے ہی طلاق دیدی ہے اور تم ان کا مہر بھی مقرر کر چکے ہو تو جو تم نے مقرر کیا ہے اس کا آدھا دیدو۔ مگر ہاں اسوقت نہیں جب کہ یہ عورتیں معاف کردیں،

اس جگہ بھی مسّ سے مراد مباشرت ہے۔ اسی طرح عدّت کے بیان میں ہے۔

یاایھا الذین اٰمنوا اذا نکحتم المومنات ثم طلّقتموھنّ من قبل ان تمسوھن فما لکم علیھنّ من عدۃٍ تعتدونھا۔ (احزاب) — اے مومنو! تم مومنہ عورتوں سے نکاح کرنے کے بعد اگر تم ان کو چھونے سے قبل طلاق دیدو تو ان کے ذمہ تمہارے لئے عدّت نہیں ہے۔

اس آیت میں بھی مسّ سے مراد مباشرت ہے۔ کیونکہ عدّت استبرار رحم کیلئے ہوتی ہے۔ عدم مباشرت کی صورت میں استبرار کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

ان آیتوں میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں ان کے طرز اور اسلوب بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت لٰمستم النسآء میں لمس سے مراد محض چھونا نہیں ہے۔ بلکہ مباشرت مراد ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں اقامت صلوٰۃ کا حکم باربار دیا گیا ہے۔ لیکن اس کی تفصیل سے قرآن میں بحث نہیں کی گئی ہے۔

لہٰذا اب احادیث میں اس کی تفصیل تلاش کیجائے گی۔ احادیث کو جب دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ صلوٰۃ، قیام، قرأت، رکوع، سجود اور قعود کے ساتھ ایک مخصوص عبادت کا نام ہے جس کے کچھ شرائط بھی ہیں اور کچھ ارکان بھی۔

ایک مفسر کیلئے جہاں تعیین مبہمات اور اجمال کی تفصیل کا علم رکھنا ضروری ہے وہیں اسے

نزول اور نسخ آیات کی حقیقت کا جاننا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ نزول قرآن کا سلسلہ ضرورت کے مطابق تھا جیسی ضرورت ہوتی گئی آیتیں نازل ہوتی رہیں۔ بسا اوقات کوئی آیت کسی واقعہ کے تحت اتری۔ اگر اس واقعہ کو جانے بغیر متعلقہ آیت کی تفسیر کر دی جائے تو یہ تفسیر نامکمل رہے گی۔

بعض لوگوں نے نسخ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ایک آیت کے حکم کو دوسری آیت کے ذریعہ بالکلیہ ختم کر دیا جائے، حالانکہ نسخ کا مفہوم اس سے عام ہے تخصیص عام یا تفصیل اجمال یہ سب اصطلاحاً نسخ ہیں۔ حافظ ابن قیمؒ اعلام الموقعین ص ۲۹/۱ میں لکھتے ہیں۔

مراد عامة السلف بالناسخ والمنسوخ رفع الحکم بجملته تارة وهو اصطلاح المتاخرین ورفع دلالة العام والمطلق والظاهر وغیرها تارة اما بتخصیص او تقیید او حمل مطلق علی مقید وتفسیره وتبیینه حتی انهم یسمّون الاستثناء والشرط والصفة نسخاً لتضمن ذالك رفع دلالة الظاهر وبیان المراد فالنسخ عندهم وفی لسانهم هو بیان المراد بغیر ذالك اللفظ بل بامر خارج عنه، ومن تامل کلامهم رأی من ذالك مالا یحصی وزال عنه به اشکالات اوجبها حمل کلامهم علی الاصطلاح الحادث المتأخر۔

ناسخ اور منسوخ سے عام سلف کی مراد کبھی حکم کا تمامہ مرفوع ہو جانا ہوتا ہے۔ یہ متاخرین کی اصطلاح ہے۔ اور کبھی نسخ سے مراد ہوتی ہے عام مطلق ظاہر وغیرہ کے معنی مدلول کا رفع کر دینا۔ خواہ وہ تخصیص کے ذریعہ ہو یا تقیید کے یا مطلق کو مقید پر محمول کرنے اور اس کی تفسیر و بیان کے ذریعہ، یہاں تک کہ یہ حضرات استثناء، شرط اور صفت کو بھی نسخ کہہ دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ دلالت ظاہر کے رفع اور بیان مراد کو متضمن ہوتا ہے۔ پس نسخ ان کے نزدیک اور ان کی زبان میں اس لفظ کے غیر سے مراد کا بیان کر دینا ہے۔ اور غیر لفظ ہی نہیں بلکہ کبھی مراد کا بیان کسی امر خارج سے بھی ہوتا ہے۔ جو شخص ان اسلاف کے کلام میں تامل کرے گا۔ اس کو اس میں غیر محدود فوائد نظر آئیں گے۔ اور اس سے وہ اشکالات زائل ہو جائیں گے جو نسخ کو اصطلاح حادث و متأخر پر محمول کر کے پیش کرتے ہیں۔

حافظ ابن قیم کے اس بیان کردہ نسخ کے مفہوم سے معلوم ہوا کہ قرآن کی بعض آیات پر جب نسخ کا اطلاق کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ازالہ نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ فلاں آیت میں جو حکم بیان کیا گیا تھا وہ فلاں وقت اور اس زمانے کے مخصوص حالات کے اعتبار سے تھا

اب جبکہ حالات دوسرے ہیں۔ ان کے لئے حکم دوسرا ہے۔ اس سے کسی ایک حکم کا قطعاً منسوخ ہوجانا لازم نہیں آتا۔ بلکہ یہ تفصیل و تشریح عین کمالِ دین کی دلیل ہے۔

تفسیر کیلئے پانچویں شرط

الخامس معرفة الاجمال والتبیین والعموم والخصوص والاطلاق والتقیید ودلالة الامر والنهی وما اشبه هذا واخذ وه من اصول الفقه

(روح المعانی صلہ ۱۴)

پانچویں شرط اجمال وتفصیل عموم خصوص، مطلق ومقید اور امر ونہی کی دلالت اور جو کچھ ان کے مشابہ ہو، ان کا جاننا ہے۔ اور ان سب کا ماخذ اصول فقہ ہے۔

اس شرط کے ضمن میں بھی چند چیزیں ذکر کی گئی ہیں۔ جن کا حصول علم اصولِ فقہ پر موقوف ہے اگر کوئی مسلمان اس علم سے آشنا ہوئے بغیر تفسیر کے سمندر میں غواصی کرنے لگے تو اس کے ہاتھ میں موتیوں کے بجائے سنگریزے ہوں گے کیونکہ حق تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی دولت سے نوازا اور اس کی تشریح آپ کے قول وعمل نے کی۔ گویا قرآن وسنت دو ایسی چیزیں ہیں جن پر اسلام کی مستحکم عمارت قائم ہے۔ فقہائے کرام معانی قرآن وسنت کے محافظ ہیں اور اس کے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ ان برگزیدہ نفوس نے اپنی زندگیاں صرف کرکے قرآن وحدیث سے استنباطِ احکام کا قابلِ فخر کارنامہ انجام دیا۔ جس سے آیات احکام اور حدیث کے معانی محفوظ ہوگئے اور ان کو ارباب ہوس کے دست بُرد سے بچالیا۔ ان کی مساعی جمیلہ کے نتیجہ میں جو علم وجود میں آیا وہ علم اصول فقہ ہے۔ اب اگر کوئی شخص ان کی کوششوں اور ان کے مقرر کردہ اصول اور استنباط کردہ مسائل سے نظر پھیرے اور ان کو حاصل کئے بغیر تفسیر قرآن کرنے بیٹھ جائے تو یہ تفسیر صحیح تفسیر نہ ہوگی۔

فقہائے اسلام اور انکی مساعی جمیلہ پر مودودی ریمارک

مودودی صاحب فقہ کو نئے سرے سے ترتیب دینے پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

" یہ بات تو سرسری نظر میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مسائل مختصر ہیں۔ قدیم طرزِ بیان وانداز ترتیب پر لکھے ہوئے ہیں۔ اور ایسی زبان میں ہیں جس کی اصطلاح

باریکیوں کو اب عموماً وہ لوگ بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے جو ان کتابوں کا درس دیتے ہیں (دیکھو سطروں کے بعد آگے لکھتے ہیں) آخر قدیم طرزِ تدوین کوئی منصوص اور مشروع طرز تو نہ تھا کہ اس کی پابندی لازم اور اس سے تجاوز گناہ ہو۔ لیکن اس سے زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ قدیم فقہی کتابوں میں جتنے احکام بیان کئے گئے ہیں ان میں زیادہ تر عام انسانی حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان احکام کو لفظ بلفظ لے کر ہر جگہ ہر معاملے پر بے تکلف جاری کر دینا اصلاً غلط ہے۔ ان کی صحیح تنفیذ موقوف ہے اس پر کہ:

اوّلاً جس اسلامی جماعت میں ان کو نافذ کیا جا رہا ہے اس کی اخلاقی تمدنی معاشرتی اور معاشی حالات کو پیش نظر رکھا جائے یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کے اجتماعی عادات و خصائل اور رسم و رواج کس قسم کے ہیں۔ وہ کس ماحول میں رہتے ہیں۔ اس ماحول کے ان پر کیا اثرات ہیں، ان کی سیرت اور ان کے معاملات میں اسلام کا اثر کس قدر قوی یا ضعیف ہے۔ بیرونی اثرات سے ان کی اسلامی خصائص میں کس قدر فرق واقع ہوا ہے اور عام تمدنی حالات سے معاملات کی فقہی حیثیت میں کیا تغیرات رونما ہوئے ہیں۔

ثانیاً ہر مقدمے کے مخصوص انفرادی حالات پر نظر رکھی جائے۔ فریقین کی سیرت، عمر، تعلیم، جسمانی حالات، معاشی و تمدنی حیثیت، گذشتہ تاریخ، خاندانی روایات اور ان کے طبقے کی عام حالت، سب پر نگاہ ڈال کر رائے قائم کی جائے کہ خاص جزئی معاملے میں ان پر قانون کا نفاذ کس طریقے سے کیا جائے جس سے قانون کا مقصد بھی ٹھیک ٹھیک پورا ہو جائے اور اصول قانون سے انحراف بھی نہ ہونے پائے۔

ان دونوں پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی شخص فقہ کی کسی پرانی کتاب میں سے ایک جزئیہ نکالے اور آنکھیں بند کر کے اس کو اس مقدمے میں جو اس جزئیے سے تعلق رکھتا ہو چسپاں کرتا چلا جائے تو اس کی مثال اس طبیب کی سی ہوگی جو بقراط اور جالینوس کے نسخے لے کر بیٹھ جائے اور ملک کی آب و ہوا، موسم، مریضوں کے الگ الگ مزاج اور امراض کی جداگانہ کیفیتوں سے آنکھیں بند کر کے ان نسخوں کو برتنا شروع کر دے حکمائے قدیم کے مرتب کئے ہوئے نسخے اپنی جگہ نہایت صحیح اور حکیمانہ سہی مگر وہ اس لئے مرتب کئے گئے تھے کہ جاہل عطار ان کو برتیں یا انہیں استعمال کرنے کیلئے بھی

علم، تجربہ، حکمت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ بالکل اسی طرح ائمہ مجتہدین نے شریعت کے قواعد اور اسی احکام سے جو جزئی مسائل مستنبط کئے ہیں وہ بھی اپنی جگہ نہایت درست سہی لیکن یہ بات تو ان بزرگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ ہوگی کہ ان اجتہادی احکام کو تفقہ اور تدبر کے بغیر اس طرح استعمال کیا جائے گا جیسے ڈاک خانے کی مہر کو ایک جاہل چپراسی ہر لفافے پر لگاتا چلا جاتا ہے۔"

حقوق الزوجین ص۷۹، ۸۰، ۸۱، قضائے شرعی کے متعلق چند اصولی مباحث، مکتبہ جماعت اسلامی رامپور ۱۹۵۲ء

جو لوگ مسائل فقہ میں آئمہ دین کی اتباع کو ضروری کہتے ہیں اور اجتہاد کی اجازت نہیں دیتے ان کے بارے میں مودودی صاحب کا قلم اس طرح رواں دواں ہے

"اس نے تقلید کے معنیٰ یہ سمجھے ہیں کہ اپنے مذہب فقہی کو بمنزلہ دین اور اس مذہب کے امام کو بمنزلہ نبی اور اس کے مسائل کو نصوص کتاب اللہ کی طرح اٹل سمجھا جائے۔ اور یہ بات عقیدے کے طور پر دل میں بٹھائی جائے کہ اس مذہب کے کسی مسئلے میں اصلاح، ترمیم اور اضافہ تو درکنار اس پر تحقیق اور تنقید کی نظر ڈالنا بھی گناہِ عظیم ہے اور کسی مسئلے میں اس مذہب کے کسی جزئیہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب فقہی سے کوئی جزئیہ اخذ کرنا زمانۂ اجتہاد یعنی چوتھی صدی ہجری تک تو حلال تھا۔ مگر اس کے بعد حرام ہو گیا ہے"

(حوالہ مذکورہ ص۵۳)

ایک دوسری جگہ مودودی صاحب اس طرح لکھتے ہیں۔

"قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گنہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ ہم نے تم کو علم و عقل سے اسی لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اسی لئے تھی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں؟ ہم نے اپنے دین کو آسان بنایا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو؟ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا۔ تم سے یہ کس نے کہا قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو؟ اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین

کو کنز الدقائق اور ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی۔
(حوالہ مذکورہ ص ۸۵، ۸۶)

مودودی صاحب کی ان تحریروں میں فقہائے اسلام کی مساعی جمیلہ کا استہزاء موجود ہے۔ اور ان حضرات کی سعی و جہد نے جس فن کو وجود بخشا یعنی علم فقہ اور اصول فقہ وہ موجودہ زمانے کیلئے نہ صرف یہ کہ ناقابل عمل ہیں بلکہ ان سب کو زمانے کے موافق ڈھال کیا جائے۔ اب اگر کسی شخص نے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی تو اُسے کل قیامت کے دن کسی بھی مصنفِ فقہ کے دامن میں تحفظ کی جگہ نصیب نہ ہوگی۔ بتایئے کیا فقہائے اسلام اور ان کی فقیہانہ سعی و جہد پر جس شخص کو اعتماد نہ ہو وہ تفسیر کی اس شرط کو پوری کرنے والا ہے۔؟

علم تفسیر کی چھٹی شرط

السادس الکلام فیما یجوز علی اللہ وما یجب لہ وما یستحیل علیہ والنظر فی النبوۃ ویوخذ ھذا من علم الکلام ولولاہ یقع المفسر فی ورطاتٍ
(روح المعانی ص ج ۱)

تفسیر قرآن کی چھٹی شرط ان چیزوں کا جاننا ہے جن کا اطلاق باری تعالیٰ کی ذات کیلئے جائز ہے اور کونسی چیزیں اس کی ذات کیلئے واجب اور کن چیزوں کا ثبوت اس ذات کے لئے ناممکن و محال ہے اور منصب نبوت میں اس کی نظر ہو ان چیزوں کے جاننے کا تعلق علم کلام سے ہے۔ اگر اس علم کے بغیر تفسیر قرآن کے میدان میں کسی نے قدم رکھا تو اس کا ظلمتوں کی خندق میں گرنا یقینی ہے۔

علم کلام ایک ایسا علم ہے جو مسلمانوں کے عقائد و نظریات کی تفصیل بتلاتا ہے۔ ایک مسلمان کا باری تعالیٰ کے ساتھ عقیدے کا رشتہ ایک ایسا نازک رشتہ ہے جسمیں معمولی کجی بھی ناقابل برداشت ہے اعمال کی بنیاد پر جو کوتاہیاں سرزد ہو جائیں ان کی معافی کی امید بارگاہِ خداوندی سے کرنا درست ہے۔ لیکن عقیدے کی بنیاد پر جو غلطیاں ہو جائیں ان پر مواخذہ کا ہونا یقینی ہے۔ کیونکہ جس شخص کے عقائد و نظریات ما انا علیہ و اصحابی کے عقائد و نظریات سے مختلف ہوں۔ وہ درحقیقت کامل مومن ہی نہیں۔ کامل مومن اسی وقت ہوگا جب کہ اس کا عقیدہ اہلسنت

ما انا علیہ و اصحابی کے عقیدے کے مطابق ہو اور یہی اعمال کی کوتاہی تو اس کی بنیاد پر ایسا شخص بدکار اور فاسق ضرور ہوگا لیکن دائرہ ایمان سے خارج نہ ہوگا اسی لئے یہ غلطی اتنی سخت نہیں جتنی عقیدے کی غلطی سخت ہے۔

مودودی صاحب اور علم کلام

مسائل علم کلام میں عصمت انبیاء ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ تمام اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد معصوم ہوتے ہیں۔ لیکن مودودی صاحب کا عقیدہ کچھ اور ہے۔ فرماتے ہیں۔

" اور تو اور بسا اوقات پیغمبروں کو اس نفس شریر کی رہزنی کے خطرے پیش آتے ہیں چنانچہ حضرت داؤد جیسے جلیل القدر پیغمبر کو ایک موقع پر تنبیہ کی گئی کہ لا تتبع الھویٰ فیضلك عن سبیل اللہ (سورہ ص ۲۴) ہوائے نفس کی پیروی نہ کرنا ورنہ یہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی (تفہیمات صـ ۱۶۳ جـ ۱ طبع چہارم بعد نظر ثانی پٹھان کوٹ)

اسی چیز کو مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں آیت یا داؤد انا جعلناك خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق و لا تتبع الھویٰ فیضلك عن سبیل اللہ کے تحت لکھا ہے کہ۔

" یہ وہ تنبیہ ہے جو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے اور بلندی درجات کی بشارت دینے کے ساتھ حضرت داؤدؑ کو فرمائی۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو فعل ان سے صادر ہوا تھا اس کے اندر خواہش نفس کا کچھ دخل تھا اس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا،،

(تفہیم القرآن صـ ۳۲۷ جـ ۴ سورہ ص طبع اول ۱۹۶۶ء)

انبیاء کرام کے پاک نفوس کو شریر سمجھنا انتہائی درجہ کی گستاخی ہے پیغمبر معصوم ہوتے ہیں۔ ان کے نفوس شر و خباثت سے پاک ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مقدس اور پاکیزہ نفوس کے فیضان سے دوسروں کے نفوس پاک ہوتے ہیں۔ دیکھو، انبیاء کرام کا ہر فعل رضائے الٰہی کے لئے ہوتا ہے مذکورہ آیت کی صحیح تفسیر یہ ہے۔

" اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے سو جس طرح اب تک کرتے رہے ہو اسی طرح

آنحضرت بھی لوگوں میں انصاف کیساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور (جس طرح ابتک کبھی نفسانی خواہش کی پیروی نہیں کی اسیطرح)
آئندہ بھی نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا کہ اگر ایسا کروگے تم وہ خدا کے راستے سے تم کو بھٹکا دیگی۔" بیان القرآن سورہ ص ع ۲/۱۰

ایک دوسری جگہ مودودی صاحب فرماتے ہیں:-

نبی ہونے سے پہلے تو کسی نبی کو وہ عصمت حاصل نہیں ہوتی جو نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ نبی ہونے سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہو گیا تھا کہ انھوں نے ایک انسان کو قتل کر دیا۔ چنانچہ فرعون نے ان کو اس فعل پر ملامت کی تو انھوں نے بھرے دربار میں اس بات کا اقرار کیا کہ اذا و انا من الضالین (شعرا) یعنی یہ فعل مجھ سے اسوقت سرزد ہوا جب راہِ ہدایت مجھ پر کھلی نہ تھی۔"

(رسائل و مسائل ص۲۵ حصہ اول۔ بیان عصمت انبیاء طبع بار اول اگست سنہ ۱۹۵۱ء)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف "بہت بڑے گناہ کی نسبت" مودودی ذہنیت کی اعلیٰ عکاسی کرتی ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ ع کی عصمت پر حملہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ہمارا مسلک اس مسئلے میں اہل سنت والجماعت سے الگ ہے۔ آیت میں وانا من الضالین سے جس امر کی طرف اشارہ ہے وہ صرف اتنا ہے کہ فرعون کی قوم کا ایک آدمی ایک اسرائیلی کو مار رہا تھا مظلوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی۔ آپ نے اس قبطی کو ایک گھونسہ مارا۔ لیکن وہ اس گھونسے کی تاب نہ لاسکا اور وہیں جان دیدی۔ ظاہر ہے آپکا ارادہ اسکے قتل کا نہیں تھا بلکہ مظلوم کی نصرت مقصود تھی کہ وہ ظالم اسرائیلی کو چھوڑ دے لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ وہ مر گیا اسمیں آپکے ارادہ قتل کا تعلق اول تو ہے ہی نہیں اسلئے حضرت موسیٰ نے فرمایا وانا من الضالین یعنی اس موقعہ پر حکمت یہ کہ بیٹھا تھا یعنی عمداً یہ قتل نہیں کیا اسکی خطا یہ سمجھو کہ یہ تمام اتفاق سے ہو گیا۔ وہ خود ہو گیا

درحقیقت مودودی صاحب نے لفظ من الضالین سے آپ کے گناہگار ہونے کا حکم لگا دیا اور انھیں اس بات کی قطعاً خبر نہ تھی کہ لفظ ضال عربی میں بھول چوک، اتفاقی غلطی اور لاعلمی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ورنہ مودودی صاحب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا حکم صادر فرمائیں گے کہ آپ کے بارے میں حق تعالےٰ فرماتے ہیں:- ووجدک ضالا فھدیٰ یہاں پر بھی لفظ ضال استعمال ہوا ہے لیکن اس جگہ اس کے معنیٰ بے خبر، اور لاعلم کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "اور اللہ تعالےٰ نے آپ کو (شریعت سے) بے خبر پایا سو (آپ کو شریعت کا) رستہ بتلادیا" (بیان القرآن)

حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں مودودی صاحب اس طرح لکھتے ہیں کہ:-

"بس ایک فوری جذبے نے جو شیطانی تحریص کے زیر اثر ابھر آیا تھا ان پر ذہول طاری کر دیا اور ضبط نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مقام بلند سے

معصیت کی پستی میں جا گرے۔ (تفہیم القرآن ص۱۳۳ ج ۳ سورۂ طٰہٰ حاشیہ ۱۰۲)

بتائیے کیا حضرت آدم ؑ کی عصمت کو مودودی صاحب نے باقی چھوڑا ہے؟ استغفر اللہ من کل ذنب واتوب الیہ

علم کلام کے اس بنیادی مسئلے میں مودودی صاحب کس قدر بھٹک چکے ہیں۔ جب اس مسئلے میں ان کی دسترس کا یہ حال ہے تو کیا علامہ محمود آلوسیؒ کا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ "اگر اس علم کے بغیر تفسیر قرآن کے میدان میں کسی نے قدم رکھا تو اس کا ظلمتوں کی خندق میں گرنا یقینی ہے"۔ قرآن چونکہ انسان کے عقائد و نظریات کا سرچشمہ ہے اس لئے اس علم میں پختگی حاصل کرنا ایک مفسر کیلئے بہت ضروری ہے۔

علم تفسیر کی ساتویں شرط

السابع، علم القرأت. لانه به یعرف کیفیة النطق بالقرآن وبالقرآت ترجح ...... بعض الوجوه المحتملة علی بعض هذا

علم تفسیر کے لئے ساتویں شرط فن قرأت و تجوید کا جاننا ہے کیونکہ نطق قرآنی کی کیفیت اور بعض محتمل وجوہ کا بعض پر راجح ہونے کا علم اسی پر موقوف ہے۔

(روح المعانی ص۶ ج ۱)

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ علم تفسیر کے لئے علوم عربیہ میں کمال حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن اسی پر بس نہیں۔ آگے ایک شرط فن تجوید کا جاننا بھی ہے کیونکہ نزول قرآن کے وقت قبائل عرب کی مختلف قرآتیں اور مختلف لہجے تھے ہر قبیلے نے اپنی قرأت اور لہجے کے مطابق قرآن کو پڑھنا شروع کیا اگر ان قراتوں اور لہجوں کو جانے بغیر قرآن کی تفسیر کی گئی تو گمراہی میں پڑنا بعید از قیاس نہیں۔ مثلاً سورۂ نمل میں حضرت سلیمان ؑ کے واقعہ میں ہے "اولا اذبحنّه" جو شخص قبائل عرب کی قراتوں اور ان کی خصوصیتوں سے واقف نہیں ہے وہ اس کا ترجمہ نفی کے ساتھ کریگا یعنی یہ کہ میں اس کو (ہدہد) ذبح نہیں کرونگا۔ لیکن اس کے برخلاف لہجات عرب سے باخبر شخص فوراً سمجھ لیگا کہ دراصل یہ لَا لائے نافیہ نہیں ہے بلکہ لام کو ذرا کھینچ دینے سے صورت لَآ کی ہوگئی ہے اور اسی لہجہ کے مطابق اس لفظ کی قرآن میں کتابت ہوگئی ہے۔

تفسیر قرآن کے یہ چند شرائط ہیں انکے علاوہ مزید کچھ شرطوں کا ذکر علامہ محمود آلوسیؒ نے جلال الدین سیوطی کے حوالے سے کیا ہے لیکن صاحب کے سب مذکورہ شرائط کے ضمن میں پائی جاتی ہیں اسلئے انکو الگ ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں باقی تھی۔

ان شرائط کو دیکھتے ہوئے یہ حقیقت بے غبار ہو گئی کہ ایک ایسے شخص کے لئے جو تفسیر قرآن جیسے مہتم بالشان کام کا ارادہ کر رہا ہے اسے ان شرائط کا جامع ہونا حد درجہ ضروری ہے۔

دوسری قسط

مولانا رحمت اللہ کیرانوی

اور اُن کے ایک شاگردِ رشید

—— از مولانا عبدالمجید خطیب ویلوری استاذ باقیات۔ صالحات

مولانا رحمت اللہ اور ان کے ساتھیوں نے علمی حیثیت سے پادری "فنڈر" کو شکست فاش دیکر بالواسطہ اس کے شریکِ کار مبلغین اور انکی تحریک کو شدید زک پہونچایا لیکن اُن کے لئے یہ کوئی غیر متوقع تجربہ نہیں تھا وہ اپنے مذہب کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھے اقتدار و حکومت کی پشت پناہی کے ہوتے ہوئے وہ اس شکست و پسپائی کو سبق آموز تو قرار دے سکتے تھے لیکن عبرت انگیز سمجھ کر اپنی تحریک سے باز نہیں آسکتے تھے۔ البتہ مولانا کی صراحت کے مطابق" مباحثہ کا فائدہ یہ ہوا کہ پادریوں کا پہلے جیسا جوش و خروش گھٹ گیا اور کتابیں جو کثرت سے بانٹتے تھے اس کی کثرت موقوف کردی اور مسلمانوں سے الزام اٹھ گیا اور عیسائیوں کا وہ تکبر و اعتقادِ فاسد مٹ گیا اور مذبذبوں کا وہ تذبذب ہٹ گیا۔ والحمد للہ علےٰ ذٰلک (ازالۃ الاوہام بحوالہ آثارِ رحمت ص۱۶۶)

مسلمان سیاسی اعتبار سے پٹے ہوئے مہرے تھے۔ ایک سیاسی زوال ہر قسم کی درماندگی اور تنزل کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ زوال پذیر اسلامی معاشرے کو سہارا دینے اور اس کی عظمتِ رفتہ کو بحال کرنے کے لئے کچھ دردمند اہلِ دل فکرمند تھے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اور اسماعیل شہیدؒ کی روح پرور ایمان افروز اور ولولہ انگیز تحریک کا اپنوں اور غیروں کی سازشوں اور منافقتوں کا نشانہ بن کر دم توڑ دینے کا سانحہ ابھی ماضی قریب ہی کا تھا۔ اس تحریک کے نام لیوا بچے کچھے افراد اِدھر اُدھر منتشر تھے۔ کچھ تازہ دم جذبۂ جہاد سے سرشار، سربکف رجال و کبار بھی موجود تھے۔ اگرچہ مولانا رحمت اللہ دہلی آگرہ کو مرکز قرار دیکر تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھے ہوئے تھے لیکن ملک کے مختلف حصوں میں جہاد آزادی کی غرض سے جو مختلف جماعتیں بن رہی تھیں ان سے بے تعلق نہیں تھے۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی ان کی جماعت میں بھی ہندوستان کے انتہا پسند اور حضرت اسماعیل شہیدؒ کے فدائی مسلمان

تھے جن کی تعداد کافی تھی۔"

"فرمانِ باری"۔ واعدوا لهم ما استطعتم " کی تعمیل کے بغیر اقدامِ جہاد کی سعی کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی تھی خصوصاً جبکہ حریف طاقت کو سامانِ حرب وضرب اور عسکری نظام واستحکام کے اعتبار سے مکمل غلبہ حاصل تھا مگر انتہائی مایوسی یا غیظ وغضب کی حالت میں جس قسم کا ردِ عمل رونما ہوتا ہے کچھ اسی قسم کا ردِ عمل جماعتِ مجاہدین اور عام مسلمانوں پر اس وقت رونما ہوا جب کچھ فوجیوں نے غیر ملکی حکام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ جوں ہی بغاوت کا یہ سلسلہ شمالی ہند کے بعض اہم اضلاع میں پھیلا تو نفرت وبیزاری کا وہ لاوا تیزی سے پھوٹ پڑا جو سو سال سے ملت کے دردمند دلوں میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اہلِ مجاہدہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور جہد وجہاد کے لئے سربکف میدان میں آگئے۔ روایتی طرز کا عسکری نظم قائم ہوا مورچہ بندی کی گئی تھانہ بھون میں حضرت امداد اللہ امیر اور مولانا قاسم نانوتوی سپہ سالار بنائے گئے۔ علاقۂ کیرانہ میں مولانا رحمت اللہ امیر اور چودھری عظیم الدین سپہ سالار مقرر ہوئے۔ پاک نفس، نیک نہاد بزرگوں کی سربراہی میں معرکۂ کارزار گرم ہوا۔ شاملی کا معرکہ جہادِ آزادی کا ایک یادگار باب ہے۔ معرکہ کی تفصیلات سے قطع نظر یہ اقدامِ جہاد جہدِ ناتمام کی صورت میں ختم ہوا اور ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط ایک طویل عرصے کے لئے مستحکم ہو گیا۔ دراصل یہ معرکہ اہلِ دل کے جذبۂ اجتہاد کا ایک والہانہ اظہار تھا اس اظہارِ حق میں مولانا رحمت اللہ برابر کے شریک رہے گویا عیاں، عیسائی حکام کے نزدیک شریکِ جرم۔ شکست وہزیمت کے بعد ان مجاہد علماء وزعماء کو گرفتار کرنے کی مہم شروع ہوئی، وارنٹ جاری کئے گئے گرفتاری کے سلسلہ میں معاونت کرنے والوں کے لئے انعامات کا اعلان کیا گیا مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے، کچھ لوگ اس طوفانِ دارو گیر کے تھمنے کے انتظار میں اِدھر اُدھر ہو گئے۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ نے ہجرت کو ترجیح دی، مولانا رحمت اللہ چھپتے چھپاتے دہلی پہنچے، وہاں سے جے پور جودھپور کے صحرائے راجپوتانہ اور مہیب ریگستانی علاقوں کو پاپیادہ طے کیا۔ اس صحرا نوردی کے خاتمہ پر سورت پہنچے پھر وہاں سے خاص وطن کو الوداع کیا۔ ملتِ اسلامیہ کا یہ مردِ مجاہد بطلِ جلیل جس نے اپنی زبان وقلم سے دینِ اسلام کی بے لوث خدمت کی اپنے دینِ عزیز کی حمایت ومدافعت کا عظیم کارنامہ انجام دیا اور وقت آنے پر تلوار کے جوہر بھی دکھائے اب وہ گھر سے بے گھر، وطن سے دُور بہت دُور بحرِ عرب کے سینے میں بادبانی کشتی پر سوار اس سرزمین کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہے جو اسلام ومسلمان کا اوّلین مرکز، پیغمبرِ اسلام

کا مولد اور مہبط وحی ہے۔

اُدھر جنوب بعید کے ایک مرکزی ساحلی شہر "مدراس" میں ایک شریف وحسیب نوجوان پوری توجہ وانہماک کے ساتھ دینی تعلیم کا آخری مرحلہ طے کر رہا ہے۔ وطن مدراس سے کچھ دور نہیں۔ ویلور، مدراس کے درمیان فاصلہ ہی کوئی اسّی، پچاسی میل کا ہوگا لیکن شوقِ طلب نے برسوں سے اس کے قدم روک رکھے ہیں۔ ۱۲۷۰ھ ہجری میں وہ مدراس وارد ہوا رہنے کو حاجی بہاؤ الدین راؤتر کی تجارتی کوٹھی اور تعلیم و تربیت کے لئے مسجد والاجاہی کا ایک گوشہ جہاں مولانا محمود فخر گوپاموی کے پوتے مولانا غلام قادر ابن عبدالحق اپنے استاد مولانا قاضی ارتضا علی خاں گوپاموی کے جانشین کی حیثیت سے بزمِ تدریس سجائے ہوئے علومِ دین کی خدمت میں مصروف تھے۔

مولانا غلام قادر مدراسی کے یہ نوجوان شاگرد جن کا نام عبدالوہاب ہے ایک ایسے گھرانے کے سپوت ہیں جہاں پشتہا پشت سے علم وفضل اور طہارت و تقویٰ کا تسلسل رہا ہے۔

جدّ اعلیٰ "شاہ مدار" عالمِ دین بھی تھے اور مرشدِ طریق بھی۔ جنوب بعید میں اولین مسلم اقتدار کا مرکز "مدورا" شاہ مدار اور ان کے آباء و اجداد کا مولد و مدفن ہے۔ شاہ مدار کے صاحبزادے شیخ عبدالقادر پوتے غلام محی الدین اور پڑپوتے شیخ عبدالقادر سبھی علمِ شریعت و طریقت کے حامل اور دین کے مخلص خادم گذرے ہیں۔

حضرت شاہ مدار کے پڑپوتے مولانا عبدالقادر نے مولانا قاضی ارتضا علی خاں سے استفادہ کیا ہے، سلوک و معرفت میں شیخ ویلور مولانا محوی کے دست گیر تھے۔ حضرت مولانا محوی ایک خدارسیدہ صاحبِ جذب وفنا بزرگ تھے کسی وقت انھوں نے اپنے شادی شدہ صاحبِ اولاد مرید "مولانا عبدالقادر" کو ویلور میں نکاحِ ثانی کی ترغیب دی۔ ممکن ہے اس تحریک و ترغیب کا باعث کوئی اشارۂ غیبی رہا ہو۔ مرید با اختصاص نے سمع و اطاعت کا ثبوت دیا۔ مولوی محمد امین ویلوری کی صاحبزادی فاطمہ حبالۂ عقد میں آئیں جن سے دو لڑکے عبدالعزیز اور عبدالوہاب پیدا ہوئے، اول الذکر کا کمسنی ہی میں انتقال ہوگیا۔

عبدالوہاب کی تاریخِ ولادت یکم جمادی الاولیٰ ۱۲۴۷ھ ۹ر اکتوبر ۱۸۳۱ء بروز شنبہ ہے۔ تقریباً چار سال کی عمر میں والدِ محترم مولانا عبدالقادر کا ان کے آبائی وطن "آتور" میں انتقال ہوگیا، یتیم عبدالوہاب کے لئے شفقتوں کا مرکز ایک ماں کی ذات تھی۔ شفیق ماں نے اپنے لاڈلے

کو بڑے اہتمام سے پالا۔ جب کبھی وہ اپنے پیر حضرت مولانا محوی علیہ الرحمۃ کے صاحبزادے مولانا عبداللطیف تقوی (معروف بہ قطب ویلور) کے ہاں جاتیں تو اپنے اس اکلوتے نورِ نظر کو بھی ساتھ لے جاتیں۔ حضرت قطب ویلور اس یتیم بچے کے سر پر دستِ شفقت پھیر کر کہتے "فاطمہ! اس بچے کا خیال رکھو بڑا ہونہار ہے، انشاء اللہ یہ ایک دن بڑا آدمی بنے گا، اللہ تعالیٰ اس سے دین کا اونچا کام لے گا۔ جو اشارۂ غیبی حضرت محوی کو ملا شاید قطب ویلور کی پیشین گوئی اسی کی بازگشت رہی ہو۔ حضرت محوی پر جذب کا غلبہ تھا جب انھوں نے مولانا عبدالقادر کو نکاحِ ثانی کی ترغیب دی تو ممکن ہے نادانوں نے اسے مجذوب کی بڑ سمجھا ہو لیکن جوں جوں مستقبل پر سے پردے اٹھ رہے تھے یہ حقیقت واضح ہوتی جا رہی تھی کہ:

"دیوانہ ہرچہ گوید دیدہ گوید"

باپ کے سایۂ عاطفت سے "محروم" بچے کے لئے ماں کا سایہ اور سہارا بلاشبہ ضروری ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ جس کو زمانے کے نشیب و فراز سے گذار کر اور آزمائش و ابتلاء کی بھٹی میں تپا کر سرخرو و شادکام بنانے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس کو ان ظاہری علائق سے محروم کرکے بے آسرا کر دیتے ہیں تاکہ ہر حال میں آسرا اسی پیدا ہے اور آغازِ شعور ہی سے اسی پر انحصار اور اسی کی طرف رجوع و انابت ہو۔ شاید یہ ایک تکوینی سنت ہے۔

ابھی کمسن "عبدالوہاب" عمر کے سولہویں سال کو پہونچے تھے کہ والدہ ماجدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا ماموں شاہ محمود شطاری قادری ایک صاحب نسبت بزرگ تھے بزرگ ماموں کی صحبت اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ بھی بہت جلد موقوف ہو گیا۔ ماں کے انتقال کے تقریباً دو سال بعد شفیق ماموں کا بھی انتقال ہو گیا۔

غرض "عبدالوہاب" اعزاز یتیمی اور یکے بعد دیگرے عزیز و اقارب سے محرومی کے سایہ میں اپنی زندگی کے چوبیس سال گذار کر ۱۲۷۱ھ ماہ رجب میں مدراس پہونچے اور مسلسل سات سال کا عرصہ یہیں قیام فرما کر علوم متداولہ سے فراغت حاصل کی۔ مدراس میں تعلیم سے پہلے وطن میں حکیم زین العابدین سے ابتدائی فارسی عربی کی تعلیم حاصل کر کے علم طب کی باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل کر چکے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا عبدالوہاب نے ویلور سے کیرانہ پہونچ کر مولانا رحمت اللہ سے رشتۂ تلمذ قائم کیا تھا۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ کے عزیز و حفید مولانا محمد سلیم ابن مولانا محمد سعید

نے اپنی ایک مختصر سی کتاب "ایک مجاہد معمار" میں دربارِ کیرانہ کے فیض یافتگان کی جو مختصر و منتخب فہرست شائع کی ہے اس میں ایک نام "مولانا عبدالوہاب" کا بھی ہے۔ غالباً مولانا محمد سلیم صاحب کی اس روایت پر اعتماد کرتے ہوئے جنوب کے مشہور فاضل ڈاکٹر محمد یوسف کوکن نے اپنی وقیع تصنیف —— Arabic and Parsian in Karnataka میں مولانا عبدالوہاب کے تعارف کے ذیل میں تحریر فرمایا ہے :- پھر (مولانا عبدالوہاب) شمالی ہندوستان تشریف لے گئے اور وہاں مولانا رحمت اللہ کیرانوی (۱۲۲۶ – ۱۳۰۸) سے علم مناظرہ سیکھا۔

راقم الحروف کے نزدیک یہ روایت امر واقعہ سے مطابقت نہیں رکھتی ہے کیونکہ جس زمانے میں مولانا رحمت اللہ خدمتِ تدریس میں منہمک و مصروف تھے وہ سنہ ۱۲۶۰ھ اور سنہ ۱۲۷۰ھ کے مابین کا زمانہ ہے کیونکہ سنہ ۱۲۵۹ھ میں مولانا مہاراجہ ہندو راؤ دہلی کے ہاں میر منشی تھے اس خدمت میں کچھ عرصہ گذار کر اپنے فرائض سے سبکدوشی حاصل کی ہے لہذا اندازاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۲۶۰ھ یا اس کے بعد کسی سال خدمتِ تدریس کا آغاز کیا ہوگا۔ یہ سلسلہ ممکن ہے سنہ ۱۲۷۰ھ تک جاری رہا ہوگا کیونکہ سنہ ۱۲۶۹ ہجری میں "ازالۃ الاوہام" کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں قیامِ دہلی کے موقع پر ڈاکٹر وزیر خاں سے ملاقات، تبادلۂ خیال اور اشتراکِ عمل نے مولانا کو رد عیسائیت کے عمل میں زیادہ سرگرم بنا دیا تھا اور قیام بھی زیادہ تر دہلی و آگرہ میں رہنے لگا تھا۔

مولانا عبدالوہاب اس عرصہ میں اپنے وطن میں مقیم حکیم زین العابدین سے طب کی تعلیم و تحصیل میں مشغول تھے۔ علم ابدان سے فارغ ہو کر علم ادیان یعنی علوم دینیہ کی تحصیل و تکمیل کے لئے سب سے پہلا سفر مدراس کا کیا ہے۔ خود مولانا نے بقلم خود تحریر فرمایا ہے :-

"سفرِ فقیر بمدراس برائے طالب علمی سنہ ۱۲۷۱ ہجری ماہ رجب المرجب و مراجعت بعد فراغ سنہ ۱۲۷۵ ہجری"

سنہ ۱۲۷۱ھ سے سنہ ۱۲۷۸ھ تک کا دور مولانا رحمت اللہ کی غیر معمولی مصروفیات کا زمانہ ہے۔ اکبرآباد آگرہ کے تاریخی مناظرے کے بعد ایک عرصہ مناظرہ سے حاصل نتائج کو مستحکم بنانے، بعض اہم کتابوں کی تصنیف اور جہاد آزادی کی تیاری میں گذرا ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کی مصروفیات کے درمیان کیرانہ کی مسجد میں بیٹھ کر درس دینے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا یہ امکان بھی قطعاً غلط ہو جاتا ہے کہ مولانا عبدالوہاب قیام مدراس کے ابتدائی دور میں ایک آدھ سال کے لئے "کیرانہ" ہو آئے ہوں۔ علاوہ ازیں دعوی کیرانے میں علم مناظرہ کی تحصیل کا ہے۔ حالانکہ علم مناظرہ کی تحصیل کا موقعہ علوم متداولہ کی تعلیم کا آخری مرحلہ ہے۔ مولانا عبدالوہاب

کی تعلیم کا آخری مرحلہ یعنی سالِ فراغت ۱۲۸۰ھ ہجری ہے۔ اگرچہ مولانا ۱۲۸۰ ہجری میں علوم متداولہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کر چکے لیکن بعد کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا شوق طلب تکمیل و تحصیل کے بعد بھی برقرار رہا مگر جن سے اس شوق کی پذیرائی اور تسکین کی توقع کی جا سکتی تھی وہ مدراس سے مولانا کی فراغت کے سال تک بھی جہادِ آزادی کے سنگین نتائج کا شکار تھے۔ علماء راسخین کا وہ گروہ جو سن ستاون کی جہادِ آزادی میں سرگرم تھا بلکہ جس نے اس جہاد کی سربراہی اور پیشوائی کی تھی وہ آقایانِ فرنگ کے نزدیک معتوب و مستوجبِ سزا بلکہ قابلِ گردن زدنی تھا۔ دار و گیر، قید و بند، مقدمات اور قرقیِ جائیداد کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو جہادِ آزادی میں ناکامی کے بعد روپوش ہو کر چھپتے چھپاتے جوارِ حرم میں پہنچنے کے لئے دو ڈھائی سال کا عرصہ لگا۔ اس پورے عرصہ میں مولانا کی کوئی خیر خبر نہ تھی۔ مولانا قاسم نانوتویؒ کو کچھ عرصہ روپوش ہونا پڑا۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ چھ ماہ جیل میں بند رکھے گئے۔ غرض مرکزِ رجال شمالی ہند ہنگامی حالات کا شکار تھا۔ علمائے کبار کے لئے اپنے ہی ملک کی زمین تنگ کر دی گئی تھی۔ اس پر آشوب دور میں مولانا عبدالوہاب کا کسی صاحبِ کمال سے تحصیل مزید یا حصولِ اختصاص کی خاطر شمالی ہند کا سفر کرنا دشوار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے مدراس میں مولانا غلام قادری سے تحصیل و تکمیل کے بعد وطن "ویلور" کا رُخ کیا۔

۱۲۸۰ھ ہجری سے شعبان ۱۲۸۴ھ ہجری تک مولانا اپنے وطن ہی میں فروکش رہے۔ ۱۵ر شعبان ۱۲۸۴ھ ہجری کو بقصدِ "حج" ویلور سے جانب مکہ روانہ ہوئے۔ مولانا نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے:۔

> سفرِ نقیسہ حج شریف ۱۵ر شعبان المعظم ۱۲۸۴ھ ہجری۔ وصول بوطن بعد فراغ وحصولِ مقصودِ دل، ربیع الثانی ۱۲۸۶ھ ہجری مقدسہ۔"

اگرچہ سفر کا عنوان "حج شریف" تھا لیکن مقصودِ دل کا لفظ ایک دوسرے مقصد پر بھی دلالت کرتا ہے۔ مولانا نے حج سے فارغ ہو کر تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ اپنے مقصودِ دل کی یافت میں لگایا ہے۔ ———— (باقی آئندہ)

بابُ الاستفتاء

[مستفتی: ایس۔ اے بولٹن ۔ انگلینڈ]

۴۸۶

مکرمی و محترمی مفتی صاحب سلام مسنون۔

میں ایک مسجد میں یہاں امامت کرتا ہوں اور نماز میں لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں کر رہا ہوں اور حضروالانے بھی برطانیہ کے سفر میں دیکھا ہوگا کہ ائمہ مساجد اس کو نمازوں میں استعمال کر رہے ہیں اور دلیل میں اس بات کو پیش کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال کے اندر جو مقالہ مفتی محمد شفیع رح نے اپنی کتاب آلاتِ جدیدہ میں لکھا ہے وہ یہاں مفقود ہے مثلاً بجلی کا چلا جانا قریب قریب مساجد کا ہونا وغیرہ۔ صرف خشوع وخضوع اور سلف صالح کی سنت کے خلاف ہے۔ اس کے باوجود آپنے بھی جمعہ و عیدین میں مساجد میں اس کا استعمال دیکھا ہوگا۔ نیز ایک عالم صاحب کہہ رہے ہیں کہ آلہ مکبر الصوت سے آواز کا بلند ہونا اور دور تک پہونچانا بناء محراب اور بنائے گنبد سے زیادہ آسان ہے اور بناء محراب و بناء گنبد بلا نکیر مدت مدید سے رائج ہے اور اس سے بھی رفعِ صوتِ امام مقصود ہے تو حضرت والا سے گذارش ہے کہ ان باتوں کا دلائل سے جواب دیں۔

الجواب وباللہ التوفیق

اصل بات تو یہی ہے کہ نماز فرض بلا لاؤڈ اسپیکر کے بالکل سادہ طریقے پر ادا کیجائے۔ اسلئے کہ امام کی قرأت کا سننا ہر مقتدی کے حق میں واجباتِ صلوٰۃ میں سے نہیں ہے بلکہ اسماع وانصات واجب ہیں اور وہ بغیر اس آلہ کے بھی حاصل ہے نیز اسلئے کہ خشوع وخضوع جو نماز کی روح ہے وہ بھی اسی صورت میں بدرجۂ اتم حاصل ہوتی ہے اور اس کی تحصیل کی ترغیب بلکہ فی الجملہ تاکید بھی ہے اور آلہ مکبر الصوت میں بجلی نہ بجاگنے کی صورت میں بھی مختلف شوں گھڑگھڑ بھر بھر کی آوازیں نکل آتی ہیں جو خشوع وخضوع میں یا کم از کم یکسوئی اور توجہ الی الصلوٰۃ میں مخل ضرور ہو جاتی ہیں جن سے بچنا یا بچنے کی تدبیر کرنا بلاشبہ مقاصد تکمیل صلوٰۃ میں سے ہے رہ گئی یہ بات کہ آلہ مکبر الصوت نماز میں استعمال کر لیا جائے تو نماز ہو جائے گی یا نہیں۔

تو ابتداء میں اپنے اکابر نے نماز نہ ہونے کا فتویٰ دیا جیسا کہ حضرت تھانوی رح کے ابتدائی فتاویٰ اور حضرت

مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے رسالہ "التحقیق الفرید فی تقریب الصوت البعید" سے اور اسکے قبل کے فتاوی سے معلوم ہوتا ہے پھر اسکے بعد جب اپنے اکابرین ہی دورائیں نظر آنے لگی اور نماز جائز کہنے والے حضرات کے اس فرمانے سے کہ لاؤڈ اسپیکر کے انبوؤں سے نکلنے والی آواز بعینہ متکلم کی ہی آواز ہے جو بڑھ کر نکلتی ہے صدائے بازگشت وغیرہ نہیں ہے اور ایسی صورت میں نماز جائز ہو جانا چاہیئے تو مانعین جواز کے نزدیک بھی اپنی رائے میں تردد پیدا ہو گیا اور حضرت تھانویؒ کے آخر زمانہ میں عدم جواز کے قائلین کے نزدیک یہ رائے ٹھیری کہ اس آلہ کے ماہرین سے تحقیق کرلی جائے جو آوازیں اس سے نکلتی ہیں وہ بعینہ متکلم ہی کی آواز ہے جو بلند ہو کر نکلتی ہے تو جواز صلوٰۃ کا فتویٰ دے دیا جائے۔ جیسا کہ رسالہ "التحقیق الفرید" کے بعد کے فتاویٰ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے اور حضرت تھانوی رحؒ کی بھی یہی رائے تھی چنانچہ اس تحقیق میں تین ماہرین میں سے دو کی تحقیق یہ ہوئی کہ بعینہ متکلم کی آواز ہوتی ہے جو بلند ہو کر نکلتی ہے صدائے بازگشت وغیرہ نہیں ہے اور ایک ماہر کی رائے اسکے خلاف ہوئی مگر ان دو ماہرین میں سے ایک غیر مسلم تھا اس لئے متفق علیہ فیصلہ جواز کا نہ ہو سکا پھر حضرت تھانوی رحؒ کا وصال ہو گیا۔ بعد میں یہ چیز متحقق ہو گئی کہ اسمیں جو آواز نکلتی ہے وہ صدائے بازگشت وغیرہ نہیں ہوتی بلکہ متکلم کی ہی آواز ہوتی ہے جو بلند ہو کر نکلتی ہے۔

تو حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ اور مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ وغیرہم تمام اکابرین کے نزدیک متفقہ طور پر بلا کراہت اس سے جواز نماز کا فتوے ہو گیا۔ شیخ الاسلام نمبر میں بھی حضرت مدنی رحؒ کا فتویٰ جواز کا شائع ہو چکا ہے اور یہ الگ بات ہے کہ بلا ضرورت اس کا استعمال مستحسن نہیں ہے باقی اگر کوئی استعمال کرے تو نماز بلا کراہت ادا ہو گی البتہ اس کا لحاظ بھی ضروری رہے گا کہ لاؤڈ اسپیکر بہت عمدہ قسم کا ہو تا کہ اس میں سے بے موقعہ فوں شوں کی کریہہ آوازیں نہ نکلیں تاکہ خشوع و خضوع وغیرہ فوت نہ ہو ورنہ اس کا استعمال مکروہ ہوگا۔ اسی طرح اگر بجلی بھاگ جانے کا یا آلہ کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو اور مجمع بڑا ہو کہ امام کی آواز پیچھے تک پہونچنے میں شبہ ہو تو مکبرین کا انتظام رکھنا بھی ضروری ہے گا تاکہ ایسے وقت نماز خراب نہ ہو اور چونکہ زمانۂ سلف میں اس آلہ کا وجود ہی نہ تھا اسلئے ان کی سنت کے مخالفت و موافقت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور محراب و ممبر بنانے سے رفع صوت امام مقصود نہیں بلکہ محراب سے امام کی جائے قیام کو واضح کرنا مقصود ہوتا ہے اور منارہ سے مسجد کی عمارت کا اعزاز و اکرام مقصود ہوتا ہے اور اس کا نمایاں کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہ مطلوب شرعی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

العبد نظام الدین مفتی دارالعلوم دیوبند

۲۸ — ۲ — ۱۴۰۴ھ

Regd. No SHN-13-NP-21 84

DARUL-ULOOM MONTHLY
DEOBAND [U.P.]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالعلوم دیوبند
کے ترقیاتی منصوبے

(۱) رواق خالد کی دوسری منزل اور مزید جدید دارالاقامہ کی تعمیر جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو

(۲) دارالتربیت (دارالاطفال) کا قیام اور اس کی تعمیر

(۳) ایک وسیع مسجد کی تعمیر جس میں اضافہ شدہ تمام طلبہ کی گنجائش ہو (قدیم مسجد ناکافی ہو چکی ہے)

(۴) علمی و دینی اجتماعات کے لئے ایک وسیع ہال کی تعمیر ——— (۵) ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر

(۶) مہمان خانہ کی توسیع ——— (۷) نئی درسگاہوں کی تعمیر ——— (۸) لائبریری کی تعمیر جدید

(۹) اساتذۂ دارالعلوم کی علمی ترقی کے لئے عالم اسلام سے علمی کتابوں کی فراہمی کا انتظام

(۱۰) تمام دنیا میں پھیلے ہوئے فضلاء دارالعلوم سے روابط اور اُن سے متعلق معلومات

(۱۱) نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر تمام ذمہ داران مدارس عربیہ کا اہم کنونشن طلب کرنا۔

(۱۲) تعلیم و تربیت کے نئے اصول و ضوابط کی ترتیب اور اُن کا اجراء۔

اس ادارے کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے

دستِ تعاون بڑھانے کی شدید ضرورت ہے

مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی امداد روانہ فرمائیں ——— شکریہ

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب) دارالعلوم دیوبند یوپی

ایچ جے پرنٹرس دیوبند

دار العلوم دیوبند کا علمی، دینی، اصلاحی ماہنامہ

دار العلوم

زیر سرپرستی

مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند

مدیر مسئول

ریاست علی بجنوری



نگرانِ اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمان صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی ماہنامہ

دارالعلوم

جلد نمبر ۶۵	مارچ ۱۹۸۴ء مطابق جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ	شمارہ نمبر ۶

سالانہ زر اشتراک

ہندوستان سے ۲۵/- روپے

سعودی عرب، کویت، ابوظہبی وغیرہ سے

بذریعہ ایر میل ۹۰/- روپے

جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے

بذریعہ ایر میل ۱۰۵/- روپے

امریکہ، کناڈا وغیرہ سے بذریعہ ایر میل

۱۱۶/- روپے

پاکستان سے ذریعہ ریل ۴۵/- روپے

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

طابع و ناشر

دارالعلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مطبوعہ

محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند

○ **ضروری گذارش**:- اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینہ یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ بذریعہ سرخ نشان اس کی آپ کو اطلاع بھی دی جا چکی ہے۔ لہٰذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی۔ پی سے زر اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے۔ اگلا شمارہ ۳۱/- روپے کے مطالبہ میں وی پی کر دیا جائیگا۔ (مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی وپاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

۱۔ ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کیساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

۲۔ پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ -/۴۵ روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والہ تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیجدیں اور انھیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں۔ خط وکتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

——— حبیب الرحمٰن قاسمی

دورِ حاضر میں اسلامی اداروں اور دینی درسگاہوں کا ملک میں جس طرح سے جال پھیلا ہوا ہے وہ تاریخ کے کسی عہد میں نظر نہیں آتا اور بحمداللہ اس میں روز بروز ترقی ہوتی جارہی ہے۔ آپ پورے ملک کا گھوم کر جائزہ لیں آپ کو ہر صوبہ اور صوبہ کے ہر ضلع اور ضلع کی اکثر بستیوں میں دینی مدارس و مکاتب ضرور ملیں گے اور ان میں ایک دو نہیں سیکڑوں مدرسے ایسے ملیں گے جن کا سالانہ بجٹ ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہوگا۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان درسگاہوں اور علمی تربیت گاہوں کے مفید اثرات ظاہر بھی ہورہے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ پوری فراخدلی سے ہمیں یہ بات تسلیم کرنی چاہیئے کہ ان دینی مدارس اور جامعات سے پورے طور پر مطلوبہ فوائد حاصل نہیں ہورہے ہیں اور ملت کی تشکیل وتہذیب کے سلسلہ میں ان سے جو توقعات وابستہ ہیں وہ پوری نہیں ہورہی ہیں۔ اور مسلم معاشرہ بے چین اور مضطرب ہے کہ اسے صحیح طور پر رہنمائی نہیں مل پارہی ہے۔ عقائد و اعمال کی دیواریں متزلزل ہوتی جارہی ہیں، اخلاق وکردار کی قدریں دم توڑتی جارہی ہیں اور شعوری وغیر شعوری طور پر امت اپنی ڈگر اور صحیح راستہ سے ہٹتی جارہی ہے۔

حالانکہ ماضی میں ہمارے اسلاف نے انھیں مدارس اور دینی تربیت گاہوں سے ملت کے بھٹکے ہوئے قافلے کو صحیح سمت پر ڈالنے کیساتھ مدارس کے انھیں زاویوں میں بیٹھ کر باطل کا مقابلہ بھی کیا تھا اور اس کو خواندازے کرانے والا فرار اختیار کرنے پر مجبور کردیا تھا ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات کا جائزہ لیجئے کس طرح غیر ملکی اور

بدیسی تاجروں نے اپنے مکروفریب اور دسیسہ کاریوں وسازشوں کے ذریعہ ملک پر قبضہ جمالینے کے بارے میں ملی شعائر وعلامات دینی عقائد ونظریات اور قومی روایات وتشخصات کو ختم کرنے کیلئے حکومتی سطح پر ایک طوفان برپا کر رکھا تھا اور ایسے حالات پیدا کردئے تھے کہ صاف نظر آرہا تھا کہ اگر بروقت الحاد ولادینیت کے اس سیلاب بلاخیز کے آگے بند نہیں لگایا گیا تو ہمارے سارے ملی ودینی تشخصات خس وخاشاک کیطرح اس کی رو میں بہ جائیں گے۔

بالآخر حضرات اکابر رحمہم اللہ اللہ کے اعتماد اور بھروسے پر اٹھے اور اس طوفان کے مقابلے میں دینی مدرسوں اور اسلامی تربیت گاہوں کی مستحکم اور مضبوط دیوار کھڑی کردی اور نہ صرف اس بند کے ذریعہ طوفان کے رخ کو موڑ دیا بلکہ انھیں درسگاہوں کے بوریہ نشین سپوتوں نے اپنے جوش عمل، جذبۂ حریت، اصابت فکر دینی صلابت اور ایثار وقربانی سے ایک ایسا صالح انقلاب برپا کردیا کہ اسلامی تہذیب وثقافت کے مرجھائے ہوئے گلستان میں بہار تازہ آگئی اور پھر ایک دن وہ وقت بھی آیا کہ ہندوستان سے مسلمانوں اور انکی تہذیب کو مٹادینے کا خواب دیکھنے والی قوم اپنی تمام تر قوت وشوکت اور حیلہ سازیوں کے باوجود ملک بدر ہونے پر مجبور ہوگئی۔

مقام حیرت وحسرت ہے کہ آج بھی وہی درسگاہیں ہیں، وہی ان کا نظام تعلیم وتربیت ہے، وہی قال اللہ وقال الرسول کی صدائے روح نواز ہے غرضیکہ سب کچھ اسی ڈھرے اور اسلوب پر موجود ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ان کے علمی وفکری سوتے خشک ہوگئے ہیں، ان کی کوکھیں بانجھ ہوگئی ہیں، مردم سازی کے ان کے سارے آلات زنگ خوردہ اور بیکار ہوگئے ہیں کہ ان سے اب تو حضرت شیخ الہند جیسا مردم ساز قائد پیدا ہورہا ہے اور نہ حکیم الامت مولانا تھانوی جیسا مصلح ومربی، نہ کوئی انورشاہ کشمیری جیسا محدث ومحقق نظر آرہا ہے اور نہ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی جیسا مرد کامل مجاہد اور نہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب جیسا ذہن ثاقب رکھنے والا مفتی دکھائی دے رہا ہے اور نہ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی جیسا مضطرب اور امت کے غم میں بے چین داعی۔ اس روح فرسا صورت حال کا شدید تقاضا ہے کہ قافلۂ ملت کے حدی خواں حضرات علماء کرام اور مصلحین امت سر جوڑ کر بیٹھیں اور صورت حال کا مکمل بالغ نظری اور سوز قلبی کیساتھ جائزہ لیں اور اصلاح حال کیلئے ایسا طریق کار اور لائحہ عمل مرتب فرمائیں جس سے ہماری دینی درسگاہوں کی متاع گم شدہ پھر انھیں واپس مل جائے اور مردم سازی کے یہ کارخانے از سر نو چاک وچوبند ہوکر رجالِ کار کی تیاری میں مصروف ہوجائیں۔

مقام شکر ہے کہ ہند وپاک کے علماء میں سے ایک طبقہ مدارس دینیہ کی اس زبوں حالی سے بے چین اور مضطرب نظر آرہا ہے اور حالات کی درستگی کی تدبیریں سوچ رہا ہے جس پر یہ حضرات بجا طور پر تبریک وتہنیت کے مستحق ہیں

لیکن اسی کے ساتھ اتنی گذارش بھی ہے کہ اس وقت تک حالات کی اصلاح کیلئے جتنی آوازیں بھی اٹھی ہیں وہ نصاب تعلیم تک محدود رہیں اگرچہ یہ بھی ایک محتاج توجہ امر ہے اور اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ نصاب تعلیم کو اس کے اصل منہاج ومقصد پر قائم رکھتے ہوئے حالات واذہان کے تقاضوں کے مطابق بنایا جائے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ اس سے اہم تر معاملہ تربیت کا ہے علوم دینیہ کی تحصیل کرنیوالوں سے جس تیزی کیساتھ دینی مزاج اور ملت کے ساتھ شیفتگی کا جذبہ ختم ہو رہا ہے اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ اس بات کی طرف پہلی فرصت میں غور کیا جائے ، اور دیکھا جائے کہ وہ حضرات جو طلبہ کے معلم ومربی ہیں وہ مطلوبہ ریاضت وتقویٰ ، اخلاص واخلاق اور فہم وبصیرت کے معیار پر اتر رہے ہیں یا اس میں کمی اور نقص ہے پھر ان طلبہ کو دیکھا جو ہمارے اداروں میں زیر تعلیم ہیں کہ کیا وہ طالب علمی کے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں یا نہیں پھر دل سوزی کے ساتھ ایسا طریقہ اور راستہ بتایا جائے جس سے اساتذہ وطلبہ دونوں کا دینی واخلاقی احساس بیدار ہو اس سلسلے میں ذمہ داران مدارس کو بھی اپنا احتساب کرنا ہوگا کہ آیا وہ اپنی ذمہ داریوں کو اسلامی دائرہ میں رہتے ہوئے نباہ رہے ہیں یا نہیں غرضیکہ صرف نصاب تعلیم میں تغیر وتبدل سے مدارس کو صحیح طور پر فعال ومتحرک نہیں بنایا جاسکتا بلکہ پورے نظام اور طریق کار پر غور کرنے کی ضرورت ہے ، اس کے بغیر کسی مفید نتیجہ تک پہنچنا مشکل ہے ۔ اس لئے کہ نصاب کے سہل الحصول بنانے سے ممکن ہے کچھ علمی فائدہ ہو جائے لیکن دینی معاملہ میں جو کمی آئی ہے ظاہر ہے کہ یہ کمی نصاب کی تبدیلی سے نہیں پوری کی جاسکتی ہے بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ جب تک صحیح دینی جذبہ بیدار نہیں ہوگا علمی استعداد بھی پیدا ہونا مشکل ہے ۔

مفکر ، فلسفی ، زاہد ، مورخ ، رہنما ، عالم — ہماری درسگاہیں قوم کے معمار جنتی ہیں
مگر محروم ہو جاتی ہیں جب دین ودیانت سے — تو پھر یہ قوم وملت کیلئے اک مار بنتی ہیں

• • •

توسیل زر کا پتہ

مولانا مرغوب الرحمن صاحب

دار العلوم دیوبند

قرآن حکیم اور جدید سائنس (۲)

ایک حقیقت پسندانہ اہم تبصرہ

از جناب کریم الدین صاحب مقیم حال حدّہ

(۱۳) صفحہ ۱۹۔ (زمین و آسمان کی اس) "علیحدگی کے عمل کے نتیجہ میں کئی دنیائیں وجود میں آئیں اس سلسلہ میں درجنوں حوالے قرآن میں دستیاب ہیں، بلکہ قرآن پاک کی سب سے پہلی آیت بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے: "سب تعریفیں اللہ کیلئے جو جہانوں کا رب ہے" (فاتحہ - ۱) اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ زمین و آسمان کی علیحدگی والا خیال ہی غلط ہے۔ قرآن میں صرف ایک جگہ آسمانوں کی طرح زمینیں بھی (سات) بنائے جانے کا ذکر ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ہماری دنیا کے مثل دنیائیں ہیں۔ شاید اسی وجہ سے مفسرین نے عالمین کے یہ معنی اختیار نہیں فرمائے بلکہ مراد اس سے مخلوقات کی الگ الگ جنسیں لی ہیں، مثلاً عالمِ ملائکہ، عالمِ انسان، عالمِ جن وغیرہ۔ پس پیشتر اس کے کہ ہماری دنیا جیسی دوسری دنیاؤں کا وجود متحقق ہو، ہم کو وثوق کے ساتھ بہت سی دنیائیں بننے کا حکم نہ لگانا چاہیئے۔

(۱۷) صفحہ ۲۰۔ آیت ۵۹ سورۂ فرقان: "وہ (خدا) ایسا ہے جس نے آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے سب چھ روز (کی مقدارِ وقت) میں پیدا کیا" میں ڈاکٹر صاحب کے خیال سے "زمین اور آسمان کے درمیان جو کچھ ہے" سے مراد مادّہ کے وہ پل ہیں جو باضابطہ فلکیاتی نظاموں سے باہر ہیں اور جو حال ہی میں دریافت کئے گئے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک

آسمانِ دنیا سے مراد نظامِ شمسی ہے، اس لئے ان کو آسمان اور زمین کے درمیان صرف یہی ایک چیز نظر آئی، جو آج بھی صرف اونچے درجے کے اہلِ سائنس ہی کے تصوّر میں آسکتی ہے۔ عام آدمی تو زمانہ نزولِ قرآن میں بلکہ ہمارے زمانہ میں بھی مَا بَیْنَهُمَا سے مراد ہوا، چاند، ستارے وغیرہ ہی بآسانی لے سکتا ہے جو مشاہد ہیں، اور ایمان بالغیب کے درجہ میں غیر مشاہد چیزوں کے وجود کا بھی قائل ہو سکتا ہے، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اگر آسمان اور زمین کے درمیان صرف ایک ہی چیز (مادّہ کے پل) ہوتی تو اللہ تعالیٰ مَا بَیْنَهُمَا نہ فرماتے بلکہ اس چیز کی وضاحت فرما دیتے۔ مَا بَیْنَهُمَا استعمال فرمانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ بہت سی چیزیں پیدا فرمائی ہیں جن میں سے بعض مشاہد اور بعض غیر مشاہد ہیں۔ پس مادّہ کے پلوں کو ہی مَا بَیْنَهُمَا کا مدلول بتانا غلط ہے۔

اب ہم ترقّی کر کے ثابت کرتے ہیں کہ مَا بَیْنَهُمَا سے مراد "مادّہ کے پل" ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ ڈاکٹر صاحب اور دوسرے سائنسدانوں کے نزدیک اس "مادّہ" سے مراد وہ چیز ہے جو سحابیہ (Nebula) سے ستارے، سیارے، تحتی سیارے وغیرہ اجرامِ فلکی (جنھیں ڈاکٹر صاحب اور بعض جدید مفسرین اور سائنسدان آسمان کہتے ہیں) بننے کے عمل کے نتیجہ میں غبار یا دخان کی شکل میں بچ رہی۔ ظاہر ہے کہ اس پر پیدا کئے جانے کا اطلاق صحیح نہیں، ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی بڑھئی ایک میز بنائے تو جو چھیلن، بُرادہ وغیرہ اس جگہ باقی رہ جائے اس کی نسبت یہ کہنا کہ میز کے ساتھ بڑھئی نے یہ چیزیں بھی بنائی ہیں درست نہیں۔ غرض مادّہ کے پل "مَا بَیْنَهُمَا" کا مدلول نہیں ہو سکتے۔

(۱۸) صفحہ ۲۰: "یہ ایک علوم فلکیاتی حقیقت ہے کہ ہمارا یہ سیارہ (زمین) اپنے ستارے (سورج) سے وجود میں آیا ہے" مگر ماہرینِ فلکیات کے پاس اس کی کوئی مسکت دلیل نہیں۔ یہ خیال کہ سورج کی کسی ستارے سے ٹکر کے نتیجہ میں سورج کے کچھ ٹکڑے ٹوٹ کر علیحدہ ہوگئے اور سیاروں کی شکل اختیار کر کے مختلف مداروں میں مختلف رفتاروں سے اس کے گرد گھومنے لگے، جن میں ایک ہماری زمین بھی ہے، ہمارے نزدیک خرافات سے زیادہ نہیں جس کو حقیقت کہنا حقیقت پر ظلم کرنا ہے۔

(۱۹) صفحہ ۲۲ "قرآن میں جہاں لفظ "نجم" (ستارہ) استعمال ہوا ہے، وہاں اس کے ہمراہ ایک اور وضاحتی لفظ "ثاقب" بھی استعمال ہوا ہے جس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ستارے ٹوٹتے جلتے ہیں اور کبھی کبھی جلتے رات کی تاریکیوں کو چیر کر راکھ بھی بن جاتے ہیں" ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق درست نہیں کہ قرآن میں ہر جگہ "نجم" کے ساتھ "ثاقب" کا استعمال ہوا ہے جیسا کہ وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ سے ہی ظاہر ہے۔ ٹوٹنے والے ستاروں کیلئے قرآن میں بجائے نجم کے "شہاب" استعمال ہوا ہے جس کے معنی "شعلہ" ہیں، اور یہ ضروری نہیں کہ وہ جل کر راکھ ہی ہوجاویں چنانچہ اُن کے ادھ جلے ٹکڑے زمین پر بھی گر پڑتے ہیں جو عجائب خانوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بعض ان میں بہت وزنی ہیں۔

(۲۰) صفحہ ۲۲ "قرآن میں لفظ کواکب سے مراد یقینی طور پر سیارے ہیں" ایک دعویٰ بلا دلیل ہے۔ ایک عام ناظر کو رات کے وقت ستارے اور سیارے میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ دونوں ہی روشن نظر آتے ہیں، جیسے چاند پر سے زمین کو دیکھنے میں وہ روشن نظر پڑتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ رات کو بے شمار روشن اجرام فلکی سے آسمان جگمگاتا ہے، جس کی نسبت آیت ۶ سورہ صافات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے آسمان دنیا کو کواکب سے زینت دی۔ تو کیا یہ سب روشن نظر آنے والے اجرام فلکی سیارے ہی ہیں؟ عقلاً تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے "کواکب" کا لفظ ستاروں اور سیاروں یعنی تمام روشن نظر آنے والے اجرام فلکی کیلئے استعمال فرمایا ہے، واللہ اعلم۔

(۲۱) صفحہ ۲۲ "سورۂ انبیاء آیت ۳۳ میں کائنات میں توازن کی بنیاد کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: "اُس (خدا) نے رات اور دن اور سورج اور چاند بنائے۔ ہر ایک اپنے اپنے مدار میں (مقررہ رفتار کیساتھ) تیر رہے ہیں"۔ بین القوسین عبارت کے اضافہ کے بعد بھی آیت کائنات میں توازن کے ذکر یا اُس کی وجہ کے بیان سے تو ساکت ہی رہی۔ دراصل توازن کی وجہ تو خدا کی قدرت ہے جیسا کہ آیت ۶۵ سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اور وہی آسمان کو زمین پر گرنے سے تھامے ہوئے ہے، ہاں مگر اُسی کا حکم ہوجاوے تو خیر (پھر تو ضرور ہی گر پڑے)"۔ ہمیں اس تجسس میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ کیسے تھامے یا توازن قائم کئے ہوئے ہے؟

(۲۲) صفحہ ۲۳ :۔ چاند کے متعلق یہ تمام حقائق (اس کا زمین کے گرد گھومنا وغیرہ) اکثر لوگوں کو معلوم ہیں، لیکن سورج کے بارے میں ان حقائق سے ذرا کم لوگ واقف ہیں۔ اگرچہ سورج کے متعلق بھی اسی اصولِ مطابقت کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے" قرآن نے جو کچھ معلومات چاند، سورج اور دوسرے اجرامِ فلکی کے متعلق دی ہیں اُن پر ایمان لانا کافی ہے۔ باقی قرآن اِس سلسلہ میں مزید معلومات کے حصول سے نہیں روکتا اگرچہ متعلقہ آیات کی تفسیر کیلئے اُنکی ضرورت نہیں۔

(۲۳) صفحہ ۲۴ :۔ (قرآن نے) جن الفاظ کے ساتھ اِس (رات اور دن کے) تواتر کو بیان کیا ہے وہ انتہائی اہم ہے۔ مثلاً سورۂ زمر (آیت ۵) میں فعل یُکَوِّرُ کا استعمال اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ کس طرح رات دن کو اور دن رات کو لپیٹتا ہے۔ اس لفظ کا لغوی مفہوم ہے سر کے گرد پگڑی لپیٹنا، اور یہ ایک حقیقی تقابل ہے (دن اور رات کی گردش کو ظاہر کرنے کیلئے) حالانکہ جس زمانہ میں قرآن اُتارا گیا، اِس حقیقت کی تصدیق کے لئے ضروری فلکیاتی معلومات نامعلوم تھیں" آیت میں دن کا رات کو یا رات کا دن کو لپیٹنا بیان نہیں ہوا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا دن کو رات پر اور رات کو دن پر لپیٹنا آیا ہے جیساکہ یُکَوِّرُ اللَّیْلَ عَلَی النَّھَارِ وَیُکَوِّرُ النَّھَارَ عَلَی اللَّیْلِ کے لفظی ترجمے سے ظاہر ہے (ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب بائیبل، قرآن اور سائنس میں البتہ صحیح ترجمہ کیا ہے) چونکہ پگڑی باندھنے سے سر چھپ جاتا ہے، اس لئے ایک چیز سے دوسری کو چھپا دینے کیلئے بھی تکویر کا استعمال ہوتا ہے۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "خدا کی قدرتِ کاملہ کو دیکھو کہ دن کے رُخِ روشن پر رات کی چادر لپیٹ کر اُسے نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے اور رات کی سیاہ زلفوں پر دن کی روشن کرنیں ڈال کر ان کی سیاہی کو کافور کر دیتا ہے" (قاموس القرآن صفحہ ۴۷۰)، اس مفہوم کو سمجھنے کیلئے ہر شخص کا اپنا روزانہ کا مشاہدہ ہی کافی ہے، کسی غور وخوض کی بھی حاجت نہیں۔ تاہم قرآن نے نہ صرف اس آیت میں بلکہ جہاں کہیں بھی رات اور دن کے تواتر اور اُن کے گھٹنے بڑھنے کا بیان کیا ہے وہ ایسے طریقے سے کیا ہے کہ آج جبکہ سائنس نے یہ تحقیق کرلیا ہے کہ یہ تواتر اور گھٹنا بڑھنا زمین کی اپنی محوری گردش اور محور کے سطح مدار پر ایک زاویہ کی جھکاؤ کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوتا ہے، ماہرین علم فلکیات قرآن کے بیان کو کسی طرح بھی اپنی مسلمہ تحقیقات کے خلاف نہیں پاتے، حالانکہ زمانہ نزول قرآن میں زمین کو ٹھہرا ہوا اور سورج کو متحرک

مانا جاتا تھا، بلکہ کم از کم اہلِ عرب تو سطحِ زمین کو بجائے گُرّوی کے چپٹی بھی سمجھتے ہوں گے۔ ایسے زمانہ میں رات دن کے تواتر کے سلسلہ میں قرآن کے بیان کو ہمارے زمانہ کا لکھا پڑھا انسان ہرگز اُس زمانہ کے کسی آدمی کا کلام خیال نہیں کرسکتا کیوں کہ اس سے زمین کے گُرّوی ہونے اور اُس کی محوری گردش کی طرف کھُلا اشارہ ملتا ہے، جس کا اُس زمانہ میں تصور بھی ممکن نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب یہی کہنا چاہتے ہیں جو اپنی کتاب میں انھوں نے زیادہ وضاحت سے کہا ہے پس بلاشبہ اس قسم کی آیتیں ہمارے غیر مسلم سائنس دانوں کو دعوتِ ایمان دے رہی ہیں، اور مسلمانوں کو اسی حیثیت سے انھیں تبلیغِ اسلام کیلئے استعمال کرنا چاہیئے۔ لیکن تفسیریں اُن کی وہی رہیں گی جنھیں ہر زمانہ کے عوام سمجھ سکیں، جیسی کہ آیت زیرِ بحث کی تفسیر ہم نے اوپر قاموس القرآن کے حوالہ سے دی ہے کیوں کہ منشاء ان آیتوں کے نزول سے سائنس پڑھانا نہیں بلکہ اظہارِ عظمتِ قدرت ہے تاکہ لوگ توحید پر دلیل پکڑیں۔

(۲۴) صفحہ ۲۳ "قرآن ہمیں آسمانوں کے ارتقاء اور سورج کے متعینہ مقام کے متعلق بھی بتاتا ہے، یہ سب کچھ جدید ترین فلکیاتی تحقیقات کے نتائج کے عین مطابق ہے۔ قرآن میں کائنات کا حوالہ بھی ملتا ہے" ہمارے مطالعہ قرآن کی حد تک قرآن میں آسمانوں کے ارتقاء (Evolution) کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا، البتہ سورج کے مستقر کا ذکر آیت ۳۸ سورۂ یٰسٓ میں مذکور ہے لیکن نہ تو اُس مستقر کے مقام کی تعیین فرمائی گئی ہے نہ اس وقت کی جب سورج اپنے اس مستقر پر پہنچیگا۔ چاند، سورج (اور اسی طرح دیگر اجرامِ فلکی) کے متعلق قرآن کی کئی آیتوں میں اُن کا ایک مقررہ میعاد تک چلتے رہنا آیا ہے اور قیاس یہی کیا جاتا ہے کہ وہ میعاد "قیامت" ہے، جو اللہ تعالیٰ کے واقع کرنے سے واقع ہوگی جیساکہ إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ جیسی آیتوں سے ظاہر ہے، نہ کہ سورج وغیرہ کے کہنہ اور فرسودہ ہوجانے پر اُن کی صفات کے زائل ہوجانے کی وجہ سے۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک آسمانوں کا مطلب چونکہ زمین کے علاوہ ستاروں، سیاروں اور کہکشانوں (Galaxies) کا مجموعہ ہے اس لئے انھوں نے آسمانوں کے ارتقاء کے سلسلہ میں اپنی کتاب میں سورج کے ارتقاء کا ذکر فرمایا ہے (جو دوسرے ستاروں کے متعلق بھی ملتا جلتا سمجھا جاسکتا ہے) وہ کہتے ہیں کہ ہمارا سورج تقریباً ساڑھے چار ارب سال پُرانا ہے اور ابھی اپنی ابتدائی حالت میں ہے

یعنی ہائیڈروجن گیس کے ذرات کو ہیلیم گیس کے ذرات میں بدل رہا ہے۔ یہ حالت ابھی تقریباً ساڑھے پانچ ارب سال تک اور باقی رہے گی۔ اس کے بعد وہ سرد اور کم نور ہوتا چلا جائیگا اور اس کا ثقل بڑھتا چلا جائیگا، حتیٰ کہ ایک وقت (اربوں سال بعد) اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر جس کی تعیین ماہر فلکیات نے کر کے اس کا نام بھی راس شمسی (Solar Apex) رکھ دیا ہے، سورج ختم ہو جائیگا۔ قیامت کا یہ سائنسی تصور، ظاہر ہے کہ اسلامی تصور سے میل نہیں کھاتا، کیونکہ ہم مسلمان لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ قیامت کے روز تک پہونچتے پہونچتے سورج ٹھنڈا اور بے نور ہو جائیگا بلکہ یہ خیال کرتے ہیں کہ قیامت کے روز بھی سورج گرم اور تاباں ہی طلوع ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ اُس کو اس کی روشنی لپیٹ کر بے نور کر دیں گے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ مسلمانوں کے خیال سے احادیث کی بنا پر قیامت قریب ہے جبکہ سائنسی نظریات کی رُو سے اُس کا وقوع ہونے میں ابھی اربوں سال باقی ہیں۔ تاہم یہ بھی غنیمت ہے کہ سائنس سورج کا مستقر تو مانتی ہے، اگرچہ آیت کی تفسیر کے لئے اس کی تعیین ضروری نہیں۔

اور "کائنات کے حوالے سے مطلب ڈاکٹر صاحب کا اُس کا بھی "ارتقاء" ہی ہے جو ان کی کتاب (بائیبل قرآن اور سائنس) سے ظاہر ہے۔ یہاں وہ ارتقاء کا مطلب "توسیع" لیتے ہیں اور ثبوت میں آیت ۴۷ سورۂ ذاریات "وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ" پیش کرتے ہیں جس میں مُوْسِعُوْنَ کا ترجمہ انھوں نے "پھیلانے والے" یا "وسیع کرنے والے" کر لیا ہے، حالانکہ ممتاز مفسرین نے اس کا مطلب "وسیع القدرت" لیا ہے جو ڈاکٹر صاحب کے نزدیک غلط ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ (حیدرآبادی مقیم فرانس) صاحب نے اپنی فرنچ تفسیر میں آسمانوں اور خلا کی توسیع کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کے آخر میں سوالیہ نشان (؟) بھی لگا دیا ہے، البتہ سائنسدانوں پر مشتمل "مجلس شوریٰ عالیہ امور اسلامیہ قاہرہ" نے اپنی "تفسیر منتخب" میں واضح طور پر ڈاکٹر صاحب کے ترجمہ کی تائید کی ہے۔ تاہم ہم تو علماء مفسرین کے ترجمہ کو ہی صحیح مانتے ہیں اور توسیع کائنات کے قائل نہیں۔ مُوْسِعُوْنَ اسم فاعل مُوْسِعٌ کی جمع ہے جس کے معنی صاحب وسعت بھی ہیں اور وسعت دینے والا بھی۔ اگر یہاں آخر الذکر معنی مراد ہوتے تو جس چیز کو وسعت دیتے یا پھیلاتے ہیں مذکور ہوتا اور "اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ" ہوتا، جیسے "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" میں لَهٗ کی ضمیر

معنی ہے۔ چونکہ آیت زیر بحث میں سمٰکہ کی لوٹنے والی ضمیر (لہا) استعمال نہیں ہوئی اسلئے یہاں موزوں کا ترجمہ وسیع القدرت سے کرنا ہی صحیح ہے اور اہل مصر کی جدت قابل قبول نہیں نیز سیاق و سباق کے اعتبار سے بھی وہ یہاں موزوں معلوم نہیں ہوتی ۔

(۲۵) صفحہ ۲۳، ۲۴ :- "قرآن خلائی تسخیر کے متعلق بھی اشارہ کر رہا ہے ..... آج انسان چاند پر قدم رکھ کر خلا کو مسخر کر چکا ہے لیکن قرآن کے نزدیک یہ کوئی انوکھی بات نہیں ۔ ذرا سورۂ رحمان کی مندرجہ ذیل آیت پر غور کریں : ' اے جنوں اور انسانوں کے گروہ اگر تم قدرت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کی حدود (دائرۂ کشش ثقل) سے نکل جاؤ لیکن تم (خدا کی عطا کی ہوئی) طاقت کے سوا باہر نہیں نکل سکتے ' تسخیر خلا کے لئے قوت قادر مطلق ہی عطا کر سکتا ہے "

ڈاکٹر صاحب تو خیر ایک ڈاکٹر ہیں ، انھیں قرآن میں اگر ربط آیات کا علم نہ ہو تو چنداں تعجب کی بات نہیں ، کیوں کہ انھوں نے غالباً ابھی قرآن کا اس مقصد سے مطالعہ ہی نہیں کیا ، مگر ہمارے (نو تعلیم یافتہ) بھائیوں کو کیا ہوا کہ وہ "قرآن کی عبارت کو " کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑہ بھان متی نے کنبہ جوڑا " کے مصداق ، معاذ اللہ ، بے ربط سمجھتے ہیں ۔ چنانچہ جیسے ہی آدمی نے خلائی سفر کیا یا چاند پر قدم رکھا انھوں نے ربط آیات سے قطعی صرف نظر کرکے بڑے زور سے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ قرآن میں خلائی سفر بلکہ معاذ اللہ ، خلائی تسخیر کے ممکن ہونیکی چودہ سو سال پہلے ہی خبر دیدی گئی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے تو سائنسداں ہوتے ہوئے بھی اتنی احتیاط برتی کہ لفظ سُلطٰن کا ترجمہ " خدا کی عطا کی ہوئی طاقت " کیا ، لیکن ان بے باک مسلمانوں نے جن میں اکثر سائنس کی ابجد سے بھی واقف نہیں ، اس لفظ کا مفہوم سائنس کی طاقت سمجھا ، اور ذرا خیال نہ کیا کہ اس مفہوم کے ساتھ آیت ۳۱ تا ۳۵ کی عبارت بالکل بے تکی اور غلط ہو جاتی ہے یعنی اس طرح :-

" اے جن و انس ہم عنقریب تمہارے (حساب کتاب کے) لئے خالی ہوئے جاتے ہیں (۳۱) سو اے جن و انس تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے ؟ (۳۲) اے گروہ جن و انسانوں کے اگر تم کو یہ قدرت ہے کہ آسمان و زمین کی حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو نکل جاؤ (مگر) نکل نہیں سکتے بجز سائنسی طاقت کے (۳۳) سو اے جن

تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے؟ (۳۴) تم دونوں پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائیگا، پھر تم (اس کو) ہٹا نہ سکو گے (۳۵)۔

اس مفہوم سے سیاق و سباق میں بے ربطی کیساتھ یہ غلطی بھی ہے کہ شعلہ اور دھویں سے اِن حضرات کے نزدیک خلائی سفر میں پڑنے والی شہاب کی بارش اور گرم طبقہ مراد ہے جس سے خلاباز سائنسی حفاظتی تدابیر کے ذریعہ سلامتی سے گذر جاتے ہیں، پس اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "تم اُسے ہٹا نہ سکو گے" یعنی اس کے عذاب سے نہ بچ سکو گے، معاذ اللہ غلط ٹھہرتا ہے۔ ایسی بے تکی اور غلط بات کو کیوں کر "وحی" مانا جا سکتا ہے؟ گویا اِن نادانوں نے قرآن میں خلائی سفر کے ممکن ہونیکی خبر ثابت کرنیکی کوشش میں اس کے الہامی ہونے ہی کی نفی کردی ؎

دوستی بے خِرداں دشمنی ست ! اِن آیتوں کا صحیح اور مربوط تفسیری ترجمہ یہ ہے :۔

"(یہ مضمون جلال و اکرام کا بقاءِ خالق کے متعلق بیان فرما کر آگے پھر فناءِ مخلوق کے متعلق ارشاد ہے کہ تم لوگ یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا فنا ہونا دائمی ہوگا اور حساب کتاب نہ ہوگا، نہیں بلکہ ہم تم کو دوبارہ زندہ کریں گے اور حساب کتاب کے بعد جزا و سزا دیں گے۔ اسی مضمون کو اس طرح فرماتے ہیں کہ) اے جن و انس ہم عنقریب تمہارے (حساب کتاب کے) لئے خالی ہوئے جاتے ہیں (۳۱) (یعنی تم سے حساب کتاب لینے والے ہیں، چونکہ حساب کتاب کی خبر دینا بھی ایک نعمت ہے) سو اے جن و انس (باوجود اس کثرت و عظمتِ نعم کے) تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے؟ (۳۲) (آگے وقوعِ حساب کے لازمی ہونے کے سلسلہ میں یہ بتلاتے ہیں کہ اس وقت کسی کے بچ کر کہیں نکل بھاگنے کا بھی احتمال نہیں چنانچہ ارشاد ہے کہ) اے گروہ جن و انسانوں کے اگر تم کو یہ قدرت ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو (ہم بھی دیکھیں) نکلو (مگر) بدون زور کے نہیں نکل سکتے (۳۳) اور زور ہے نہیں پس نکلنے کا وقوع بھی محتمل نہیں اور جب دنیوی زندگی میں بھی یہ حالت ہے تو قیامت میں تو اور زیادہ عجز ہوگا پس یہ احتمال مرتفع ہوگیا، یہ بات بتلا دینا بھی موجب ہدایت ہے) سو اے جن و انس!

(باوجود اس کثرت وعظمت نعم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے؟ (۳۴) یہ تو حساب کتاب سے بچنے میں عجز کا ذکر تھا، آگے عذاب سے بچنے میں عجز کا بیان ہے، یعنی اے جن وانس کے مجرمو!) تم دونوں پر (قیامت کے روز) آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائیگا، پھر تم (اس کو) ہٹا نہ سکوگے (۳۵) (یہ شعلہ اور دھواں غالباً وہ ہے جس کا ذکر سورۂ مرسلات میں ہے: اِنْطَلِقُوْا اِلٰی ظِلٍّ ..... اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ۔ اور اس کا بتلا دینا بھی بوجہ ذریعہ ہدایت ہونے کے ایک نعمت عظمیٰ ہے)" [بیان القرآن]

اسلام کے ان نادان دوستوں نے قرآن سے خلائی سفر کا امکان ثابت کرنے میں ربط آیات میں غور نہ کرنے کے علاوہ دو "عقلی" غلطیاں بھی کی ہیں، ایک تو یہ کہ انھوں نے آسمان اور زمین کے حدود سے باہر نکلنے کا مطلب زمین اور کسی جرم فلکی (جو ان کے نزدیک ایک آسمان ہے) کے دائرۂ کشش ثقل سے باہر نکلنا سمجھا حالانکہ قرآن سے جنوں کا آسمانی خبریں معلوم کرنے کیلئے اس کے قریب تک پہنچنا اور شہاب ثاقب کے ذریعہ فرشتوں کا ان کو مار بھگانا ثابت ہے، گویا وہ بغیر کسی راکٹ وغیرہ کے ہی زمین اور بہت سے اجرام فلکی کی کشش ثقل کے دائروں سے بہت آگے نکل جاتے تھے یا نکل جاتے ہیں، پھر اُن سے یہ کہنا کہ اگر تم قدرت رکھتے ہو تو نکل جاؤ کیا معنی رکھتا ہے؟ پس زمین وآسمان کی حدود سے باہر نکلنے کا مطلب یہاں ساری کائنات سے باہر نکلنا ہے جو کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

دوسری غلطی ان حضرات نے آیت کے اس جملہ کا مطلب سمجھنے میں کی "مگر بدون زور کے نہیں نکل سکتے"۔ اس کا مطلب یہ نکالا کہ زور ہونے پر نکل سکتے ہیں، حالانکہ یہ ایک اسلوب بیان ہے کسی چیز کو ناممکن الوقوع ثابت کرنیکا۔ جیسے قرآن میں آیا ہے کہ فلاں قسم کے لوگ جنت میں نہ جائیں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں سے نہ نکل جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب اونٹ سوئی کے ناکہ میں سے گذر جائیگا تب یہ لوگ جنت میں چلے جائیں گے بلکہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا جنت میں داخل ہونا ایسا ہی محال ہے جیسے اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذرنا۔ پس یہاں بھی اللہ تعالیٰ کائنات سے باہر نکل سکنے کو ایسا ہی ناممکن بتلا رہے ہیں جیسا اس کلام کی طاقت رکھنے

کو۔ بھلا جب حضرت جبرئیل ؑ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے بڑھنے کی طاقت نہیں رکھتے (جو کائنات کے اندر ہی ہے) تو پھر کائنات سے باہر نکل سکنے کی طاقت کس میں ہو سکتی ہے؟ کاش کہ ڈاکٹر صاحب اور ان سے پہلے جدت پسند مسلمان جن کو ہم اسلام کے نادان دوست کہتے ہیں، تقریر بالا کی روشنی میں سورۂ رحمٰن کی ان آیتوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کریں تاکہ قرآن پر ظلم کرنے سے باز رہیں۔

(۲۶) صفحہ ۲۶، ۲۷۔ علم طبقات الارض میں حال ہی میں اہم چیز دریافت کی گئی ہے وہ ہے "مظہر التفاف" کی حقیقت جس سے سلسلہ ہائے کوہ وجود میں آئے ہیں۔ قشر الارض کی بھی یہی کیفیت ہے جو ایک ٹھوس خول یا پوست کی طرح ہے جس پر ہم جی سکتے ہیں جبکہ اس کی تہیں گرم اور سیال ہونے کے باعث زندگی کی کسی بھی شکل کے لئے ناموزوں ہیں۔" ڈاکٹر صاحب کی اس عبارت کا مفہوم واضح نہیں ہے یعنی اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ "مظہر التفاف" کی وہ کیا حقیقت ہے جو قشر الارض کی بھی کیفیت ہے؟ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ قشر الارض ([illegible] [illegible]) کی سلوٹیں یا شکنیں ہی جغرافیہ دانوں کے نزدیک پہاڑوں کی شکل میں رونما ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے "التفاف" (شکنیں) کی بھی کوئی وجہ نہیں بتلائی، جو جغرافیہ طبیعی میں اسکولوں میں ہم کو پڑھائی گئی تھی کہ زمین شروع میں ایک آگ کا کرہ تھی، ایک طویل عرصہ کے بعد اس کا قشر رفتہ رفتہ سرد ہو گیا جس سے اس پر حیوانی اور نباتی زندگی ممکن ہوئی۔ ٹھنڈا ہونے پر وہ سکڑا یعنی کہیں دب گیا اور کہیں ابھر آیا، اور یہ ابھری ہوئی شکنیں ہی پہاڑ بن گئیں۔

مذکورہ بالا عبارت سے آگے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "یہ بھی ایک ارضیاتی حقیقت ہے کہ پہاڑوں کے استحکام کا تعلق "مظہر التفاف" سے ہے کیونکہ شکنوں کے سلسلہ یا التفاف کی بدولت ہی سلسلۂ کوہ میں بلند و پست کی کیفیت رونما ہوتی ہے اور یہی بلند و پست پہاڑ کہلاتے ہیں" یہ بات بھی ہمیں گنجلک آمیز معلوم ہوتی ہے کہ پہاڑوں کے استحکام کا تعلق "مظہر التفاف" سے کس طرح ہے؟ ان کی تخلیق سے تو التفاف کا تعلق معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ادھر بیان ہوا، نہ کہ استحکام سے۔ شاید ڈاکٹر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پہاڑوں کے غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے قشر الارض اپنے نیچے کے گرم اور سیال مادہ میں کافی دھنس گیا جس سے پہاڑوں کی بنیادیں گہری ہو کر ان کے استحکام کا باعث

[illegible] واللہ اعلم بالصواب

آخر میں صفحہ ۲۰ پر انھوں نے سورۂ نبا آیت ۶-۷ کا ترجمہ "کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا؟" پیش فرماکر لکھا ہے "میخ یا کھونٹے (اَوْتَاد) جو زمین میں گاڑے گئے ہیں، ایسے جیسے کسی خیمے کو گاڑنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، یہاں گہرے ارضی شکنوں کی بُنیادیں ہیں۔ پس اس سلسلہ میں قرآن نے جو بیان دیا ہے وہ جدید ارضیاتی معلومات سے مکمل مطابقت رکھتا ہے": اس عبارت سے بھی زیادہ سے زیادہ یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پہاڑ قشر زمین کو اُس کے گودے (یعنی اندرونی گرم اور سیال کرہ) پر جمائے رکھنے کیلئے استحکام ([illegible]) فراہم کرتے ہیں اور صرف اسی اعتبار سے ان کو "زمین کی میخیں" فرمایا گیا ہے۔ مگر قرآن میں دوسرے تین مقامات پر (سورۂ نحل آیت ۱۵، سورہ انبیاء، آیت ۳۱ اور سورۂ لقمان آیت ۱۰ میں) تخلیق جبال کی حکمت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ (زمین) ہمیں یعنی انسانوں کو لے کر ہلنے یا ڈانواڈول نہ ہونے لگے۔ اگر سائنس سے یہ ثابت ہوجاتا کہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین ہلا کرتی، تب تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ واقعی سائنسی تحقیق قرآن کے عین مطابق اور اس کی تشریح کرنے والی ہے۔ باقی جو کچھ ڈاکٹر صاحب (یعنی سائنس) نے بتلایا ہے یعنی پہاڑوں کے بننے کا طریقہ وہ اوّل تو ظنّی ہے دوسرے نہ قرآن کے مخاطبین اوّلین کیلئے کچھ مفید تھا اور نہ آجکل کے ترقی یافتہ لوگوں کیلئے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان نہیں فرمایا۔ اور پہاڑوں کو میخیں فرمانا صرف اُن کے مضبوطی سے جمے رہنے کو ظاہر کرنے کیلئے ہے نہ کہ قشر الارض کو تھامنے کیلئے کیونکہ قرآن کے مخاطبین اوّلین زمین کے قشر اور مغز سے محض ناواقف تھے، البتہ میخ کی طرح مضبوطی سے جما رہنا اُن کو مشاہد تھا جس کیلئے کسی غور و خوض کی بھی حاجت نہ تھی۔ خلاصہ یہ کہ سائنس نے ایک ظاہر اور مشاہد چیز کی تو بلا ضرورت ایک ظنّی توجیہ کی لیکن اظہار متعلقہ حکمت کی کوئی قابل قبول تحقیق ہنوز نہیں کرسکی۔

یہاں میں یہ عرض کر دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو خصوصی طور پر انسانوں اور اُن کے مویشیوں کے فائدہ کیلئے پیدا کیا ہے جبکہ سائنس کی رو سے زمین کے قشر کے سرد ہونے کے نتیجہ میں اُن کا خود بخود بننا لازم آتا ہے۔ [illegible]

ہرگز نہیں کہ اُن کے اس طرح بننے میں خدا کا کوئی دخل نہیں، دخل تو ہے کیونکہ انھوں نے ہی حرارت و برودت میں بعض تاثیریں رکھی ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ پہاڑوں کے بننے میں خصوصی ارادہ متعلق نہیں ہوتا۔ بس یہی خیال احقر علوم جدیدہ کو غیر خدا پرستانہ ماحول میں، جیسا کہ آج کل کالجوں اور یونیورسٹیوں کا عموماً ہے، بلا تنقید پڑھنے پڑھانے کے نتیجہ میں ضعفِ ایمان کا زبردست خطرہ ہے۔

(۲۷) صفحہ ۲۷۔ "اس قسم کی آیات کا صحیح مفہوم سمجھنا اب اس لئے ممکن ہوا ہے کہ ہم نے سائنسی میدان میں کافی ترقی کرلی ہے، ورنہ ماضی میں بے شمار لوگوں نے نہایت فصیح اور ادبی پس منظر کیساتھ قرآن کی تفسیریں بیان کی ہیں لیکن ایسی آیات کو بہتر طور پر نہیں سمجھا گیا کیونکہ وہ اس قسم کے سائنسی علم سے بے بہرہ اور ناواقف تھے، لہذا سائنس دان اُن کی تفسیر کو قابلِ قبول نہیں سمجھتے" ایسی تمام آیات کی بلکہ پورے قرآن کی وہی تفسیریں صحیح اور مناسب ہیں جن کو سمجھنے کیلئے علوم جدیدہ پڑھنے کی مطلق ضرورت نہ ہو۔ اگر سائنسدان اُن کو قابلِ قبول نہیں سمجھتے تو ان کی غلطی ہے جیسا کہ اوپر نمبر (۱)، (۶) میں مدلّل و مفصّل طور پر عرض کیا جاچکا ہے۔

(۲۸) صفحہ ۲۸۔ آیت ۳۰ سورۂ انبیاء کے آخری ٹکڑے کا ترجمہ ڈاکٹر صاحب نے "اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی میں سے تخلیق کیا" کرکے فرمایا ہے کہ "یہ آیت اس جدید نظریہ کی تصدیق کررہی ہے کہ زندگی کی نمو پانی سے ہوئی"۔ ڈاکٹر صاحب کا ترجمہ غلط ہے، صحیح ترجمہ در تبصرہ نمبر (۱۰) میں ملاحظہ ہو، جس سے ہرگز سائنسی نظریہ کی تصدیق نہیں ہوتی۔

(۲۹) صفحہ ۲۸۔ کچھ ایسی ہی صورت (پرانی تفاسیر کے غلط اور ناقابلِ قبول ہونے کی) علم نباتات کے معاملہ کی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس علم میں ابھی اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی کہ اس حقیقت کو ایک قاعدہ کے طور پر مان لیا جاتا کہ پودھوں میں بھی نر و مادہ کے لازمی جوڑے ہوتے ہیں..... سورۂ طٰہٰ کے اس بیان پر غور فرمائیں: "خدا وہ ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعہ نباتات پیدا کیں جو آپس میں جوڑا جوڑا اور ایک دوسرے سے الگ ہیں (طٰہٰ آیت ۵۳)"۔ آیت کی یہ تفسیر بالکل غلط ہے، صحیح تفسیر نمبر (۱۰) کے ذیل میں ملاحظہ ہو۔ غلطی کی وجہ اور متعلقہ تبصرہ کیلئے نمبر (۱)، (۳) اور (۹) کو پھر پڑھ لیں۔ ڈاکٹر صاحب کو خود بھی تسلیم

جوتے کے جوڑے کیلئے بھی زَوجَین آتا ہے (جیسا کہ ان کی کتاب میں میں نے کہیں پڑھا ہے) حالانکہ اُن میں جنسیات کا وجود نہیں۔ لغت میں زوج کے معنی جوڑے کے علاوہ "ہر چیز کی قسم بھی دیئے ہوئے ہیں۔ کہیں "زوج" کا مطلب "مقابل قسم" لیا جاتا ہے، خصوصاً زَوجَین میں۔ جیسے جوتے کے جوڑے میں ہر ایک دوسرے کا مقابل ہوتا ہے۔ میاں بیوی بھی اسی لئے "زَوجَین" کہلاتے ہیں۔ پس آیت زیر بحث میں "اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی" کا صحیح ترجمہ "اقسام مختلفہ کے نباتات" ہے۔

(۳۰) صفحہ ۲۹۔ "پھل دار پودوں کے اندر جنسی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس جدید نباتاتی حقیقت پر سورۂ رعد کی آیت ۳ روشنی ڈال رہی ہے": ڈاکٹر صاحب نے آیت کا ترجمہ کیا ہے:- "اور اس (زمین) میں ہر نوع کے پھلوں میں دو دو کے جوڑے پیدا کئے"۔ جو غلط ہے کیونکہ انھوں نے جوڑے سے مراد نر و مادہ لئے ہیں۔ سر اوّل تو پھلوں میں نر و مادہ ہوتے ہی نہیں، البتہ بعض درختوں میں ہوتے ہیں جیسے کھجور یا پپیتہ (اکثر نباتات میں تو ایک ہی پودے کے پھولوں میں بیج پیدا کرنے والے نر و مادہ حصے یا اعضاء ہوتے ہیں)، دوسرے اُس زمانہ کے لوگ تناسل و توالد نباتات کا کوئی قابلِ لحاظ علم بھی نہیں رکھتے تھے، پس صحیح ترجمہ آیت کا یہ ہوگا "اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم کے پیدا کئے (مثلاً کھٹے اور میٹھے چھوٹے اور بڑے، کوئی کسی رنگ کا اور کوئی کسی رنگ کا)"۔ واضح رہے کہ قرآن میں زَوجَین سے نر و مادہ صرف وہاں مراد ہوں گے جہاں یہ لفظ انسانوں یا حیوانوں کیلئے آیا ہو، ورنہ ترجمہ "زَوجٌ" کا "مقابل قسم" یا محض "قسم" سے کیا جانا ہی صحیح ہوگا، اور یقیناً جن مفسرین نے اسکے خلاف کیا ہے مثلاً علامہ یوسف علیؒ یا مولانا مودودیؒ، وہ سب غلطی پر ہیں بلکہ غیر شعوری طور پر گناہ کے مرتکب بھی، کیوں کہ اُن کی اس تفسیری جرأت سے بواسطہ یہ لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی صحیح تفسیر سمجھنے سے قاصر رہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بھی معاذ اللہ عقولِ عامہ کی رعایت ملحوظ نہ رکھی۔ اور آیت زیر بحث میں دو کا عدد بھی تمثیلاً ہے ورنہ بعض پھلوں یا چیزوں کی بہت سی قسمیں بھی ہوتی ہیں۔ ایک مشہور آیت جس کے ترجمے میں جدید مفسرین غلطی کرتے ہیں یہ ہے: "وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ

اور دوسری "سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّھَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِھِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ" ہے۔ دونوں میں زوجین اور ازواج سے مراد نر و مادہ کے جوڑے نہیں ہیں۔ (قارئین) کرام سے ملتجی ہے کہ وہ ان دونوں آیتوں کی تفسیر "بیان القرآن" میں ضرور دیکھ لیں، جس سے اُن کو نفع بھی پہونچے گا اور راقم الحروف ان کا ممنون بھی ہوگا، البتہ سورہ ہود کی آیت ۴۰ "مِنْ کُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ" کا ترجمہ "ہر قسم (کے جانوروں میں) سے ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ یعنی دو دو" کیا جائیگا، کیوں کہ یہاں "زوجین" کا جانوروں کے لئے آنا واضح ہے۔ امید ہے کہ اب قارئین کرام احقر کا مطلب خود سمجھ گئے ہونگے۔

(جاری)

انسانوں کی چار قسمیں:

(۱) ایک وہ انسان ہے جس کے پاس علم ہے اور وہ جانتا ہے کہ اسکے پاس علم ہے (۲) وہ انسان ہے جو علم رکھتا ہے اور نہیں جانتا کہ اسکے پاس علم ہے (۳) وہ انسان ہے جو جاہل ہے اور جانتا ہے کہ وہ جاہل ہے (۴) وہ انسان جو جاہل ہے لیکن اپنے آپکو عالم گردانتا ہے۔

اوّل سے علم سیکھنا چاہیئے۔ دوسرے کو اس کی حیثیت یاد دلائیے۔ تیسرے کو سکھائیے اور تعلیم دیجئے۔ چوتھے سے بچئے کہ وہ انتہائی خطرناک انسان ہے۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں: کہ عبودیت کا مدار دو چیزوں پر ہے:

محبت کامل۔ اور عجز تام

•••

ــــہ پہلی آیت ۴۹ سورۂ ذاریات ہے اور دوسری آیت ۳۶ سورہ یٰسٓ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قسط (۳)

تفہیم القرآن
ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

از
مولانا
جمیل الرحمٰن
پرتاب
گڈھی

حضرات اسلاف رح کی تفسیر میں احتیاط

شرائط تفسیر کو دیکھتے ہوئے علمائے سلف نے اس کام میں حد درجہ احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رض فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ طیبہ کے فقہاء کو دیکھا ہے۔ یہ حضرات تفسیر قرآن کے سلسلے میں گفتگو کرنے کو بڑا اہم اور ذمہ داری کا کام سمجھتے تھے۔ سالم بن عبد اللہ، قاسم بن محمد، سعید بن مسیب اور حضرت نافع انھیں حضرات میں تھے۔

یحییٰ بن سعید کا بیان ہے کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا سعید بن مسیب سے قرآن مجید کی کسی ایک آیت کی نسبت دریافت کر رہا تھا مگر آپ نے جواب دیا میں قرآن سے متعلق کچھ نہ کہوں گا۔ حضرت شعبیؒ فرماتے ہیں:۔ تین چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق میں مرتے دم تک کچھ نہیں کہہ سکتا (۱) قرآن (۲) روح (۳) اور قیاس [1]

اصمعی کو کون نہیں جانتا لغت وادب کا زبردست امام تھا برسوں تحقیق لغات، صحیح محاورات اور ان کے معانی کی فکر میں عرب کے جنگلوں کی خاک چھانتا پھرا ہے۔ اور لفظ لفظ کیلئے عرب کے بدوؤں

---

[1] تفسیر ابن جریر صفحہ ۲۸/۱

میں برسوں تک قیام کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کی تفسیر میں بالکل خاموش رہتا تھا اس لئے جب کبھی کسی آیت کی نسبت دریافت کیا جاتا تو کہتا عرب اس کے یہ معنی بیان کرتے ہیں میں نہیں جانتا کہ اس سے کیا مراد ہے[1]۔

لیکن بدقسمتی سے آج کے اس دور میں ہر وہ شخص تفسیر قرآن کی جسارت کرنا اپنے لئے فخر سمجھتا ہے جسے عربی کی معمولی شد بد پیدا ہو گئی ہو خواہ وہ ان شرائط تفسیر سے کتنا ہی نابلد ہو۔ حتٰی کہ مودودی صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "قرآن کیلئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے[2]"۔

مودودی صاحب کا فلسفۂ تفسیر

مودودی صاحب نے بڑی ہمت کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ:

"عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا تھا اس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ الٰہ کے کیا معنی ہیں اور ربّ کسے کہتے ہیں" (چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں)۔

"لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزولِ قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کیلئے خاص ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے ان کیلئے الٰہ، ربّ، دین اور عبادت کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزولِ قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے انہیں دونوں وجوہ سے دور آخر کی کتب لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی کوئی اصل معانی لغوی کے بجائے ان معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے مسلمان سمجھتے تھے"۔ (چند سطروں کے بعد) "پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں (الٰہ، ربّ، عبادت اور دین) کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی ہے۔ اور اسلام قبول کرنے کے باوجود لوگوں کے عقائد و اعمال میں جو نقائص نظر آ رہے ہیں

---

[1] المزہر صفحہ ۲۰۴ بحوالہ فہم قرآن [2] تنقیحات صفحہ ۲۳۲۔

ان کا ایک بڑا سبب یہی ہے[۱]۔

مودودی صاحب کے اس دعویٰ سے جو چیز واضح ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ (مودودی صاحب کی تفسیر سے پہلے) جو تفاسیر لکھی جا چکی ہیں سب بیکار ہیں چونکہ قرآن کی صحیح تعلیم کو یا تو دور اوّل کے مسلمانوں (حضرات صحابہ کرام) نے سمجھا یا پھر اس دور فتن میں ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس لئے درمیان کی جتنی صدیاں گذر چکی ہیں خواہ وہ تابعین کا دور ہو یا تبع تابعین کا، خواہ حضرات ائمہ اربعہ ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، اور احمد بن حنبلؒ ہوں یا امام غزالیؒ، رازیؒ اور حسن بصریؒ ہوں، سب کی نگاہیں قرآن کی حقیقی روح تک پہنچنے سے قاصر رہ گئیں۔ ان ادوار میں فہم قرآن کے سلسلے میں جو بھی کوششیں کی گئی ہیں وہ سب قرآن کی حقیقی روح سے خالی ہیں۔ اور عقائد و اعمال میں آج جو نقائص نظر آرہے ہیں وہ سب ان حضرات کے تفسیری سرمایہ سے استفادہ کا نتیجہ ہے۔

مودودی صاحب کی یہ وہ باتیں ہیں جس سے امت کا اعتماد اپنے علماء سلف سے اٹھ جاتا ہے اور قرآن کی اس آیت:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْن — بیشک ہم نے قرآن حکیم نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہوگا۔ کیونکہ یہ آیت اپنی عمومیت کے لحاظ سے نہ تو کسی مخصوص زمانے کے ساتھ مقید ہے اور نہ ہی کسی مقام کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن حکیم کے ساتھ حفاظتِ خداوندی کا تعلق ہر زمانے میں رہا ہے اور رہے گا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ دور اوّل کے لوگ قرآن کی صحیح تعلیم اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ حقیقی معنی کو محفوظ رکھنے میں ناکام رہے ہیں تو جہاں اس حفاظتِ خداوندی کا انکار ہوگا وہیں اسلام ایک مشکوک مذہب بھی ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی حقانیت کے شفاف چہرے پر شبہات کے دھبے نظر آنے لگتے ہیں۔ مودودی صاحب نے اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں نہ تو کوئی دلیل پیش کی ہے اور نہ ہی قیامت تک پیش کر سکتے ہیں۔

علمائے سلف تابعین کرام اور محدثین عظام نے دور اوّل کے علمی سرمایہ کو جس اہتمام اور دیانتداری سے محفوظ کیا ہے اس کی نظیر دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔ گویا بعد کی کتابیں خواہ

---

[۱] (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں صفحہ ۱ مقدمہ مولانا مودودی)

تفسیر قرآن سے متعلق ہوں یا کسی اور فن سے۔ دور اوّل کے خیالات وحقائق کا ایک محفوظ ریکارڈ ہیں اس کا ثبوت اسماء الرجال کی کتابیں پیش کرتی ہیں۔

تفسیر بالرّائے

غالباً مودودی صاحب کو اس ادعائے باطل کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ موصوف نے جب چار لفظوں کو قرآن کی بنیادی اصطلاح قرار دے کر پھر ان کے ایسے منطقی معنی بیان کرنا شروع کر دئے جن کے وجود سے متقدمین علماء مفسرین کی تمام تفسیری خدمات خاموش تھیں تو یہ کہنا ضروری ہو گیا کہ چونکہ ان حضرات کی نگاہیں قرآن کی حقیقی روح تک نہیں پہنچ پائی ہیں۔ اس لئے یہ معنی ان میں کہاں سے ملیں گے اس طرح موصوف کو اپنے مخصوص نظریئے کیساتھ آزادانہ تفسیر کرنے کا راستہ صاف ہو گیا۔

اس قسم کی قرآن کی تفسیر جس کے پس منظر اس کے ذاتی خیالات کے عکس نظر آرہے ہوں تفسیر بالرّائے کہلاتی ہے جس کے بارے میں قرآن وحدیث نے سخت مذمت کی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَاَنْ تَقُوْلُوْا علی اللہ مالا تعلمون ۔ اللہ پر جانے بغیر بات مت کہو۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

مَن تکلّم فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدہ من النّار۔ (ابوداؤد و ترمذی شریف) جو شخص علم کے بغیر قرآن کے بارے میں کچھ کہتا ہے اس کو چاہیئے کہ دوزخ کو اپنا ٹھکانا بنالے۔

حضرت ابوبکر صدیق رض کا ارشاد ہے:۔

اَیّ ارض تقلنی وایّ سماء تظلنی اذا قلت فی القرآن مالا اعلم۔ (ابن جریر ص ۱/۲) مجھ کو کون سی زمین اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ گستر ہوگا جب کہ میں قرآن میں وہ بات کہوں جسے میں نہیں جانتا۔

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ قرآن فہمی میں عقل و دانش کو ذرا بھی دخل نہ دیا جائے غور و فکر کرنے کی تو قرآن نے خود دعوت دی ہے۔

افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالھا۔ کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا دلوں پر تالے پڑے ہیں۔

گویا احادیث پاک میں وارد شدہ وعیدوں کے مستحق وہ حضرات ہیں جو شرائط تفسیر

خالی محض عقل وفکر اور اپنی طبیعت کی اپج پر اس میدان میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ نہ انھیں شرائط سے سروکار اور نہ ہی سلف کی خدمات سے کوئی کام۔ عقل ان کی رہنما ہے اور فکر ان کی قائد ان کے نزدیک سلف کی تحریروں میں عقائد و اعمال کو بگاڑ دینے والے جراثیم موجود ہیں۔ اس لئے انھیں اس سے استفادہ کی ضرورت ہی نہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے الاتقان فی علوم القرآن میں تفسیر بالرائے کے سلسلے میں پانچ قول نقل کئے ہیں جو اس موضوع کیلئے میزان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۱) ان علوم کو حاصل کئے بغیر تفسیر کرنا جن پر تفسیر کا مدار ہے۔

(۲) ان متشابہات کی تفسیر کرنا جن کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

(۳) اپنے رجحان یا غلط مذہب کو مقدم کرکے قرآن کریم کو اس کے تابع بنانا۔

(۴) کسی آیت میں دلیل صحیح کے بغیر یہ دعویٰ کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یقیناً یہی ہے۔

(۵) من پسند تفسیر کرنا[1]

ان پانچوں اقوال میں سب سے بہتر اور معقول بات وہ ہے جس کو یتیمۃ البیان کے مصنف مولانا الشیخ محمد یوسف بنوریؒ نے رقم فرمایا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"راقم الحروف کہتا ہے کہ میرے نزدیک اس سلسلے میں قول فیصل وہ ہے جس کو تفسیر خازن کے مقدمہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے بھی تفسیر بالرائے کے یہی معنی پسند فرماتے ہیں۔ خازن کے الفاظ یہ ہیں کہ قرآن کریم میں تفسیر بالرائے کی ممانعت ان لوگوں کیلئے وارد ہوئی ہے جو قرآن کریم کو اپنی ذاتی رائے کے مطابق معانی پہناتے ہیں۔ اور تفسیر ان کی خواہش اور طبعی میلان کے تابع ہو جاتی ہے۔ یہ کام انسان کبھی جان بوجھ کر کرتا ہے اور کبھی علم کے بغیر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ علم کے باوجود اس کا ارتکاب کرنیوالوں کی مثال میں وہ لوگ پیش کئے جائیں گے جو دین میں پیدا کی ہوئی بدعتوں کی صحت ثابت کرنے کیلئے قرآن کریم کی بعض آیتوں سے جانتے ہوئے استدلال کرتے ہیں کہ آیت کی مراد یہ نہیں، بلکہ کچھ اور ہے اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بدعتوں کو استدلال کی دنیا میں ثابت

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ص۱۸۳ ج۲)۔

کر کے لوگوں کو ان کی طرف مائل کر سکیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو علم کے بغیر یعنی جہالت کے سبب یہ حرکت کرتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آیت میں چند وجوہ محتمل ہیں۔ تفسیر کرنیوالا ان وجوہ محتملہ کے علاوہ کوئی اور معنی بیان کرے یہ دونوں ہی قسمیں قابلِ مذمت ہیں اور اسکے سلسلے میں وارد ہونیوالی وعید شدید میں داخل ہیں۔[1]

مولانا مودودی صاحب اور تفسیر بالرائے

یہاں تک تو تفسیر کی شرائط اور تفسیر بالرائے سے بحث کی گئی تھی۔ اب آئیے مولانا مودودی صاحب کی تفسیری نگارش کا بھی جائزہ لیں کہ کہاں تک آپ اس کام کو سنبھالنے میں کامیاب رہے ہیں۔ کہیں موصوف کی تفسیر کسی مخصوص طبع زاد نظریئے کے ارد گرد تو نہیں گھوم رہی ہے۔ اگر ایسا ہے تو یقیناً مودودی صاحب اس قابلِ مذمت فعل کے مرتکب ہوئے ہیں جس کیلئے شدید وعیدیں آپ دیکھ چکے ہیں۔

مودودی صاحب کی تفسیر سمجھنے سے پہلے ضروری ہوگا کہ ان کی برپا کی ہوئی تحریک جماعتِ اسلامی اور اس کا نصب العین سمجھ لیا جائے تاکہ حقیقت کو سمجھنا آسان ہو سکے۔ ورنہ اس کے بغیر شاید یہ بات واضح نہ ہو سکے کہ مودودی صاحب بھی تفسیر بالرائے جیسے مہلک مرض کے شکار ہوئے ہیں۔

جماعتِ اسلامی کا نصب العین

جماعتِ اسلامی کی ابتدائی تاسیس کے وقت جو دستور تیار ہوا تھا۔ اس میں جماعت کا نصب العین ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"جماعتِ اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے"

دستور میں نصب العین کے اس حصے کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"اس سے مراد اللہ کی شرعی حکومت کا قیام ہے جس کا تعلق انسان کی زندگی کے اس حصے سے ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار دیا ہے"

ملک کی تقسیم کے بعد جب ہندوستان کی علیحدہ جماعت قائم ہو گئی تو یہاں کے رہنماؤں نے

---

[1] ترجمہ مقدمہ تبیان القرآن علامہ نووی ص۳۔

نصب العین کے عرصے میں کچھ تبدیلی کر دی اور اس کو مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کیا۔

"جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود دنیا میں اقامت دین اور بالآخر آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔"

اور اس تبدیلی کی تصریح میں یہ نوٹ درج کیا گیا۔

"دستور جماعت میں اس سے پہلے اقامت دین کے بجائے حکومت الٰہیہ کا لفظ تھا جو دراصل اسی مفہوم میں استعمال کیا گیا تھا جو اقامت دین کا تھا لیکن چونکہ حکومت الٰہیہ کے لفظ کے سمجھنے میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور کرائی جاتی ہیں اسی لئے ضرورت سمجھی گئی کہ اپنے نصب العین کے اظہار کیلئے ایسا لفظ اختیار کیا جائے جو قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے تمام مفہوموں پر حاوی ہو اور کسی غلط فہمی کا باعث بھی نہ ہو۔"

اس دستور کے بعد جو دستور مرتب ہوا اس میں نصب العین کی وضاحت اس طرح پر کی گئی ہے۔

"جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامت دین ہے جس کا حقیقی محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول ہے یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اس کی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے، عقائد، عبادات اور اخلاق سے لیکر معیشت معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے دائرے سے خارج ہو۔ یہ دین رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا ضامن ہے۔ اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کیلئے بہترین نظام زندگی بھی ہے۔ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی صالح اور ترقی پذیر تعمیر صرف اسی کے قیام سے ممکن ہے۔"

اس دین کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر کیجائے۔ اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقاء، معاشرہ کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔

اسی مخصوص نظریے کی ترجمانی دوسری جگہ اس طرح کی گئی ہے۔

" اسلام (عام معنوں میں) کسی مذہب کا اور مسلمان کسی قوم کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے جو تمام دنیا کے اجتماعی نظم کو بدل کر اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق تعمیر کرنا چاہتا ہے اور مسلمان اسی مخصوص بین الاقوامی انقلابی جماعت کا نام ہے جسے اسلام اپنے مطلوبہ انقلابی پروگرام کو عمل میں لانے کیلئے منظم کرتا ہے اور جہاد اس انقلابی جدوجہد کا اس انتہائی صرفِ طاقت کا نام ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے عمل میں لائی جائے۔

اور یہ دعوت جو لوگ بھی قبول کرلیں وہ .... اسلامی جماعت کے رکن بن جاتے ہیں اور اس طرح وہ بین الاقوامی انقلابی پارٹی تیار ہوتی ہے جسے قرآن حزب اللہ کے نام سے یاد کرتا ہے ...... یہ پارٹی وجود میں آتے ہی اپنے مقصدِ وجود کی تحصیل کیلئے جہاد شروع کردیتی ہے۔ اس کے عین وجود کا اقتضاء یہی ہے کہ یہ غیر اسلامی نظام کی حکمرانی کو مٹانے کی کوشش کرے اور اس کے مقابلے میں تمدن و اجتماع کے اس معتدل و متوازن ضابطہ کی حکومت قائم کرے جسے قرآن ایک جامع نام کلمۃ اللہ سے تعبیر کرتا ہے:

یہ مذہبی تبلیغ کرنیوالے واعظین اور مبشرین کی جماعت نہیں بلکہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا سے ظلم، فتنہ، فساد، بداخلاقی، طغیانی، اور ناجائز استفاع کو بزور مٹادے اور ارباب من دون اللہ کی خدائی کو ختم کرکے اور بدی کی جگہ نیکی قائم کرے۔ لہٰذا اس پارٹی کیلئے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ کیونکہ مفسدانہ نظام تمدن ایک فاسد حکومت کے بل پر ہی قائم ہوتا ہے۔ اور ایک صالح نظام تمدن اس وقت تک کسی طرح قائم نہیں ہو سکتا جب تک حکومت مفسدوں سے سلب کر کے صالحین کے ہاتھ میں نہ آجائے۔

تفہیمات حصہ اول بیان جہاد فی سبیل اللہ ص ۶۱ شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام پٹھانکوٹ طبع چہارم بعد نظر ثانی۔

ایک دوسری جگہ دین اسلام کا حقیقی مقصود ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"دین اسلام کا حقیقی مقصود امامت صالحہ کا قیام ہے یہی کتاب الٰہی کا مطالبہ ہے یہی انبیاء علیہم السلام کی سنت" اس کے علاوہ دو تحتی معاون نظریئے بھی ہیں اول یہ کہ جہاد نظام حق کی سعی ہی کا دوسرا نام ہے"

(تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

یعنی انسان پر سے انسان کی حکومت ہٹا کر خدائے واحد کی حکومت قائم کرنے کیلئے تن من دھن کی بازی لگا دینا ہے۔

(خطبات باب جہاد)

دوسرا یہ کہ نماز روزہ حج وزکوٰۃ ارکان اربعہ جہاد کے تربیتی (TRAINING) کورس کی حیثیت سے رکھے گئے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ ارکان اربعہ جہاد کیلئے اور جہاد نظام حق کے قیام کیلئے جو اصل دین ہے اس نظریہ کے تحت جماعت اسلامی کا نصب العین قیام حکومت الٰہیہ یا اقامت دین ہے۔

مولانا مودودی صاحب کی ان عبارتوں کو صرف اس لئے پیش کیا گیا ہے تاکہ ان کی برپا کی ہوئی تحریک کا مرکزی خیال اور حقیقی نصب العین واضح ہو سکے۔ ورنہ ظاہر ہے ایک انسان کا مقصد تخلیق باری تعالیٰ کی فرمانبرداری کے علاوہ اور کچھ نہیں قرآن نے انسان کے مقصد حیات پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (ذاریات۔۵۶)	ہم نے جن وانس کو محض عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔

اور اسی چیز کو باری تعالیٰ نے بار بار دہرایا ہے۔

یاایها الناس اعبدوا ربکم (البقرہ۔۲۱)	اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔
واعبد ربك حتی یاتیك الیقین۔ (حجر آخر)	اپنے رب کی عبادت کرو وقت یقین کے آنے تک۔
وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی	تم سے پہلے جو رسول ہم نے بھیجے ان پر یہی وحی

الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون۔ کی تھی کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں اس لئے صرف (انبیاء - ۲۵) میری ہی عبادت کرو۔

عبادت کا مطلب خدا کے آگے پستی اور عاجزی اختیار کرنا ہے۔ اس چیز کو قرآن نے خشیت، تضرع، اخبات، انابت، خشوع وخضوع اور قنوت وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے عبادت کی تشریح ان الفاظ میں زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔

"خدا کی عبادت کرنا خدا کیلئے اپنے آپ کو انتہائی حد تک بچھا دینا ہے۔ پھر عبادت کا یہ عمل جس ہستی کے آگے ہوتا ہے وہ چونکہ کوئی ظالم و جابر ہستی نہیں ہے بلکہ انتہائی شفیق ہستی ہے اور ہمارے اوپر اس کے بے پایاں احسانات ہیں اس لئے اس اظہار عجز کے اندر لازمی طور پر محبت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ بندے اور خدا کا تعلق ایک انتہائی محبوب ہستی سے انتہائی عجز کا تعلق ہے لیکن اس وقت جب بندہ شدت خوف سے کانپ رہا ہوتا ہے جب خدا کے تصور سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے ہوتے ہیں اس وقت بھی اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کے بہترین جذبات خدا کیلئے وقف ہوتے ہیں وہ انتہائی اشتیاق کے ساتھ خدا کی طرف لپک رہا ہوتا ہے وہ ایک دردانگیز محبت کی اعلیٰ ترین کیفیت میں اپنے آپ کو لپٹا ہوا پاتا ہے الذین آمنوا اشد حباً للہ (بقرہ ۶۵)"[1]

لیکن زیر بحث نظریے نے دین کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں اس کی حقیقی صورت بالکل بدل گئی ہے۔ اس نظریے نے انسان کا مقصد تخلیق حکومت الٰہیہ کا قیام بتلایا ہے اور تمام عبادت (ارکان اربعہ) اس مطلوبہ مقصد کیلئے ٹریننگ کورس کی حیثیت رکھتے ہیں یہی وہ مقصد ہے جس کے اثبات کیلئے مولانا مودودی صاحب نے قرآن کریم کی آیتوں کا سہارا لیا ہے اور قرآن کی پوری تفسیر اسی مطلوبہ مقصد (حکومت الٰہیہ کا قیام) کے ارد گرد گھمادی جس

---

[1] تعبیر کی غلطی۔

کالازمی نتیجہ نکلا کہ موصوف کی تفسیر تفسیر بالرائے کے زد میں آگئی ۔

اس سلسلے سے جب ہم تلاش وجستجو کی راہ میں قدم رکھتے ہیں کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جن سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے مطلوبہ مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کیگئی ہے تو ہمیں پانچ چیزیں ملتی ہیں جن کی غلط توضیح وتشریح سے مطلوبہ مقصد حاصل کیا گیا ہے ۔

جملہ انبیاء کرام ؑ کے حقیقی دعوتی پروگرام کو پوشیدہ رکھ کر ایک ایسا پروگرام ظاہر کرنا جس سے مزعومہ مقصد ثابت ہوسکے ۔ اور بقیہ چار چیزیں لفظ الٰہ ، رب ، عبادت اور دین کی غلط توضیح و تشریح ہے ۔

ذیل کی سطور میں ہم انھیں پانچوں چیزوں پر مکمل بحث کرنے کے ساتھ ہی ان آیتوں کی نشاندہی کرتے ہیں جس میں مولانا موصوف کو صاف طور پر تفسیر بالرائے کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے ۔

(باقی آئندہ)

بیان ملکیت متعلقہ ماہنامہ رسالہ دارالعلوم بابت رجسٹریشن ایکٹ فارم رول ۸

نام	رسالہ دارالعلوم
وقفہ اشاعت	ماہانہ
پرنٹر پبلشر	مولانا مرغوب الرحمان صاحب
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دارالعلوم دیوبند
ایڈیٹر	مولانا ریاست علی صاحب
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دارالعلوم دیوبند
مالک	دارالعلوم دیوبند

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست ہیں ۔

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب)

قسط (۳)

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کے ایک شاگرد رشید

از:۔ مولانا عبدالمجید خطیب ویلوری استاذ باقیات صالحات

مقصود دِل کا اجمال محتاجِ تفصیل ہے۔ دراصل اس سفر کا ایک بنیادی مقصد مکہ مکرمہ میں فروکش اکابر رجال سے فیض صحبت اور تحصیل مزید رہا ہے ممکن ہے ابتداءً کوئی متعین شخصیت پیشِ نظر نہ رہی ہو۔ لیکن مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد جس شخصیت نے آپکو بہت زیادہ متأثر کیا وہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی تھے بلکہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے فیضِ صحبت سے بھی آپ بہرہ ور ہوئے مولانا کے ایک تلمیذ و مجاز مولانا عبدالقادر شاکر کہتے ہیں :۔

ہوا مکّے میں آپ کا جو ورود　　جو کہ ہے اک جہاں کا مسجود
جس کو کہتے ہیں بیت ربِّ ودود　　دو مہاجر ولی تھے وہاں موجود
چاہا دونوں سے رحمت و امداد
فیض سے ان کی پائی دل کی مراد

ان دو مہاجر ولی سے اکتسابِ فیض کے علاوہ مولانا سید محمد حسین پشاوری ، ملا محمد نواب ، اور شیخ احمد دحلان شافعی سے بھی فیض اٹھایا ہے۔ مولانا سید عبدالحیؒ لکھنوی نے اپنی کتاب " نزہۃ الخواطر " میں مولانا عبدالوہاب پر جو تعارفی نوٹ لکھا ہے اس میں مذکورہ علماء کا تذکرہ ہے جن سے مولانا نے مکہ مکرمہ میں اخذ و استفادہ کیا تعلیمات حسب ذیل ہے:

ثم سافر الى مكة المكرمة واخذ عن الشيخ رحمة الله بن خليل العثماني الكيرانوي ، والعلامة محمد نواب الهندي المهاجرين الى مكة ، واخذ

الحدیث عن الشیخ احمد دحلان الشافعی مدرس الحرم الشریف والسید الحسین المهاجر۔

چونکہ مولانا مدراس میں مولانا غلام قادر مدراسی سے کتب متداولہ کی تحصیل و تکمیل کے بعد مکہ پہنچے تھے لہذا اغلب یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے استفادہ، کتاب خوانی کی صورت میں نہ رہا ہو بلکہ علمی مذاکرات کے ذریعہ فکر و نظر میں بالیدگی حاصل کی ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا امداد صابری نے اپنی کتاب "آثار رحمت" میں "حرم شریف میں مولانا کے تلامذہ" کے عنوان سے جو منتخب فہرست شائع کی ہے اس میں مولانا عبدالوہاب کے صاحبزادے مولانا ضیاء الدین محمد کا نام تو ہے لیکن خود مولانا عبدالوہاب کا نام نامی غیر مذکور ہے۔ البتہ "عثمان نامہ" کے مؤلف مولانا شمس اللہ قادری نے "علم اصول مناظرہ" کی تحصیل کی صراحت ضرور کی ہے، مولانا شرف الحق صدیقی کی روایت ہے "کتب اظہار الحق اور ازالۃ الاوہام کا سبق مولانا (رحمت اللہ) کے یہاں صبح و شام ہوتا تھا" کیا خبر کہ مولانا عبدالوہاب کا مولانا رحمت اللہ سے کتابی استفادہ انھیں دو کتابوں کی حد تک محدود رہا ہو۔ بلکہ اصول مناظرہ کی تعلیم بھی انھیں کتابوں سے حاصل کی ہو۔

علمی استفادے کی تفصیلات سے قطع نظر یہ بات یقینی ہے کہ مولانا عبدالوہاب مولانا رحمت اللہ سے نہایت قریب تھے اور اس علمی تعلق کی بنا پر باہم انس و محبت۔ اور اعتماد و خلوص کا ایسا رشتہ قائم ہوا کہ مکہ مکرمہ سے مراجعت کے بعد بھی یہ رشتہ مضمحل نہ ہو سکا بلکہ اس میں مزید استواری پیدا ہوگئی مولانا عبدالوہاب کو بحیثیت ایک مستفید کے استاذ محترم سے جو انس اور لگاؤ تھا وہ محل حیرت نہیں بلکہ خود مولانا رحمت اللہ کو اپنے شاگرد عزیز پر اس حد تک اعتماد تھا کہ انھوں نے اپنی ایک وقیع و ضخیم کتاب "ازالۃ الشکوک" کا مسودہ ان کے حوالے کر دیا۔ تاکہ وہ وطن مراجعت کے بعد اس کی تصحیح کر کے شائع کر دیں۔

مولانا ۱۲۸۶ھ ہجری ماہ ربیع الثانی میں وطن "ویلور" واپس ہوئے اور "ازالۃ الشکوک" کی تصحیح کا کام شعبان ۱۲۸۸ھ ہجری تک مکمل کر لیا لیکن طباعت و اشاعت کا مرحلہ کئی سال بعد آیا۔ وطن واپسی کے بعد مولانا کے لئے ایک بڑی الجھن آئندہ طریقۂ کار کے بارے میں تھی۔ مولانا کے صاحبزادے مولانا ضیاء الدین محمد فرماتے ہیں (مولانا) اپنے آئندہ طریقۂ کار کے متعلق متردد تھے کسی اسلامی ریاست میں ملازمت کا خیال

پیدا ہوتا کبھی اور "..... "آخر اس تردد نے مولانا کو حیدرآباد" پہنچا دیا وہاں بعض احباب کی تگ و دو سے سرکاری ملازمت کا ایک موقع نکل رہا تھا کہ مولانا کی رائے بدل گئی۔ انگریزی استعمار کی وجہ سے ملت اسلامیہ کا مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی نظام جس تیزی سے بدل رہا تھا اس نے مولانا کو اپنے "معاش" سے زیادہ ملت کے "معاد" کے بارے میں غور و فکر پر مجبور کیا۔ مولانا کے صاحبزادے نے اس دور کے بدلتے ہوئے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ان سب امور نے آپ کو اس امر پر آمادہ کیا کہ آپ ہمہ تن تعلیم علوم عربیہ کی طرف عنانِ توجہ منعطف فرمائیں اور ملازمت کا خیال بھلا دیں، مبادا اگر کسی نے ادھر توجہ نہ کی تو چند سالوں میں اس وقت جو کچھ تعلیم کا چرچا ہے اس کا مفقود ہو جانا کوئی مشکل نہیں بنا براں آپ حیدرآباد دکن سے واپس تشریف لائے، مولانا عبد الصمد علی کی روایت ہے مولانا عبدالوہاب نے کہا تھا خداوند تعالیٰ نے دنیا کی آسودگی کی صورت کچھ مہیا بھی کر دی تو میرا خیال ہوا بلکہ دل میں ٹھان لیا کہ خلق کی خدمت تادمِ موت کروں گا ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست   بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

کچھ دن دوسرے شہروں میں جا کر وعظ و نصیحت شروع کیا پھر ویلور میں پہنچ کر تدریس شروع کر دی"۔

وعظ و ارشاد اور درس و تدریس میں لگنے سے پہلے مولانا نے تزکیہ نفس اور اصلاحِ باطن کی طرف توجہ کی، اگرچہ مولانا مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ کے فیض صحبت سے طریق آشنا ہو چکے تھے لیکن علوم ظاہری میں تخصص و امتیاز کی کوششوں میں لگے رہنے کی وجہ سے تکمیل کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اب ویلور میں اس کا بہتر موقع فراہم تھا قطب ویلور حضرت سید شاہ عبداللطیف لفتوی قادری کا وجودِ مسعود منبعِ فیض بنا ہوا تھا، چنانچہ مولانا نے حضرت قطب ویلور سے بیعت کا رشتہ استوار کیا۔ مولانا سید عبدالحیٔ لکھنوی لکھتے ہیں۔ ثم رجع الی الهند وصحب الشیخ محی الدین عبد اللطیف الویلوری واخذ عنه الطریقة۔

مرشدِ ویلور نے اصلاح و تربیت کے ساتھ مسائل تصوف کی باضابطہ تعلیم بھی دی۔ اپنی دو بلند پایہ کتابیں "جواہر الحقائق" اور "جواہر السلوک" کو سبقاً سبقاً پڑھا کر طائر فکر کو حقائق و معارف کی سمتوں سے آگاہ کیا اور نفس و وجدان کو سنوار اور نکھار کر اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اُدھر مولانا رحمت اللہ نے اپنے شاگرد رشید کی ذہن سازی کے بعد محبت و اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ایک کتاب کا مسودہ تصحیح و طباعت کیلئے ان کے حوالے کردیا۔ اور ادھر مرشد ویلور نے بھی تزکیہ النفس کے بعد اپنی دو معرکۃ الآراء کتابیں یہ کہہ کر مرید کے حوالے کیں کہ وہ ان کو چھاپ سکتے ہیں۔

حکیم شاہ اسمٰعیل ویلوری کہتے ہیں:۔

پس حوالت کرد وگفت ایں طبع کن — من سپردم جوہر عرشش بریں
من ترا دادم کہ ایں گنج سلوک — ایں حقائق مایۂ روح الامیں

حضرت قطب ویلور کی ان دو کتابوں کی علمی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لئے مولانا سید عبدالحئ لکھنوی کا یہ تبصرہ پیش نظر رہے "من نظر فی مصنفاته بان له منزلته فی سعة العلم وقوة الفهم وسیلان الذهن"

حضرت قطب ویلور سے فیض صحبت کا دور نہایت مختصر رہا۔ کیونکہ حضرت والا ۱۳ شوال ۱۲۸۸ھ ہجری کو ویلور سے جانب حجاز روانہ ہوئے، حضرت والا کا یہ سفر مقدس سفر آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا دوسری بار حج کی سعادت سے مشرف ہونے کے بعد ۱۱ محرم ۱۲۸۹ھ ہجری کو مدینہ منورہ میں انتقال ہوگیا۔

مکہ مکرمہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ سے علمی استفادے کی میعاد لگ بھگ ڈیڑھ سال رہا ہے۔ ہمارے خیال میں اتنی ہی مدت ویلور میں حضرت قطب ویلور سے استفادے کی ہے لیکن اس مختصر سی مدت میں اوّل الذکر نے مولانا کی فکر ونظر اور ثانی الذکر نے قلب ووجدان پر جو گہرے اثرات چھوڑے وہ بڑے دور رس ثابت ہوئے، یہ دونوں عظیم المرتبت شخصیتیں مولانا کے لئے آئیڈیل شخصیات تھیں مولانا کے مذاق ومشرب، افکار وخیالات، اور گرانقدر خدمات کا واضح تصور ان دو شخصیتوں کے بغیر دشوار ہے۔

اس سے پہلے ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ مولانا رحمت اللہ، حضرت شاہ عبدالغنی علیہ الرحمۃ سے رشتۂ تلمذ رکھتے تھے، حضرت قطب ویلور حضرت شاہ عبدالغنی کے استاد عالی مقام حضرت شاہ اسحاق کے شاگرد رشید تھے دونوں کے درمیان اس رشتۂ علمی کیساتھ تحریک ولی اللہی سے

مناسبت بلکہ موافقت کا خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے چنانچہ مولانا رحمت اللہ کے بارے میں ہم مولانا الطاف حسین حالی کے یہ الفاظ نقل کرچکے ہیں کہ " ان کی جماعت میں ہندوستان کے انتہا پسند اور حضرت مولانا اسماعیل شہید کے فدائی مسلمان تھے جنکی تعداد کافی تھی " انتہا پسند کی پھبتی سے قطع نظر جس مقدس جماعت سے حضرت مولانا رحمت اللہ کی وابستگی بتائی گئی ہے وہ قابل غور ہے۔ حضرت قطب ویلور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب حضرت سید احمد شہید کے خلیفہ مولانا محمد علی رامپوری مدراس تشریف لائے تو حضرت قطب ویلور نے ان سے تعاون کیا بلکہ ویلور اور اس کے مضافات میں دعوتی کام کے مواقع فراہم کئے اور ان کو اپنے یہاں پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ ٹھہرایا ان تفصیلات کی روشنی میں ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا عبدالوہاب کے مذکورہ دونوں شفیق مربیوں کے درمیان علمی اور فکری توافق کے رشتے پائے جاتے تھے اور ان دونوں کے ساتھ عظمت و عقیدت کا یکساں تعلق مولانا کیلئے زندگی کے کسی بھی مرحلے میں الجھن کا سبب نہیں بنا ہے البتہ وہ لوگ الجھن کا شکار رہوئے ہیں جو مولانا کی شخصیت کے اس پس منظر سے ناواقف تھے۔

جب حضرت قطب ویلور نے "نفل حج" کا قصد کرکے سفر کی تیاریاں شروع کیں تو مولانا عبدالوہاب کو بھی شوق ہوا کہ اس سفر مقدس میں اپنے پیر و مرشد کے ہمرکاب ہوں۔ مگر اظہارِ شوق پر مرشد محترم نے ویلور سے جنوب کی سمت انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "تم سے اس طرف کے پورے علاقے کو ہدایت ملنے والی ہے لہذا تم میرے ساتھ چلنے کا قصد نہ کرو۔ یہیں ٹھہر کر اصلاحِ خلق کی خدمت میں لگے رہو" چنانچہ مولانا نے مرشد محترم کی ویلور سے روانگی کے بعد حسب ہدایت جنوب بعید میں اصلاح و ارشاد کا کام شروع کیا، شہر شہر، گاؤں گاؤں گھوم پھر کر وعظ و نصیحت فرماتے، بدعات و معاصی سے اجتناب کی تلقین کرتے اور اتباع شریعت کی ترغیب دیتے " مولانا کے الفاظ " کچھ دن دوسرے شہروں میں جاکر وعظ و نصیحت شروع کیا " یہ اسی کارگذاری کا اجمالی تذکرہ ہے۔

اپنی خدمت کے اس پہلے مرحلے میں مولانا نے ایک خواب دیکھا پھر چند دنوں بعد مکہ مکرمہ سے مولانا رحمت اللہ کا ایک مکتوب اس خواب کی تعبیر بن کر آیا۔ مولانا کے صاحب زادے

"ضیاء الدین محمد" نے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ۔ آپ نے ایک خواب دیکھا کہ آپ عظیم الشان باغ میں ہیں اور درختوں سے پھل توڑ کر لوگوں میں تقسیم فرما رہے ہیں ۔ اور ایک خط حضرت شیخ رحمت اللہ صاحب کیرانوی ثم المکی سے آپکو پہنچا کہ "تم تعلیم کو ترجیح دو اور ادھر ہی متوجہ ہو جاؤ جس میں دینی بھلائی ہے" خود مولانا رحمت اللہ اِن دنوں "مکہ مکرمہ" میں ایک باضابطہ مدرسے کی داغ بیل ڈالنے میں مصروف تھے ۔ مسجد حرام میں متعدد درسی حلقے ہوتے تھے لیکن یہ تمام حلقے نہایت غیر مرتب تدریجی تعلیمی مراحل سے خالی ، اور کسی جامع نصابِ تعلیم سے محروم تھے مرکزِ اسلام میں تعلیمی عمل کی یہ بدنظمی مولانا کے نزدیک قابلِ تشویش تھی مولانا کی یہ شدید خواہش تھی کہ اس مرکزِ دینی میں ہندوستانی نظامِ تعلیم و تربیت کے نہج پر ایک باضابطہ نظام تدریس ہو چنانچہ مولانا نے آغازِ کار کے طور پر ابتداءً مسجد حرام میں کعبۃ اللہ کے سامنے ۲۷ رجب ۱۲۸۵ھ م ۱۸۶۸ء کو مجوزہ منصوبے کے مطابق درس کا آغاز فرما دیا تھا ، یہ نظام تدریس ۱۸۶۰ء سے جاری اس حلقۂ درس سے مختلف تھا جس کا آغاز مولانا نے جوارِ حرم میں پناہ لینے کے بعد شیخ زینی دحلان کی وساطت سے کیا تھا ۔ کچھ عرصے بعد اس نظام درس کو "محلہ شامیہ" کے ایک مکان میں منتقل کر لیا گیا ۔ ابھی ایک باضابطہ مدرسے کی تشکیل و تأسیس کا سامان بہم نہ پہنچا تھا ، تأسیس مدرسہ کے سلسلے میں مولانا رحمت اللہ کی جد و جہد سے مولانا عبدالوہاب ناواقف نہیں تھے ، کیونکہ مولانا رحمت اللہ نے اپنی باقاعدہ تعلیمی تحریک کا آغاز مولانا عبدالوہاب کے مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران کر دیا تھا ۔ بہرحال بے سر و سامانی کے عالم میں اپنی انفرادی کوششوں سے دین اور علومِ دین کی جو خدمت مولانا رحمت اللہ کر رہے تھے وہ ان کے شاگردِ رشید کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی تھی ، خواب کے اشارۂ غیبی اور استاذ گرامی کے حسب ہدایت مولانا نے وعظ و تقریر کے سلسلے کو موقوف کر کے تعلیم و تدریس شروع کر دی ، مولانا مکہ مکرمہ میں استاذ محترم کی ابتدائی تعلیمی جد و جہد کو دیکھ چکے تھے اور بے سر و سامانی اور کسی ظاہری نقشے کے بغیر آغازِ کار کا منظر ذہن میں محفوظ تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے کسی اعلان و اشتہار کے بغیر اپنے ہی مکان میں بعض عزیزوں کو پڑھانا شروع کر دیا ۔ برخوردار ضیاء الدین محمد ابھی بہت چھوٹے تھے ، ان کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ اپنے برادر زادے غلام محی الدین

کو جو " مدورا " میں کسی عالم دین کے ہاں عربی صرف و نحو کی تعلیم حاصل کرکے ان دونوں علوم میں خوب درک حاصل کر چکے تھے بکمالِ شفقت اپنے ہاں " ویلور " بلالیا اور مولانا کے ایک خالہ زاد عبدالقادر بادشاہ جو استاذِ حضرت مکان میں ابتدائی عربی فارسی کی تعلیم حاصل کر رہے تھے وہ بھی مولانا کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے ، کچھ عرصے بعد ویلور کے مضافات میں واقع محلّہ ۔۔۔ شہ کے ایک ہونہار طالب علم " عبدالجبار " نے بھی اس خانگی مدرسے میں شمولیت اختیار کرلی ، مولانا نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو استعمال کرکے چند سال کے عرصے میں ان ہونہار ، سعادت آثار باصلاحیت عزیزوں کو علم و ہنر سے اس حد تک آراستہ کر دیا کہ اب وہ مولانا کے مجوزہ منصوبے کیلئے دست و بازو بن سکتے تھے ۔ بلاشبہ مولانا کا یہ ابتدائی لائحہ عمل تاسیس مدرسہ کے مقصد کے حصول کیلئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔

اسی اثناء میں استادِ محترم مولانا رحمت اللہ نے مکہ مکرمہ میں مقیم ہندوستانی مہاجرین کی توجہ و عنایت سے " نواب فیض احمد خان " مہاجر کے سکونتی ذاتی مکان میں ماہ رمضان ۱۲۹۰ھ ہجری میں " مدرسہ ہندیہ " کے نام سے ایک تعلیمی ادارے کا آغاز فرمایا ، چند ماہ بعد کلکتہ کی ایک نیک بخت خاتون " صولۃ النساء " کے امداد و تعاون سے مدرسہ کی مستقل عمارت وجود میں آگئی جس کا نام " مدرسہ صولتیہ " رکھا گیا ، اور اس کا باقاعدہ افتتاح ۱۴ ر شعبان ۱۲۹۱ھ ہجری کو ہوا ۔

استادِ محترم کی تعلیمی تحریک اور دیرینہ آرزو کی تکمیل شاگردِ رشید کے لئے یہ موقع اور امکان فراہم کر رہی تھی کہ وہ بھی اپنے مقصد کی جانب پیش رفت کیلئے تیزی سے قدم بڑھائیں اور اپنے استادِ عالی قدر کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے منزل سے قریب تر ہونے کی کوشش کریں چنانچہ مولانا عبدالوہاب نے ۱۲۹۲ھ ہجری مطابق ۱۸۷۵ء عیسوی محلہ کی مسجد کے ایک ایسے حصے میں جو ان دنوں " مسافر خانہ " کہلاتا تھا ۔ نظامِ تدریس قائم فرمایا ۔ غالباً مسجد کے اس احاطے میں قائم کردہ اس مدرسہ میں محلے کے بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم دی جاتی تھی ، ویلور کے ایک صاحبِ علم " مولوی شہاب الدین " اس مدرسہ کے مدرس مقرر ہوئے ۔ خود مولانا اپنے ہی مکان میں بیرونی اور مقامی طلبہ کو عربی اور فارسی کی تعلیم دیا کرتے تھے برخوردار " ضیاء الدین محمد " اور

خالہ زاد "عبدالقادر بادشاہ " کتب متداولہ کی تکمیل کے بعد تحصیل مزید کیلئے مولانا رحمت اللہ کے ہاں مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ روانہ کردئے گئے۔ اکلوتے برخوردار کو اپنی آغوش تربیت سے جدا کرکے استاد محترم کے سایۂ عاطفت میں پہنچا دینے کا فیصلہ اپنے استاد کی تعلیم و تربیت پر غیر معمولی اعتماد اور اپنے ان عزیزوں کی ترقی علم کے مفاد کے علاوہ اس غرض سے بھی ہو سکتا ہے کہ تاسیس مدرسہ کے مجوزہ منصوبے میں ان عزیزوں کی شرکت و معاونت بہتر صلاحیت و استعداد کے ساتھ ہو۔

۱۲۹۳ھ ہجری سے ۱۲۹۹ھ ہجری تک مکان سے مسجد تک پھیلا ہوا لیکن محدود و خودکفیل نظام تدریس پوری کامیابی کے ساتھ جاری رہا اس عرصے میں مولانا شہر کے سرکردہ معتقد احباب کو ایک مرکزی دینی درسگاہ کی تاسیس کی اہمیت سے آشنا کرکے اور انھیں اپنا ہمنوا بنانے کی سعی بھی کر رہے تھے۔ ایک طویل منصوبہ بند جدوجہد اور رجال کار و رفقائے مخلص کی تیاری اور فراہمی کے بعد ۱۲۹۹ھ ہجری م ۱۸۸۲ء عیسوی میں مولانا نے اپنے خانگی ادارے کو ملی درسگاہ میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کرکے بعض معتقد و مخیر احباب یعنی الحاج قادر حسین ویلوری، آلنجی محمد عثمان اور ساہوکار شمس الدین کو معاون کار کی حیثیت سے لیا اور ایک کمیٹی تشکیل دیکر تاسیس مدرسہ کی جدوجہد کو تیز تر کر دیا۔ اپنے عزائم و مقاصد کی نشر و اشاعت اور مادی وسائل کی فراہمی کیلئے مسلسل سفر کئے، تقریروں اور پمفلٹوں کے ذریعے تاسیس مدرسہ کی اہمیت سے علاقے کے مسلمانوں کو آگاہ کیا اور مسلسل جدوجہد اور انتھک کوششوں کے بعد ۱۳۰۱ھ ہجری میں محلے کی مسجد کے قریب ایک وسیع قطعۂ ارضی خرید کر مدرسے کی اولیں عمارت کا سنگ بنیاد رکھا، جلسۂ سنگ بنیاد کے موقع پر شہر اور علاقے کے متعدد عمائدین، ہمدردان ملت اور سرکردہ شخصیتیں موجود تھیں۔

(جاری)

باب الاستفتاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الف ۸۰۵

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں۔

۱۔ روح کا قفسِ عنصری سے پرواز کرجانے کے بعد جسم سے کیا تعلق رہتا ہے؟

۲۔ کیا مردہ کی روح دنیا میں واپس آتی ہے؟

۳۔ کیا مردہ قبر میں شعور واحساس کرتا ہے یا نہیں؟

۴۔ کیا مردہ مرنے کے بعد سنتا اور دیکھتا ہے یا نہیں؟

۵۔ حیاتِ انبیاء اور عامۃ المؤمنین کی حیات برزخیہ میں کیا فرق ہے؟

۶۔ حیاتِ شہداء اور دیگر مؤمنین کی حیات میں کیا فرق ہے؟

۷۔ کیا مردہ بقید حیات لوگوں کی طرح صحیح وسالم احساس رکھتا ہے؟

محمد افضل افریقی

متعلم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند۔ ۲ر جمادی الاولیٰ

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق

۱۔ متقدمین فقہاء نے روح اور جسم بعد الموت کے درمیان تعلق کی تعبیر اس طرح کی ہے کہ آفتاب اور زمین اور زمین کی چیزوں کے درمیان جس قسم کا تعلق ہوتا ہے، اسی قسم کا روح اور جسد بعد الموت کے درمیان ہوتا ہے کہ آفتاب کی شعائیں زمین اور زمین کی چیزوں پر پڑتی ہیں، اور زمین اور زمین کی ہر چیز اپنی استعداد کے مطابق متاثر ہو جاتی ہے۔

شیشے میں گرمی کے ساتھ ساتھ چمک بھی پیدا ہو جاتی ہے، اور سیاہ خشک پتھر جلد اور تیز گرم ہو جاتا ہے، اور سنگ مرمر بہت دیر میں اور کم گرم ہوتا ہے، اسی طرح درجہ بدرجہ ہر چیز اپنی استعداد کے مطابق متاثر ہوتی ہے۔ یہی حال جسد بعد الموت کے اور اسکی روح کے تعلق کا ہوتا ہے، کہ جسد سے شعائیں چلتی ہیں، اور اسکی ارواح تک پہنچتی ہیں، اور روح اس سے متاثر (خوش یا متألم وغیرہ) ہوتی ہے، اور جسد بعد الموت جس جگہ اور جس حالت میں بھی ہو اس کی شعائیں اس کی روح تک پہنچتی رہتی ہیں، اور روح متاثر ہوتی رہتی ہے بالکل اسی طرح روح سے اس کے جسد تک شعائیں پہنچتی ہیں، اور جسد اس سے متاثر ہوتا ہے اور بالکل اسی طرح نفس و روح کے درمیان بھی شعاؤں کا تعلق ہوتا ہے، جیسا کہ علامہ ابن قیم نے بھی کتاب الروح میں بیان کیا ہے۔

اور اس قسم کے تعلق کا ثبوت نصوص و روایات سے ہوتا ہے، خاص کر عذاب قبر اور بعد الموت کے حالات سے متعلق روایات سے معلوم ہوتا ہے، اور یہ بھی ظاہر و عیاں ہے۔

یہ تعبیر محض عوام کی سمجھ کے لئے ہے اور اب تو ریڈیو، وائرلیس ٹیلکس اور راکٹ وغیرہ کی ایجادات سے اس ربط و تعلق کا سمجھنا تو اور بھی قریب الفہم و آسان ہو گیا۔ اس لئے کہ دنیا کے جس ملک و خطہ سے رابطہ قائم کرنا چاہیں، وہاں کے نمبر سے اپنے یہاں کا نمبر ملا لیں، رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور اپنا تاثر ان تک اور ان کا تاثر اپنے تک پہنچا دیتے ہیں حالانکہ بیک وقت بہت سے ریڈیوں وغیرہ اسکی لائن ایک مقام سے دوسرے مقام تک چلتی رہتی ہیں، اور آپس میں ٹکراؤ ہو کر کسی کے رابطہ

ںا مزاحمت وکھا ڑ ہمونا پیدا نہیں کرتیں ، بالکل اسی طرح لاکھوں جسم وروح کے روابط ہر وقت چلتے
ہنے کے باوجود ایک دوسرے سے مزاحم ہو کر رابطہ میں خلط ملط پیدا نہیں کرتے ۔

بلکہ آجکل کمانڈر انچیف جو محاذ جنگ سے بسا اوقات صدہا میل دور بیٹھ کر اپنی لاسلکی ذریعوں
ے محاذ کی نگرانی اور ان کی مستقل کمان ہر وقت کرتا رہتا ہے ۔ اور یہ لاسلکی چلتی ہوئی لائنیں اسمیں
زاحم نہیں ہوتیں ۔ بلکہ سطح ارض سے بہت بلند فضاء میں بلکہ کرۂ ارض کے تأثر سے باہر بھی راکٹ کی
رانی و تربیت کرنیوالا ہمہ وقت اسی لاسلکی تعلق کی بنیاد پر ہمہ وقت نگرانی وغیرہ کرتا رہتا ہے ۔ اور
ب انسانی نظم اپنی قوت وطاقت کے محدود و زوال پذیر ہونے کے باوجود ایسا تعلق لاسلکی پیدا
رسکتا ہے تو احکم الحاکمین جو ان عقول کا خالق و پروردہ ہے ایک مضبوط نظم کرے ، اسمیں کیا استبعاد ہے ۔
ر گفتگو تو محض سمجھانے اور قریب الفہم کرنے کیلئے ہے ، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کیفیت وتعلق
پورا اور صحیح علم صرف ذات باری تعالیٰ عز اسمہٗ کو ہے اور اسی کو ہو سکتا ہے ، اور اس کی حقانیت
بطور دلیل وعلامت کچھ اشارے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہماری رہبری وہدایت کیلئے بر لسان نبوت
ہر فرمادیئے ہیں تاکہ عقول سافلہ بھی بغیر پریشانی کے تسلیم کرلے ۔

فتدبروا وتفکروا وآمنوا باللہ العزیز العلیم ۔

— دنیا ایک عالم ہے اور اس کے دو حصے ہیں ۔ ایک کا نام عالم مادیات ہے ، جیسے آگ
ا ، پانی ، زمین یعنی عناصر اربعہ اور ان سے ان کے جنس کی پیدا شدہ چیزیں ۔

دوسرا حصہ عالم مجردات کا ہے ۔ جیسے روح ، عقل ، ہوش ، فہم وادراک وغیرہ ۔ روح
رنے کے بعد جسم سے نکل کر اسی دنیا کے عالم مجردات میں رہتی ہے ، اس لئے دنیا میں آنیکا کیا سوال؟
برزخ جس مقام میں رہتی ہے اس کا نام برزخ ہے ۔ برزخ کے دو طبقے ہیں ایک کا نام علیین ہے
ور دوسرے کا نام سجین ہے ، سجین میں کافر کی روح رہتی ہے ، سجین کا تعلق جہنم سے ہوتا ہے ۔
س لئے جہنم کے اثرات اس میں آتے ہیں ۔ جس سے روحوں کو طرح طرح کے رنج وغم ومصیبت
تکلیف ہوتی ہے اور اس کا اثر جسم مادی کو بھی جواب ملا میں انکے طریقہ پر ہوتا ہے ، اور
بھی براہ راست جسم پر عتاب ہوتا ہے اور اس کا اثر روحوں کو پہنچتا ہے ، جس سے وہ بھی
معذب ہوتی ہیں ، سجین بمنزلہ حوالات کے ہے اس سے ان روحوں کو نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی

رہوتی بھی ہے تو جوالا نی قیدی کی طرح ہوتی ہے۔

اور علیین میں مومنین کی روحیں رہتی ہیں، علیین کا تعلق جنت سے ہوتا ہے، اس لئے جنت ونعمائے جنت کے اثرات ان روحوں میں آتے ہیں۔ اور اس سے ان روحوں کو طرح طرح کی آسائش میسر ہوتی ہے، اور اس سے ان کو طرح طرح کی خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس کا اثر ان کے جسم مادی تک حسب جواب ملا پہنچتا ہے، اور کبھی براہ راست جسم مادی کو راحت ونعمت ملتی ہے جس سے جسم خوش وفرحاں ہوتا ہے اور اس کا اثر ان کی روحوں تک پہنچتا ہے، اور وہ بھی خوش وفرحاں ہوتی ہیں۔ اور علیین ان کیلئے باغ جنت کا نمونہ ہوتا ہے اور وہ روحیں حسب اجازت خداوندی گھومتی پھرتی بھی ہیں، مگر مجردات کے قبیل سے ہونیکی وجہ سے ہم کو ان مادی آنکھوں سے نظر نہیں آتیں۔ کبھی کبھی بحکم خداوندی محسوس ومبصر بھی ہو جاتی ہیں۔ جس طرح شیاطین وجنات وملائکہ قبیل مجردات سے ہونیکے باعث قریب رہ کر بھی ان مادی آنکھوں سے نظر نہیں آتے مگر کبھی کبھی بحکم خداوندی محسوس ومبصر بھی ہو جاتے ہیں، اسی طرح ان روحوں کا بھی حال ہوتا ہے۔

ان باتوں کے ثبوت میں بکثرت احادیث وروایات وآثار موجود ہیں، اور کبھی واقعات بھی حسب حکمت خداوندی اس پر شاہد بن جاتے ہیں۔

ان روحوں کے قوائے ادراکیہ وعملیہ دونوں قفس عنصری چھوڑنے کے بعد بہت مضبوط اور تیز ہو جاتے ہیں۔ بیضاوی شریف میں تبقی دراکۃ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے ای تبقی دراکۃ باذنہ وحسب حکمتہ تعالیٰ لا مطلقاً۔ ولا اصالۃ۔

جنات وغیرہ کی طرح آن واحد میں دور سے دور پہونچ جاتی ہیں، اور حسب حکمت خداوندی اور باذن خداوندی اپنے اولیاء واحباب کی معاونت اور ان کے اعداء ودشمنوں سے مدافعت وغیرہ بھی کر سکتی ہیں اور آپس میں ملاقات وبات چیت بھی کر سکتی ہیں چنانچہ صحیح احادیث میں ہے کہ جب مومن کی روح مرنے کے بعد علیین میں پہنچتی ہے تو وہاں کی روحیں ملاقات کرتی ہیں۔ حالات بھی پوچھتی ہیں۔ اپنے خاندان وکنبہ والوں کو بھی پوچھتی ہیں جب یہ روح کہتی ہے کہ وہ تو ہم سے پہلے آچکا ہے، کیا یہاں نہیں پہنچا تو وہاں کی روحیں کہتی ہیں کہ پھر وہ سجین میں گیا اھ ملخصاً

اس سے نفرت کرنے لگتی ہیں۔

اسی طرح بعض احادیث میں ہے کہ شہداء کی روحیں سبز چڑیوں کے قالب میں اڑ کر عرش کے نیچے عرش کے قریب تک پہونچ جاتی ہے۔

ان چیزوں کی مزید تفصیل و وضاحت مطلوب ہو تو بیہقی و محدث جلیل حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی تفسیر (تفسیر مظہری) میں آیت کریمہ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون کی تفسیر ملاحظہ کیجئے۔

۳ و ۴ – مردہ قبر میں شعور و احساس بھی رکھتا ہے، اور سنتا اور دیکھتا بھی ہے جیسا کہ مرنے کے بعد نکیرین سے مردہ سے سوال و جواب کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

اور زیارت قبور کی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب زیارت کرنے والا السلام علیکم الخ کہتا ہے تو وہ اس کو سنتا ہے، اور جواب بھی دیتا ہے، اور یہ الگ بات ہے کہ وہ جسد مادی کی زبان سے جواب نہیں دیتا ہے اس لئے ہم اسکو عنصری کانوں سے نہیں سنتے۔

نیز مصنف ابن ابی شیبہ اور حاکم کی روایت ہے جو عقبہ بن عامر رضؓ سے اور حضرت حذیفہ رضؓ سے مروی (معلوم ہوتا ہے) حضرت عقبہ بن عامر صحابی کے الفاظ یہ ہیں لان اطأ علی جمرۃ او علی حد سیف حتی یخطفہ رجلی احب الی من ان امشی علی قبر رجل مسلم وما ابالی أفی القبور قضیت حاجتی ام فی السوق بین ظهرانیه والناس ینظرون اور اسی روایت کو انہی الفاظ میں ابن ماجہ نے حضرت حذیفہ رضؓ سے روایت کی ہے (شرح الصدور للسیوطی ص ۱۲۱)۔

نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے جس میں ارشاد نبوی اس طرح ہے ما من رجل یزور قبر اخیه ویجلس عنده الا استأنس به ورد علیه حتی یقوم (کتاب الروح للعلامة ابن قیم)۔ نیز حضرت ابن عباس رضؓ کی روایت سے جسمیں ارشاد نبوی بایں الفاظ منقول ہے ما من رجل یمر علی قبر اخیه المؤمن کان یعرفه فیسلم علیه الا رد علیه السلام پھر یہی روایت حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔

غرض اس قسم کی روایات مختلف سندوں سے اس طرح کثرت سے مروی ہیں، کہ سب مجموعہ حدیث حسن لغیرہ تک پہونچتا ہے، اور اس کا ضعف مرتفع ہو کر انکو ضعیف یا سقیم کہنا صحیح

نہ ہوگا۔

بلکہ علامہ ابن قیمؒ نے کتاب الروح میں اس بات پر کہ اجماع سلف نقل کیا ہے کہ روحیں اپنی زیارت کرنے والے کو پہچانتی ہیں۔ اور اسی سے بشارت لیتی ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں۔ و السلف مجمعون علی هذا وقد تواترت الآثار عنهم بان المیت یعرف زیارة الحی له ویستبشر به۔

ایک شبہ رہ گیا یہ شبہ کہ نکیرین والی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مرنے والے سے یہ سوال و جواب ہوتا ہے، لیکن ہر مرنے والا قبر میں دفن نہیں ہوتا، تو یہ سوال و جواب سب سے کس طرح ہوگا اور روایت کا عموم و شمول کس طرح صحیح ہوگا۔

جواب شبہ جواب یہ ہے کہ چونکہ عموماً مردے اسی قبر میں دفن ہوتے ہیں جو زمین میں گڑھا کھود کر بنائی جاتی ہے ورنہ قبر کے پورے معنی یہ ہیں "مقر الجسد بعد الموت۔ مرنے کے بعد جسم کی جگہ۔

پس مرنے کے بعد نظر انسانی سے اوجھل ہو کر جہاں بھی اور جس حال و شکل میں جسد رہے گا۔ وہی اس کی قبر ہے اور وہیں نکیرین کا سوال و جواب ہوتا ہے۔ لہٰذا اب روایت کے عموم و شمول میں اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔

ایک اور شبہ اور اس کا ازالہ آیت کریمہ ان الله یسمع من یشاء وما انت بمسمع من فی القبور الآیة سے معلوم ہوتا ہے کہ مردے قبروں میں نہیں سن سکتے ورنہ وما انت بمسمع الخ نہ فرمایا جاتا۔

جواب یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ قلیب بدر میں جو مقتولین کفار ڈالے گئے تھے، ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح خطاب فرما رہے تھے جس طرح زندوں سے خطاب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ زندوں کی طرح ان کو نہیں سنا سکتے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سنوا سکتا ہے اسی مفہوم کو روح المعانی میں بیان کیا ہے۔ المراد نفی الاسماع بطریق العادة۔

اگر آیت کریمہ کے عموم الفاظ سے یہ حکم تمام مردوں کو خواہ مومن ہوں یا غیر مومن ہوں، سب کو عام قرار دیا جائے تو یہ مفہوم ہوگا کہ ہم یا کوئی دوسرا اپنے اختیار و قدرت سے زندوں

کی طرح انکو نہیں سنا سکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ حسب حکم آیت کریمہ ان اللہ یسمع من یشاء خود سنا سکتے ہیں، باقی اس آیت سے خود مردوں کا نہ سننا دیکھنا ثابت نہیں ہوتا لہٰذا مذکورہ بالا احادیث وآثار میں مردوں کو دیکھنے سننے کا ذکر آیا ہے اس کے یہ آیت منافی ومتضاد نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص ولا تسمع الصم الدعاء کے منطوق الٰہی سے استدلال کرے کہ مردے بھی نہیں دیکھ سن سکتے تو اس کا جواب بھی یہی ہوگا کہ وہ اپنے اختیار وقدرت سے زندوں کی طرح نہیں سن سکتے باقی بفحوائے منطوق الٰہی إن اللہ یسمع من یشاء اللہ تعالیٰ کے سنانے دکھانے سے وہ دیکھ سن سکتے ہیں۔

پس احادیث وآثار مرویہ جن میں مردوں کا دیکھنا سننا مروی ہے۔ بطریق اشارۃ النفس یہ بات ماننی لازمی ہوگی کہ وہ باذنہ تعالیٰ وحسب حکمتہ سنتے دیکھتے ہیں البتہ جن اشیاء کے بارے میں نص ناطق ہو کہ نہیں دیکھ سن سکتے ان کے بارے میں یہی اعتقاد رکھنا لازم ہوگا کہ ان اشیاء کو نہیں دیکھ سن سکتے۔ پھر جن اشیاء وامور کے بارے میں دیکھنے نہ دیکھنے یا سننے نہ سننے سے نص میں سکوت ہو ان اشیاء کے بارے میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ کے اصول کے مطابق سکوت کرنا لازم ہوگا۔

اس گفتگو سے سماع موتیٰ کا مسئلہ بھی حل ہوگیا کہ نہ مطلقاً ہر حال میں سماع کے قائل ہو سکتے ہیں اور نہ مطلقاً ہر حال میں عدم سماع ہی کے قائل ہو سکتے ہیں، بلکہ اوپر کی تشریح وتفصیل کے مطابق عقیدہ رکھنا ہی اسلم ہوگا۔

۵ و ۶ — حیات انبیاء علیہم السلام اور حیات مؤمنین کی حیات برزخیہ میں بڑا فرق ہے اور اسی طرح حیات شہداء و دیگر مؤمنین کی حیات برزخیہ میں بھی بہت فرق ہے۔ آیت کریمہ اولٰئک الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین الآیۃ۔ میں خواص مؤمنین کے اسی ترتیب ذکری کے مطابق چار مرتبے بیان فرمائے گئے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ صالحین مؤمنین غیر صالحین سے متمیز وممتاز رہیں گے اور یہ فرق دنیوی حیات سے لے کر برزخی حیات بلکہ

خروی حیات میں بھی ملحوظ رہے گا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ سے بھی اس کا اشارہ ملتا ہے ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملائکۃ ان لا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون الآیۃ۔ بعض صحیح روایات میں آتا ہے کہ صالحین کاملین کو دنیا میں جس عبادت میں مقام حاصل ہو جاتا ہے، وہ بعد الموت (برزخ میں) بھی اپنے مقام عبادت کے اعتبار سے باذنہ تعالیٰ اسی عبادت میں مشغول رہتے ہیں، مثلاً کسی کو مقام صلوٰۃ حاصل ہے تو قبر میں بھی نماز کے ساتھ مشغول رہتا ہے تو کوئی تلاوت میں مشغول رہتا ہے، غرض اپنے اپنے مقام کے اعتبار سے تعلق مع اللہ میں مشغول رہتے ہیں، بلکہ بعض صالحین کاملین کے جسد پر زمین دست درازی نہیں کرسکتی۔ اس سے عامۃ المؤمنین وصالحین کی حیات برزخی میں فرق ظاہر ہو گیا۔

پھر بفحوائے ترتیب آیت کریمہ اولٰئک الذین انعم اللہ علیہم الخ شہداء کو زیادہ فضیلت و مزیت حاصل ہوتی ہے، چنانچہ شہداء کو اسی کپڑے و خون کے ساتھ قیامت میں اٹھایا جائے گا وغیرہ وغیرہ امور ماثورہ فی الآثار الصحیحہ، کما فی شرح الصدور للسیوطی ایضاً اور یہ صورت خود شہداء کی حیات برزخی کے صالحین سے قوی تر ہونے کی دلیل ہے۔ پھر اسی آیت کریمہ کی ترتیب ذکری کے مطابق صالحین و شہداء پر برزخ میں بھی صدیقین کو فوقیت اور مزید فضیلت و مزیت حاصل ہوگی۔ اس تفصیل سے ان اقسام ثلثہ (صالحین، شہداء، صدیقین) کے اندر آپس میں بھی حیات برزخیہ کے فرق کی طرف اجمالی اشارہ نکل آیا۔ یعنی صدیقین کی حیات برزخی شہداء سے بھی قوی تر ہوگی، اور پھر انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخی کا ان سب سے قوی ہونا نکل آیا۔

علاوہ ازیں غیر نبی کی ازواج بیوہ ہونے کے بعد دوسرا نکاح کرسکتی ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام کی ازواج اپنا نکاح کسی سے نہیں کرسکتیں۔ یہ قول بھی اسی وجہ سے ہے کہ انبیاء کی حیات برزخی اتنی قوی ہے کہ ان کی ازواج کا نکاح دنیوی جو دنیوی حیات کی فرع ہے، باقی رہتا ہے۔ اس سے انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخی کا سب سے زیادہ قوی ہونا بھی معلوم ہو گیا۔

پھر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حیاتِ برزخی کی فوقیت اور آپ کا اپ کے ماسوا سب سے زیادہ قوی و اکمل ہونے کا پوچھنا ہی کیا ہے اس پر بیشمار روایات و آثار کتب احادیث و آثار میں مروی و ثابت ہیں مثلاً ارشاد نبوت علیہ الصلوٰۃ والسلام من رآنی فی المنام فقد رآنی و فی روایۃ فقد رأی الحق اور مثلاً من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی اوکما قال علیہ السلام اور مثلاً من حج او اعتمر ثم زار قبری فکانما زارنی اوکما قال علیہ السلام اور مثلاً من حج البیت ولم یزرنی فقد جفانی رواہ ابن عدی بسند حسن وفی روایۃ من وجد سعۃ ولم یزرنی فقد جفانی وغیرہ یہ سب اسی قوت و برزخی حیات کی فوقیت کی جانب مشعر ہیں، غرض ان سب سے آپکی حیات انبیاء علیہم السلام اور حیات عامۃ المومنین میں فرق ظاہر ہوگیا بلکہ مراقی الفلاح میں اس طرح مذکور ہے۔ ومما ھو مقرر عند المحققین انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یرزق ممتع بجمیع الملاذ (المناسب لشـــانـه) والعبادات غیرانہ حجب من ابصار القاصرین عن شریف المقامات آپکی حیات میں اور غیر انبیاء کی حیات میں زمین و آسمان کا فرق نمایاں ہوگیا۔

۷۔ ہاں رکھتا ہے، بلکہ اس سے قوی تر رکھتا ہے۔ البتہ اس کا رنگ ولون دوسرا ہوتا ہے یعنی دنیوی حیات کا لون و رنگ مادہ کے ساتھ مشوب رہتا ہے، اور ان کا اس تشویب سے منزہ و پاک ہو کر خالص و صافی رہتا ہے، اور اسی وجہ سے مادی آنکھوں سے اوجھل و مخفی رہتا ہے، باقی جن کو اللہ تعالیٰ نے اس عالم سے بہ برکت اتباع سنت و اتباع شریعت جلاء و نورانیت عطا فرمائی ہے، وہ اس کو خود بھی اس حیات مادی کے ساتھ محسوس کر لیتے ہیں، ولا مناقشۃ ولا استحالۃ فیہ کما حققہ المحققون من الامۃ کالعلامۃ ابن القیم وغیرہ۔

ھذا ما ظھر لی الآن بفتح المنان وعلیہ التکلان۔ فقط

واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ العبد نظام الدین

مفتی دارالعلوم دیوبند

۹/۷/۹۳ھ

فہرست کتب مکتبہ دارالعلوم دیوبند (شعبہ نشر و اشاعت دارالعلوم دیوبند)

نام کتب	قیمت	نام کتب	قیمت	نام کتب	قیمت
فتاوی دارالعلوم جلد ۱	۲۲/-	دیوان المتنبی	۱۱/-	انتصار الاسلام	۹/-
〃 〃 ۲	۱۴/-	تاریخ دارالعلوم جلد ۱	۴۴/-	مصابیح التراویح	۲/۵۰
〃 〃 ۳	۲۵/-	〃 〃 ۲	۴۰/-	تفسیر معوذتین	۳/-
〃 〃 ۴	۳۱/-	〃 انگریزی 〃 ۱ 〃 〃 〃 ۲	۱۲۵/- ۱۰۵/-	اسلامی عقائد اور سائنس	۲/-
〃 〃 ۵	۳۰/-	سوانح قاسمی جلد اول	۴۶/-	مودودی مذہب	۲/۵۰
〃 〃 ۶	۳۶/-	〃 〃 〃 دوم	۳۸/-	دستور و عقائد	۲/۵۰
〃 〃 ۷	۳۲/-	〃 〃 〃 سوم	۱۲/-	نظریہ ودود قرآن پر ایک نظر	۴/-
〃 〃 ۸	۲۸/-	مخطوطات جلد اول	۱۹/-	مکتوبات	۳/-
〃 〃 ۹	۳۱/-	〃 〃 دوم	۲۶/-	مکتوبات ثلثہ	۳/۵۰
〃 〃 ۱۰	۲۲/-	قبلہ نما	۲۸/-	دو ضروری مسئلے	۱/-
〃 〃 ۱۱	۸/-	دینی دعوت کے قرآنی اصول	۶/۵۰	جماعت اسلامی کا دینی رخ ۱	۳/۵۰
مقدمہ ابن الصلاح	۱۱/-	ناقابل فراموش واقعات	۲۶/-	〃 ۲	۲/۵۰
الفیۃ الحدیث	۱۲/-	المنار الانوار	۷/-	〃 ۳	۲/۵۰
مشکوۃ الآثار	۱۱/-	مثنوی فروغ	۲/۵۰	〃 ۴	۴/-
الفیہ	۴/-	براہین قاسمیہ	۱۰/-	اجتماع گنگوہ	۱/-
نفحۃ الادب	۶/-	حکمت قاسمیہ	۵/-	درمنثور اول	۱/-
تفسیر مدارک التنزیل	۸/-	مدارج سلوک	۱۶/-	〃 دوم	۱/-
الاشباہ والنظائر	۳۰/-	جائزہ تراجم قرآنی	۱۱/-	اعفاء اللحیہ	۱/-
عقیدۃ الطحاوی	۱۱/-	قرآن محکم	۹/-	ایمان وعمل	۳/-
حسامی	۱۲/-	حجۃ الاسلام	۱۰/-	دارالعلوم دیوبند کا ایک	
نو حسن	۱۲/-	اسرائیل	۲/-	فتوی اور اس کی حقیقت	[illegible]
مقامات حریری	۲۵/-	قرآنی پیشین گوئی	۳/۷۵	ماثورہ دعائیں	[illegible]

Regd. No SHN-13-NP-21 84

DARUL-ULOOM MONTHLY

DEOBAND [U.P.]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالعلوم دیوبند

کے ترقیاتی منصوبے

(۱) رواق خالد کی دوسری منزل اور م[...] جدید دارالاقامہ کی تعمیر جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے کافی ہو

(۲) **دارالتربیت** (دارالاطفال) کا [...] تعمیر

(۳) ایک وسیع مسجد کی تعمیر جس میں اضافہ شدہ تمام طلبہ کی گنجائش ہو (قدیم مسجد ناکافی ہو چکی ہے)

(۴) علمی و دینی اجتماعات کے لئے ایک وسیع ہال کی تعمیر ——— (۵) ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر

(۶) مہمان خانہ کی توسیع ——— (۷) نئی درسگاہوں کی تعمیر ——— (۸) **لائبریری کی تعمیر**

(۹) اساتذۂ دارالعلوم کی علمی ترقی کے لئے عالم اسلام سے علمی کتابوں کی فراہمی کا انتظام

(۱۰) تمام دنیا میں پھیلے ہوئے فضلاءِ دارالعلوم سے روابط اور اُن سے متعلق معلومات۔

(۱۱) نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم پر تمام ذمہ دارانِ مدارسِ عربیہ کا اہم کنونشن طلب کرنا۔

(۱۲) تعلیم و تربیت کے نئے اصول و ضوابط کی ترتیب اور اُن کا اجراء۔

اس ادارے کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے

دستِ تعاون بڑھانے کی شدید ضرورت ہے

مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی امداد روانہ فرمائیں ——— شکریہ

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب) دارالعلوم دیوبند یوپی

دارُالعلوم دیوبند کا علمی دینی اِصلاحی ماہنامہ

دارُالعلوم

اپریل ۸۲

زیرِ سرپرستی

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

مدیر مسئول

ریاست علی بجنوری

نگرانِ اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم

دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی

ماہنامہ

جلد نمبر ۶۶	اپریل سنہ ۱۹۸۴ء مطابق رجب المرجب سنہ ۱۴۰۴ھ	شمارہ نمبر ۱

سالانہ زرِ اشتراک

ہندوستان سے ۲۵/- روپے

سعودی عرب، کویت، ابوظہبی وغیرہ سے
بذریعہ ایرمیل ۹۰/- روپے

جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے
بذریعہ ایرمیل ۱۰۵/- روپے

امریکہ، کناڈا وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل
۱۱۶/- روپے

پاکستان سے ذریعہ ریل ۴۵/- روپے

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

مجلس ادارت

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی
مولانا ریاست علی صاحب (مدیر مسئول)
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی (مدیر)

طابع و ناشر

دارالعلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مطبع

محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند

○ **ضروری گذارش:-** اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینہ یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپکی مدتِ خریداری ختم ہو چکی ہے، بذریعہ سرخ نشان اسکی آپکو اطلاع بھی دی جا چکی ہے، لہٰذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپکا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی، پی ہی سے زرِ اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے۔ اگلا شمارہ -/۳۱ روپے کے مطالبہ میں وی، پی کر دیا جائے گا۔

(مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

۱ - ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہیکہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

۲ - پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ -/۵/۴ روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والہ، تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیجدیں اور انھیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

گذشتہ شمارہ کے حرفِ آغاز میں مدارس اسلامیہ کے نظام تعلیم و تربیت اور ان کے ماضی و حال کے بارہ میں معروضی انداز سے، کچھ اشارے کئے گئے تھے، حقیقت یہی ہے کہ، ان مدارس نے پچھلی صدی میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء و ترقی کے سلسلے میں جو حیرت انگیز اور معجز نما کارنامے انجام دئے ہیں وہ اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، ان مدارس نے امّت کو ایسے افراد اور رجال کار دئے جو اپنی اپنی جگہ ایک ایک امّت سے کم نہ تھے، اسلامی درسگاہوں کی اس تاریخی خدمت کو جتنا ہی خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مردم سازی کا یہ کام ایک عرصہ سے تقریباً بند سا ہو گیا ہے،

ملّت کے دردمند اصحاب اس اندوہناک صورت حال سے کرب و بےچینی محسوس کررہے ہیں اور اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ان خامیوں اور کمزوریوں پر غور اور انکی تلافی کی راہیں تلاش کررہے ہیں، جن کے سبب یہ سانحہ پیش آرہا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ کی ایک اہم ترین کوشش وہ "تعلیمی و ملّی کانفرنس" ہے جو اسی ماہ اپریل کی ۶، ۷، ۸/ تاریخوں میں جمعیۃ علماء ہند کے صدر حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ کی صدارت میں ہندوستان کے دارالحکومت "دہلی" میں منعقد ہوئی، جسمیں ملک کے تقریباً ہر حصے سے قدیم و جدید تعلیم کے ماہرین کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

اس سہ روزہ کانفرنس میں علماء امّت اور زعماء ملّت جس طرح سے سر جوڑ کر بیٹھے اور جس

دردمندی و دلسوزی کے ساتھ مدارس و جامعات کے مسائل و مشکلات پر غور و فکر کیا، اصلاحِ حال کیلئے تدبیریں سوچیں اور تجویزیں طے کیں، اسے دیکھ کر یہ توقع کیجا سکتی ہے کہ تعلیمی درسگاہوں کے ساتھ زعماء ملت کی یہ دلچسپی اور فکرمندی قائم رہی تو انشاء اللہ صورتِ حال بدلے گی اور مدارس کی راہ کی مشکلات خواہ وہ داخلی ہوں یا خارجی دور ہونگی، اور یہ کاروانِ علم و فضل نئی امنگوں اور تازہ قوتوں کے ساتھ اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں ہو جائیگا،

کانفرنس نے اس سلسلہ میں جو سب سے اہم تجویز پاس کی ہے وہ وفاق المدارس کی ہے۔ یہ ایک ایسی تجویز ہے جسکی افادیت اور مفید نتائج سے انکار نہیں کیا جا سکتا، علماء پاکستان نے اسے عملی جامہ پہنا کر ایک مثال قائم کر دی ہے، اس سلسلے میں انکے تجربات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، وفاق المدارس پاکستان کی سالانہ رودادوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ذریعہ انھوں نے مدارس کو بہت سے خطرات سے محفوظ کر لیا ہے، پھر علمی انحطاط کے سیلاب کو روکنے میں اس سے کافی مدد ملی ہے، مدارس کے ایک سلسلے میں مربوط ہو جانیکی بنا پر بہت سی وہ خرابیاں جو باہمی انتشار و افتراق کی بنا پر پیدا ہو جاتی ہیں ان کا بھی سدّباب ہو جاتا ہے، اسلئے ہندوستان کے اربابِ مدارس کو سنجیدگی کیساتھ اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے، اور باہم بیٹھ کر ان خطوط کو اتفاق و اتحاد کے ساتھ طے کر لینا چاہیئے جنکی بنیادوں پر وفاق پائیدار اور مستحکم ہو سکے۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم تجویز نصاب سے متعلق ہے، یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہیکہ نصابِ تعلیم کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسمیں تغیر و تبدل عقل و تجربہ کے نزدیک مناسب و موزوں نہ ہو بلکہ اسکے برخلاف تاریخ کی شہادت یہ ہیکہ ہر دور میں اسکے تقاضے کے مطابق ماہرینِ علم و فن نے اسمیں تبدیلیاں کی ہیں جسکی زندہ مثال ہمارے مدارس میں رائج درسِ نظامی ہے، جو اگرچہ درسِ نظامی ہی کے نام سے مشہور ہے، لیکن ملا نظام الدین سہالوی کے مرتبہ کردہ نصاب اور موجودہ نصاب میں تدریجاً کافی فرق ہو چکا ہے، ملا نظام الدین کا مرتب کردہ نصاب یہ تھا۔

علم الصرف :۔ میزان، منشعب، پنج گنج، زبدہ، صرف میر، فصول اکبری، اور شافیہ ابن حاجب

علم النحو :۔ نحو میر، شرح مائۃ عامل، ھدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی تا بحث حال

بلاغت :۔ مختصر المعانی، مطول تا بحث انا قلت۔

منطق :۔ صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم العلوم، میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال

فلسفہ :۔ میبذی، شرح ھدایۃ الحکمۃ اور ملا صدرا کی شرح ھدایۃ الحکمۃ معروف بہ صدرا تا بحث مکان، و شمس بازغہ

ریاضی :۔ خلاصۃ الحساب تا باب التقسیم، تحریر اقلیدس کا مقالہ اول، تشریح الافلاک، توشیحہ اور شرح چغمینی کا باب اول

فقہ ۔ شرح وقایہ کا نصف اول اور ہدایہ کا نصف ثانی : اصول فقہ ۔ نور الانوار، توضیح، مقدمات اربع تک، اور مسلم الثبوت مبادی کلامیہ تک : کلام ۔ شرح عقائد تفتازانی، محقق دوانی کی شرح عقائد، کا جزء اول، اور میر زاہد شرح مواقف تا بحث امور عامہ : تفسیر ۔ جلالین، بیضاوی سورۂ بقرہ : رشیدیہ، ملا محمد رشید جونپوری کا : حدیث ۔ مشکوٰۃ شریف تا کتاب الجمعہ ۔

یہ ہے اصل درس نظامی، اب موجودہ رائج درس نظامی کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ اس میں کس قدر تبدیلیاں ہو چکی ہیں، نصاب درس میں حذف و اضافہ اور تبدیلی ایک ناگزیر ضرورت ہے اور اسی ضرورت کے پیش نظر ہر دور میں علماء نے اپنے طور پر یہ کام کیا ہے اسلئے اس تجویز سے بھی کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا البتہ اس سلسلہ میں جو بات کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ نصاب میں غور و فکر سے پہلے مدارس اسلامیہ اور اسکی تعلیم کے مقصد اصلی کو متعین کرنا ہوگا، اور پھر اس مقصد کو مرکز و محور بنا کر نصاب میں غور کیا جائے، یہ بات اسلئے کہی جا رہی ہے کہ آج کل بہت سے حضرات، مدارس اسلامیہ کے نصاب میں ایسے علوم کو شامل کرنے پر زور دیتے ہیں جن کا مدارس کے مقصد سے کوئی جوڑ نہیں ہے، اس قسم کی تبدیلی مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوگی پھر نصاب کے ساتھ طرز تعلیم پر بھی توجہ کی ضرورت ہے، اگر طرز تعلیم میں مناسب تبدیلی پیدا کر دی جائے تو بہت حد تک نصاب کی تبدیلی کی ضرورت پوری ہو جائیگی، علاوہ ازیں نظام تربیت بھی سخت توجہ کا محتاج ہے، بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ مدارس کی یہ سب سے اہم اور پہلی ضرورت ہے جسے پورا ہونا چاہئے، اگر صحیح معنوں میں تربیت کا نظام قائم ہو جائے تو علمی زوال میں بھی کمی ہو سکتی ہے، تعلیمی کانفرنس نے مدارس کے نظام کار پر غور و فکر کیلئے جو کمیٹی بنائی ہے، اسکے ارکان سے یہ گذارش ہے کہ وہ نصاب تعلیم کے ساتھ نظام تربیت کو بھی اپنے غور و فکر کا مرکز بنائے کیونکہ مدارس کی مشکلات کا مکمل حل اسکے بغیر نہیں ہو سکتا، اس صورت میں اگرچہ کمیٹی کا دائرہ کار وسیع ہو جائیگا لیکن اگر اس پر قابو پا لیا گیا تو یہ قوم و ملت کی بہت بڑی خدمت ہوگی، ورنہ صرف نصاب تعلیم میں حذف و اضافہ سے کوئی خاص فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا ۔

یہ تمام امور تو مدارس کے داخلی مسائل کو حل کرنے کیلئے مفید ہوں گے، ان مسائل کے ساتھ خارج سے مدارس اسلامیہ پر جو حملے ہوتے ہیں انکے تدارک کی جانب بھی خاص توجہ کی ضرورت ہے، جمعیۃ علماء ہند جو ملت کے کاموں میں بطور خاص دلچسپی رکھتی ہے اسکے لئے یہ کام کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے، بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اسی کے کرنے کا ہے اور وہی اسے کر سکتی ہے، اس لئے ارباب جمعیۃ سے بجا طور پر توقع ہے کہ وہ اس بیڑہ کو اٹھائیں گے ۔

قسط ۳

قرآن حکیم اور جدید سائنس پر

ایک حقیقت پسندانہ اہم تبصرہ

از جناب کریم الدین صاحب مقیم حال جدہ

(۳۱) صفحہ ۲۹ و ۳۰ ۔ غذا سے خون اور دودھ بننے اور دوران خون کے متعلق جدید ترین طبّی معلومات پیش کرنیکے بعد صفحہ ۳۰ پر ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "اس حقیقت کی وضاحت قرآن کی اس آیت سے ہوتی ہے جسے صدیوں تک سمجھے بغیر مفسرین ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے ہیں، لیکن آج اس آیت کو سمجھنا مشکل نہیں رہا ہے"، اس کے بعد انھوں نے آیت ۶۶ سورہ نحل کا ترجمہ دیا ہے جو لفظی ترجمہ کی حد تک بالکل درست ہے، ذیل میں ہم "بیان القرآن" سے آیت کا تفسیری ترجمہ مع ذیلی فوائد کے پیش کرتے ہیں؛

"اور (نیز) تمہارے لئے مواشی میں بھی غور درکار ہے (دیکھو) ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون (کا مادّہ) ہے اس کے درمیان میں سے (دودھ کا مادہ کہ ایک حصہ خون کا ہے، بعد ہضم غذا کے جُدا کرکے تھن کے مزاج اور خاصیت سے اس کا رنگ بدل کر اسکو) صاف اور گلے میں آسانی سے اُترنے والا دودھ (بنا کر) ہم تم کو پینے کو دیتے ہیں؛"

ف۔ نُسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهِ الخ میں یہ مراد نہیں کہ پیٹ میں ایک طرف گوبر ہوتا ہے اور ایک طرف خون اور دونوں کے درمیان دودھ رہتا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو غذا ہوتی ہے اس میں دودھ بننے والے اور گوبر بننے والے اجزا مخلوط ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جُدا جُدا کرتے ہیں۔ کچھ حصہ گوبر بن جاتا ہے اور کچھ ہضم کبدی میں اخلاط بنتے ہیں، جن میں خون بھی ہے، پھر خون میں بھی دودھ بننے والا اور نہ بننے والا حصّہ دونوں مخلوط ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایک حصہ جدا کرکے پستان دھن تک پہنچاتا ہے جہاں وہ دودھ بن جاتا ہے، جیساکہ تشفین

میں خاصیت رکھی ہے کہ خون وہاں پہنچ کر مادہ منویہ بن جاتا ہے یہ سب اللہ پاک کے کام ہیں۔

اب ہم ڈاکٹر صاحب سے بڑے ادب سے دریافت کرتے ہیں کہ آیت کا مفہوم سمجھنے کیلئے کیا قرآن کے مخاطبین اولین کو بلکہ ہم لوگوں کو بھی اس سے زیادہ کچھ سمجھنے کی ضرورت ہے اور کیا آپ تفسیر بالا کو سنجیدگی کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنا، کہہ سکتے ہیں۔؟

(۳۲) صفحہ ۳۲ و ۳۳۔ ڈاکٹر صاحب سورۂ علق میں عَلَق کا ترجمہ "چمٹنے والی چیز" کرتے ہیں اور اس پر مصر ہیں کہ اس لفظ کو اسکے اصل مفہوم کے علاوہ کسی اور انداز میں استعمال نہیں کیا جاسکتا اسکو "وابستگی" کے مفہوم میں استعمال کرنا (جیسے بلاشے صاحب نے کیا ہے) یا اس کا ترجمہ "لختۂ خون" کے طور پر کرنا (جیسا کہ پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے ترجمہ قرآن میں کیا ہے) غلط نظر آتا ہے۔ یہ دونوں ہی مشتق معانی ہیں جو موجودہ متن (سورہ علق) میں بے جوڑ دکھائی دیتے ہیں، لیکن تعجب ہے کہ اپنے ان اقوال کے باوجود انھوں نے آیت ۱۴ سورۂ مومنون کے ترجمہ میں خود بھی عَلَق کا ترجمہ "خون کے لوتھڑے" ہی کیا ہے، پھر سورۂ علق میں کسی مفسرؔ نے علق کا یہی مفہوم اختیار کیا تو اسکے غلط اور بے جوڑ ہونے کا سوال کیوں پیدا ہوا؟ دراصل "خون بستہ" تو علق کی ماہیت یا حقیقت ہے اور "چمٹنے والی" ہونا اسکی صفت ہے جسکے اعتبار سے اسکے معنی "جونک" بھی ہیں۔ بہرحال یہ متفق علیہ حقیقت ہے کہ استقرار حمل کے بعد علق ہی پہلی شکل ہے جو نطفہ رحم میں اختیار کرتا ہے، اور یہیں تو اس کا ترجمہ "خون کے لوتھڑے" یا خون بستہ "سے کیا جانا بھی بہتر معلوم ہوتا ہے، باقی ڈاکٹر صاحب اگر ان تمام معلومات کے باوجود سورۂ علق میں اس کا ترجمہ "چمٹنے والی چیز" سے کرنا ہی پسند فرماتے ہیں تو ہمیں ان سے مناقشہ کی ضرورت نہیں، لیکن انھیں عام مفسرین کے ترجمہ کو بھی غلط نہ کہنا چاہئے۔

(۳۳) صفحہ ۳۴۔ ڈاکٹر صاحب نے سورہ حج کی آیت ۵ میں آئے ہوئے مُخَلَّقَةٍ وَّغَیْرِ مُخَلَّقَةٍ کا ترجمہ "جو تناسب میں ہوتی ہے اور کبھی تناسب سے باہر" قدرے غلط اور بھدا کیا ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے: "کہ (بعضی) پوری ہوتی ہے (یعنی اس میں پورے اعضاء بن جاتے ہیں) اور (بعضی) ادھوری بھی (ہوتی ہے کہ بعض اعضاء ناقص رہ جاتے ہیں)" [بیان القرآن]

(۳۴) صفحہ ۳۸۔ "بائبل کے برعکس قرآن ایک ایسے سیلاب کا ذکر کرتا ہے جو نوح کی امت تک محدود تھا"۔ ایسا نہیں ہے بلکہ بائبل کی طرح قرآن سے بھی ایسا ہی مترشح ہوتا ہے کہ

سیلاب روئے زمین کی پوری انسانی آبادی پر آیا تھا، جس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ حضرت نوحؑ نے ایسی ہی دعا کی تھی :۔ وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ ، جو قبول ہوئی ہو گی پوری کی پوری، ورنہ اللہ تعالیٰ ساتھ ہی حسب عادتِ قرآن، دعا کے غلط جزو پر تنبیہ فرماتے دوسرا ثبوت یہ ہے کہ دنیا کی ہر مہذب قوم کے قدیم لٹریچر میں اس طوفان کا کسی نہ کسی شکل میں ذکر ملتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس زمانہ میں انسانی آبادی ہی بحر روم اور بحیرہ قلزم کے آس پاس کے خطوں میں محدود رہی ہو، اور بائبل کا یہ بیان صحیح نہ ہو کہ یہ سیلاب حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش سے صرف تین سو سال قبل آیا تھا۔ بہر حال طوفان کے عالمگیر ہونے کی حد تک بائبل کا بیان قرآن کے خلاف نہیں، اور ڈاکٹر صاحب کا خیال غلط معلوم ہوتا ہے

(۳۵) صفحہ ۱۴۱ :" بائبل کے متن کی حقیقی تالیف و ترتیب میں انسان نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے، (لیکن) قرآن کی تاریخ بالکل مختلف ہے، قرآن وحی کے نزول کے ساتھ لکھا اور زبانی یاد کیا جاتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مستند ہونے کے متعلق کوئی گمان نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کا معروضی مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ جدید علم سائنس اور قرآنی متن کے درمیان کہیں کوئی اختلاف موجود نہیں، چنانچہ یہ حقیقت اس امکان کو ناقابل یقین بنا دیتی ہے کہ آنحضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دور میں علوم کی جو عام کیفیت تھی، کوئی شخص اس قسم کے قرآنی بیانات کا مصنف بن سکتا یہی وہ حقائق ہیں جو قرآنی وحی کو ایک یکتا مقام عطا کرتے ہیں، اور ایک غیر جانبدار سائنس داں کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ ان قرآنی بیانات کے سلسلہ میں محض مادہ پرستانہ دلائل پر مبنی کسی قسم کی وضاحت پیش نہ کر سکنے کا اعتراف کرے۔ میرے نزدیک یہ حقائق بشری فہم و فراست کیلئے ایک جائز چیلنج ہیں۔" ہمیں انتہائی حیرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب قرآن کو غیر تحریف شدہ، مسلم الثبوت، اور واحد الہامی کتاب مانتے ہوئے اس کے احکام و مطالبات سے اغماض برت رہے ہیں انھیں اپنی اوّلین فرصت میں دل سے کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دینا چاہئے، اگر خدا نخواستہ اب تک دولتِ ایمان سے محروم ہوں۔ دل تو یہی کہتا ہے کہ وہ مسلمان ہیں لیکن کان اس خبر کو سننے کے ابھی منتظر ہیں خدا کرے جلد یہ انتظار ختم ہو جائے۔ آمین ! (بحمد اللہ وہ اب مسلمان ہیں)

کتابچہ "قرآن حکیم اور جدید سائنس" پر تبصرہ تو بحمد اللہ ختم ہو گیا، اب احقر حسب

وعدہ، قرآنی آیتوں کی سائنسی تفاسیر کرنے کے خطرناک نتائج پیش کرتا ہے، امید ہے کہ قارئین کرام ان پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔

آیاتِ قرآنیہ کی تفاسیر کو علوم جدیدہ پر منطبق کرنے کے خطرناک نتائج

قرآنی آیتوں کی سائنسی تفسیریں نہ صرف غیر ضروری اور عوام کیلئے ناقابلِ فہم ہونیکی وجہ سے بیکار محض ہیں بلکہ وہ خطرات ذیل کو بھی متضمن ہیں:-

(۱) **تفسیر بالرائے کا لازم آنا**۔ قرآن کی جو تفسیر کسی مسلّمہ عقیدے کو بدل دے، جو لغت، گرامر اور محاورہ سے پوری مطابقت نہ رکھے، جو قرآن کے مخاطبین اوّلین یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے بھی نہ سمجھی ہو، یا جو قرآن کی دوسری آیتوں کے خلاف پڑتی ہو، تفسیر بالرائے ہے جسکے متعلق احادیث میں وعیدیں آئی ہیں، سائنسی تفاسیر میں یہ سب بدعنوانیاں محتمل ہیں، اسلئے ایسے مفسرین محل وعید ہونگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے میری طرف کوئی غلط بات منسوب کی اسکو اپنا ٹھکانہ دوزخ میں تلاش کرنا چاہئے، پھر غور کرنیکی بات ہیکہ اگر اللہ تعالیٰ کیطرف وہ باتیں منسوب کیجائیں جو انھوں نے نہ فرمائی ہوں تو ان پر اس سے بھی زیادہ سزا کیوں نہ لازم آئیگی؟

(۲) **ضعف ایمان کا خطرہ**۔ دو طرح پر، اوّل تو اس طرح کہ اگر کوئی سائنسی نظریہ مستقبل میں غلط ثابت ہوا، جو کوئی غیر معمولی اور عجیب بات نہیں چنانچہ متعدد نظریات غلط ثابت ہو چکے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر خود ڈاکٹر بکائی صاحب نے اپنی کتاب میں کیا ہے، تو جو تفسیر کسی آیت کی موجودہ نظریہ کے مطابق کی گئی ہے اس میں جدید انکشاف کے مطابق ترمیم کرنی پڑے گی، اور عوام کا اعتماد تفاسیر کی صحت سے اٹھ جائیگا، بعض یہ بھی خیال کرینگے کہ یہ کیسا اللہ کا کلام تھا جو غلط ثابت ہوا؟ ظاہر ہیکہ دونوں ہی صورتیں تضعیف ایمان کا باعث ہیں۔ دوسری طرح سے ضعف ایمان یوں محتمل ہے کہ جب کوئی شخص یہ سوچے گا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ایسی باتیں فرمائیں جو مخاطبین اوّلین کی فہم سے بالاتر تھیں اسکی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں، یا تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ لوگوں کے معیارِ فہم کا اندازہ نہ تھا یا پھر قصداً اس چیز کو نظر انداز کر دیا، چونکہ دونوں ہی صورتیں اللہ تعالیٰ کے بارہ میں محال ہیں پس لامحالہ اسکو یہی ماننا پڑے گا کہ قرآن الہامی کتاب نہیں۔

(۳) **اغیار کی طعنہ زنی**۔ اہل سائنس یہ کہنے میں حق بجانب ہونگے کہ ہمارا احسان مانو کہ ہماری ہی بدولت تم کو بعض قرآنی آیات کا صحیح مطلب معلوم ہوا، ورنہ گذشتہ چودہ سو سال تک تم سب جہالت

ہی میں مبتلا رہے۔ کیا یہ حق بجانب طعنہ زنی مسلمانوں کیلئے انتہائی شرمناک نہ ہوگی؟ اور کیا اس سے حضور، صحابہ کرامؓ اور جملہ مفسرین کی توہین (بواسطہ تجہیل) لازم نہ آئیگی اس سے بھی ضعف ایمان محتمل ہے۔

بعض مسلم سائنسداں اسلام کے نادان دوست ہیں

حضرات بالا کے پیش نظر مسلمانوں کو آیات قرآنی کی سائنسی تفاسیر سے احتراز لازم تھا، مگر افسوس ہے کہ انکے سائنسدانوں میں یہ غلط رجحان پیدا ہو چکا ہے اور ترقی پذیر ہے، تفسیری صلاحیت کے فقدان کی وجہ سے یہ حضرات باوجود اپنی نیک نیتی کے قرآن پر ظلم کرکے اسلام اور مسلمانوں کو ایسا ضرر پہونچا رہے ہیں جو مخالفین بھی نہیں پہونچا سکتے، بلاشبہ انکی حالت،، دوستی بے خرد چوں دشمنی ست،، کے مصداق ہے۔ چنانچہ رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ کے انگریزی ماہنامہ بابت دسمبر سنہ ۱۹۷۶ء میں اسلامی علم کائنات (islamic cosmology) کے زیر عنوان ڈاکٹر منظام اجمیر محمد صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں سورج، چاند، ستاروں، سیاروں اور کہکشانوں کے متعلق جدید ترین سائنسی معلومات دیکر یہ نتیجہ نکالا تھا کہ جو انکشافات سائنسدانوں کو اب ہوئے ہیں، قرآن نے انکو چودہ سو سال پیشتر بتلا دیا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے قرآنی آیات کے مفہوم کو توڑ مروڑ کر سائنسی انکشافات و نظریات کے مطابق بنایا تھا۔ اسی ماہنامہ کے دسمبر سنہ ۱۹۷۷ء کے شمارہ میں دو مسلم سائنسدانوں کے مضامین چھپے تھے، ایک ڈاکٹر ظہیر الدین صدیقی صاحب کا جسکا عنوان تھا۔ قرآن کے الہامی کتاب ہونے پر میرا عقیدہ)" اور دوسرا جناب علوی الحسین صاحب کا بعنوان،، اسلام کا پیغام اور سائنسی شہادت،، دونوں میں بحیثیت مجموعی مندرجہ ذیل سائنسی معلومات کا وجود قرآن میں ثابت کیا گیا تھا۔

(یہاں ہم ان پر اپنا مختصر تبصرہ بھی دیرہے ہیں، کسور کے شمار کنندہ سورہ نمبر اور نسب نما آیت نمبر ظاہر کرتے ہیں)

(۱) پیڑ پودھوں میں جنسیات کا وجود ہے یعنی ان کا توالد و تناسل بھی حیوانات کیطرح عمل تزویج کے ذریعہ ہوتا ہے،، (۱۳/۳، ۳۶/۳۶، ۴۲/۱۵) سائنسی نظریہ اپنی جگہ صحیح ہے، لیکن قرآن کی ان آیتوں یا کسی بھی آیت سے ثابت نہیں،، البتہ قرآن اسکی تردید بھی نہیں کرتا۔

(۲) "چاند خود روشن نہیں ہے بلکہ اسکی روشنی سورج سے مستعار ہے۔" (۷۱/۱۶) یہ نظریہ بھی صحیح ہے مگر ان آیتوں سے ہرگز ثابت نہیں، لیکن قرآن نے چاند کو نورانی اور سورج کو چراغ کہا ہے، اس سے البتہ سائنسی نظریہ کے صحیح ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے،

(۳) سیارات کے مداروں کیلئے قرآن نے بڑا مناسب لفظ، فلک، استعمال کیا ہے کیونکہ جدید سائنسی انکشافات سے بھی ان کا بجائے گول ہونیکے بیضوی ہونا ثابت ہے"۔ (۳۶/۴۰، ۲۱/۳۳) قرآن نے سارے ہی اجرام فلکی کے مداروں کو، فلک، کہا ہے جسکے معنی بیضوی کسی لغت سے ثابت نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ

وہ گول اور بیضوی دونوں کیلئے استعمال کرلیا جائے۔ اور جس جرم فلکی کو سائنسی زبان یا اصطلاح میں "سیارہ" (Planet) کہتے ہیں اس کا تو قرآن میں ذکر ہی نہیں بلکہ قرآن کی زبان میں تو سارے ہی اجرام فلکی سیارے ہیں کیونکہ سب ہی خلا میں گھوم رہے ہیں۔ کُلٌّ فِی فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ۔

(۴) "خلائی سفر ممکن ہے" (۵۵/۳۳) اسکے قرآن سے ثابت نہ ہونے پر گذشتہ صفحات میں کافی بحث آچکی ہے کہ یہ آیت خلائی سفر سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی۔ تبصرہ کا نمبر (۲۵) دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۵) "ابتداء آفرینش میں زمین و آسمان آپس میں جڑے ہوئے تھے، بعد میں الگ الگ کئے گئے" (۲۱/۳۰) آیت کی یہ تفسیر قطعاً غلط ہے، جیساکہ تبصرہ کے نمبر (۱۵) میں بالتفصیل ثابت کیا جاچکا ہے۔ ویسے سائنسی نظریہ اس معنی کر درست ہیکہ ساری کائنات کا مادّہ ایک ہی ہے۔

(۶) تمام جاندار پانی سے پیدا کئے گئے ہیں" (۲۱/۳۰، ۲۴/۴۵) یہ قرآن کا نظریہ ہے جس کا پورا انطباق سائنسی (ملتے جلتے) نظریہ پر [illegible] نہیں ہوتا۔ دیکھئے تبصرہ کا نمبر (۱۰)

(۷) "زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں پر بھی جانداروں کی موجودگی" (۴۲/۲۹) آیت سے زمین و آسمان میں دوآبّ کا پھیلانا ضرور معلوم ہوتا ہے، لیکن آسمانوں کے سیارات ہونے یا سمجھے جانیکی کیا دلیل ہے؟ سائنسدانوں کے نزدیک آسمان سے مراد عالم بالا ہے جو ستاروں سیاروں اور کہکشانوں کے علاوہ کوئی چیز نہیں، آیت کی تفسیر میں علماء محققین نے لکھا ہے کہ "بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ" سے مراد مطلق ذی روح لیا جائے، تو کچھ اشکال نہیں کیونکہ آسمانوں میں ملائکہ موجود ہی ہیں۔ اگر جانور مراد لئے جائیں تو ایک توجیہ تو یہ ہیکہ فیهما کا مطلب فی مجموعهما یعنی زمین و آسمان کے مجموعہ میں "سمجھا جائے، دوسری توجیہ یہ ہیکہ احادیث سے جنت میں پرندوں اور یاقوتی گھوڑوں کا ہونا ثابت ہے، اور جنت فی الحال موجود ہے، لہٰذا کچھ اشکال نہ رہا۔ ظاہر ہیکہ آیت کی تفسیر سائنسی نظریہ پر (جو محض ظنی ہے) اس وقت تک منطبق نہ ہوگی جب تک سارے اجرام فلکی کا آسمان ہونا ثابت نہ ہو جائے نیز یہ ثابت نہ ہو جائیکہ قرآن میں آسمانوں کیلئے سمٰوٰت کا صیغہ محض جمع یا کثرت ظاہر کرنے کیلئے آیا ہے جو ایک دعویٰ بلا دلیل ہے۔ قرآن کی متعدد آیتوں میں آسمانوں کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ ہرگز ستاروں سیاروں وغیرہ پر منطبق نہیں ہوتیں۔

(۸) "تمام اجرام فلکی مع زمین کے غالباً ہائیڈروجن سے بنے ہیں" (۴۱/۱۱) آیت میں آسمانوں کا، نہ کہ ساری کائنات کا، دھوئیں جیسی چیز سے بنائے جانے کا ذکر ضرور ہے، مگر آسمانوں سے مراد زمین کے علاوہ سارے اجرام فلکی (جن کا شمار ممکن نہیں) ہونے اور دھوئیں جیسی چیز کے ہائیڈروجن ہونیکی کوئی دلیل نہیں۔

(۹) "خلا میں آکسیجن یا ہوا نہیں ہے اسلئے وہاں آدمی کا دم گھٹنے لگتا ہے" (۶/۱۲۵) آیت سے محض ایک مضحکہ

خیز استنباط۔

(۱۰) "خلائی سفر میں شہاب کی بارش سے جل جانیکا خطرہ" (۳۵:۵۵) یہ بھی آیت سے ایک مضحکہ خیز استنباط ہے کیونکہ آیت قیامت کے متعلق ہے نہ کہ خلائی سفر کے (جس کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں)۔ اور اس سے زیادہ مضحکہ خیز آیت کا ترجمہ ہے جو صاحب مضمون نے کیا ہے یعنی "اے جنو اور انسانو! تم دونوں کے برخلاف آگ کی تپش اور پیتل کی چمک بھیجی جائیگی اور تم بچ کر نہ جا سکو گے"۔ بھلا کچھ ٹھکانہ ہے اس من مانی کا؟ افسوس ہیکہ یہ حضرات اپنی ہمہ دانی کے زعم میں کسی اچھے عالم یا اچھی تفسیر سے قرآن فہمی کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے

قارئین کرام ذرا غور فرمائیں کہ کس طرح ان دونوں سائنسدانوں نے مندرجہ بالا دس سائنسی انکشافات کو قرآن پر منطبق کرنے میں محولہ چودہ قرآنی آیتوں کی تفسیر میں تحریف کی ہے، اور حق یہ ہیکہ بلا کچھ نہ کچھ تحریف کے یہ کام ہو بھی نہیں سکتا۔ یا تو آیت کی غلط تفسیر کرنی پڑے گی یا صحیح تفسیر کا مفہوم بدلنا ہوگا۔ اول الذکر سائنسداں یعنی ڈاکٹر نظام اجیر محمد صاحب نے بھی اپنے مضمون میں مندرجہ بالا سائنسی دعاوی میں سے بعض کا ذکر کرنے کے علاوہ سائنس سے قیامت کا امکان ثابت کرتے ہوئے بزعم خود اُسے قرآنی بیان کے مطابق ٹھہرایا ہے، فرماتے ہیں:۔

(۱۱) "ہماری گرم اور روشن ستاروں والی کائنات ایک سرد، سکڑے ہوئے اور موت کی آغوش میں لیٹے ہوئے ستاروں والی کائنات میں بدل جائے گی۔ ہمارے سورج کا ریڈیائی ایندھن جسکے برابر جلتے رہنے سے وہ گرم رہتا تھا، ختم ہو جائے گا، اور آخر کار وہ ایک سکڑا ہوا اور انتہائی ثقیل یعنی مردہ ستارہ ہو جائے گا، اسی حالت کا بیان قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے، اور جب سورج تہ کر دیا جائے گا اور ستارے خاکی رنگ کے ہو جائیں گے (سورہ تکویر آیت ۱ و ۲) یہاں یہ امر قابل غور و توجہ ہے کہ قرآن نے یہ بیان چودہ سو سال قبل دیا تھا جبکہ سائنس ہمارے نظام شمسی کے انجام سے محض ناواقف تھا"! آگے فرماتے ہیں، "سورج کے ایک مردہ ستارہ بنجانے پر زمین اس قدر سرد ہو جائے گی کہ اس پر زندگی کا وجود ناممکن ہوگا۔ زمین کا یہ انجام یقینی ہے، اگر اس کے قبل ہی وہ کسی شمسی دھماکے سے برباد نہ ہو چکی ہو، جو سورج کی (طبیعی) موت سے قبل واقع ہو سکتا ہے"۔ ہمیں حیرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب ان سائنسی انکشافات کو جو محض ظن و تخمین پر مبنی ہیں، قرآن کے بیان کے مطابق بتلا رہے ہیں، حالانکہ قرآن کے بیان سے قیامت کے روز بھی زمین کا اسی طرح آباد ہونا ثابت ہے جیسی کہ وہ فی الحال ہے، یعنی نہ وہ سرد ہو چکی ہو گی اور نہ کسی شمسی دھماکے سے برباد و معدوم۔ کم سے کم وہ اتنا تو سوچ لیتے کہ اگر قیامت کا وقوع

مذکورہ سائنسی انکشافات کے مطابق ہو تو صور اسرافیل کی کیا اہمیت اور حقیقت باقی رہ جائے گی؟ ڈاکٹر صاحب نے آیتوں کا ترجمہ بھی صحیح نہیں کیا۔ پہلی آیت کے شروع میں لفظ "اور" زائد ہے نیز انکدرت کا مطلب یہاں خاکی رنگ کا یا مٹیالا ہو جانا نہیں۔ مصدر انکدار جب ستاروں کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی بکھر جانا یا جھڑ پڑنا ہوتے ہیں، مگر یہ مطلب سائنسی معلومات کے مطابق نہ رہتا۔ ڈاکٹر صاحب نے وقوع قیامت کے متعلق دیگر صورتیں بھی سائنسدانوں کے مختلف خیالات کے مطابق بیان فرمائی ہیں اور زبردستی ان کو بعض آیات قرآنیہ کے مطابق بھی بتلایا ہے جبکہ کوئی صورت بھی قرآن سے ثابت نہیں، البتہ یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات خود بھی کسی صورت پر متفق نہیں۔ اور افسوس ہے کہ مختلف قسم کی ان ظنی اور تخمینی باتوں کو جو متفق علیہ بھی نہیں، ڈاکٹر صاحب نے اسلامی علم کائنات (Islamic Cosmology) کا عنوان دیا ہے

شہنشاہ سکندر رومی

سکندر سے کسی نے پوچھا!

آپ نے مشرق و مغرب کو کیسے فتح کیا جبکہ پچھلے سلاطین عاجز رہے حالانکہ ان کے پاس لشکر اور خزانے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ سکندر نے کہا، "میں نے خدائے بزرگ و برتر کی مدد سے فتح پائی اور جس ملک کو میں نے فتح کیا اس کی رعیت کو کبھی نہیں ستایا۔ پچھلے بادشاہوں کی اچھی روایات کو قائم رکھا اور ان کا ذکر ہمیشہ اچھائی سے کیا، یہی ہماری فتوحات کا راز ہے۔

بزرگش نخوانند اھل خرد — کہ نام بزرگاں بزشتی برد

عقلمند کے نزدیک ایسا شخص بزرگ نہیں ہو سکتا جو بزرگوں کا نام برائی سے لیتا ہے، لہٰذا اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اسے عزت و بڑائی سے یاد کیا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ بزرگوں کی عزت اور ان کا احترام کرے

(از)
مولانا
جمیل الرحمن
پرتاپ گڈھی

تفہیم القرآن
ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

تمام انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد مودودی مکتب فکر میں!!

مولانا مودودی صاحب کے نزدیک تمام انبیاء کرام کی بعثت کے دو مقصد ہیں (۱) فوق الفطری معنی ہیں مخلوق کی پرورش، خبرگیری، حاجت روائی اور نگہبانی دیں جن قوموں نے دوسروں (فرشتوں، دیوتاؤں، بتوں) کو اپنا معبود بنالیا تھا ان سے باز رکھنا اور یہ بتانا تھا کہ اس معنی میں اگر کوئی معبود بننے کے لائق ہے تو وہ صرف اللہ ہے (۲) اور سیاسی و تمدنی معنی ہیں۔ اقتدار اعلیٰ کا مالک، رہنمائی کا منبع، قانون کا ماخذ، مملکت کا رئیس اور اجتماع کا مرکز وہی اللہ ہے جس طرح وہی اکیلا خدا تمہارا فوق الفطری رب ہے اسی طرح اخلاقی، تمدنی، اور سیاسی رب بھی وہی ہے۔ موصوف کے نزدیک یہی اصل گمراہی تھی جسکی اصلاح کیلئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا، مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

قوم نوح! سب سے پہلی قوم جس کا ذکر قرآن کرتا ہے، حضرت نوحؑ کی قوم ہے۔ قرآن کے بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص۳۲"

"پھر ان کو اس بات سے بھی انکار نہ تھا کہ اللہ ان کا الٰہ ہے، اسی لئے تو حضرت نوحؑ نے ان کے سامنے اپنی دعوت ان الفاظ میں پیش کی مالکم من الٰہ غیرہ، (اس کے سوا تمہارے لئے کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے) ورنہ وہ اگر اللہ کے الٰہ ہونے سے منکر ہوتے تو دعوت کے یہ الفاظ

ہوتے اتخذ واﷲ الٰھا (اللہ کو اپنا الٰہ بنالو) اب سوال یہ ہے کہ ان کے اور حضرت نوحؑ کے درمیان نزاع کس بات پر تھی، آیات قرآنی کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ بنائے نزاع دو باتیں تھیں :۔

ایک یہ کہ حضرت نوحؑ کی تعلیم یہ تھی کہ جو رب العٰلمین ہے جسے تم بھی مانتے ہو کہ تمہیں اور تمام کائنات کو اسی نے وجود بخشا ہے اور وہی تمہاری ضروریات کا کفیل ہے، دراصل وہی تمہارا الٰہ ہے اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ کوئی اور ہستی نہیں ہے جو تمہاری حاجتیں پوری کرنے والی، مشکلیں آسان کرنے والی، دعائیں سننے اور مدد کو پہنچنے والی ہو، لہٰذا تم اسی کے آگے سرِ نیاز جھکاؤ ص۳۸ ص۳۹ کتاب مذکور۔

دوسرے یہ کہ وہ صرف اسی معنی میں اللہ کو رب مانتے تھے کہ وہ ان کا خالق زمین و آسمان کا مالک اور کائنات کا مدبر اعلیٰ ہے، لیکن اس بات کے قائل نہ تھے کہ اخلاق معاشرت تمدن سیاست اور تمام معاملاتِ زندگی میں مالکیت و اقتدار اعلیٰ اسی کا حق ہے وہی رہنما وہی قانون ساز وہی صاحبِ امر ونہی بھی ہے اور اسی کی اطاعت ہونی چاہئے ان سب معاملات میں انھوں نے اپنے سرداروں اور مذہبی پیشواؤں کو رب بنا رکھا تھا۔ برعکس اس کے حضرت نوحؑ کا مطالبہ یہ تھا کہ ربوبیت کے ٹکڑے نہ کرو اسے تمام مفہومات کے اعتبار سے صرف اللہ ہی کو رب تسلیم کرو اور اسی کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے جو قوانین اور جو احکام میں تمھیں پہنچاتا ہوں ان کی پیروی کرو، ص۳۹-۴۰

قوم عاد !۔ قوم نوح کے بعد قرآن عاد کا ذکر کرتا ہے۔ یہ قوم بھی اللہ کی ہستی سے منکر نہ تھی۔ اس کے الٰہ ہونے سے بھی اسکو انکار نہ تھا۔ اور جس معنی میں حضرت نوحؑ کی قوم اللہ کو رب تسلیم کرتی تھی اس معنی میں یہ بھی اللہ کو رب مان رہی تھی۔ البتہ بنائے نزاع وہی دو امور تھے جو اوپر قوم نوح کے سلسلے میں بیان ہو چکے ہیں، ص۴۱

قوم ثمود ! اب ثمود کو لیجئے جو عاد کے بعد سب سے بڑی سرکش قوم تھی اصولاً اسکی گمراہی بھی اسی قسم کی تھی جو قوم نوح و قوم عاد کی بیان ہوئی ہے ان لوگوں کو اللہ کے وجود اور اس کے الٰہ اور رب ہونے سے انکار نہ تھا اور اس کی عبادت سے بھی انکار نہ تھا۔

بلکہ انکار اس بات سے تھا کہ اللہ ہی الٰہ واحد ہے صرف وہی عبادت کا مستحق ہے۔

اور ربوبیت اپنے تمام معنی کے ساتھ اکیلے اللہ ہی کے لئے خاص ہے۔ وہ اللہ کے سوا دوسروں کو بھی فریاد رس، مشکل کشا اور حاجت روا ماننے پر اصرار کرتے تھے اور اپنی اخلاقی و تمدنی زندگی میں اللہ کے بجائے اپنے سرداروں اور پیشواؤں کی اطاعت کرنے اور ان سے اپنی زندگی کا قانون لینے پر مصر تھے یہی چیز بالآخر ان کے ایک فسادی قوم بن جانے اور مبتلائے عذاب ہونے کی موجب ہوئی ۔، صلا۴

قومِ ابراہیم اور نمرود!

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی قوم کا نمبر آتا ہے، اس قوم کا معاملہ خاص طور پر اس لئے اہم ہے کہ اسکے بادشاہ نمرود کے متعلق عام غلط فہمی ہے کہ وہ اللہ کا منکر اور خود خدا ہونے کا مدعی تھا، حالانکہ وہ اللہ کی ہستی کا قائل تھا، اس کے خالق و مدبر کائنات ہونے کا معتقد تھا، اور تیسرے، چوتھے اور پانچویں معنی کے اعتبار سے اپنی ربوبیت کا دعویٰ کرتا تھا، نیز یہ بھی عام غلط فہمی ہے کہ یہ قوم اللہ سے بالکل ناواقف تھی اور اس کے الٰہ اور رب ہونے کی سرے سے قائل ہی نہ تھی، حالانکہ فی الواقع اس قوم کا معاملہ قوم نوحؑ اور عاد اور ثمود سے قطعًا کچھ مختلف نہ تھا وہ اللہ کے وجود کو بھی مانتی تھی اس کا رب ہونا اور خالق ارض و سماں اور مدبر کائنات ہونا بھی اسے معلوم تھا۔ اس کی عبادت سے بھی وہ منکر نہ تھی، البتہ اسکی گمراہی یہ تھی کہ وہ ربوبیت بمعنی اول دوم میں اجرام فلکی کو حصہ دار سمجھتی تھی اور اس بنا پر اللہ کے ساتھ ان کو بھی معبود قرار دیتی تھی، اور ربوبیت بمعنی سوم و چہارم و پنجم کے اعتبار سے اس نے اپنے بادشاہوں کو رب بنا رکھا تھا۔ قرآن کی تصریحات اس بارے میں اتنی واضح ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح لوگ اصل معاملہ کو سمجھنے سے قاصر رہ گئے ،، صلا۴۳

"اب نمرود کے معاملہ کو لیجئے اس سے حضرت ابراہیمؑ کی جو گفتگو ہوئی اسے قرآن اس طرح نقل کرتا ہے،

علہ مولانا مودودی صاحب نے اپنی اسی کتاب میں لفظ رب کے پانچ معنی بیان فرمائے ہیں۔ (۱) پرورش کرنیوالا ضروریات بہم پہنچانیوالا، تربیت اور نشوونما دینے والا۔ (۲) کفیل، خبرگیراں، دیکھ بھال اور اصلاح حال کا ذمہ دار، (۳) وہ جو مرکزی حیثیت رکھتا ہو جس پر متفرق اشخاص مجتمع ہوتے ہوں، (۴) سید مطاع، سردار، ذی اقتدار، جس کا حکم چلے جسکی فوقیت و بالادستی تسلیم کیجائے، جسکو تصرف کے اختیارات ہوں۔ (۵) مالک، آقا، انھیں پانچوں معنوں کی طرف مولانا کا اشارہ ہوتا ہے،

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرَاھِیْمَ فِیْ رَبِّہٖ اَنْ اٰتَاہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ اِذْ قَالَ اِبْرَاھِیْمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیِیْ وَاُمِیْتُ قَالَ اِبْرَاھِیْمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ، (بقرہ - ۲۵)

تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں بحث کی اس بنا پر کہ اللہ نے اسے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے تو اس نے کہا زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے، ابراہیم نے کہا اچھا تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال یہ سنکر وہ کافر مبہوت رہ گیا۔"

اس گفتگو سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ جھگڑا اللہ کے ہونے یا نہ ہونے پر نہ تھا اس بات پر تھا کہ ابراہیم رب کو تسلیم کرتے ہیں، نمرود اول تو اس قوم سے تعلق رکھتا تھا جو اللہ کی ہستی کو مانتی تھی، دوسرے جب تک وہ بالکل ہی پاگل نہ ہو جاتا وہ ایسی صریح احمقانہ بات کبھی نہ کہہ سکتا تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور سورج و چاند کو گردش دینے والا وہ خود ہے، بس دراصل اس کا دعویٰ یہ نہ تھا کہ میں اللہ ہوں یا ربّ السموات والارض ہوں بلکہ اس کا دعویٰ صرف یہ تھا کہ میں اس مملکت کا رب ہوں جس کی رعیت کا ایک فرد ابراہیم ہے اور یہ رب ہونے کا دعویٰ بھی اسے ربوبیت کے پہلے اور دوسرے مفہوم کے اعتبار سے نہ تھا۔ کیونکہ اس اعتبار سے تو وہ خود چاند اور سورج اور ستاروں کی ربوبیت کا قائل تھا۔ البتہ وہ تیسرے، چوتھے اور پانچویں مفہوم کے اعتبار سے اپنی مملکت کا رب بنتا تھا۔ یعنی اس کا دعویٰ یہ تھا کہ میں اس ملک کا مالک ہوں۔ اس کے سارے باشندے میرے بندے ہیں میرا مرکزی اقتدار ان کے اجتماع کی بنیاد ہے، اور میرا فرمان ان کے لئے قانون ہے، (ان آتٰہ اللّٰہ الملک) کے الفاظ صریحاً اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس کے دعویٰ ربوبیت کی بنیاد بادشاہی کے زعم پر تھی جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی رعیت میں سے ابراہیم نامی ایک شخص اٹھا ہے جو نہ چاند اور سورج اور ستاروں کی فوق الفطری ربوبیت کا قائل ہے اور نہ بادشاہِ وقت کی سیاسی و تمدنی ربوبیت تسلیم کرتا ہے تو اسکو تعجب ہوا اور حضرت ابراہیم کو بلا کر اس نے دریافت کیا کہ آخر تم کسے رب مانتے ہو؟ حضرت ابراہیم نے پہلے فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زندگی اور موت کے اختیارات ہیں، مگر اس جواب سے وہ بات کی تہہ کو نہ پہنچ سکا۔ اور یہ کہکر اس نے اپنی ربوبیت ثابت کرنی چاہی کہ زندگی اور موت کے اختیارات تو مجھے حاصل ہیں

جسے چاہوں قتل کرادوں اور جسکی چاہوں جان بخشی کردوں۔ تب ابراہیمؑ نے اسے بتایا کہ میں صرف اللہ کو رب مانتا ہوں۔ ربوبیت کے جملہ مفہومات کے اعتبار سے میرے نزدیک تنہا اللہ ہی رب ہے، اس نظام کائنات میں کسی دوسرے کی ربوبیت کیلئے گنجائش ہی کہاں ہوسکتی ہے، جب کہ سورج کے طلوع و غروب پر وہ ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ نمرود آدمی ذی ہوش تھا۔ اس دلیل کو سنکر اس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ فی الواقع اللہ کی اس سلطنت میں اس کا دعویٰ ربوبیت بجز ایک زعم باطل کے اور کچھ نہیں ہے، اس لئے وہ دم بخود ہو کر رہ گیا، مگر نفس پرستی اور شخصی و خاندانی اغراض کی بندگی ایسی دامن گیر ہوئی کہ حق کے ظہور کے باوجود مختارانہ حکمرانی کے منصب سے اتر کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر آمادہ نہ ہوا، یہی وجہ ہے کہ اس گفتگو کو نقل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے واللہ لایھدی القوم الظالمین،، (مگر اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا) یعنی اس ظہور حق کے بعد جو رویہ اسے اختیار کرنا چاہئے تھا۔ اسے اختیار کرنے کے لئے جب وہ تیار نہ ہوا اور اس نے غاصبانہ فرمانروائی کرکے دنیا پر اور خود اپنے نفس پر ظلم کرنا ہی پسند کیا، تو اللہ نے بھی اسے ہدایت کی روشنی عطا نہ کی، کیونکہ اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جو خود ہدایت کا طالب نہ ہو اس پر زبردستی اپنی ہدایت مسلط کردے،، ص ۴۷-۴۸۔

لطیفہ

کسی نے نوشیرواں کو یہ خوشخبری سنائی کہ خدا نے آپ کے دشمن کو اٹھا لیا، نوشیرواں نے کہا، کیا تو نے یہ بھی سنا کہ خدا نے مجھے ہمیشہ کیلیے آزاد کردیا؟

اگر بمرد عدو جائے شادمانی نیست　　　کہ زندگانیِ ما نیز جاودانی نیست

اگر دشمن مرگیا تو یہ کوئی خوشی کی بات نہیں ہے، کیونکہ ہماری زندگی بھی چندروزہ ہے، خوشی تو اس وقت زیب دیتی جب دشمن کو موت آتی اور ہماری زندگی کو دوام ملتا۔

تقلید اور اسکی ضرورت

جناب مولوی محمد سلیم ساگری متعلم دار الافتاء، دار العلوم دیوبند

تقلید کی تعریف اور اس کی حقیقت

یہ روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب آدمی کسی کام کو کرنا چاہتا ہے اور وہ اسکی اہلیت اور صلاحیت نہیں رکھتا تو اس سلسلہ میں وہ ان لوگوں سے رجوع کرتا ہے جو اس کام کے ماہر اور پختہ کار ہوتے ہیں، اور وہ اس پوچھنے میں کوئی عار بھی محسوس نہیں کرتا، اور پھر اسکی ہدایت پر عمل پیرا ہونے میں یہ بھی نہیں سمجھتا کہ ہم اس کام میں کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو گئے ہیں. یا ہم نے کوئی بہت بڑا جرم کر ڈالا ہے جس کے تدارک کی کوئی سبیل نہیں. بلکہ اسکے برخلاف کچھ دنوں کے بعد جب اس کام میں فائدہ سامنے آنے لگتا ہے، تو وہ اسکو اپنا محسن اور راہ نما سمجھنے لگتا ہے اور یہی طریقہ اور اصول بھی ہے پھر اس کام کے کرنے کا جسکو آدمی نہ جانتا ہو اور وہ اسمیں سوجھ بوجھ بھی نہ رکھتا ہو جب ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کے واقف کار سے رجوع کرتا ہے۔

"تقلید" کی بھی بس یہی حقیقت ہے کہ جو شخص قرآن اور سنت سے براہ راست احکام مستنبط کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ کسی ماہر قرآن وسنت کے علم و فہم و بصیرت اور تفقہ پر اعتماد کر کے دلیل معلوم کئے بغیر اسکے قول اور فتوے پر عمل کرنے لگے۔

تقلید کی ضرورت کن مواقع پر پڑتی ہے؟

قرآن اور سنت میں احکام تین طرح کے ہیں، بعض احکام تو وہ ہیں جن میں کسی طرح کا کوئی اجمال و ابہام یا تعارض نہیں، جو شخص بھی انھیں پڑھے گا اُسے اس کا مطلب سمجھنے میں کوئی الجھن پیش نہیں آئیگی اور بعض احکام وہ ہیں جن میں کوئی ابہام یا اجمال ہے، اور کچھ احکام ایسے بھی ہیں جو قرآن کی کسی دوسری آیت یا کسی دوسری حدیث سے متعارض ہیں، ایسے

مواقع پر ہر آدمی براہ راست قرآن وسنت سے احکام مستنبط نہیں کر سکتا ایسے مواقع پر اپنے سے زیادہ صاحب علم وفہم کی جانب رجوع کی ضرورت پیش آتی اور تقلید کی ضرورت پڑتی ہے،

توضیح کیلئے اجمال وابہام اور تعارض میں سے ہر ایک کی ایک مثال پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ (۱) اجمال کی مثال یہ ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے، والمطلقٰتُ یتربصن بانفسهن ثلٰثة قروء ؛ ترجمہ: اور جن عورتوں کو طلاق دیدی گئی وہ تین قروء گزرنے تک انتظار کریں۔

اس آیت میں مطلقہ عورت کی عدت بیان کی گئی ہے اور اس کے لئے تین قروء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، قروء کا لفظ عربی زبان میں حیض کیلئے بھی آتا ہے اور طہر کیلئے بھی۔ اگر پہلے معنی مراد لئے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مطلقہ کی عدت تین حیض ہے۔ اگر دوسرے معنی مراد لئے جائیں تو تین طہر عدت قرار پائے گی، اس موقع پر ہمارے لئے یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ ہم ان دونوں معنوں میں سے کس پر عمل کریں؟

(۲) ابہام کی مثال ملاحظہ ہو۔

حدیث شریف میں ہے۔ من لم یترك المخابرة فلیؤذن بحرب من الله ورسوله (ابو داؤد شریف)

ترجمہ: جو شخص بٹائی کا کاروبار نہ چھوڑے وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لے۔

اس حدیث شریف میں بٹائی کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن بٹائی کی بہت سی صورتیں ہیں، اور حدیث شریف اس بارے میں خاموش ہے کہ یہاں بٹائی کی کونسی صورت مراد ہے؟ کیا بٹائی کی ہر صورت ناجائز ہوگی؟ یا بعض صورتیں جائز اور بعض ناجائز؟ حدیث میں یہ تفصیل مبہم چھوڑ دی گئی ہے جس کی وجہ سے ہمارے لئے یہ دشواری پیدا ہوگئی کہ بٹائی کو علی الاطلاق ناجائز کہدیں یا اسمیں کوئی تقسیم ہے

(۳) تعارض کی مثال یہ ہے

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من کان له امام فقراءة الامام له قراءة (ابن ماجہ)

ترجمہ: جس کا کوئی امام ہو تو امام کی قراۃ اسکے لئے بھی قرأت بن جائیگی

اس سے معلوم ہو گیا کہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے، اور دوسری طرف آپ ہی کا

ارشاد ہے، لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب۔

ترجمہ: جس شخص نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اسکی نماز نہیں ہوئی، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کیلئے سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے، ان دونوں حدیثوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ آیا اس سے پہلے حدیث کو اصل قرار دے کر یوں کہا جائے کہ دوسری حدیث میں صرف امام اور منفرد کو خطاب کیا گیا ہے اور مقتدی اس سے مستثنیٰ ہیں، یا دوسری حدیث کو اصل قرار دے کر یوں کہا جائے کہ پہلی حدیث میں قرأت سے مراد سورۂ فاتحہ کے سوا کوئی دوسری سورۃ ہے، سورۃ فاتحہ اس سے مستثنیٰ ہے،

اب آپ غور فرمائیں کہ کیا ایسے موقع پر ہر شخص قرآن وسنت سے براہ راست مسئلہ کی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے، یا ایسے موقع پر اپنے سے زیادہ جاننے والے سے پوچھ کر احکام خداوندی پر عمل کرنا پڑے گا؟ ظاہر ہے کہ صحیح راستہ یہی ہے کہ ایسے مواقع پر کسی ماہر فن کی طرف رجوع کیا جائے، اور اسی کا نام تقلید ہے،

قرآن وحدیث سے تقلید کا ثبوت ووجوب

(۱) فاسئلوا اهل الذکر۔

ترجمہ:۔ اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلیا کرو،

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے اسی اصولی مسئلہ کی تعلیم دی ہے کہ جو لوگ خود قرآن کریم کے غوامض کو نہیں سمجھ سکتے وہ اہل علم سے احکام الٰہیہ دریافت کریں اور انکی تقلید کریں۔

(۲) یایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔

ترجمہ: اے ایمان والو اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اولی الامر کی تفسیر حضرت جابر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عطاء و مجاہد و ضحاک اور ابوالعالیہ اور حسن بصری وغیرہم صحابہ وتابعین وتبع تابعین نے علماء اور فقہاء اور علماء سے کی ہے، اور خود مولانا صدیق حسن خاں مرحوم اس معنیٰ کو اپنی تفسیر میں قبول کرتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے۔ انما شفاء العی فی السوال۔

ترجمہ: نہ جاننے والے کی شفاء اس میں ہے کہ جاننے والوں سے دریافت کرے۔

تقلید کا خلاصہ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن وحدیث سے یہ بات بالکل صاف معلوم ہوتی ہے کہ جو مسئلہ معلوم نہ ہو اسمیں علماء و فقہاء کی

تقلید کرنی چاہیئے، اور یہ تقلید درحقیقت ان علماء فقہاء کی نہیں ہے کیونکہ اصل حکم تو تمام امور میں حق تعالیٰ ہی کا چلتا ہے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ، بلکہ انبیاء و رسل کی اطاعت بھی صرف اسلئے ہیکہ وہ حق تعالیٰ کے احکام کے مبلغ اور خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ ہیں تو جس طرح انبیاء علیہم السلام کی اطاعت عین حق تعالیٰ کی اطاعت ہے اسی طرح ائمہ دین کی اطاعت بھی بلاشبہ اللہ اور رسول کی اطاعت ہے اور اسی اطاعت کا نام اصطلاحِ فقہ میں تقلید ہے،

ایک امام معین کی تقلید کیوں ضروری ہے؟

چونکہ مطلق تقلید کے ثبوت و وجوب کے قائل اہل حدیث حضرات بھی ہیں، اس لئے اس جزیر زیادہ دلائل و شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہیں، چونکہ اختلاف اور بحث امام معیّن کے بارے میں ہے جسکو تقلید شخصی سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اور بحث کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ ایک ہی امام کی تقلید کیوں ضروری ہے ؟ اور نیز ایک امام کی تقلید کرتے ہوئے دوسرے ائمہ کے اقوال پر عمل کیوں نہیں کرسکتے ؟ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں بھی تقلید شخصی رائج تھی یا نہیں ؟ اس بات کے سمجھنے کیلئے ایک ہی امام کی تقلید کیوں ضروری ہے ؟ آپ اصولی طور پر ایک بات ذہن نشین کرلیں تو آپکو تقلید شخصی کے ضروری سمجھنے میں کوئی دقت اور الجھن نہیں محسوس ہوگی ۔

واقعہ یہ ہے کہ اتباعِ ہوا اور خواہش کی پیروی وہ زبردست گمراہی ہے جو بسا اوقات انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم قدم قدم پر ہوشیار کرتا ہے کہ کہیں یہ روگ تم میں نہ پیدا ہو جائے،

آیات و احادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے جو خواہش کی اتباع کو ممنوع قرار دیتا ہے اور اس سے دامن بچانے کی جگہ جگہ تلقین کرتا ہے، پھر خواہش پرستی بھی ایک تو یہ ہے کہ انسان بُرے کام کو بُرا اور گناہ کو گناہ سمجھتا ہے، مگر اپنے نفس کی خواہشات کے آگے مجبور ہو کر اسمیں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ صورت ایک بہت بڑا جرم ہونیکے باوجود اتنی سنگین نہیں ہے کہ یہ صورت جس قدر سنگین ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا ہوا اس حد تک پہنچ جائے کہ حلال کو حرام، اور حرام کو حلال کر ڈالے اور دین و شریعت کو ایک کھلونا بنا دے، ظاہر ہے کہ خواہش پرستی کی یہ دوسری صورت پہلی سے بہت زیادہ سنگین، خطرناک اور تباہ کن ہے، انسانوں کا ہجوم بھی انھیں خواہش پرستی کی راہ میں ڈال سکتا ہو اس سے بچنا ضروری ہے، یہی وہ حقیقت ہے جسکو ہمارے فقہاء اور مجتہدین نے جو اپنے اپنے وقت میں مسلّم امت تھے اور دوررس فہم کے مالک تھے انھوں نے اپنی خداداد بصیرت سے تاڑلیا

کہ اس بیماری سے آگے چل کر کوئی بچ نہ سکے گا، انھوں نے بطور حفظ ماتقدم کے عافیت اور دین کی سلامتی اسی میں دیکھی کہ امام واحد کی اتباع تمام مسائل میں لازم قرار دیدی جائے۔

اور قرآن وحدیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اتباع ہوا (خواہش پرستی) کی حرمت وممانعت کیلئے موجود ہے اور اسی لئے ائمہ اربعہ اور تمام امت کا اس پر اتفاق ہیکہ اتباع ہوا (خواہش پرستی) احکام دینیہ میں قطعاً حرام ہے

حافظ ابن تیمیہؒ کے فتویٰ میں اس موضوع پر ایک مبسوط مقالہ ہے جس میں تمام امت کا اتفاق نقل کرتے ہوئے لکھا ہیکہ جو شخص اپنی خواہشات کی پیروی کرنے کیلئے ائمہ مجتہدین کے مذاہب ڈھونڈتا ہے اور اپنے ہوا پر عمل کرکے اسکو کسی امام کی طرف منسوب کردیتا ہے، وہ خدا تعالیٰ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع نہیں۔ بلکہ متبع ہوا ہے اور ایسا کرنا دین کو ایک کھلونا بنانا ہے۔ ابن تیمیہ کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ — یہ لوگ ایک وقت میں اس امام کی تقلید کرتے ہیں جو نکاح کو فاسد قرار دیتا ہے، اور دوسرے وقت میں اس امام کی جو اسکو صحیح قرار دیتا ہے اور یہ محض اپنی غرض وہوا کی وجہ سے ہے اور ایسا کرنا باتفاق امت ناجائز ہے (پھر اسکی تین سطروں کے بعد لکھا ہے) اور اسکی نظیر یہ ہے کہ کوئی آدمی جس وقت حق شفعہ کا خود طالب ہو تو مذہب امام ابو حنیفہ کے موافق شفعہ جوار کے ثبوت کا اعتقاد ظاہر کرے اور اگر مشتری ہو اور دوسرا شخص طالب شفعہ ہو تو مذہب امام شافعیؒ کے مطابق اس کے عدم ثبوت کا معتقد بنجائے، ایسے ہی وہ شخص جو بحالت قیام نکاح ولایت فاسق کی صحت کا قائل، اور اسکی بناء پر منافع نکاح کا طالب ہے۔ مگر جب طلاق ثلاثہ دیدے تو حرمت مغلظہ سے بچنے کیلئے ولایت فاسق کو کالعدم اور اس کے ماتحت منعقد شدہ نکاح کو فاسد قرار دیدے۔ تو یہ باجماع مسلمین جائز نہیں۔

اور اگر کوئی مستفتی یہ کہے کہ پہلے مجھے اس مذہب کی خبر نہ تھی اور اب میں اس کا معتقد اور پابند ہوں تب بھی اس کا قول قابل تسلیم نہیں، کیونکہ یہ دین کو ایک کھلونا بنانیکا دروازہ کھولنا ہے اور اسی کا ذریعہ پیدا کرنا ہیکہ حرام وحلال کا مدار محض اہوا و خواہشات پر ہوجائے (حوالہ فتویٰ ابن تیمیہ صفحہ ۲۲۰و۲۲۱ ج دوم)

بہر حال اتباع ہوا باجماع امت حرام ہے اور ادھر یہ بات تجربہ سے محسوس ومشاہد ہے کہ اگر عوام کو آزاد چھوڑ دیا جاوے کہ جس مسئلہ میں چاہیں ابو حنیفہؒ کے مسئلہ پر عمل کریں اور جس میں چاہیں شافعیؒ کے مذہب پر اور پھر جب چاہیں مالکیہ کا قول لے لیں اور جب چاہیں حنابلہ کا یا دوسرے ائمہ مجتہدین کا تو اس کا انجام لازمی طور پر وہی ہوگا جسکو حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے باجماع مسلمین حرام اور

ناجائز قرار دیا ہے۔

امام معین کی تقلید کا خلاصہ

خلاصۂ کلام یہ کہ اصل مقصود اتباع ہوا سے بچنا ہے اور چونکہ اسکی تدبیر اس ہوا پرستی کے زمانہ میں اسکے سوا کچھ نہیں کہ عمل کرنیوالوں کو آزاد نہ چھوڑا جاوے، اسی حقیقت اور مصلحت کے پیش نظر ایک ہی امام کی تقلید کو واجب اور ضروری قرار دیا گیا ہے، اور اس کے خلاف کرنیوالے کو چاہے وہ عمل بالحدیث کا خوبصورت زرق و برق لبادہ پہن کر اور اپنے آپ کو اہلِ حدیث کہکر ہی کوئی عمل کرے، غیر مقلد کہیں گے جس کا مطلب ہے متبع ہوا۔

اور اس حقیقت سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جو اپنے آپ کو متبع حدیث کہتے ہیں۔ وہ حقیقت میں متبع حدیث نہیں ہیں، بلکہ متبع ہوا ہیں، کیونکہ بغیر امام معین کی تقلید کے عمل بالحدیث متعذر و دشوار ہے،

تقلید کا رواج عہد صحابہؓ اور عہد تابعین میں

تقلید شخصی کوئی نئی نرالی بات نہیں ہے جیسا کہ لوگ محض اپنی ہٹ دھرمی اور بقائے تحزب کیلئے اخبار و رسائل کے ذریعہ پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں کہ یہ سلف صالحین اور ائمۂ عظام کے طریقہ کے خلاف ہے، بلکہ اس قسم کا پروپیگنڈہ کرنا اپنی تاریخی جہالت کا ثبوت پیش کرنا اور اپنے جہل کا ڈھنڈورا پیٹنا ہے، (عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں عبداللہ ابن عباسؓ مکہ میں اور زید بن ثابتؓ مدینہ میں اور عبداللہ بن مسعود کوفہ میں فتویٰ دیتے تھے، اور مختلف فیہ مسائل میں اہلِ مکہ عبداللہ بن عباسؓ کے قول اور اہلِ مدینہ زید بن ثابتؓ کے قول کو ترجیح دیتے تھے اور انھیں کے فتوے پر عمل کرتے تھے اور محل خلاف میں ایک کو اعلم و افضل سمجھ کر اسی کے قول کو اختیار کرتے تھے، اور اسی کا نام تقلید شخصی ہے،

بخاری، ترمذی، ابوداؤد شریف میں ہے کہ ابوموسیٰ اشعریؓ سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا پھر وہی مسئلہ عبداللہ بن مسعودؓ سے دریافت کیا گیا، پھر عبداللہ ابن مسعودؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ کے خلاف فتویٰ دیا، جب ابوموسیٰ اشعریؓ کو اس کا علم ہوا تو سمجھ گئے کہ صحیح فتویٰ عبداللہ ابن مسعودؓ کا ہے، تو یہ فرمایا لا تسئلوانی مادام ھذا الحبر فیکم۔ ترجمہ: جب تک یہ متبحر عالم یعنی عبداللہ ابن مسعودؓ تم میں موجود ہیں مجھ سے مت دریافت کرو یعنی ہر مسئلہ انھیں سے دریافت کرو، اور جو فتویٰ دیں اسی پر عمل کرو اسی کا نام تقلید شخصی ہے،

محدث الہند حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں وکان ابراہیم واصحابہ یرون ابن مسعود و اصحابہ اثبت الناس فی الفقہ۔

ترجمہ:۔ یعنی حضرت ابراہیم نخعی اور ان کے تلامذہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور انکے تلامذہ کو فقہ میں اثبت الناس سمجھتے تھے اور محل خلاف میں انہیں کے قول کو ترجیح دیتے تھے، اور تقلید شخصی کا مفہوم اور حقیقت بھی یہی ہے۔

جامع ترمذی اور سنن ابو داؤد شریف میں حضرت معاذ ابن جبلؓ سے ایک روایت نقل ہے،

عن معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما بعثہ الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لک قضاء۔ قال اقضی بکتاب اللہ۔ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ۔ قال بسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ قال اجتہد برأئی ولا الو قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی صدرہ وقال الحمد للہ وفق رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما یرضی بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ترجمہ:۔ معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ رضؓ کو یمن کیجانب بھیجا تو فرمایا کس طرح فیصلہ کروگے جب تمہارے پاس کوئی معاملہ آئیگا؟ تو آپ نے فرمایا، میں اللہ کی کتاب کے ذریعہ فیصلہ کروں گا، آپؐ نے فرمایا اگر نہ پاؤ تم اس حکم کو کتاب اللہ میں، تو آپ نے کہا سنت کے ذریعہ فیصلہ کروں گا۔ آپؐ نے فرمایا اگر نہ پاؤ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں؟ تو آپ نے کہا اسوقت اجتہاد و استنباط کروں گا، اور تلاش میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گا۔ معاذ رضؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے اسپر فرط مسرت سے اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی کہ جس پر اللہ کا رسول راضی ہے،

یہاں ہمیں اس واقعہ کے صرف ایک پہلو پر توجہ دلانا مقصود ہے اور وہ یہ کہ آپؐ نے اہل یمن کیلئے اپنے فقہاء و صحابہ کرامؓ میں صرف ایک جلیل القدر صحابی کو بھیجا اور انھیں حاکم و قاضی معلم و مجتہد بنا کر اہل یمن پر لازم کردیا کہ وہ انکی اتباع کریں۔ اور انھیں صرف قرآن و سنت ہی نہیں بلکہ قیاس و اجتہاد کے مطابق فتویٰ صادر کرنیکی اجازت عطا فرمائی اس کا مطلب اسکے سوا اور کیا ہے؟ کہ آپ نے اہل یمن کو انکی تقلید شخصی کی اجازت دی بلکہ اسکو انکے لئے لازم فرمادیا، الحاصل!

تقلید شخصی عہد صحابہ کرام وتابعین کے زمانہ میں رائج تھی اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے حکم سے ہوئی، جیسا کہ ابھی اوپر معاذ ابن جبل رضہ کے واقعہ سے معلوم ہوا۔

فقہاء، صوفیا، علماء تقلید کے آئینہ میں !

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے دو جانشین، حضرت امام محمدؒ، اور حضرت امام ابویوسفؒ

یہ دونوں حضرات بڑے پائے کے بزرگ تھے اور دونوں حضرات امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتے تھے، اگر تقلید غلط ہوتی تو یہ حضرات تقلید کو کیوں قبول کرتے؟ ان بزرگوں کی لکھی ہوئی کتابیں (۱) جامع صغیر (۲) جامع کبیر (۳) سیر صغیر (۴) سیر کبیر (۵) زیادات (۶) مبسوط (۷) محیط۔ آج بھی موجود ہیں۔

مشہور صاحب سلسلہ بزرگ فضیل بن عیاضؒ متوفی ۱۸۷ھ جو فقہ اور حدیث میں امام اعظمؒ کے شاگرد تھے انکی عظمت کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ انکے شاگرد تھے، شیخ ابراہیم ادہم بلخیؒ متوفی ۱۶۱ھ مشہور ترین بزرگ ہیں یہ امام اعظمؒ کے بلا واسطہ فقہ میں شاگرد ہیں، بادشاہی چھوڑ کر درویشی اختیار فرمائی تھی، اور حضرت فضیل بن عیاضؒ سے خلافت پائی تھی، حضرت خواجہ محمد عبدالباقی نقشبندیؒ بھی حنفی تھے، حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ، اور نہ معلوم کتنے اولیاء اللہ حنفی گزرے ہیں، اگر تقلید کوئی مذموم یا گناہ یا شرک فی النبوۃ جیسی کوئی چیز ہوتی تو آپ خود بتلائیں کیا یہ حضرات تقلید کو گوارہ کرتے؟ اگر اس بات کو کہدیا جائے تو کوئی غلط نہ ہوگی کہ یہ تو شرک جیسی قبیح اور مذموم چیز کو ختم کرنے ہی کیلئے پیدا کئے گئے تھے، چہ جائیکہ شرک۔ یا شرک جیسی مذموم چیز کو اپنانے۔

حضرت امام غزالیؒ جو بڑے پائے کے عالم تھے اور ان کے زمانہ میں کوئی انکا ہم پلہ بھی نہ تھا جنکی کتاب احیاء العلوم۔ اردو ترجمہ۔ مذاق العارفین جو چار جلدوں میں چھپا ہے وہ خود شافعی المسلک تھے حضرت امام ابن کثیر حنؒ کی کتاب "تفسیر ابن کثیر" ساری دنیا میں مشہور ومعروف ہے شافعی المسلک تھے،

ان شواہد سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر تقلید شخصی کے بغیر کوئی چارہ ہوتا یا تقلید ائمہ کرام یا اسلاف کے خلاف ہوتی تو یہ حضرات تقلید کیوں اختیار کرتے؟

وما علینا الا البلاغ

سلیم جاوید ساگری
متعلم دار الافتاء دار العلوم
دیوبند

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نور اللہ مرقدہٗ

اور ان کے ایک شاگرد رشید　قسط (۴)

از:۔ مولانا عبدالمجید خطیب ویلوری استاذ باقیات صالحات

مدرسے کی خوبصورت عمارت ۱۳۰۴ھ ہجری میں مکمل ہوئی، عمارت کی تکمیل سے پہلے مولانا نے شمالی ہند کا سفر کیا دہلی، لکھنؤ اور علی گڑھ وغیرہ پہنچے، لکھنؤ میں ایک جوان سال نامور عالم دین، متعدد فقہی رسائل وکتب کے مؤلف مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے تفصیلی ملاقات کی، علی گڈھ میں، ،سرسید احمد خان،، سے ملکر تبادلۂ خیال کیا، اور گنج مراد آباد میں اویس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن کی بارگاہ میں حاضر ہو کر بقول مولانا سفیر بلنچوری　ط

پائے ہیں فیض ان سے بھی جا کر وہاں بمولانا سالکِ طریق ہی نہیں، مرشد سلوک بھی تھے؛ عارف باللہ شیخ کامل، قطبِ زمانہ محی الدین عبداللطیف قادری کے تربیت یافتہ ممتاز خلیفہ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے فیضِ صحبت سے بہرہ ور۔ بلکہ۔ حضرت شاکر کی صراحت کے مطابق ان سے رشتۂ بیعت میں منسلک:

آپ کے جملہ مشائخ سے حاجی امداد اللہ ایک حضرت تھے،

اس اعزاز وسرفرازی کے باوجود مولانا تصوف وسلوک کے اس بنیادی تقاضے سے بے خبر نہیں تھے کہ:

اندریں رہ تا دمِ واپسیں　　　ی خراش و می خراش و می خراش

شاید تراش وخراش کے نئے ناولوں کی طلب وتلاش آپ کو ایک نئے آستانے کی طرف لے گئی ہو۔ یہاں حضرت مولانا شاکر کی صراحت کے مطابق۔

مدتوں رہ کے ان کی خدمت میں　　ولیِ کامل ہوئے طریقت میں

حضرت مولانا کی خدمت میں کافی وقت گذار کر رخصت ہوتے ہوئے

وقت وداع آپ نے کی عرض مرشد کی — پھر میرے مدرسہ کو دیجئے دعا ولی
تب کی دعا ولی نے کہ یا قادر غنی — وہ مدرسہ ہو اوجِ ترقی پہ ہر گھڑی

چنانچہ — جیسی دعا وہ مانگے بدرگاہِ ذوالجلال ویسا ہی مدرسہ کو ملا درجۂ کمال
۱۲۴۳ھ میں مدرسہ کی اولین عمارت مکمل ہونے پر اس نوتاسیس ادارے کا نام "الباقیات الصالحات" رکھا گیا، اگرچہ مولانا کی خدمتِ تدریس برسوں سے جاری تھی، لیکن نظامِ تدریس یعنی خانگی درسگاہ کا کوئی نام نہیں تھا، لیکن تاسیس مدرسہ سے پہلے درس وتدریس اور تعلیم وتربیت کی جو پرخلوص اور بے لوث خدمت مولانا نے انجام دی ہے وہ یقیناً ان کے باقیات صالحات میں شمار کی جائے گی۔

اس نو ایجاد ادارے کی پہلی دہائی جو چودہویں صدی ہجری کی بھی پہلی دہائی ہے، بانی کے حق میں تجربہ آموز بھی تھی، اور صبر آزما بھی، کیونکہ جامعاتی طرز کا یہ ملی ادارہ جنوب بعید کے علاقے کیلئے بالکل ایک نیا تجربہ تھا، اس لئے تجربے کی غیر معمولی کامیابی پر بعض اپنے اور بہت سے برائے رشک ورقابت، حسد وعناد، اور تعصب واختلاف کا شکار ہو گئے، مولانا شاکر کہتے ہیں۔

مدرسہ کے قیام پر کیا کیا — فتنے حساد نے کئے برپا
ابشرُ اللہ کیا تحمل تھا — متزلزل ہوا قدم نہ ذرا
نہ جگہ سے ہلا وہ کوہِ امثال — مرحلے طے کئے باستقلال

شاید دین وملت کے مخلص خدمت گاروں کیلئے اس قسم کی آزمائش ایک تکوینی سنت ہے، استاد محترم مولانا رحمۃ اللہ کو بھی تاسیس مدرسہ کے ابتدائی دور میں حالات کے نشیب وفراز سے گذرنا پڑا، مدرسہ صولتیہ کے استحکام وفروغ کیلئے قائم کردہ مجلسِ شوریٰ کیطرف سے سردمہری کا برتاؤ اور باضابطہ کنارہ کشی، بعض مفسدین کی فتنہ انگیزی اور حجاز کے گورنر "عثمان نوری پاشاہ" کی ناراضی اور برگشتگی انھیں نامساعد حالات کی چند مثالیں ہیں۔ مولانا عبدالوہاب کا مولانا رحمۃ اللہ سے جو خصوصی ربط وتعلق تھا اس کا یہی مقتضیٰ تھا کہ مولانا مشکل وقتوں میں ان سے رجوع کرتے ذاتی عظمت کے علاوہ وہ جوارِ حرم میں فروکش ہونے کے ناطے ان سے دعا کراتے، چنانچہ ایک بار تامل ترجمہ قرآن کے مصنف "مولانا عبدالحمید باقوی" کے والد محترم کے ذریعے جب کہ وہ سفرِ حج کیلئے مکہ مکرمہ تشریف لے جارہے تھے، مولانا نے ان سے موثر حال

کی تفصیلات لکھوا کر دعا کی درخواست کی ہے، دوبارہ ایک ایسے ہی موقع پر پی گنڈہ کے حاجی متولی ابراہیم صاحب مرحوم کے تایا کے ذریعہ دعائے خیر کے ملتجی ہوئے ہیں، کہا جاتا ہے کہ دونوں ہی بار مولانا نے اپنے عزیز شاگرد اور اس کے قائم کردہ ادارے کیلئے خانہ کعبہ کے پاس پہنچ کر الحاح وزاری کے ساتھ دعا کی، مولانا محمد سلیم قدس سرہ کی روایت ہے کہ ایک بار جنوب کا کوئی حاجی مولانا کی طرف سے بعض غیر معمولی حالات کی خبر لایا اور دعا کی درخواست پیش کی، اس وقت مولانا حلقۂ درس میں تشریف فرما تھے، لیکن شاگرد عزیز کے حالات معلوم کرکے بے چین ہوگئے، درس کو موقوف کیا اور خانہ کعبہ کے پاس پہنچ کر پہلے طواف کیا پھر نفل سے فارغ ہوکر غلافِ کعبہ کو تھام رو رو کر دیر تک دعائیں کرتے رہے، حج کے موسم میں قاصدوں کے ذریعہ نامہ وپیام کے علاوہ دونوں کے درمیان مراسلت کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے، غرض استاد محترم کی دعائے مستجاب، وقت کے اکابر رجال کی توجہ وعنایت، رفقائے کار کی مساعدت اور خود مولانا کی سرگرم کوششوں کے نتیجے میں مدرسہ باقیات صالحات، بہت جلد آزمائش وابتلاء کے بھنور سے نکل کر ترقی و استحکام کی سمت چل پڑا۔

مدرسے کے اولیں مدرسین حسب ذیل تھے مولانا غلام محی الدین، مولانا عبدالقادر بادشاہ، مولانا کمال الدین اور مولانا عبدالجبار، بعد میں مولانا رحمت اللہ کے تعاون سے مولانا نور محمد پنجابی جو مدرسہ صولتیہ میں خدمتِ تدریس انجام دیرہے تھے مدرسہ باقیات آگئے وہاں انھوں نے تقریبا تین سال تک تعلیم وتدریس کا کام انجام دیا ہے، مولانا نور محمد کے علاوہ شمالی ہند سے مولانا شاہ زمان دیوبندی اور مولانا عبدالرحمن پنجابی بھی باقیات مدعو کئے گئے، شمالی ہند کے اساتذہ نے علوم عقلیہ کی تعلیم کی طرح ڈالی اور اپنے کمالِ ہنر کے ذریعہ مدرسے کے تعلیمی معیار کو بام عروج تک پہنچا دیا۔

اگرچہ شمال کے یہ باکمال اساتذہ اپنی بہاریں دکھا کر بہت جلد رخصت ہوگئے، لیکن مدرسے کے بعض اساتذہ پران کا فیضان بڑے گہرے اور دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا، مولانا عبدالجبار معقولات میں مولانا نور محمد پنجابی کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور مولانا شیخ آدم کمال علمی میں اپنے استاد مولانا شاہ زمان دیوبندی کے بیحد ممنون تھے،

مدرسہ باقیات صالحات کی تاسیس کو ابھی صرف آٹھ سال کا عرصہ ہورہا تھا کہ مولانا رحمت اللہ جن کا وجود باسعادت مولانا عبدالوہاب کیلئے بعد مکانی کے باوجود روشنی کا ایک

مینار تھا، جن سے مولانا کو حوصلہ ملا، عزم وہمت میں استواری اور بلندی حاصل ہوئی، اور جن سے دور رہتے ہوئے بھی ذہنی اور فکری قربتیں قریب سے قریب تر ہونے کا تاثر دیتی تھیں وہ ۲۲ر رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ ہجری کو اپنے مولا سے جا ملے،

مرشد ویلور سے محرومی کے بعد مولانا کی زندگی میں یہ ایک دوسرا بڑا المناک سانحہ تھا، گرچہ مولانا نے متعدد شیوخ واساتذہ سے استفادہ کیا ہے، بقول مولانا شاکر۔

عزم تحصیل علم تھا جو صمیم ہر چمن میں پھرے برنگ نسیم
راستہ شوقِ دل نے دکھلایا فیض ہر اہلِ فیض سے پایا

مولانا نے جن اہلِ فیض سے فیض پایا وہ سب کی سب بڑی مبارک ومسعود ہستیاں تھیں، خود مولانا فرمایا کرتے تھے "میری یہ خوش بختی ہے کہ میں نے ایسے اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا جو بلاشبہ اولیائے وقت تھے۔ لیکن۔ والہانہ تعلق اور فکری ہم آہنگی صرف دو برگزیدہ نفوس سے تھی، ایک حضرت مولانا سید شاہ عبداللطیف نقوی قادری معروف بہ "قطب ویلور، اور دوسرے مولانا رحمت اللہ کیرانوی ملقب بہ "پایۂ حرمین"۔

مولانا رحمت اللہ کی رحلت کے بعد مولانا عبدالوہاب اس دارالعلوم میں تقریباً انتیس[۲۹] سال رہے، حیات مستعار کا یہ طویل وقفہ مسلسل حرکت وعمل میں گذرا ہے۔ بلکہ مولانا عبدالصمد علیمی کی شہادت ہے "مولانا قدس سرہٗ کی عمر شریف میں بعد بلوغ کے دو منٹ کوئی ایسے نہیں دکھا سکتے جس میں مولانا قدس سرہ اپنے کام کیلئے جسمیں کوئی دینی فائدہ نہ ہو مشغول ہوئے (ہوں)"، یعنی اپنی پوری زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے نصب العین کیلئے وقف رکھا، جس کا فیصلہ انھوں نے آغازِ عمل کے موقع پر کیا تھا اپنے آپ کو، ملی خدمات کیلئے وقف رکھنے کے باوجود کبھی ارباب ملت سے اجر وصلے کے خواہاں نہ ہوئے حتیٰ کہ جس ادارے کو اپنی انتھک کوششوں سے قائم کرکے اسکو بام عروج تک پہنچایا اور جس پر انھیں پورا اختیار اور مکمل اقتدار حاصل تھا کبھی اس سے تنخواہ یا اور کسی عنوان سے، کچھ نہ لیا۔ مولانا شاکر کہتے ہیں۔

مدرسہ مدتوں سے ہے چلتا جمع سرمایہ بھی ہمیشہ رہا
آپ نے کچھ مگر کبھی نہ لیا انتہا ہے کہ پانی تک نہ پیا

مولانا نمک آمیز چائے کے عادی تھے، ایک بار مدرسہ میں انھوں نے اپنی مخصوص چائے پیتے ہوئے چائے کو بے نمک محسوس کیا۔ تو کسی طالب علم سے کہا:

لاؤ مطبخ سے نے کے نام اپنا۔

عرض کی اس نے حضرت ایسا کیوں ۔ آپ کے نام سے نہ کیوں لاؤ سے
بولے میرا ہے عہد دل سے یہ ۔ مدرسہ کی کوئی بھی چیز نہ لو سے

مولانا نے اپنی انتھک کوششوں سے مدرسہ کی عظیم الشان عمارت بنوائی۔ لیکن اپنا قیام تا اپنے مکان کے اسی حصے میں بدستور جاری رکھا جہاں سے آپ نے تعلیمی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ احتیاط کا یہ اہتمام مولانا کے زہد و اتقاء اور اخلاص و للہیت پر دلالت کرتا ہے ۔

مولانا نے اپنے استادِ عالی قدر مولانا رحمت اللہ سے مناظرے کے جو اصول و قواعد سیکھے تھے اور اس ضمن میں ردِّ عیسائیت کا جو ہنر حاصل کیا تھا اسکو اپنے لائق و فائق تلامذہ کے توسط سے اسطرح استعمال کیا کہ بڑی حد تک دیلور اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں فتنۂ عیسائیت کا سدِّباب ہو گیا ورنہ صورتِ حال یہ تھی کہ ۔

ان علاقوں میں دشمنِ اسلام ۔ کہتے پھرتے تھے وعظ و پند و کلام
ان کی باتوں سے سادہ لوح عوام ۔ دم میں ہو جاتے تھے اسیرِ دام
بحث کرنا نہ جانتے تھے لوگ ۔ جو وہ کہتے تھے مانتے تھے لوگ

اور مولانا کے تلامذہ ....

بحث کرنے کو جب بڑھے آگے ۔ مشنری ملک چھوڑ کر بھاگے
یا وہ ایام تھے کہ عیسائی ۔ کرتے پھرتے تھے بادپیمائی
یا یہ حالت خدا نے دکھلائی ۔ چھوڑ بیٹھے دروغ آرائی

مولانا نے جو تعلیمی اور اصلاحی تحریک اٹھائی اسکی غیر معمولی کامیابی اور وسیع پیمانے پر مثبت ٹھوس نتائج کے ظہور کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو شخصیت سازی پر لگایا اور اپنی عمر کا نصف حصہ یعنی پورے پینتالیس ۴۵ سال پوری یکسوئی کے ساتھ درس و تدریس اور ارشاد و تربیت میں صرف کئے، باصلاحیت، نیک نہاد نفوس پر ایک برگزیدہ شخصیت کی سعی و کاوش سے رجالِ کار کی ایک ایسی جماعت وجود میں آئی جو بلا شبہ "خیر امت" کا مصداق تھی جسکے ظہور و اثرات سے جنوب بعید بلکہ مشرقِ بعید کے متعدد جزائر و ممالک کے مسلمانوں کی ملی حالت رو بہ اصلاح ہے ۔ مولانا عبدالعزیز ملی لکھتے ہیں ۔

بر آمد از و طبقہا بر زمیں ۔ ز اصحاب علم و ز ارباب دیں

۱۳۴۷ ہجری میں منعقد ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا ابوالفضل ضیاء الدین محمد نے کہا ہے۔

اکثر مدارس عربیہ میں ایسے مدرس مامور ہیں بلا واسطہ۔ بالواسطہ مدرسہ ہذا کے تعلیم یافتہ ہونے کا شرف رکھتے ہیں علاوہ ازیں عموماً کوئی شہر و قصبہ تلنگانہ میں ایسا نہ ملے گا جہاں ہمارے مدرسہ کا تعلیم یافتہ موجود نہ ہو۔ (اقتباس خطبہ صدارت)

مدرسہ باقیات کے توسط سے حضرت مولانا عبدالوہاب کا یہ عمومی فیضان پورے تسلسل کے ساتھ اب تک جاری ہے علاوہ ازیں مولانا کی تعلیمی تحریک اور مدرسہ باقیات کی تاسیس کے نتیجے میں جنوبی ہند کے مختلف مقامات پر متعدد دینی مدارس وجود میں آئے، چنانچہ سب سے پہلے خود ویلور میں۔ دارالعلوم لطیفیہ مولانا کی تعلیمی تحریک کا مظہر جمیل یا ایک خوشگوار ردّ عمل کی صورت میں ظاہر ہوا، اور تعلیم و تربیت کا ایک محدود خانگی نظام حضرت مولانا شاہ رکن الدین نادری علیہ الرحمہ کی دوراندیشی اور بالغ نظری سے ۱۳۱۸ھ میں دارالعلوم کی شکل اختیار کرگیا۔ ویلور میں دارالعلوم لطیفیہ کے علاوہ نیڈور میں "مدرسہ مصباح الهدیٰ"۔ پدوکڈی میں "مدرسۃ النور المحمدی"، پیٹائی میں "ریاض الجنان فی علوم الادیان"، ترچناپلی میں "مدرسۃ الصراط المستقیم"، کوتانلور میں "مدرسۂ منبع العلیٰ" اور مدرسۂ فیض الباقیات "، راجگری میں "مدرسہ قاسمیہ" بانی باقیات کی تعلیمی تحریک کا ٹھوس نتیجہ ہیں، مذکورہ مدارس کے علاوہ بعض دیگر مدرسے جیسے شہر مدراس میں "مدرسہ محمدی" اور مدرسہ جمالیہ" وانباڑی میں "معدن العلوم" عمرآباد میں "جامعہ دارالعلوم" اور بنگلور میں مدرسہ قوۃ الاسلام، اگرچہ مولانا عبدالوہاب علیہ الرحمہ کی تعلیمی تحریک کا براہ راست نتیجہ نہیں ہیں لیکن مولانا نے جو تعلیمی انقلاب برپا کیا یہ مدارس اسکی بازگشت کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔

مولانا کے بلند اقبال صاحبزادے حضرت مولانا ضیاء الدین محمد نے اپنے ایک مطبوعہ خطبۂ صدارت میں تحریر فرمایا ہے، حضرات! اس پچاس سال کی مدت میں جو کچھ مقصود بانیان مدرسہ کا تھا اس میں بہت کچھ کامیابی ہوئی، ہزارہا طلبہ مدرسہ سے فیضیاب ہوئے، علاوہ بریں تعلیم عربی کا شوق مسلمانوں میں بڑھ گیا، اہل ثروت بھی اسکی تائید کی طرف متوجہ ہونے لگے جس کا نتیجہ یہ کہ آج کل ہمارے قلمرو میں تقریباً پچاس علوم عربی کے مدارس موجود ہیں"

اس کے بعد مولانا نے بطور مثال ان چند مدارس کے نام لئے ہیں جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔

حضرت مولانا عبدالوہاب علیہ الرحمہ کے ایک شاگرد رشید مولانا محمد اعظم سفیر بلیچپوری مولانا کی چالیس سالہ تعلیمی خدمات اور اس سے حاصل شدہ نتائج کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ڈھائی سو سے زائد فارغ التحصیل جید علما ایسے ہیں جن کی مساعی جمیلہ سے ممالک جنوبی ہند زائر لنکا، مالا بار، سنگاپور، اور ملایا میں دو سو مدارس عربیہ تقریباً قائم ہو چکے ہیں جو لاکھوں کے سرمایہ سے چل رہے ہیں اور ان میں سو سو دو دو سو طالب علموں کی تعلیم و تدریس، اکل و شرب و اقامت اعلیٰ پیمانہ پر انتظام کیا گیا ہے"

جامعاتی طرز کی اقامت درسگاہوں کے علاوہ جو چھوٹے چھوٹے دینی مکاتب جا بجا شہروں قصبوں اور دیہاتوں میں قائم کئے گئے ان کا حساب و شمار دشوار ہے۔ ایک مولانا محمد کلبوی (لنکا) جو مولانا عبدالوہاب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، مولانا محمد اعظم کی صراحت کے مطابق، انھوں نے جنوبی ہندوستان میں تقریباً تین سو اسلامی مکاتب جاری کئے جن میں مسلمان بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم ہوتی ہے"

تامل ناڈ میں "مجلس العلماء" کی تنظیم مولانا کے ساختہ پرداختہ تلامذہ کی طرف سے قائم کردہ ایک مفید اور کارگزار جمعیت رہی ہے ۱۹۱۸ء میں بمقام ترچنا پلی منعقدہ اشاعت اسلام اور احیاء علوم عربیہ کانفرنس جس میں دس ہزار سے زیادہ علماء، طلبہ، ملت اسلامیہ کے سرکردہ عمائدین اور عام مسلمانوں نے شرکت کی بالواسطہ مولانا کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کا ایک آخری شاندار مظہر تھا،

مولانا کے ایک شاگرد رشید مولانا احمد سعید اور ان کے رفقاء کی کوششوں سے قائم شدہ "انجمن حفاظت الاسلام" اور "انجمن اصلاح العقائد" بے دینی، اسلام دشمن تحریکات شدھی سنگھٹن اور فتنۂ قادیانیت کے قلع قمع کرنے میں اور مسلمانوں کے درمیان عقائد و افکار کی تطہیر و اصلاح کے سلسلے میں تاریخ ساز خدمات رکھتی ہیں۔

مولانا رحمت اللہ صاحب اپنے طویل تجربات اور امت مسلمہ کی عام نفسیات سے کامل آگہی کی بنا پر اور غیروں کی اسلام دشمن تحریکوں اور انگریزوں کی طرف علماء کی توجہ منعطف رکھنے اور دین کی حفاظت و صیانت کے معاملے کی اولین اہمیت کے پیش نظر روز اول ہی مدرسہ صولتیہ کا مسلک متعین فرما دیا تھا آپ کا متعین کردہ مسلک درج ذیل تین اہم دفعات پر مشتمل تھا:-

(۱) قطعی طور پر سیاسیات اور سیاسی دلچسپیوں سے ہر کارکن و مدرس اور طالب علم کو بے تعلق رہنا ضروری ہے

(۲) اختلافی امور اور مختلف فیہ مسائل سے کلی طور پر احتراز کیا جائے۔
(۳) تفریق اور گروہ بندی سے ہر طرح بچنا چاہئے۔

اگرچہ مولانا عبدالوہاب علیہ الرحمہ نے دستاویزی حیثیت سے ایسا کوئی مسلک، اپنے قائم کردہ ادارے کیلئے متعین نہیں فرمایا، لیکن عملاً مولانا اسی مسلک پر کاربند تھے، مولانا محمد اعظم سفیر جو حضرت والا کے فیض یافتہ ہیں، مولانا کے اس طرز عمل کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

خدماتِ دینِ حق میں ہی کی وقف زندگی
بحث و فساد فتنوں سے نفرت سدا رہی

حضرت مولانا کا یہ طرز عمل بعینہٖ مسلکِ باقیات بھی ہے، یہی مسلک اہل جنوب کے مزاج اور افتادِ طبع سے ہم آہنگ ہے، اور اہل حق نے بھی اسی مسلکِ اعتدال کو اپنا شعار قرار دیا ہے۔

بانی دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بھی اپنی تمام تر توجہ وقت کے اہم مسائل دینی تعلیم و تربیت کا انتظام و انصرام، ردّ عیسائیت اور فتنۂ آریہ سماج کی سرکوبی پر منعطف رکھی تھی

بانی ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری بھی اتحادِ ملت کے حامی اور باہمی رواداری کے علمبردار تھے، چنانچہ مولانا نے مدرسہ صولتیہ کے مسلک وروش پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا

اس کے تمام مدرسین اور طلبہ اس وقت کی آفتوں سے علیحدہ ہیں ان کے خیالات میں نہ افراط و تفریط ہے اور نہ جدال و نزاع کا انھیں شوق ہے اور نہ کسی مسلمان کی تکفیر و تفسیق کا انھیں خیال ہے، الحمدللہ اس نازک اور پر فتنہ وقت میں اس بلا سے بچنا ہی خدا کا بڑا فضل ہے،

الحمدللہ مدرسہ صولتیہ کا ہمرنگ و ہم مسلک مدرسہ باقیات بھی ہر قسم کی آفتوں سے محفوظ رہ کر الٰہی کا پرتو بنا رہا ہے، نہ اس نے سیاسی تحریکوں میں حصہ لیا اور نہ فروعی مسائل میں اپنے آپکو الجھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ فروعی مسائل کے تعلق سے اہل زیغ و ضلال کا ہمنوا ہے، وہ اس قسم کے مسائل میں قطعاً علمائے حق کا ہم مسلک ہے مگر اس مسلک کا اس طرح اظہار کرے جس سے دین کے ارکان و اصول کی اہمیت گھٹ جائے دین و ملت کے نازک تقاضوں سے توجہ ہٹ جائے اور کسی شخص کا معیار بس چند مختلف فیہ فروعات ہو جو ان فروع و زوائد سے عاری ہو اسکو ملت سے خارج سمجھا جائے نہ تو اہل حق کا شیوہ رہا ہے اور نہ مولانا عبدالوہاب کبھی اس طرز عمل کے قائل رہے ہیں۔

مولانا کے مرشد و مربی حضرت مولانا شاہ عبد اللطیف قادری بھی مختلف فیہ مسائل کے بارے میں بڑے محتاط اور اعتدال و توازن کے علمبردار رہے ہیں، مولانا محمد علی رامپوری کے بارے میں بعض انتہا پسند علماء نے مدارس میں جو سورش برپا کی تھی حضرت والا نے اپنی ایک تصنیف کے ذریعہ اس کا تدارک کیا ہے، مولانا سید عبد الحی لکھنوی لکھتے ہیں۔

وكان رحمه الله ادرك السيد محمد على الحسينى الرامبورى وحرر (القول الفصل فى المسائل المتنازعة فيما بينه وبين علماء مدارس. - (نزهة الخواطر ج ۷. ص ۳۰۲)

دراصل مسلم معاشرے میں جو زوائد و رسوم و بدعات و خرافات کسی نہ کسی جہت سے در انداز ہو گئے ہیں ان کے تعلق سے انتہا پسندی اور جارحانہ روش خود ان امور کے طرفداروں کا طرۂ امتیاز رہا ہے ورنہ علمائے حق اور حضرات مجددین نے ہمیشہ ان امور زائدہ کے بارے میں مثبت رویہ اختیار کیا ہے، اور ان کی واقعی حیثیت کو امت کے سامنے آشکار کرکے وہ ایک اہم شرعی فریضے سے عہدہ برآ ہوئے ہیں، احیائے سنت، تجدید دین اور دین کے رخ زیبا سے زوائد کی آلودگی کو دور کرنے کیلئے یہ اقدام ضروری ہے، اسکے بجائے امور مختلفہ کو لیکر امت میں تفرقہ پیدا کرنا، تکفیر و تفسیق کا محاذ کھولنا دراصل جہالت کا راستہ اپنانا ہے۔

حضرت مولانا عبد الوہاب سے متعدد ایسے رواجی امور کے بارے میں سوال کیا گیا جن کیلئے مسلم معاشرے میں تقدس کا درجہ حاصل ہے اور جن کو اظہار تدین کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، لیکن حضرت مولانا نے اس قسم کے مسائل کا جو جواب دیا ہے، وہ ان کی اصابت فکر اور فراست ایمانی کا مظہر ہے اور اس باب میں مولانا اکابر علمائے ہند کے ساتھ ہیں۔

چونکہ مولانا ایک بالغ نظر مفتی بھی تھے اس جہت سے متعدد سوالات بدعات و خرافات کے بارے میں بھی کئے گئے، مولانا نے ہمیشہ اس قسم کے سوالوں کا متوازن جواب دیا ہے اور بدعات و رسوم کی واقعی حیثیت کو اجاگر کرکے سائل کی توجہ ایمان و یقین اور احیاء سنت کرنے کی پرخلوص کوشش کی ہے چنانچہ کسی سائل نے ماحول میں عام طور پر مروج چند موٹے موٹے بدعات جن کی تعداد بیس ہے کے بارے میں سوال کیا تو مولانا نے جواب کے آغاز میں تحریر فرمایا۔

جاننے کہ ہم اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے کلمۂ شہادت کا اقرار کئے ہیں اس سے مستحق عبادت کا اللہ تعالی کے سوائے اور کوئی نہیں ہے لیکے ثابت ہوا عبادت کے معنی۔ امر و نہی پر حق تعالی کے چلنا ہے، امر و نہی قرآن و حدیث

سے ظاہر ہوئے ہیں، پس ہم حق تعالیٰ کے امر و نہی اور اتباع سنت کے خلاف کرنا مذکورہ تصدیق و اقرار کے مخالف ہے اور یہ مؤمن کے لائق نہیں ہے ،،

اس تمہید کے بین السطور صاحب تحریک کی جو اصابت فکر جھلک رہی ہے وہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مولانا موصوف نے دین کے چشمۂ صافی کو پاک صاف رکھنے کے معاملے میں کس قدر حساس تھے بعض بدعتوں کی تردید میں مولانا کا ایک اہم فتوی ،، فتویٰ رنگون ،، مولانا کے مذاق و مشرب کا ایک واضح ترجمان ہے یہی وجہ ہے کہ مفتی کفایت اللہ نے اپنی مرتب کردہ ایک کتاب ،، میں مذکورہ فتویٰ کو نمایاں جگہ دی ہے ،

مولانا کے مرشد و مربی حضرت مولانا عبداللطیف قادری نقوی نے اپنے ایک مسترشد ،، محمد علاء الدین عکری ،، کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے ۔

رسم و عادت کی بنیاد پر کوئی کام نہ کریں اور دنیا والوں کے پاس و لحاظ اور کسی ملامت گر کی ملامت کو نظر انداز کر دیں، کیونکہ یہ چیز موت کے بعد مفید اور کارآمد نہیں ہے ، وہاں تو صرف خالق کے ساتھ معاملہ ہے ، ،،

ایک دوسرے مکتوب میں جو بنام مولانا حسن شریف منگلوری ہے فرماتے ہیں ۔

اس دو رغربت و اجنبیت میں سعادت مند شخص وہی ہے جو پھیلی ہوئی بدعتوں میں کسی ایک بدعت کو مٹائے اور متروکہ سنتوں میں سے کسی ایک سنت ہی کو بھی زندہ کر دے (خلاصۂ مکتوب فارسی)

مرشد عالی مقام کے اس فکر و روش کے پس منظر میں مولانا کے مسلک و مشرب کا تعین قطعاً مبہم نہیں رہ سکتا ۔ مولانا نے احیاء سنت اور رد بدعت کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں افسوس کہ انکی تفصیلات تاریخ کے اوراق میں ثبت نہ ہو سکیں ، البتہ اس سلسلے میں بعض فتاویٰ دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان فتاوی کو اساس قرار دیکر باقیات صالحات کے مسلک کو اجاگر کیا جائے ،

مولانا نے مکہ مکرمہ سے وطن مراجعت کے بعد اپنے بارے میں جو کچھ طے کیا اور جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا تھا کہ ،، میرا خیال ہوا بلکہ دل میں ٹھان لیا کہ خلق کی خدمت تا دم موت کروں گا ، سو انھوں نے اس عزم و اظہار پر پوری استقامت کے ساتھ عمل کر کے دکھا دیا، بڑھاپے کی حد کو پہنچنے کے باوجود ذاتی وظائف اور ملی خدمات کے باب میں کوئی کمی آنے نہ دی، بلکہ پوری مستعدی اور کمال اخلاص کے ساتھ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو خدمت خلق کی نذر کیا ۔

⁂　⁂　⁂　⁂　⁂　⁂

قسط ۱

اسلامی اخلاق

مولوی سعید الرحمٰن شمس. مدیر ماہنامہ نصرۃ الاسلام کشمیر

لوگوں کے دل و جان میں محبت و صفائی پیدا کرنیکی خاطر اسلام مسلمانوں کو کچھ انفرادی و اجتماعی آداب سکھاتا اور تلقین کرتا ہے، تاکہ وہ اس مقصد میں مدد و معاون بن سکیں وہ اس بات سے پوری شدت کیساتھ منع کرتا ہے، کہ نفوس انسانی میں بغض و کینے کے شعلے بھڑکیں، قلوب پر نفرت و عداوت کا قبضہ ہو جائے، وہ قوانین و ضوابط کی مدد لینے سے پہلے ان عظیم آداب شفقت سے فائدہ اٹھاتا ہے، اگو ضرورت کے وقت وہ قانون و تعزیر پر بھی عمل کرتا ہے،

غرض اسلام کا اصل زور اخلاق و آداب پر ہے، کیونکہ مہذب رویہ، خوبصورت آداب اور بہتر معاملہ سب ایسی چیزیں ہیں جو انفرادی و اجتماعی زندگی میں خوش دلی، تلطف، باہمی رضا، اور سکون و اطمینان پھیلا کر انسانی معاشرہ کو جنت بدا مال بنا دیتی ہیں، اور ضابطہ و قانون کی ضرورت بہت ہی کم پیش آتی ہے، اسلام چونکہ دین فطرت ہے۔ لہذا قدرتی طور پر نفس انسانی کے باریک ترین احساسات کا بھی لحاظ رکھتا ہے، حتیٰ کہ وہ اس بات سے روکتا ہے کہ تیسرے شخص کی موجودگی میں دو آدمی آپس میں ایسی کوئی خفیہ بات نہ کریں۔ جس میں وہ شامل نہ ہو،

"اذا کان ثلثۃ فلا یتناجیٰ اثنان دون الثالث فان ذلک یوذیہ (بخاری، مسلم، ترمذی، وابوداؤد)

جب کسی جگہ تین آدمی اکٹھے ہوں تو دو آدمی تیسرے کو چھوڑ کر کوئی سرگوشی نہ کریں، کیونکہ اس سے اسکو اذیت ہو گی :

غور کیجئے! یہ ایک انتہائی بلند اور لطیف ترین نفسیاتی ادب ہے،

کسی سے نیکی کرنا، صدقہ وخیرات کرکے جتلانا بھی اسی قبیل سے ہے، لہذا اس سے بھی

شریعت مطہرہ نے منع کر دیا، کیونکہ نیکی کرکے جتلا نا فی نفسہ ایک مکروہ عادت ہے، اور اس سے ان لوگوں کو اذیت ہوتی ہے، جن سے نیکی کی گئی ہو، یہی سبب ہے کہ اس سے صدقہ، ثواب کالعدم اور نیکی برباد ہو جاتی ہے، اور شکر و اعتراف کے بجائے ناراضگی اور کینہ پیدا ہو جاتا ہے، قرآن مجید کے اندر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

یاایها الذین آمنوا لا تبطلوا صدقٰتکم بالمنّ والاذیٰ ط کالذی ینفق ماله رئاء الناس ولا یؤمن باللہ والیوم الآخر فمثله کمثل صفوان علیه تراب فاصابه وابل فترکه صلداً لایقدرون علی شیءٍ مما کسبوا واللہ لا یهدی القوم الکٰفرین ہ (البقرۃ)

اے ایمان والو! اپنے صدقات احسان جتا کر اور تکلیف دیکر ضائع مت کرو، اس شخص کے مانند جو اپنا مال لوگوں کو دکھلانے کیلئے خرچ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا، تو اسکی مثال ایک صاف چٹان کیطرح ہے جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اسے موسلا دھار بارش پہنچی تو اسے صاف کر جائے، ایسے لوگ اپنے اعمال میں سے کسی چیز کے مالک نہیں اور اللہ ناشکرے لوگوں کو راہ نہیں دیتا۔

ان آداب و ہدایات کے متعلق اسلام صرف سلبی حدود تک ہی نہیں رہتا، بلکہ محبت کے شعور اور الفت کے احساس کو برانگیختہ کرنے کیلئے ایجابی صورت بھی اختیار کرتا ہے، چنانچہ اس مقصد کے حصول کیلئے وہ لوگوں میں اچھی باتوں کی اشاعت کی دعوت دیتا ہے۔

• قل لعبادی یقولوا التی هی احسن۔ (الاسراء)۔

اور میرے بندوں سے کہو کہ وہ بات کہیں جو احسن ہو،

• واذا حییتم بتحیة فحیوا باحسن منها او ردّوها (النساء)

اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس سے بہتر سلام کہو یا اس کے مانند جواب دو!۔

وہ ہر جگہ اور ہر انسان تک سلامتی پھیلانے کا حکم دیتا ہے، چاہے اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو تعارف کے طور پر صرف انسانی رابطہ ہی کافی ہے، اس طرح تالیف قلوب کیلئے اور اطمینان کی اشاعت کی خاطر سلام و دعا، کیلئے یہی تعلق کافی ہے،

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

یُسلّم الصغیر علی الکبیر والمارّ علی القاعد

چھوٹا بڑے کو سلام کرے گذرنیوالا بیٹھے ہوئے کو

والقليل على الكثير۔ (بخاری شریف) اور قلیل جماعت کثیر جماعت کو سلام کہے۔

ایک موقع سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ۔

ای الاسلام افضل؟ قال تطعم الطعام وتقرء السلام على من عرفت ومن لم تعرف۔ (بحوالہ بخاری شریف)

اسلام میں (کونسی خصلت سب سے اچھی ہے) اور پسندیدہ ہے، آپ نے فرمایا کہ تم (مفلوک و تنگدستوں) کو کھانا کھلاؤ، اور جان پہچان اور انجانے لوگوں کو سلام کہو۔

وہ اپنے پیروکاروں کو برائی کا بدلہ یا مقابلہ نیکی سے کرنے کی دعوت دیتا ہے، فرمانِ الٰہی ہے،

ادفع بالتی هی احسن فاذا الذی بینك وبینه عداوة كانه ولی حمیم۔ (فصلت)

احسن طریقے سے دفاع کرو تو تم دیکھو گے کہ جن لوگوں کیساتھ تمہاری عداوت تھی وہ بھی گرم جوش دوست بن جائیں گے،

وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض هونا واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما۔ (الفرقان)

اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دھیمے انداز میں چلتے ہیں اور جب نادان ان سے مخاطب ہوں تو سلام کہتے ہیں،

نیز وہ برائی سے درگذر کرنے اور غصے کے وقت ضبطِ نفس کا حکم دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ نفس کو عفو و درگذر اور جود و بخشش کا عادی بناؤ نہ کہ کینے اور عداوت کا، اس طرح اس کا تا ثر زائل ہو جائیگا، اور صحت مندی و فیاضی اسکی جگہ لے لیگی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

ولمن صبر وغفر ان ذلك لمن عزم الامور۔ (الشوریٰ)

اور بلاشبہ جس نے صبر کیا اور بخش دیا تو یقیناً یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے،

وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا فان الله غفور رحیم۔ (التغابن)

اور اگر تم معاف کردو، درگذر کرو اور بخشدو تو بے شبہ اللہ غفور رحیم ہے،

والكاظمين الغيظ والعافين عن الناس (آل عمران)

اور مومن غصہ کو پی جانیوالے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں،

واذا ما غضبوا هم يغفرون۔ (الشوریٰ) اور جب کبھی وہ غضبناک ہوں تو بخش دیتے ہیں۔

وہ خرید و فروخت اور قرض کے تقاضے کے معاملات میں وسعت ظرف اور فراخ دلی کی دعوت دیتا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

"رحم اللہ رجلاً سمحاً اذا باع واذا اشتریٰ و اذا اقتضیٰ ۔ (بخاری و ترمذی)

یعنی بیع و شراء اور تقاضے میں نرم خو یا وسیع القلب آدمی پر اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے وہ لین دین میں دیانت و امانت داری کا حکم دیتا ہے، قرآن مجید کا بیان ہے

فان امن بعضکم بعضاً فلیؤد الذی اؤتمن امانتہٗ ۔ (البقرۃ)

یعنی اگر تم میں سے کوئی دوسرے کو امانت دے تو امانت رکھنے والا اسکی امانت کو واپس ادا کرے

اور تجارت میں بیرسگالی کا حکم دیتا ہے، اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے،

البیعان فی الخیار ما لم یتفرقا فان صدقا وبیّنا بورك لهما في بیعهما وان کتما وکذبا محقت برکۃ بیعهما ۔ (بخاری ومسلم وغیرہ)

خرید و فروخت کرنیوالے فریقین کو فسخ کا اختیار ہے جب تک کہ جدا نہ ہو جائیں ۔ اگر وہ سچ بولیں اور حقیقت ظاہر کر دیں تو ان کے سودے میں برکت ہو گی اگر حقیقت کو چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو انکے سودے کی برکت ختم کر دی جائے گی،

عداوتیں بھڑکانے اور کینے پیدا کرنیوالی چیزوں سے وہ مسلمانوں کو دور رہنے کا حکم دیتا ہے ۔ جیسا کہ جوئے بازی کی مجلسیں جن سے حرام کمائی اور متعدی نقصان کے باعث دلوں میں عداوتوں کا اُتار چڑھاؤ ہوتا ہے، اور جیسے شراب کی محفلیں جن میں جذبات اور عقل و ارادے پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ فهل انتم منتهون (المائدہ)

یقیناً شیطان چاہتا ہیکہ شراب اور جوئے سے تمہارے اندر عداوت اور بغض ڈال دے، اور تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے روک دے سو کیا تم باز آجاؤ گے:

(جاری)

شفق ابیض کے غروب سے پہلے صبح صادق

(عشاء، وتر اور سحری کے احکامات)

برطانیہ میں ۵۰ عرض البلد کے بعد گرمی کے موسم میں شفق ابیض غروب نہیں ہوتی کہ صبح صادق نمودار ہو جاتی ہے

وہاں عرصہ سے عشاء، وتر اور سحری کے وقت کا مسئلہ زیر بحث ہے ابھی حال میں دارالعلوم بولٹن بری (برطانیہ) کے مفتی جناب مولانا شبیر صاحب نے اس سلسلہ میں ایک رسالہ مرتب کیا ہے، جسکا مدعا یہ ہے کہ چونکہ غروب شمس سے طلوع شمس تک آدھے وقت میں سورج حالت صعود میں رہتا ہے اور آدھے وقت حالت صعود میں اس لئے سحری کا وقت نصف لیل تک باقی رہنا چاہئے اور آدھی رات ہوتے ہی روزہ شروع ہو جانا چاہئے۔
موصوف نے اپنے رسالہ کا مسوّدہ رائے کیلئے حضرت مولانا سعید احمد پالنپوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کے پاس بھیجا مولانا موصوف نے اسکے متعلق جو جواب لکھا وہ قارئین کے استفادہ کیلئے شریک اشاعت کیا جا رہا ہے۔

الحمد للہ وکفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد!

مرسلہ رسالہ موصول ہوا، مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس مسئلہ میں پہلے سے بھی غور کرتا رہا ہوں، صورت مسئولہ میں لیل حقیقی کا تحقق نہیں ہے۔ لیل حقیقی غروب شفق ابیض سے، طلوع صبح صادق تک ہے، جو عشاء اور وتر کا وقت ہے۔ غَسَقُ اللیل سے یہی مراد ہے، غسق کے معنی ہیں شدّت ظلام یعنی ظلام محض، چونکہ غروب شفق ابیض تک فی الجملہ سورج کا اثر باقی رہتا ہے اور صبح صادق سے فی الجملہ سورج کا اثر ظاہر ہونے لگتا ہے، اس لئے لیل کی یہ طرفین۔ شدّتِ ظلام کا تحقق نہ ہونے کی وجہ سے — لیل حقیقی میں داخل نہیں ہیں، لیل حقیقی صرف وہ ہے جسمیں سورج کا کوئی اثر افق سے اوپر موجود نہ ہو۔ رات پوری طرح چھائی ہوئی ہو، الحاصل صورت مسئولہ میں لیل حقیقی متحقق نہیں ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء کرام نے اہل بلغار کی عشاء اور وتر سے بحث کی ہے کہ وہ واجب ہیں یا نہیں؟

اور قرآن کریم نے روزہ کا مبدأ خیط ابیض کا خیط اسود سے امتیاز، مقرر کیا ہے، خیط اسود لیل حقیقی کا جزو ہے، اور خیط ابیض صبح صادق کا، اور ناظر کیلئے دونوں خیوط کا امتیاز روزوں کا مبدأ ہے، اور صورت مسئولہ میں خیط اسود متحقق نہیں ہے، بلکہ صورت حال یہ ہے کہ خیط ابیض مدھم ہوتا رہتا ہے اور ایک مرحلہ پر پہنچ کر پھر سے نور بڑھنے لگتا ہے پس جب لیل حقیقی کا تحقق نہیں تو عشاء، وتر کیلئے تقدیر (اندازہ) سے کام لینا ہوگا۔ البتہ شفق اور فجر کا تحقق ہے اسی وجہ سے اہل بلغار کی مغرب اور فجر کی نمازوں کا مسئلہ زیر بحث نہیں آیا کہ وہ واجب ہیں یا نہیں؟

اب حل طلب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ شفق کو کب تک ممتد مانا جائے، اور فجر کو کب سے شروع سمجھا جائے؟ اگر شفق کو فجر تک ممتد مانا جائے اور صبح صادق کو شفق سے متصل قرار دیا جائے تو عشاء و وتر کا وقت معدوم ہو جاتا ہے، اور ان کا وجوب مرتفع ہو جاتا ہے، حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے، اس لئے عشاء و وتر کیلئے تقدیر ضروری ہے، اور جب یہاں تقدیر تسلیم کرلی گئی تو طرفین میں بھی تقدیر تسلیم کرنی پڑے گی، ہبوط و صعود شمس کی بحث فی نفسہ صحیح ہے، مگر مسئلہ شرعی کا اسے مبنی قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ اولاً تو یہ بات دین کی سادگی کے خلاف ہے۔ نحن امۃ امیۃ میں اسی طرف اشارہ ہے، ہر مسلمان، ہر جگہ اور ہر وقت فلکی حساب سے استفادہ نہیں کرسکتا، اسی وجہ سے شریعت میں کسی حکم کا مدار فلکی حسابات پر نہیں رکھا گیا بلکہ عام مشاہدہ پر رکھا گیا ہے ثانیاً ہبوط و صعود شمس پر مدار رکھنے کی صورت میں عشاء و وتر کو غیر واجب کہنا ہوگا حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے، ثالثاً خطوط کے امتیاز کے ذریعہ صورتِ مسئولہ میں فیصلہ ممکن نہیں ہے کیونکہ خیطِ ابیض کا خیط ابیض سے امتیاز اُتنا آسان نہیں ہے جتنا خیط ابیض کا خیط اسود سے امتیاز آسان ہے، الغرض مغرب اور فجر کا مسئلہ بھی تقدیر ہی سے طے کرنا چاہئے، فجر حقیقی کو، یعنی نصف لیل کو روزوں کا مبدأ نہیں قرار دینا چاہئے، فقہ حنفی میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہے کہ روزوں کا مبدأ فجر حقیقی ہے یا تبیین فجر؟ پہلا قول احوط ہے اور دوسرا اوسع، اور اکثر احناف کا میلان دوسرے قول کی طرف ہے، مولانا بنوری قدس سرہ تو یہ فرماتے ہیں۔ فی الفتاوی الھندیۃ "روایۃ جواز الاکل للصائم الی انتشار الصبح، وقد اختلف فی ان العبرۃ لاول طلوع الفجر الثانی او لاستطارتہ وانتشارہ فیہ؟ قال شمس الائمۃ الحلوانی القول الاول احوط والثانی اوسع، ھکذا فی المحیط، والیہ مال اکثر العلماء، کذا فی خزانۃ الفتاوی" فی کتاب الصلوٰۃ ۱۰۔
اور چونکہ حسابات فلکی کا اعتبار نہیں اور مشاہدہ میں خیط ابیض کا خیط ابیض سے امتیاز دشوار ہے اس لئے انتشار صبح والا قول (جو کہ اوسع ہے اور جس کی طرف اکثر احناف کا میلان ہے) اختیار کرنا چاہئے، اول طلوع فجر ثانی یعنی منتصف اللیل کا قول نہیں لینا چاہئے۔

علاوہ ازیں فقہ حنفی میں قیاس کے علاوہ ایک چیز استحسان بھی ہے، امام جصاص رازیؒ نے "فصول" میں استحسان کی دو قسمیں کی ہیں، اور پہلی قسم کی یہ تعریف کی ہے تخصیص الحکم مع وجود العلۃ یعنی حکم کی علت پائے جانے کے باوجود اس کا اعتبار نہ کرتے ہوئے کوئی اور حکم تجویز کرنا، جیسے بیع سلم میں چونکہ مبیع معدوم ہے اس کی بیع باطل ہونی چاہئے مگر۔ ۔ شریعت میں بیع سلم کی اجازت

لہ آپ نے جو قواعد فلکی اور ان کا تقاضا بیان ۔ ۔ ۔ کیا ہے وہ قیاس ہے۔ ۱۲

دی گئی، اور حکم کی تخصیص تین وجوہ سے کی جاتی ہے۔ یعنی اثر (نص) اجماع اور ضرورت کی بنا پر، صورت مسئولہ میں تینوں سے تقدیر ثابت ہے ،

نص - دجال والی روایت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام طوال کی طرح ایام قصار میں بھی تقدیر کا حکم دیا ہے، ابن ماجہ شریف میں ہے، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

وان ایامہ اربعون سنۃ، السنۃ کنصف السنۃ، والسنۃ کالشہر، والشہر کالجمعۃ وآخر ایامہ کالشررۃ، یصبح احدکم علی باب المدینۃ، فلا یبلغ بابہا الآخر حتی یمسی، فقیل یا رسول اللہ! کیف نصلی فی تلک الایام القصار؟ قال: تقدرون فیہا الصلوٰۃ، کما تقدرونہا فی ھذہ الایام الطوال، ثم صلوا۔ (ابن ماجہ، کتاب الفتن باب فتنۃ الدجال)

اجماع، آج تک تمام علماء کا فتویٰ اور وہاں کے جمہور مسلمین کا عمل تقدیر ہی پر رہا ہے، اس میں چاہے اختلاف رہا ہو کہ تقدیر کس طرح کی جائے مگر نفس تقدیر وہاں کا اجماعی مسئلہ ہے یہ خیال رہے کہ مفتیوں کا فتویٰ علمائے فلکیات کے اقوال کے پیش نظر ہوتے ہوئے تھا، کیونکہ شرح چغمینی ہمارے نصاب کا لازمی جزو تھا، مفتیان کرام ان تحقیقات سے لاعلم نہیں تھے،

ضرورت: مسلمانوں کی عمومی ضرورت کا مقتضیٰ تخفیف ہے۔ اور تخفیف تقدیر ہی میں ہے، فجر حقیقی کا اعتبار کرنے میں لوگوں کیلئے دشواری ہے، یہ خیال رہنا چاہئے کہ روزہ فی نفسہ طبائع کیلئے دشوار امر ہے، اسی وجہ سے قرآن کریم میں روزوں کا حکم دیتے ہوئے پوری طرح ذہن سازی کی گئی ہے، ارشاد باری ہے -

یٰایہا الذین آمنوا! کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم، لعلکم تتقون۔ ایاماً معدودات، فمن کان منکم مریضاً او علی سفر فعدۃ من ایام آخر، وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین فمن تطوع خیراً فہو خیر لہ، وان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون۔

ان آیات میں روزوں کا حکم دیتے ہوئے سات وجوہ سے اس حکم کو آسان کیا گیا ہے -

(۱) یایہا الذین آمنوا سے خطاب فرمایا گیا ہے تاکہ شوق و ذوق سے لوگ عمل کریں ،

(۲) صوموا، معروف صیغۂ امر کے بجائے کُتب علیکم کی تعبیر اختیار فرمائی گئی ہے جس سے حکم کی تاکید مقصود ہے تاکہ لوگ اسکی اہمیت کو سمجھیں ،

(۳) کما کتب علی الذین من قبلکم کا حوالہ دے کر حکم کو گوارہ بنایا گیا ہے کہ یہ ایک ایسا حکم ہے

جس سے کوئی امت مستثنیٰ نہیں کی گئی ،

(۴) لعلکم تتقون ۔ میں روزوں کا عظیم فائدہ بیان کیا گیا ہے، وہ فائدہ جو مؤمن کی زندگی کا حاصل ہے اور عظیم فائدہ کے حصول کی امید عظیم حکم پر عمل کیلئے طبیعت کو آمادہ کردیتی ہے ۔

(۵) ایاما معدودات کی دلالت تسہیل حکم پر بدیہی ہے ،

(۶) فمن کان منکم ۔ میں ایک شبہ ناشئی عن دلیل کا حل بیان فرمایا گیا ہے شبہ یہ ہے کہ انسان کے ساتھ اعذار کا چولی دامن کا ساتھ ہے، سفر و مرض سے وہ دوچار ہوتا رہتا ہے، پھر روزں کے حکم کی تعیین کیونکر ہوسکے گی ؟! جواب ارشاد فرمایا گیا کہ تم میں سے جسے ایسا کوئی عذر پیش آئے ، اُسے رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوگی، وہ دوسرے دنوں سے مقررہ تعداد پوری کرے اس کے لئے یہ بات کافی ہوگی، اسی وجہ سے اس آیت میں منکم بڑھایا گیا ہے، یعنی یہ خطاب سب مؤمنوں سے نہیں ہے، صرف ان لوگوں سے ہے جنکے لئے یہ اعذار باعث تشویش ہوں، حکم شرعی بیان کرنے کیلئے یہی بات دوبارہ آئی ہے، اور وہاں منکم نہیں ہے، کیونکہ رخصت کا تعلق اعذار سے ہے، اشخاص سے نہیں ہے ،

(۷) وعلی الذین یطیقونہ الآیۃ میں ایک دوسرے شبہ کا حل پیش کیا گیا ہے، مگر یہ شبہ ناشئی عن دلیل نہیں ہے، بلکہ ناشئی عن التوہم ہے۔ وہم کے غلبہ سے وہ یہ سمجھتا ہے کہ روزہ کیسے رکھا جائے گا ؟! دن بھر نہ کھانا نہ پینا یہ تو بہت مشکل کام ہے ؟! ایسے لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ بمشقت تمام روزہ رکھ سکتے ہیں یعنی روزہ ان کے لئے آسان نہیں ہے، روزہ میں ان کو بے حد مشقت لاحق ہوتی ہے وہ اگر روزہ نہ رکھیں اور اس کے بدل فدیہ دیدیں تو گنجائش ہے، مگر روزہ رکھنا ان کے لئے بھی بہرحال بہتر ہے اگر وہ سمجھیں ! پھر جب لوگ روزوں پر پڑ گئے اور تجربہ سے ثابت ہوگیا کہ عمومی حالات میں روزہ رکھنے میں غیر معمولی جہد و مشقت نہیں ہوتی تو فمن شھد منکم الشہر نے نازل ہوکر اس آیت میں جزوی نسخ کیا، اور فدیہ کی اجازت ختم ہوگئی، البتہ ان لوگوں کے حق میں جنکو واقعی روزوں میں غیر معمولی جہد و مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حکم باقی رہا ، توہم کی بنا پر جو فدیہ دینے کی اجازت تھی وہ ختم کردی گئی ۔

الغرض روزہ فی نفسہ طبائع کے لئے دشوار امر ہے، اس لئے مفتی کو صورت مسئولہ میں سہولت کی طرف جانا چاہیئے دشواری کی طرف نہیں جانا چاہیئے ۔

علمائے فلکیات کی جو عبارتیں آپ نے رسالہ میں درج فرمائی ہیں ان سب کا مفاد صرف یہ ہے کہ

وہاں رات بھر روشنی کیوں رہتی ہے، فلکی اصول سے اُسے سمجھایا جائے، علمائے فلکیات نے بتایا سورج حالتِ ہبوط میں تحت الارض اتنی ڈگریوں تک نہیں جاتا کہ اس کی روشنی فوق الافق سے سمٹ جائے اور پھر صعود شروع ہو جاتا ہے اور روشنی بجائے گھٹنے کے بڑھنے لگتی ہے ایسے ان مقامات میں رات بھر افق کے روشن رہنے کی، ان حضرات کو صبح صادق سے بحث مقصود نہیں ہے، نہ یہ ان کا وظیفہ ہے یہ مسئلہ تو علمائے دین کے طے کرنے کا ہے اور مفتیانِ شرع متین صادق کی تعیین میں یا روزوں کا مبدا متعین کرنے میں علمائے فلکیات سے مشورہ نہیں لیں بلکہ ماخذ شرع سے استفادہ کریں گے، اور اصول موضوعہ کی روشنی میں فیصلہ کریں گے،

اور تقدیر کیلئے اقرب الایام یا اقرب البلاد کو اختیار کرنے کے بجائے اَعْدَلُ الْ کو لینا چاہئے، یعنی دیکھا جائے کہ وہاں کے معتدل زمانہ میں غروب شمس سے غروب شفق ابیض کا وقت رات کا کتنا حصہ ہے، اسی طرح طلوع فجر سے طلوع شمس تک کا وقت رات کا کتنا حصہ ہے چوتھائی، پانچواں، چھٹا، ساتواں، آٹھواں جو متعین ہو وہی غیر معتدل راتوں میں تجویز کرنا چاہئے مثلاً اعدل الایام میں یہ دونوں وقت رات کا پانچواں حصہ ہوں تو غیر معتدل راتوں میں غروب کے بعد ایک خمس رات گزرنے تک مغرب کا وقت سمجھا جائے پھر تین خمس لیل حقیقی قرار دئے جائیں اور ان میں عشاء، وتر اور تراویح ادا کی جائیں اور جب رات کا ایک خمس باقی رہے تو صبح صادق قرار دی جائے، دجال والی روایت میں جو اُقْدُرُوا لَہٗ قَدْرَہٗ کہا گیا ہے، شارحین اسکی تقدیر میں اعدل الایام کا اعتبار کیا ہے، امام نووی رحمۃ اللہ تحریر فرماتے ہیں۔

ومعنی۔ اُقدروا لہ قدرہ۔ انہ اذا مضی بعد طلوع الفجر قدر ما یکون بینہ الظہر کل یوم فصلوا الظہر الخ (مسلم شریف باب ذکر الدجال)

اس عبارت میں کل یوم سے مراد اس جگہ کے معتدل ایام ہیں، واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم

حررہ العبد الضعیف سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

خادم دارالعلوم دیوبند۔ حقق المحقق العلام المسئلۃ۔

۱۷ ر جمادی الثانیہ ۱۴۰۴ھ بشکل واضح وبرہن القول الراجح ببرھان

سطع. العبد المسکین المدعو بمحمد نظام الدین

الاعظمی۔ المفتی بدارالعلوم دیوبند

۱۸ ر ۶ ر ۱۴۰۴ھ

نام کتاب:۔ **خطبات عیدین** ۔ مؤلف: مولانا محمد تقی امینی
طباعت: آفسیٹ، صفحات ۔ ۱۶۰، ناشر:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی

مولانا محمد تقی امینی علمی طبقہ میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، طبقۂ علماء میں مولانا امینی صاحب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انکی مقبولیت کا سکہ قدیم عربی و دینی درسگاہوں اور علوم جدیدہ کی جامعات و یونیورسیٹوں دونوں میں یکساں رائج ہے اور وہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ایک اہم علمی منصب پر فائز ہیں، مولانا موصوف تعلیمی مشاغل کے ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی ایک منفرد مقام کے مالک ہیں، انکی متعدد کتابیں اپنے موضوع پر آج بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں، زیر تبصرہ کتاب "خطبات عیدین" مولانا کے دعوتی مقالات کا ایک جدید مجموعہ ہے، جسمیں ۳۴ عنوانات پر مقالے تحریر کئے گئے ہیں۔ اور انھیں عیدین کے موقع پر سامعین کو پڑھ کر سنایا گیا ہے، سارے کے سارے مقالات زبان وبیان اور موضوع ومواد کے لحاظ سے خاصے وقیع واہم ہیں اور بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے کہ یہ مجموعہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

نام کتاب:۔ **توحید کا خنجر** : مؤلف: مولانا امام علی دانش، صفحات: ۳۱۰،
ملنے کے پتے:۔ مکتبہ دانش ادارہ محمودیہ محمدی لکھیم پور یوپی، عظیم بک ڈپو دیوبند۔

بریلوی فرقہ کی تکفیری سرگرمیاں کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہیں اس فرقہ کا کام ہی یہ ہے کہ اہل سنت کے سرکردہ علماء کی تصانیف سے اقتباس لیکر ان میں کتر بیونت اور تحریفات کرکے انکے مصنفین کو طعن وتشنیع اور کفر کا نشانہ بنائے۔ اور پھر بھولے بھالے عوام کو ان علماء سے برگشتہ اور منحرف کرے تاکہ عوام کا رشتہ علماء حق سے کٹ جائے اور انھیں اپنے فاسد عقائد اور بدعات وخرافات کو ان میں پھیلانے کا موقع مل جائے، اس گروہ کے تزویر کو چاک کرنے اور انکے غلط عقائد اور بدعات وخرافات کے ابطال کے لئے علماء حق نے بے شمار کتابیں لکھی ہیں، زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس میں اس گروہ کے رئیس اور مقتدا مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور ان کے دیگر اہم علماء کی کتابوں کے حوالے سے ان کی دہریں تحریفات وتلبیسات کو واضح کیا گیا ہے، اور علماء حق کی عبارتوں پر ان کے اعتراضات واشکالات کا مکمل طور پر جواب بھی

دیا گیا ہے ، اور اکابر علماء کی عبارتوں میں تحریف و قطع جدید کی گئی ہے، اس کی بھی وضاحت کی گئی ہے، کتاب اپنے موضوع پر عمدہ ہے اور مواد کے فراہم کرنے میں محنت کی گئی ہے، البتہ زبان کہیں کہیں تیز ہو گئی ہے، فاضل مؤلف اگر اس کا خیال رکھتے تو کتاب اپنے مقصد میں زیادہ مفید ہوتی ۔

نام کتاب : **فیصلہ کن مباحثہ** ، مؤلف : مولانا امام علی دانش ، صفحات ۸۰

ملنے کے پتے : مکتبہ دانش ادارہ محمودیہ محمدی لکھیم پور ۔ عظیم بک ڈپو دیوبند ۔

یہ کتاب بھی رد بدعت ہی کے موضوع پر ہے مؤلف کتاب مولانا امام علی دانش صاحب سے ایک بریلوی عالم کا مسئلۂ تثویب میں مباحثہ ہوا تھا ، اس کتاب میں اسی مباحثہ کی روداد قلم بند کی گئی ہے ،

شروع کتاب میں بدعت کی تعریف اور اسکی مذمت میں ایک تمہیدی تحریر ہے ، جس سے بدعت کی حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے ،

مؤلف نے پوری روداد بڑے ہی دلکش اور پر لطف انداز میں مرتب کی ہے ۔

ایک درویش کی دعا

شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک درویش کو دیکھا جو آستانہ کعبہ پر سر رکھ کر رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا ۔ — اے غفور الرحیم ! میں کمزور و ناتواں ہوں ، تیری عبادت کا حق مجھ سے ادا نہ ہو سکا ، جو کچھ فرض کی ادائیگی ہوئی ہے اس پر مجھے کوئی تکیہ نہیں ہے ، اب میں تجھ سے بخشش کی بھیک مانگتا ہوں تو میری خطاؤں کو درگذر کر دے ، میرے گناہوں کو معاف کر دے ، اور میرے ساتھ مہربانی کا معاملہ فرما ، تیری رحمت وسیع ہے ، اور مجھے صرف تیری رحمت ہی کا بھروسہ ہے ۔

نہ گویم کہ طاعتم بپذیر — قلم عفو بر گناہم کش

میں یہ نہیں کہتا کہ تو میری عبادت قبول کرلے بلکہ میری دعا یہ ہے کہ تو میرے گناہوں پر معافی کا قلم پھیر دے ۔

فہرست کتب مکتبہ دار العلوم دیوبند و شعبہ نشر واشاعت دار العلوم دیوبند

نام کتب	قیمت	نام کتب	قیمت	نام کتب	قیمت
فتاویٰ دار العلوم جلد ۱	۲۴/-	دیوان المتنبی	۱۱/-	انتصار الاسلام	۹/-
" " " ۲	۱۷/-	تاریخ دار العلوم جلد ۱	۴/-	مصابیح التراویح	۶/۵۰
" " " ۳	۲۵/-	" " " ۲	۴۰/-	تفسیر معوذتین	۳/-
" " " ۴	۳۱/-	" " انگریزی ۱	۱۲۵/-	اسلامی عقائد اور سائنس	۲/۰
" " " ۵	۳/-	" " " ۲	۱۰۵/-	مودودی مذہب	۲/۵۰
" " " ۶	۳۶/-	سوانح قاسمی جلد اول	۴/-	نظریہ دور قرآنی پر ایک نظر	۴/-
" " " ۷	۴۴/-	" " " دوم	۳۸/-	مکتوبات	۳/-
" " " ۸	۲۸/-	" " " سوم	۱۴/-	مکتوبات ثلثہ	۲/۵۰
" " " ۹	۳۱/-	ملفوظات جلد اول	۱۹/-	دو ضروری مسئلے	۱/-
" " " ۱۰	۲۲/-	" " دوم	۳۱/-	جماعت اسلامی کا دینی رخ ۱	۳/۵۰
" " " ۱۱	۱۱/-	قبلہ نما	۲۸/-	" " " " ۲	۲/۵۰
مقدمۃ ابن الصلاح	۱۱/-	دینی دعوت کے قرآنی اصول	۶/۵۰	" " " " ۳	۲/۵۰
الفیۃ الحدیث	۱۲/-	ناقابل فراموش واقعات	۲۶/-	" " " " ۴	۴/-
مشکوٰۃ الآثار	۱۱/-	المنار الانوار	۷/-	اجتماع گنگوہ	۱/-
النحیہ	۴/-	مثنوی فروع	۴/۵۰	در منثور اول	۱/-
نفحۃ الادب	۶/-	براہین قاسمیہ	۱۰/-	" دوم	۱/-
تفسیر مدارک والتنزیل	۸/-	حکمت قاسمیہ	۵/-	اعفاء اللحیہ	۱/-
الاشباہ والنظائر	۳۰/-	مدارج سلوک	۱۶/-	ایمان وعمل	۳/-
عقیدۃ الطحاوی	۱۱/-	جائزہ تراجم قرآنی	۱/-	دار العلوم دیوبند کا ایک	
حامی	۲۴/-	قرآن محکم	۵/-	فتویٰ اور اسکی حقیقت	۱/۵۰
ملاحسن	۱۲/-	حجۃ الاسلام	۲/۵	ماثورہ دعائیں	۱/۵۰
مقامات حریری	۲۵/-	اسرائیل قرآنی پیشین گوئی	۴/- ۲/۸۵	دستور عقائد	۲/۵۰

Regd. No. SHN-13-NP-21-84
DARUL-ULOOM MONTHLY
DEOBAND (U.P.)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دار العلوم دیوبند
کے ترقیاتی منصوبے

(۱) رواق خالد کی دوسری منزل اور مزید جدید دارالاقامہ کی تعمیر جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو

(۲) دارالتربیت (دارالاطفال) کا قیام اور اس کی تعمیر

(۳) ایک وسیع مسجد کی تعمیر جس میں اضافہ شدہ تمام طلبہ کی گنجائش ہو (قدیم مسجد ناکافی ہو چکی ہے)

(۴) علمی و دینی اجتماعات کے لئے ایک وسیع ہال کی تعمیر ——— (۵) ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر

(۶) مہمان خانہ کی توسیع —— (۷) نئی درسگاہوں کی تعمیر ——— (۸) لائبریری کی تعمیر جدید

(۹) اساتذہ دارالعلوم کی علمی ترقی کے لئے عالم اسلام سے علمی کتابوں کی فراہمی کا انتظام

(۱۰) تمام دنیا میں پھیلے ہوئے فضلاء دارالعلوم سے روابط اور اُن سے متعلق معلومات

(۱۱) نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر تمام ذمہ داران مدارس عربیہ کا اہم کنونشن طلب کرنا۔

(۱۲) تعلیم و تربیت کے نئے اصول و ضوابط کی ترتیب اور اُن کا اجراء۔

اس ادارے کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے

دست تعاون بڑھانے کی شدید ضرورت ہے

مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی امداد روانہ فرمائیں ——— شکریہ

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب) دارالعلوم دیوبند یوپی

۲۱ ... دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی اصلاحی ماہنامہ

دارالعلوم

زیرسرپرستی

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

مدیر مسئول

ریاست علی بجنوری

نگرانِ اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی ماہنامہ

دارالعلوم

جلد نمبر ۶۶	مئی ۱۹۸۴ء مطابق شعبان المعظم ۱۴۰۴ھ	شمارہ نمبر ۲

سالانہ زرِ اشتراک

ہندوستان سے -/۲۵ روپے

سعودی عرب، کویت، ابوظہبی وغیرہ سے
بذریعہ ایرمیل -/۹۰ روپے

جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے
بذریعہ ایرمیل -/۱۰۵ روپے

امریکہ، کناڈا وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل
-/۱۱۶ روپے

پاکستان سے بذریعہ رجسٹری -/۴۵ روپے

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

طابع وناشر

دارالعلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مطبوعہ

محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند

ضروری گذارش: اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ اس مہینہ یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپکی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ بذریعہ سرخ نشان اس کی آپکو اطلاع بھی دی جا چکی ہے لہٰذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی، پی ہی سے زرِ اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے۔ اگلا شمارہ -/۲۷ روپے کے مطالبہ میں وی، پی کر دیا جائیگا۔

(مدیر)

فہرستِ مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

۱۔ ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کیساتھ منی آڈر سے روانہ فرمائیں۔

۲۔ پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ -/۴۰ روپے مولانا عبدالستار صاحب، مقام کرم علی والہ تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیجدیں اور انھیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں۔ خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(مدیر)

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

قادرِ مطلق کی مشیت ہے ایک عجیب چل چلاؤ لگ رہا ہے، ہر ہر شعبہ کی اہم اہم شخصیتیں اٹھتی جارہی ہیں اور کوئی بھی اپنا بدل اور جانشین نہیں چھوڑ رہا ہے، ابھی آج ہی ۱۲ مئی کو عصر کے نماز کے بعد اس غمناک سانحہ کی اطلاع ملی کہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صدر مسلم مشاورت و رکن مجلسِ شوریٰ دار العلوم دیوبند کا دلی میں وصال ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ واکرم نزلہ

حضرت مفتی صاحب دیوبند کے مشہور قدیم علمی خانوادہ کے ایک ممتاز فرد تھے، آزادیٔ ضمیر اصابت رائے، معاملہ فہمی، اور نکتہ رسی میں ایک خاص شان کے مالک تھے، علمی، سماجی، اور سیاسی تمام حلقوں میں آپ کو یکساں مقبولیت حاصل تھی، درجنوں علمی و دینی اداروں کے ممبر اور رکن تھے۔

مرحوم عارف باللہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ کے خلف رشید تھے ۱۳۱۹ھ میں دیوبند میں آپ کی ولادت ہوئی، تاریخی نام "ظفر الحق" ہے، ۹ برس کی عمر میں حفظ قرآن کریم سے فارغ ہوکر اردو فارسی اور عربی کی تعلیم شروع کی، آپ کی تمام تر تعلیم دار العلوم دیوبند ہی میں ہوئی ۱۳۴۱ھ میں حضرت محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری اور دیگر اساتذۂ دار العلوم سے دورۂ حدیث پڑھ کر سندِ فراغت حاصل کی، دو تین سال مطالعہ کتب میں مصروف رہے بعد ازاں ۱۳۴۴ھ میں دار العلوم میں معین المدرس مقرر ہوئے، تدریس کے ساتھ اپنے والد ماجد کی زیر نگرانی افتاء کا کام بھی کرتے رہے ۱۳۴۵ھ میں جب اربابِ انتظام اور حضرت محدث کشمیریؒ کے مابین اختلاف پیدا ہوا تو حضرت مفتی صاحب نے اپنے استاذ علامہ کشمیریؒ کی ہمنوائی کی اور انھیں کے ساتھ دار العلوم کو چھوڑ کر ۱۳۴۶ھ

میں ڈابھیل چلے گئے، اور تقریباً پانچ سال تک ڈابھیل میں ہی درس و افتاء کی خدمت انجام دی
پھر انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک نمک سازی وغیرہ سے متاثر ہو کر اپنے رفیق حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے مستعفی ہو کر سیاسی میدان میں آگئے اور پانچ سال کلکتہ میں مقیم رہ کر سیاسی امور کی انجام دہی کے ساتھ تفسیر افتاء اور تبلیغ دین کی اہم خدمت میں بھی مصروف رہے کلکتہ میں مفتی صاحب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور آپ کا حلقۂ اثر یہاں بہت وسیع ہو گیا۔ اسی زمانہ میں مفتی صاحب کے ذہن میں ندوۃ المصنفین کا خاکہ آیا بالآخر اپنے رفقاء کار حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب وغیرہ کے مشورہ سے ۱۳۵۷ھ میں قرول باغ دہلی میں اس ادارہ کی بنیاد رکھدی، اس ادارے کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی علوم و فنون کی اہم کتابوں کو اس سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب کے حسن انتظام اور جد و جہد کی بدولت اس ادارہ نے مختصر سی مدت میں اہم ترین کتابیں شائع کر دیں اور اسوقت اسکی مطبوعات کی تعداد سو سے اوپر تک پہنچ چکی ہے جو تفسیر، حدیث، تاریخ، لغت، اخلاق اور سیاسیات کے موضوعات پر مشتمل ہیں

حضرت مفتی صاحب ندوۃ المصنفین کے ابتدائے قیام سے زندگی کی آخری سانس تک اسکے ناظم اور نگراں رہے، ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں جبکہ دلی میں فسطائی عناصر نے دل کھول کر مسلمانوں کا قتل عام کیا اس موقع پر ندوۃ المصنفین کو بھی لوٹ کر نذر آتش کر دیا گیا تھا یہ ایسا زبردست اور عظیم مشاہدہ تھا کہ اس قسم کے حوادثات کے بعد کسی ادارہ کا سنبھلنا مشکل ہی ہوتا ہے لیکن حضرت مفتی صاحب کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اس تباہی کے بعد نہ صرف ندوۃ المصنفین کو زندہ رکھا بلکہ اپنی جرأت و ہمت اور انتظامی صلاحیتوں سے اس میں حیات تازہ پیدا کر دی اور اس اجڑے ہوئے چمنستان علم کو پھر سے گلزار بنا دیا۔

آپ جمعیۃ العلماء ہند کے ساتھ ابتداء سے وابستہ رہے اور قومی و ملی کاموں میں حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے ہمیشہ دست و بازو بنے رہے، حضرت مجاہد ملت کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے ورکنگ صدر منتخب ہوئے لیکن مرحوم اس عہدہ پر تا دیر قائم نہ رہ سکے اور نہ صرف یہ کہ اس عہدہ سے الگ ہو گئے بلکہ اسکے ساتھ ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جمعیۃ ہی سے اپنا سلسلہ منقطع کر لیا۔ حضرت مفتی صاحب کا یہ فیصلہ انکی اصابت فکر و رائے کے باوجود ملی حلقہ میں [illegible] کو نگاہ [illegible] سے دیکھا گیا۔ ادھر ایک عرصہ سے قوم مشاورت کی صدارت کے منصب پر فائز

اور اسی کے پلیٹ فارم سے جو کچھ بن پڑتا تھا قومی و ملی خدمت انجام دیتے تھے مفتی صاحب کی سابقہ قومی خدمات کی بنا پر حکومتِ وقت انکی باتوں کا بہت لحاظ کرتی تھی اور انکی رائے کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتی

مرحوم بہت سے دینی و علمی اداروں کے سرپرست اور مشیر کار تھے، اور انکی مجلسوں میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے تھے اور اپنے صحیح مشوروں سے کارکنوں کی رہنمائی کرتے تھے، مفتی صاحب کی بالغ نظری اور اصابتِ فکر و رائے کے پیش نظر ۱۹۶۱ء میں انھیں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا ممبر بنایا گیا جس پر وہ آخری دم تک باقی رہے، اور بیماری سے پہلے پابندی کے ساتھ شوریٰ کی مجلسوں میں شرکت کرتے تھے، مفتی صاحبؒ کی رائے کا شوریٰ میں ایک خاص وزن تھا۔

دارالعلوم کے حالیہ بحران کے زمانہ میں بد قسمتی سے حضرت مفتی صاحب کا نقطۂ نظر مجلس شوریٰ کے موافق نہیں رہا جس کی بنا پر مجلس شوریٰ کو بعض مواقع پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے باوجود ارکانِ شوریٰ اور اربابِ دارالعلوم کے دلوں میں مفتی صاحب کی عزت و وقعت بدستور باقی تھی اور ان کا اعزاز و احترام پہلے ہی کی طرح قائم تھا۔

مفتی صاحب کو تقریر و تحریر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ندوۃ المصنفین اور قومی و ملّی کاموں کی مصروفیت کی بنا پر اگرچہ خود کوئی تصنیف نہیں کر سکے، لیکن ندوۃ المصنفین کی مطبوعات پر انھوں نے پیش لفظ یا تعارف کے طور پر جو کچھ لکھا ہے اس سے انکی تصنیفی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے مفتی صاحبؒ اگرچہ خود تو مصنف نہ بن سکے لیکن انھوں نے بہت سے لوگوں کی رہنمائی کر کے انھیں بلند پایہ محقق و مصنّف بنا دیا۔

مرحوم تقریباً ایک سال سے صاحبِ فراش تھے، گزشتہ سال دارالمصنفین اعظم گڈھ کے سیمینار میں شرکت کر کے واپس لوٹ رہے تھے کہ راستہ ہی میں ان پر فالج کا حملہ ہوا، چند یوم لکھنؤ زیر علاج رہ کر دہلی آ گئے اس وقت سے صاحب فراش ہی رہے، ادھر چند مہینوں سے کینسر کا موذی مرض بھی لاحق ہو گیا تھا، اور حکومتِ وقت کی زیر نگرانی خصوصی علاج و معالجہ کے باوجود بھی اس مرض نے ساتھ نہیں چھوڑا، اور بالآخر اسی مرض میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مرحوم کے وصال کی اطلاع دارالعلوم کو دیر سے ملی کیونکہ دہلی سے دارالعلوم کو خبر پہنچانے کا کوئی منظم انتظام متعلقین نے نہیں کیا تھا لیکن جیسے ہی اطلاع ملی اسی وقت دارالعلوم میں تعطیل کر دی گئی اور تمام اساتذہ طلبہ اور کارکنان نے قرآن کریم اور کلمہ طیبہ پڑھ کر مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کیا کیونکہ زندوں کی جانب سے مرنے والوں کو اس سے اچھا اور کوئی تحفہ اور کوئی ہدیہ پیش کیا جا سکتا ہے، دارالعلوم اور اس کے جملہ ارکان حضرت مفتی صاحبؒ کے متعلقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں۔ آمین

قرآن حکیم اور جدید سائنس

ایک حقیقت پسندانہ اہم تبصرہ

از جناب کریم الدین صاحب مقیم حال جدّہ

بعض علماء کا ناپسندیدہ رویّہ

اہلِ علم حضرات کا فرض تھا کہ وہ مسلم سائنسدانوں کے اس غلط رجحان کے خلاف موثر انداز میں قلم اٹھاتے حتی کہ ان کی سمجھ میں آجاتا کہ سائنسی نظریات و انکشافات کو قرآنی آیات کی تفاسیر پر منطبق کرنا مسلمانوں کے لئے مضر ہے، اور یہ کہ بہترین تفسیر کسی آیت کی وہی ہے جو قرآن کے مخاطبین اوّلین کی سمجھ میں آسکتی ہو کیونکہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے لوگوں کے معیارِ فہم کی رعایت اپنے کلام میں رکھی ہوگی، نیز ایسی ہی تفاسیر ہر زمانہ کے عوام کیلئے (جو ہمیشہ اکثریت میں ہوتے ہیں) بھی قابلِ فہم ہو سکتی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ بجائے سائنسدانوں کی اصلاح کے وہ خود (یعنی ان میں کے وہ افراد جو علومِ جدیدہ سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں) تقریباً اسی قسم کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ احقر نے ماہنامہ "البلاغ" کراچی کے ۱۹۸۱ء کے شماروں میں مولانا محمد شہاب الدین ندوی ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور، بھارت کے ایک طویل مضمون "قرآن مجید اور علم حیاتیات" کی صرف چھ قسطیں پڑھی ہیں جو تقریباً چالیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، اور جن میں موصوف نے سورۂ اعلیٰ کی صرف تین ابتدائی آیات یعنی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۝ کی تفسیر کی ہے۔ خدا جانے وہ ان قسطوں میں بھی پوری ہوئی یا نہیں، کیونکہ باقی اقساط احقر کو دیکھنے کو نہیں ملیں۔ ان آیات کا تفسیری ترجمہ بیان القرآن کے مطابق یہ ہے:-

(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (اور جو مومن آپ کے ساتھ ہیں) اپنے پروردگار عالیشان

کے نام کی تسبیح (و تقدیس) کیجئے (۱) جس نے (ہر شئی کو) بنایا پھر (اسکو) ٹھیک بنایا (یعنی ہر شئی کو مناسب طور پر بنایا) (۲) اور جس نے (جانداروں کیلئے ان کے مناسب چیزوں یعنی انکے رہنے سہنے کا طریقہ حصول غذا کے اور بقائے نسل وغیرہ کو) تجویز کیا۔ پھر ان جانداروں کو ان چیزوں کی طرف، راہ بتلائی (یعنی ان کے طبائع کو ان اشیاء کیطرف راغب کر دیا۔)

جو عام فہم اور تسلی بخش ہے یعنی اسکو پڑھ کر ان آیات کا مطلب ایسا واضح ہو جاتا ہے کہ کسی قسم کی تشنگی نہ کسی عامی کو باقی رہ سکتی ہے اور نہ کسی بڑے سے بڑے سائنسداں کو۔ لیکن اگر غیر ضروری تفصیلات و تشریحات کو "بہتر تفسیر" کا لقب دیکر (احقر کے نزدیک بات کا بتنگڑ بنا کر) پیش کیا جائے تو واقعی دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہوں گے، اور اگر اس حشو و زوائد کو کلام الٰہی کے عجائبات میں شمار کیا جائے تو ایسے عجائبات تو ہر جاہل سے جاہل (بلا تخصیص مؤمن و کافر) کے کلام میں بھی مل سکتے ہیں۔ مثلاً میں کہوں کہ فلاں نے کھانا کھایا تو کھانے کی تفصیل میں تمام علوم جدیدہ کا ذکر اور ان کے مسائل بیان کئے جا سکتے ہیں، فاضل مضمون نگار نے تو آیات مذکورہ کی تشریح میں صرف علم حیاتیات (ص ۱۵۰ تا ۱۵۶) ہی کا ذکر فرمایا ہے لیکن یہ ذکر ایسا ہی ہوگا جیسا کسی کے سوال کرنے پر کسی نے اپنی کیفیت یہ بتلائی تھی۔ "ایسے خدا کے بندہ بیٹا جس نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے چھ روز میں پیدا کیا اور تکان نے اسکو چھوا تک نہیں۔

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ضرورت کے مواقع پر بھی تفصیل و تشریح نہ کیجائے، نہیں بلکہ ضرور کیجائے، لیکن ضرورت کا موقعہ وہ ہے جہاں لفظی ترجمہ باعث اشکال ہو، یا باعث اشکال تو نہ ہو لیکن اس سے شرح صدر نہ ہو، یا شرح صدر بھی ہو جائے لیکن محض علمی اور اعتقادی حد تک جسکو کسی معروف مثال کے ذریعہ حق الیقین میں بدلا جا سکتا ہو، پہلے موقعہ کی مثالیں اس قسم کی آیات ہو سکتی ہیں۔ وَ اَن لَیسَ لِلاِنسَانِ اِلَّا مَا سَعیٰ (اس سے ایصال ثواب کی نفی ہوتی ہے حالانکہ احادیث سے یہ ثابت ہے) ءَاَمِنتُم مَن فِی السَّمَاءِ (سے اللہ تعالیٰ کا آسمان میں ہونا معلوم ہوتا ہے، حالانکہ وہ ہر جگہ موجود ہے) وَ اِن تَعُودُوا نَعُد (یہ اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر کے بعد کفار مکہ سے خطاب کیا ہے کہ اگر تم پھر ایسا ہی کرو گے یعنی مسلمانوں سے قتال تو ہم بھی پھر ایسا ہی کریں گے یعنی تم کو مغلوب اور مسلمانوں کو غالب، لیکن اگلے سال جنگ احد میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کے خلاف ہوا یعنی کفار غالب تھے تو کفار کے اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ معاذ اللہ خلاف حقیقت ہی رہا، وجہ خواہ کچھ بھی ہو، ربط آیات بیان کر دینے کے مواقع بھی اسی ذیل میں آتے ہیں، مثلاً سورۂ ماعون میں

آیت فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ ہم عَنْ صَلٰوتِہِمْ سَاہُوْنَ میں کلمہ فا کی مناسب توجیہ ضروری ہے ورنہ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ دوسرے موقعہ کی مثالیں اس قسم کی آیتیں ہیں: اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا۔ یہاں صبًّا اور شقًّا مفعول مطلق اپنے اپنے افعال کے "عجیب طور پر" انجام دیئے جانے کو ظاہر کرتے ہیں، پس شرح صدر کے لئے "عجیب طور" کی کچھ تشریح کر دینا بہتر ہے، تیسرے موقعہ کی مثال میں یہی آیت خَلَقَ فَسَوّٰی پیش کی جا سکتی ہے، جسمیں لفظ فسوّٰی کا مطلب "مناسب طور سے بنایا" ہے جسکو اعتقاداً سبھی جانتے اور مانتے ہیں لیکن اس حقیقت کو اگر کسی مناسب مثال سے واضح کر دیا جائے مثلاً مخاطب کا ذہن اس کے دانتوں کیطرف منتقل کر کے یہ تبلایا جائے کہ یہ تین قسم کے ہیں، سامنے کے دانت، کیلے یا کچلیاں اور ڈاڑھیں، مضبوطی کی ضرورت کے مطابق ان کی جڑیں بھی ترتیب سے ایک ایک دو دو تین تین ہوتی ہیں، پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ ڈاڑھیں جن سے لقمہ چبایا جاتا ہے برابروں میں پوشیدہ ہیں، اگر سامنے ہوتیں تو کسی کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھ کر بڑا گھن آیا کرتا، سر، ڈاڑھی مونچھ، بھوں اور جسم کے بال بظاہر یکساں نظر آتے ہیں، مگر خاصیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، مثلاً سب کے بڑھنے کی حد مختلف ہے جسم کا روواں، اور بھویں بھی اگر سر یا ڈاڑھی کے بالوں کی طرح بڑھا کرتیں تو ان کو چھوٹا کرنے میں پریشانی ہوتی۔ اس قسم کی لاکھوں مثالوں میں سے ایک دو کا مختصراً بیان کر دینا علم الیقین کو ایک دم حق الیقین میں بدل دینے کیلئے کافی ہے، بیالوجی (Biology) کی طویل تفصیلات میں پڑنے مثلاً یہ تبلانے کہ کلورین (chlorine) کا تناسب روئی کے ریشہ میں اتنے فیصد، جو، سیم، آلو، گنے اور ریسیم میں اتنے اتنے فیصد ہے بالکل غیر ضروری اور نامناسب ہے جیسا کہ فاضل مضمون نگار نے کیا ہے،

فاضل مضمون نگار صاحب کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ ایسی تفسیر جس میں تین انتہائی مختصر آیتوں کا بیان زائد از چالیس صفحات پر پھیلا ہوا ہو، پڑھنے کیلئے وہی شخص وقت دے سکتا ہے جو کم از کم فکر معاش سے فارغ ہو، اور سارے ہی علوم جدیدہ پڑھا ہوا ہو، کیونکہ فاضل

لہ اسی لئے مولانا اکبر شاہ خانصاحب نجیب آبادیؒ نے فرمایا ہے کہ عامۃ المسلمین کیلئے تفسیر وہی بہترین ہے جو مختصر ہو، چنانچہ انھوں نے موضح القرآن کو بہترین تفسیر کہا ہے، شاید اس وقت تک بیان القرآن شائع نہ ہوئی ہو جو مختصر ہونے کے ساتھ بعض اعتبار سے موضح القرآن پر فوقیت رکھتی ہے،

مضمون نگار کے خیال سے "قرآن حکیم میں مختلف علوم و فنون سے متعلق بے شمار اشارے کنائے موجود ہیں جنکو سمجھنے کیلئے متعلقہ علوم اور ان کی تفصیلات سے بحث کرنا پڑتا ہے۔" نیز ان کے خیال سے "تبیاناً لکل شیئ"، کا مطلب "ہر چیز کی خوب وضاحت کرنیوالی" ہے، حالانکہ علماء محققین نے "ہر چیز" سے مراد "ہر چیز متعلقہ دین"، لی ہے وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کتاب حکمت میں جس علم و فن کا بھی ماہر گہری اور عمیق نظر ڈالے گا، اسی قدر اسکی عظمت و جلال کے نقوش اس پر مرتسم ہو جائیں گے۔" ہماری موٹی سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں کہ ایک ماہر گھڑی ساز، ایک میکنکل انجینئر، ایک ماہر خیاط ایک پائلٹ (ہوائی جہاز چلانیوالا) ایک ماہر ریاضیات وغیرہ اپنے علوم و فنون کے متعلق قرآن میں کیا معلومات پائیں گے جس سے قرآن کی عظمت و جلال کے نقوش ان پر مرتسم ہو جائیں؟ بہر حال اس طویل مضمون میں تفسیر آیات سے متعلق سوائے تسویہ اور نظام ہدایت کی بعض مثالوں کے کوئی کام کی بات نظر نہ آئی۔ یہ مثالیں بھی بیالوجی کی کتابوں سے ماخوذ نہیں ہیں جس سے اس علم کی غیر متعلقہ معلومات سے اس مضمون کو پھیلانا کسی درجہ میں بھی کار آمد اور حق بجانب سمجھا جاتا

فاضل مضمون نگار نے بعض قرآنی آیات کا مفہوم بھی صحیح بیان نہیں فرمایا، چنانچہ سورۂ فرقان آیت ۶ میں لفظ "سِر"۔ سورۂ نمل آیت ۲۵ میں لفظ "خبٔ"، اور آیت ۷۵ سورۂ نمل میں لفظ "غائبۃ" ان کے نزدیک تقریباً ہم معنی ہیں جن کو سائنس کی زبان میں "قوانین فطرت" (Laws of nature) اور قرآن کی زبان میں "سر" یعنی راز سربستہ کہا گیا ہے، حالانکہ ان الفاظ کا قوانین فطرت سے کوئی تعلق نہیں۔ ان آیتوں میں ان الفاظ کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کیلئے تفسیر بیان القرآن ملاحظہ فرمائیں۔ سورۂ زمر آیت ۲۷ میں "من کل مثل" کا مفہوم "ہر ایک مثال" نہیں ہے بلکہ "ہر قسم کے ضروری اعمدہ مضامین" ہے، اور آیت ۲۵ سورۂ نمل "الا یسجدوا" میں استفہام نہیں ہے، بلکہ "الا"، "ان" اور "لا" کا مجموعہ ہے، جس کا ترجمہ "کہ نہیں"، کرنا چاہیے تھا۔

فاضل مضمون نگار نے اس مضمون کی پہلی قسط میں یہ بھی فرمایا ہے "واضح رہے کہ قرآن حکیم کو سمجھنا بظاہر اگرچہ علوم جدیدہ یا علوم سائنس کے سمجھنے پر موقوف نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ان علوم میں کمال حاصل کرکے کتاب اللہ پر گہری نظر اس حیثیت سے ڈالی جائے کہ وہ ہر دور کے لئے ہدایت نامہ ہے تو اس کا معجزہ ہونا صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔" اس عبارت میں لفظ "بظاہر"، فاضل مضمون نگار کے اس خیال کی غمازی کر رہا ہے کہ درحقیقت قرآن حکیم کو بغیر علوم جدیدہ میں کمال حاصل کئے ہوئے نہیں سمجھا جا سکتا، اور اس کا موجودہ دور کے لئے ہدایت

نام اور معجزہ ہونا بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ مضمون نگار کا یہ خیال ڈاکٹر بکائی صاحب کے خیال سے مشابہ ہے، صرف فرق اتنا ہے کہ ایک مسلم ہونیکی وجہ سے انھوں نے اسے ذرا دبی زبان میں ظاہر کیا ہے ورنہ مطلب اس کا بھی یہی ہے کہ اسلاف نے مع حضورؐ، صحابہ کرامؓ، اور جملہ ائمہ مفسرینؒ کے علوم جدیدہ سے ناواقفیت کی بنا پر معاذ اللہ قرآن کو کما حقہ نہیں سمجھا، چنانچہ "البلاغ" بابت ماہ جون ۱۹۸۱ء صفحہ ۲۲ پر وہ فرماتے ہی ہیں۔

"ہمارے ذخیرہ تفاسیر میں بھی اس سلسلہ میں بہت سے حقائق اور اصولی اعتبار سے بہت سے کارآمد نکات ملتے ہیں، جن کو ہم بنیاد بنا کر جدید علوم کی روشنی میں مزید تشریح و تفصیل پیش کر سکتے ہیں، اس طرح ہم پر سلف صالحین سے ہٹنے اور کجروی پیدا کرنے کا الزام بھی عائد نہ ہوگا" (لہ کی تشریح میں فٹ نوٹ میں فرماتے ہیں) پچھلے دور میں چونکہ سائنسی علوم کی تحقیق و تدوین اسطرح نہیں ہوسکتی تھی، جس طرح کہ عصر جدید کا خاصہ ہے اسلئے ہمارے مفسرینؒ نے اس سلسلہ میں تفصیلی بحث نہیں کی"

غرض انھوں نے اقوال سلف کی مزید تشریح و تفصیل کی آڑ میں علوم جدیدہ کی روشنی میں تفسیر کرنے کا جواز پیدا کر لیا مگر اس سے علوم جدیدہ سے ناواقف جملہ مفسرینؒ (جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل ہیں) کے متعلق جو خیال بنتا ہے اس پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا، ان کا یہ فرمانا بھی صحیح نہیں کہ علوم جدیدہ میں کمال حاصل کر کے کتاب اللہ پر گہری نظر ڈالی جائے تو اس کا معجزہ ہونا صاف ظاہر ہو جاتا ہے، علوم جدیدہ میں کمال حاصل کرنے کیلئے بڑی مدت چاہئے۔ ایسے لوگوں کو باقاعدہ علوم دین پڑھنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ہم نے تو آج تک کوئی ایسا شخص دیکھا تو کیا سنا بھی نہیں جس نے طبعیات، کیمیا، حیاتیات، فلکیات، موسمیات، علم طبقات الارض وغیرہ درجہ کمال تک پڑھے ہوں اور پھر باقاعدہ علوم دین بھی پڑھے ہوں، اور شاذ (ہزاروں میں ایک) کوئی پڑھے بھی تو چونکہ اس کا زاویۂ نظر بدل جاتا ہے اس لئے وہ قرآن کی آیتوں کو کھینچ تان کر علوم جدیدہ کے مطابق بناتا ہے، جیساکہ ہم نے تین مسلم سائنسدانوں کی تفسیری کوشش کے نمونہ اوپر پیش کئے ہیں، اور اگر کسی آیت کے بیّن طور پر واضح المراد ہونیکے سبب ایسا نہ کر سکے تو بہتر تشریح و تفصیل کی آڑ لیکر بالکل بلا ضرورت تفسیر میں علوم جدیدہ کو ٹھونستا ہے جیساکہ فاضل مضمون نگار نے کیا ہے۔ حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ قرآن (یعنی تفسیر)

کو فلسفہ اور منطق پڑھنے سے پہلے پڑھنا چاہیے جبکہ ذہن اپنی سادہ طبعی حالت پر ہو، ورنہ ان علوم سے ذہنی ساخت بدل جانے پر قرآن کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے، اور بخیال احقر علوم جدیدہ مدت تک پڑھنے کے بعد تو قرآن سمجھنا اور بھی مشکل ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ پہلے دینی علوم پڑھے اس کے بعد علوم جدیدہ پڑھے، تنقید کے ساتھ مگر ان کو تفسیر میں قطعی داخل نہ کرے۔

قرآن مجید میں سائنسی حقائق کی طرف اشارے اور ان کے متعلق مسلم سائنسدانوں کا صحیح طرز عمل

غرض قرآنی آیات کی تفسیر میں سائنس کو داخل کرنا تو بوجوہ ناپسندیدہ بلکہ مضر ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ قرآن مجید کی بعض آیتوں سے سائنسی نظریات و تحقیقات کی طرف جلی یا خفی اشارے ضرور ملتے ہیں، مثلاً۔

(۱) آسمان دھوئیں جیسی چیز سے بنائے گئے ہیں (۴۱/۱۱) سائنس کی تحقیق جو محض قیاس پر مبنی ہے وہ بھی یہی ہے کہ نہ صرف آسمان بلکہ ساری ہی کائنات کا مادہ ابتدا میں ایک قسم کی انتہائی گرم گیس (Nebula) کی شکل میں تھا، اگرچہ آسمان کی حقیقت دونوں میں ایک نہیں معلوم ہوتی، یعنی اہل سائنس زمین کے علاوہ جملہ ستاروں، سیاروں اور کہکشانوں وغیرہ کو آسمان مانتے ہیں، اور ان کے علاوہ آسمانوں کے الگ مستقل وجود کے قائل نہیں۔

(۲) قرآن کی متعدد آیتوں سے کائنات کی تخلیق ثابت ہے، (مثلاً ۵۴/۲) اور اگرچہ بعض سائنسٹ کائنات کا شروع اور اخیر نہیں مانتے تاہم بعض مثلاً آرٹ آئنسٹین اور جارج گیمو کائنات کے ازلی و ابدی ہونے کے بجائے اس کی تخلیق کے قائل ہیں۔

(۳) چاند سورج (اور اسی طرح تمام اجرام فلکی) کا حساب سے اپنے اپنے مدار میں چلتے رہنا (۲۱/۳۳، ۳۶/۴۰) یہ چیز سائنس سے بخوبی ثابت ہے،

(۴) سورج کا ایک مستقر ہے جس کی طرف وہ برابر چل رہا ہے (۳۶/۳۸) موجودہ علم فلکیات بھی سورج کا مستقر مانتا ہے، بلکہ اپنے خیال سے، ماہرین فلکیات نے اس مقام کی نشاندہی بھی کرلی ہے، اور اس کا نام بھی "راس شمسی" . . . . رکھ دیا ہے گو وہ قرآن کے مطابق نہ ہو،

(۵) آیات ۱۶/۱۵ اور ۲۱/۳۱ میں تخلیق جبال کی یہ حکمت بیان فرمائی گئی ہے کہ کہیں زمین تم لوگوں کو لیکر ہلنے اور ڈگمگانے نہ لگے اس سے اس کے متحرک ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ احقر کے خیال سے چونکہ سطح زمین کے تین چوتھائی رقبہ میں گہرا سمندر ہے اور پانی اس مادہ سے ہلکا ہے جس سے

باقی ایک چوتھائی رقبہ قشر زمین (Earth's Crust) کا اپنی پوری جسامت میں بنا ہے یعنی مٹی وغیرہ کے مقابلہ میں، اسلئے اگر بھاری بھاری پہاڑ پہاڑیاں نہ بنائی جاتیں تو زمین کا مرکز ثقل کرّہ کے اصل مرکز سے ہٹا ہوا ہوتا جس سے حرکت کے وقت توازن باقی نہ رہتا اور اضطراری زلزال یا ڈگمگاہٹ پیدا ہوتی۔ اس سے زمین کے بھی دوسرے اجرام فلکی کیطرح اپنے مدار میں سفر کرتے رہنے کیطرف اشارہ ملتا ہے، یوں بھی چونکہ زمین اجرام فلکی کی طرح ایک کرّہ ہے اسلئے گھومنے میں ان کے مشابہ ہونے پر عقلی استدلال پکڑا جا سکتا ہے۔

(۶) قرآن نے سورج کو سِرَاجٌ وَهَّاج (بھڑکتا ہوا چراغ) اور چاند کو محض "نورانی" کہا ہے (۱۰/۵، ۲۵/۶۱، ۷۱/۱۶، ۷۸/۱۳) جس سے یہ اشارہ نکل سکتا ہے کہ چاند خود روشن نہیں بلکہ اس کی روشنی سورج سے مستعار ہے،

(۷) انسان کی پیدائش اچھلتے ہوئے پانی (مَآءٍ دَافِقٍ) یعنی مادّہ منویہ سے ہوتی ہے، جو پشت اور سینہ کے درمیان سے نکلتا ہے، یہ بیان جدید طبی تحقیق کے مطابق ہے۔ (۸۶/۷)

(۸) پیدائش انسان کی تفصیل یعنی جنین کا مختلف حالتوں سے گذرنا (۲۳/۱۲ تا ۱۴) اسکی بھی طبی سائنس تصدیق کرتا ہے۔

(۹) قرآن میں بادلوں کو پر آب کرنیوالی ہواؤں (لَوَاقِحَ) کا ذکر ہے (۱۵/۲۲) جس سے بارش ہونے کے طریقہ پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز ۸۰/۲۵ میں صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا سے پانی کا عجیب طور سے برسانا معلوم ہوتا ہے، جس سے بارش کے متعلق پوری سائنسی معلومات کیطرف اشارہ ملتا ہے،

(۱۰) قرآن میں رات و دن کے تواتر اور انکے گھٹنے بڑھنے کا بیان ایسے الفاظ میں ہوا ہے جن سے زمین کی محوری گردش کیطرف کھلا اور اس کے محور کے جھکاؤ کیطرف خفی اشارہ ملتا ہے جیسا کہ نمبر (۲۳) میں بالتفصیل بیان ہوا ہے۔

(۱۱) قرآن کی بہت آیتوں میں قیامت کے حالات بیان ہوئے ہیں خصوصًا سورۂ تکویر اور سورۂ انفطار کی شروع کی آیتوں میں۔ سائنسداں بھی قیامت کا امکان تسلیم کرتے ہیں، مگر اسکے وقوع کی کوئی خاص صورت متعین نہیں کر سکے، جو حالات ان دونوں سورتوں میں بیان ہوئے ہیں ان کا بھی ممکن ہونا قیامت کی بعض صورتوں میں انھیں تسلیم ہے،

ڈاکٹر بکائی کے نزدیک انکے علاوہ بھی بعض امور ایسے ہیں جن میں قرآن کا بیان اپنے زمانہ کے مروّجہ خیالات سے مختلف اور موجودہ سائنسی انکشافات کے مطابق ہے

مثلاً بارش کے پانی کے ایک حصہ کا نباتات کی نشو ونما کرتے ہوئے زمین کی گہرائیوں میں اتر کر محفوظ رہنا (۲۳ / ۱۹:۱۸) جیساکہ کنوؤں اور چشموں کی شکل میں ہم دیکھتے ہیں ۔ آبی دورہ کے متعلق صحیح معلومات ۱۵۸۰ء میں حاصل ہوئی ہیں ۔ مگر قرآن کے اس قسم کے بیان کی ندرت صرف ایسے لوگوں پر واضح ہوسکتی جو ڈاکٹر بکائی کی طرح ان امور کی تاریخ تلاش کرکے زمانہ نزول قرآن نیز اس سے پہلے اور پچھلے زمانہ کے لوگوں کے خیالات معلوم کرسکتے ہوں ، اس لئے فہرست بالا میں ہم نے ایسے امور کو نہیں لیا ۔ ہمیں کہنا یہ ہے کہ دیندار مسلم سائنسدانوں کو چاہئے کہ قرآن مجید سے ایسے تمام اشاروں کی ایک مفصل ومشرح فہرست تیار کریں اور اسکو قرآن کے کلام الٰہی ہونیکے ثبوت میں منجملہ دوسرے ثبوتوں کے غیر مسلموں پر تبلیغی و دعوتی حیثیت سے پیش کریں ۔ یہ ایک بڑی دینی خدمت موجب اجر عظیم انشاء اللہ ہوگی ۔ اُن کا یہ کام نہیں کہ وہ قرآن مجید کی تکوینی آیات کی صداقت علوم جدیدہ کے نظریات وانکشافات کی روشنی میں جانچیں ، کیونکہ مسلم ہونیکی حیثیت سے وہ قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان رکھتے ہیں ۔ البتہ ایک غیر مسلم کو ایسا کرنے کا پورا حق ہے ، اور ہمیں بھی اُسے اِس کام کی ترغیب ودر جو مدد اس میں ممکن ہو دینا چاہئے ۔

اب ہم قرآنی آیتوں کی تفسیر میں سائنس داخل کرنیکے متعلق اکابر کے خیالات ہدیہ ناظرین کررہے ہیں ، بغور ملاحظہ ہوں ۔

کتابچہ " قرآن حکیم اور جدید سائنس " اور اس پر کریم الدین صاحب کے تبصرہ کے متعلق شاہ محمد ابرار الحق صاحب مدظلہٗ خلیفہ مجاز حضرت تھانویؒ کی رائے عالی اور مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب خلیفہ شاہ وصی اللہ صاحبؒ و خلیفہ حضرت شیخ الحدیث کی تصدیق ۔

مکرم ومحترم جناب کریم الدین صاحب ریٹائرڈ انجینیئر مجھ کو قرآن حکیم اور جدید سائنس " کتابچہ اور اس پر اپنا تحریر کردہ تبصرہ دکھلاکر مجھ سے اول الذکر کے متعلق اِس جہت سے اظہار خیال کے متمنی ہوئے کہ اس کا مطالعہ عوام مسلین کیلئے کیسا ہے ؟ اس سلسلہ میں بجائے خود کچھ کہنے کے مجھے یہ بہتر معلوم ہوا کہ حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ کے وعظ " تقویم الزیغ " سے کچھ عبارت بطور اقتباس پیش کردوں ، وھو ھٰذا ۔

اسی طرح آج کل قرآن کی غلط تفسیر کی جاتی ہے اور زور دیکر کہا جاتا ہے کہ اس کا یہی مطلب ہے ، حالانکہ نہ وہ مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا ، نہ صحابہ کرامؓ نے سمجھا ، نہ خدا تعالیٰ نے بتلایا ..... چنانچہ مسلمانوں کے ایک بڑے فرقے کی یہ کوشش

ہے کہ قرآن شریف کی آیتوں کو جس طرح بن سکے سائنس پر منطبق کیا جائے، اور ایسے
لوگ علماء پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ لکیر کے فقیر ہیں۔ صاحبو! میں دعویٰ کرتا
ہوں کہ سائنس کا کوئی تحقیقی مسئلہ قرآن شریف کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ اور تحقیقی
کی قید میں نے اس لئے لگائی ہے کہ سائنس کے مسائل دو قسم کے ہیں، ایک وہ
ہیں کہ محض تخمین سے اُن میں کام لیا گیا ہے اور اکثر اسی قسم کے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں
جو تحقیق سے ثابت ہوئے ہیں۔ تو جو مسائل تحقیقی ہوں گے وہ کبھی قرآن شریف
کے دعویٰ کے معارض نہیں ہوں گے کیونکہ قطعی عقلی قطعی نقلی کے معارض نہیں ہو
سکتا.... تو ذرا اس میں بھی تو غور کرو کہ اہل سائنس کے جتنے دعاوی ہیں سب
صحیح بھی ہیں یا نہیں... سائنس کی رو سے آسمان کا قطعی طور سے عدم ثابت نہیں ہو سکتا
آج تک جتنی دلیلیں نفی آسمان پر قائم کی گئی ہیں ان سب کا خلاصہ عدم العلم ہے جو عدم
الوجود کو مستلزم نہیں، اور وجود آسمان دلیل قطعی سے ثابت ہے۔"

۔ ایک صاحب مجھ سے ملے، کہنے لگے کہ ڈاکٹری تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ منی میں کچھ کیڑے
ہوتے ہیں مجھے مدت سے خیال تھا کہ قرآن شریف سے بھی یہ بات ثابت ہو تو اچھا ہے۔
چنانچہ میں ایک روز قرآن پڑھ رہا تھا اس میں یہ آیت نکلی خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ
اور علق جونک کو کہتے ہیں، مجھے بہت خوشی ہوئی، بھلا خیال تو فرمائیے کہ آیت کے یہ
معنی ہیں؟ کہاں جونک کہاں کیڑے۔ کہاں ڈاکٹری کے مسائل، کہاں قرآن شریف
اسکی بالکل ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص فن طب کی کتابوں میں کپڑا بُننے کی ترکیب
تلاش کرنے لگے.... صاحبو! جس فن کی کتاب ہو اُسی فن کے مسائل اسمیں تلاش
کرنے چاہئیں... قرآن شریف طبّ روحانی اور تہذیب نفس کی کتاب ہے تو جیسے
طبّ ابدان میں زراعت و صناعی کے مسائل نہ ملیں گے، قرآن شریف میں بھی
بجز طبّ روحانی کے دوسرے مسائل کی تلاش سعی لاحاصل ہے۔ اور اگر کسی دوسری
چیز کا ذکر آیا بھی ہے تو وہ کسی روحانی مرض کے دفع کیلئے، مثلاً منجملہ امراض روحانی
کے ایک مرض جہل باللہ و بصفاتہ بھی تھا، قرآن شریف نے اسکو دفع کیا، اور
اس ضرورت کیلئے یہ فرمایا کہ "اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ ... وَالنَّهَارِ" جس کا خلاصہ
یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات معلوم کرنے کیلئے مصنوعات میں غور کرو گو..

(صرف انکے) مطلق موجود اور مصنوع ہونیکے اعتبار سے، پس قرآن شریف میں ایک مسئلہ بھی سائنس کا بحیثیت سائنس کے مذکور نہیں، اور ہم اس پر فخر کرتے ہیں۔ مسلمانو! خدا کی قسم یہ قرآن کا غایت درجہ کمال ہے کہ اسمیں یہ خرافات نہیں ہیں، نہ قرآن شریف کو اسکی ضرورت کہ زبردستی اس میں ان مسائل کو داخل کیا جائے۔

؎ بنقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را !!

"اگر قرآن شریف میں یہ خرافات ہوتے تو وہ کتاب الطبیعات ہوتی نہ کہ طب روحانی، لہذا قرآن شریف سے کیڑوں وغیرہ کا وجود ثابت کرنیکی کوشش "دوستی بے خبر چوں دشمنی ست" ہے میں کہتا ہوں کہ اگر علق کے یہی معنی ہیں جو کہ ان ڈاکٹر صاحب نے فرمائے تو کیا وجہ کہ اسکو نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا نہ ابوبکرؓ سمجھے نہ دوسرے صحابہؓ اور تابعین نے سمجھا۔ چنانچہ کسی نے یہ تفسیر نہیں کی۔ اگر کہا جائے کہ آج مسئلہ کی تحقیق ہوئی ہے، اس سے پیشتر یہ محقق نہ تھا تو اس میں اول تو اپنے اسلاف کے کتنے بڑے جہل کا اقرار ہے۔ دوسرے اگر کوئی ملحد تم سے کہے کہ تمہارا قرآن شریف نازل ہوا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور پڑھا تمام صحابہؓ اور تابعین نے لیکن سمجھا ہم نے تو تم کیا جواب دوگے؟ اور اگر قرآن شریف ایسا ہی وسیع ہے کہ اسمیں ہر چیز کو داخل کیا جاسکتا ہے تو پھر اپنے کو اور اپنے متعلقین کو بھی داخل کردو جیسے کسی دیہاتی امام نے اپنے تین مقتدی ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو خوش کرنے کیلئے سورۂ اعلی کے آخر میں صُحُفِ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوسیٰ کے بعد "وعیسی" بڑھا کر پڑھ دیا تھا"

"مجھے ایک مقام پر ایک ڈاکٹر ملے، کہنے لگے کہ جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہیکہ جسطرح حیوانات میں مذکر مؤنث کا جوڑا ہوتا ہے، اسی طرح نباتات کے تخم میں بھی ہوتا ہے کہ تخم کا ایک حصہ نر ہوتا ہے دوسرا مادہ، مجھے خیال ہوا کہ قرآن شریف سے بھی یہ بات ثابت ہو تو بہت خوب ہو... آخر ایک روز بیوی سورہ یٰسٓ پڑھ رہی تھی اس میں جو یہ آیت پڑھی سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ تو فوراً سمجھ میں آگیا کہ اس آیت میں وہ مسئلہ مذکور ہے... صاحبو! یہ خبط نہیں تو کیا ہے، اس آیت کو اس مسئلہ سے کیا تعلق؟ زوج کے معنی خاص میاں بیوی کے نہیں ہیں بلکہ مطلق جوڑے کے معنی ہیں خواہ وہ مذکر و مؤنث کے طور پر ہو یا دوسرے

طور پر چنانچہ زوجی الخف بولتے ہیں، پس حق تعالیٰ نے اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ نباتات میں بھی اقسام مختلفہ ہیں مزید کہ (آیت کے اعتبار سے) ان میں میاں بیوی ہے ... اسکے علاوہ اور بہت مسائل ہیں جو کہ بالکل تخمینی ہیں اور وہ قرآن شریف سے کچھ تعلق نہیں رکھتے اور میں کہتا ہوں کہ اگر ان مسائل سائنس پر قرآن شریف کی تفسیر کی بنا رکھی جائے اور چند روز کے بعد یہ دعاوی سائنس کے کاذب ثابت ہوں تو اسکی کیا تدبیر کی جائے گی کہ ملحدین اسوقت آپ کو کہیں کہ دیکھئے تمہارے محققین اس مسئلہ کو قرآن شریف کا مدلول بتلا گئے ہیں، اور یہ مسئلہ غلط ثابت ہوا، تو قرآن شریف کا غلط ہونا ثابت ہو گیا۔ اس کا کیا جواب دوگے؟ افسوس ہمارے مسلمان بھائی ذرا غور نہیں کرتے کہ اس کا کیا انجام ہوگا۔"

اب یہ فیصلہ میں قارئین کرام پر ہی چھوڑتا ہوں کہ "کتابچہ" قرآن حکیم اور جدید سائنس" مسلمانوں کے لئے مفید ہے یا مضر، اور انجینئر صاحب کے تبصرہ کی اشاعت ضروری ہے یا نہیں؟ البتہ اتنی گذارش ضرور کردوں گا کہ چونکہ حضرت حکیم الامتؒ کے وعظ کے اس اقتباس میں انجینئر صاحب کے تبصرہ کی روح کھینچ کر آگئی ہے اس لئے اس کے ساتھ اس اقتباس کو بھی چھپوا دینا بہت مفید ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو زیغ سے بچا کر صراط مستقیم پر قائم رکھیں۔ آمین۔

ابرار الحق ۲۲ ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ
خلیفہ حضرت حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ۔

مجھے حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب مدظلہ کی رائے سے کامل اتفاق ہے
عبد الحلیم (رکن شوریٰ دار العلوم دیوبند) و مظاہر علوم سہارنپور)
خلیفہ حضرت شاہ وصی اللہ و خلیفہ حضرت شیخ الحدیثؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذکر و فکر

مولانا محمد تقی عثمانی

دینی مدارس کا نصاب و نظام

حمد و ستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا

اور

درود و سلام اس کے آخری پیغمبرؐ پر جنھوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

آئندہ جمادی الثانیہ کے وسط میں وفاق المدارس العربیہ کا ایک اجلاس دینی مدارس پر غور کرنے کیلئے منعقد ہو رہا ہے گذشتہ سال شعبان میں وفاق کی ایک کمیٹی نے نصاب پر نظرثانی کرکے ایک سولہ سالہ نصاب تجویز کیا تھا جس پر سال رواں کے آغاز سے بعض مدارس میں عمل شروع کر دیا گیا ہے، اس دوران متعدد مدارس کی طرف سے اس نصاب پر کچھ اشکالات بھی پیش کئے گئے، اس اجلاس کا مقصد ان اشکالات کا، نیز جن مدارس نے اس سال اس نصاب پر عمل کیا ہے، انکے عملی تجربات کا جائزہ لینا ہے، تاکہ آئندہ کوئی متفقہ لائحۂ عمل تیار کیا جا سکے۔

دینی مدارس کے نصاب میں ترمیم و اضافہ کی آوازیں مختلف حلقوں سے بار بار اٹھتی رہی ہیں۔ اور ہم نے بھی "البلاغ" کے ان صفحات میں متعدد مرتبہ اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے، لیکن اس سے قبل جو کچھ عرض کیا گیا، اس کی حیثیت جزوی اور ضمنی سی تھی آج جبکہ دینی مدارس کا یہ نمائندہ اجتماع اس موضوع پر اصولی غور و فکر کیلئے منعقد ہو رہا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ اپنی گذارشات پیش کر دی جائیں۔ واللہ المستعان

جو لوگ دینی مدارس کے نظام سے براہِ راست وابستہ نہیں ہیں، اور جن کو اس نظام تعلیم کا کوئی عملی تجربہ حاصل نہیں ہے، اُنکی طرف سے بسا اوقات اس قسم کی تجویزیں سامنے آتی رہتی ہیں کہ ان مدارس کے نصاب میں سائنس، ریاضی اور انجینئرنگ وغیرہ کی معیاری تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے، تاکہ جو علماء ان دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر نکلیں، وہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ ان تجربی علوم میں بھی کماحقہ درک اور بصیرت رکھتے ہوں۔

یہ تجویز خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ پیش کی جاتی ہو، لیکن نہایت سطحی تجویز ہے جو درحقیقت دینی مدارس کے مقاصد سے ناواقفیت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ دینی مدارس کا مقصد ایسے صاحب استعداد علماء پیدا کرنا ہے جو قرآن و سنّت اور انکے متعلقہ علوم میں ماہرانہ بصیرت کے حامل ہوں، اور یہ مقصد جس ذہنی یکسوئی اور ہمہ تن توجہ کا متقاضی ہے، اسکی موجودگی میں یہ بات قریب قریب ناممکن ہے کہ ایک شخص بیک وقت اونچی استعداد کا حامل عالم دین بھی ہو اور ساتھ ساتھ ماہر ڈاکٹر، انجینئر، سائنسداں، یا ماہر معاشیات بھی ہو،

یہ بات یوں تو ہر دَور میں سچ تھی، لیکن آج کا زمانہ، جسے ہر علم وفن میں اختصاص کا دَور کہا جاتا ہے اس میں روز روشن کیطرح واضح ہوگئی ہے، آج اگر کوئی شخص علم طب کو اپنا خصوصی موضوع بناتا ہے، اور میڈیکل سائنس میں مہارت حاصل کرتا ہے تو کوئی بھی صاحب عقل اُس پر یہ اعتراض نہیں کرسکتا کہ وہ ڈاکٹر ہونیکے ساتھ ساتھ انجینئر کیوں نہیں ہے؟ یا اگر کوئی شخص انجینئرنگ کے شعبے میں فارغ التحصیل ہوتا ہے تو اُس پر کوئی ہوش مند یہ اعتراض نہیں کرتا کہ اس نے میڈیکل سائنس کیوں نہیں پڑھی؟

اسی طرح اگر کسی سائنسی تعلیم کے ادارے میں تمام تر توجہ سائنس کی تعلیم پر دی جاتی ہے، تو کوئی شخص وہاں یہ اعتراض پیش نہیں کرتا کہ اس ادارے میں ادب، شاعری، یا کلاسکس کی تعلیم کیوں نہیں ہوتی؟ کسی کامرس کالج پر یہ اعتراض کبھی نہیں کیا جاتا کہ یہاں سے انجینئر کیوں پیدا نہیں ہوتے؟ کسی لاء کالج کے بارے میں کبھی یہ تجویز نہیں سُنی گئی کہ اس میں فلکیات کی تعلیم بھی ہونی چاہیئے۔

سوال یہ ہے کہ اگر دینی مدارس کی تمام تر توجہ اسلامی علوم کے ماہرین پیدا کرنے پر مرکوز ہے اور وہاں سے کوئی ڈاکٹر، انجینئر، سائنسداں یا ماہر معاشیات پیدا نہیں ہوتا تو اس بات پر اس قدر تشویش اور واویلا کیوں ہے؟ کیا تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور

انکے متعلقات ایسے علوم نہیں ہیں کہ ان کے درس و تدریس کے لئے کچھ ادارے مخصوص ہوں جو ہمہ تن انہی علوم پر محنت کرکے انہی کی خدمت انجام دیں، اور انہی علوم کے متخصص علماء پیدا کریں؟ اگر کوئی شخص واقعۃً ایسا سمجھتا ہے تو اسکی ناواقفیت پر اظہار افسوس کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے! لیکن اگر کوئی شخص ان علوم کی اہمیت اور عظمت کا کسی بھی درجے میں احساس رکھتا ہے تو اُسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ علماء دین سے انجینئر اور سائنسدان بننے کا مطالبہ کس قدر غلط، غیر حقیقت پسندانہ اور ناقابل عمل ہے ۔

بعض حضرات دینی مدارس کی خیر خواہی اور ہمدردی میں یہ تجویز بھی پیش فرماتے رہے ہیں کہ ان درسگاہوں میں دستکاری کے ہنر سکھانے اور دوسری تکنیکی تربیت کا بھی انتظام ہونا چاہئے تاکہ جو علماء یہاں سے فارغ التحصیل ہوں، وہ معاشی اعتبار سے معاشرے پر بوجھ بننے اور دوسروں کے دست نگر ہونے کے بجائے اپنے معاش کا انتظام اپنے ہاتھ کے ہنر سے کرسکیں اور دین کی خدمت کسی معاوضے بغیر انجام دیں ۔

یہ تجویز بھی خواہ کتنی نیک نیتی سے پیش کی گئی ہو، اور بظاہر کتنی خوشنما معلوم ہوتی ہو حقیقت پسندی سے بہت دُور اور ناقابلِ عمل ہے ۔ ـــ پہلی بات تو وہی ہے کہ اگر ان دینی مدارس کا مقصد قرآن وسنت کے علوم میں بصیرت رکھنے والے علماء پیدا کرنا ہے تو یہ علوم اپنی تحصیل اور اپنی خدمت کے لئے پورا وقت چاہتے ہیں ، اور آج کی زندگی جس قدر پیچیدہ ہو گئی ہے اس میں تجربہ یہی ہے کہ تکنیکی کاموں میں لگ جانیکے بعد ان علوم کی خدمت محض ایک آرزو ہو کر رہ جاتی ہے ، جو ساری عمر پوری نہیں ہوتی ۔ بعض طلباء نے علم دین کے ساتھ ساتھ یہ تکنیکی ہنر سیکھے ، لیکن اس عملی تجربے میں شاید کوئی استثناء نہ ہو کہ فارغ التحصیل ہونیکے بعد اگر طالب علم دینی علوم کی خدمت میں لگا تو اپنے ہنر کیطرف توجہ نہ دے سکا ، اور اس ہنر کے ذریعے کسب معاش میں مصروف ہوا تو علوم دین سے تعلق باقی نہ رکھ سکا ۔ لہٰذا جو مدارس اعلیٰ قابلیت کے علماء تیار کرنے کے لئے قائم ہوئے ہیں ان کے لئے یہ نہ ممکن ہے ، اور نہ مناسب ، کہ وہ اپنے طلباء کو علوم دین کے ساتھ تکنیکی تربیت دینے کا بھی انتظام کریں ۔

دوسرے یہ عجیب تصور ہے کہ اگر کوئی شخص معاشرے کی دینی ضروریات پوری کرکے کوئی اجرت یا تنخواہ وصول کر رہا ہے تو وہ معاشرے پر بوجھ بن گیا ، دوسروں کا دست نگر بن گیا ہے

و فن کے ہر شعبے کا قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص جس علم و فن میں مہارت حاصل کر کے اس شعبے معاشرے کی خدمت انجام دیتا ہے، اس کا معاش بھی اسی شعبے سے وابستہ ہوتا ہے ور اگر وہ اس شعبے میں معاشرے کی خدمت انجام دینے کی بنا پر کوئی اجرت یا تنخواہ وصول رتا ہے تو اس میں معاشرے پر بوجھ بننے یا کسی کا دست نگر ہونے کا کوئی سوال نہیں، بلکہ یہ اس معاشرتی نظام کا ایک لازمی حصہ ہے جس پر پوری انسانیت کی بنیاد قائم ہے، اگر کوئی طبیب انجینئر، ماہر معاشیات، یا سائنسدان اپنے شعبے میں معاشرے کی خدمت کرتا ہے، اور اسکے صلے میں معاشرہ اُسے معاشی فوائد بہم پہنچاتا ہے تو نہ یہ اس پر کسی کا احسان ہے، اور نہ اس کی بنا پر یہ سمجھنا درست ہے کہ وہ معاشرے پر بوجھ بن رہا ہے، یا دوسروں کا دست نگر ہے،

سوال یہ ہے کہ کیا علوم دین کی خدمت معاشرے کی کوئی ضرورت نہیں؟ کیا ایک مسلمان معاشرے کو ایسے اہل علم کی حاجت نہیں جو اُس کی دینی ضروریات پوری کر سکیں؟ انکو نت نئے مسائل میں دین کی رہنمائی فراہم کر سکیں؟ ان کے بچوں کو دینی تعلیم دے سکیں؟ انکے دینی مستقبل کے تحفظ کیلئے اپنی زندگیاں وقف کر سکیں؟ دین پر حملہ آور فتنوں کا مؤثر تعاقب کر سکیں؟ اور دین سے متعلق وہ تمام امور انجام دے سکیں جو دوسرے کاموں میں مشغول افراد انجام نہیں دے سکتے

اگر یہ ایک مسلمان معاشرے کی اولین ضرورت ہے، اور کون ہے جو اس حقیقت کا انکار کر سکے! تو اگر معاشرہ ان خدمات کے صلے میں ایسے اہل علم کو اپنے معاش سے بے فکر کرنے کیلئے اپنا فریضہ ادا کرتا ہے تو یہ کونسا احسان ہے، جو ان اہل علم پر کیا جا رہا ہے! اور اسکی بنا پر یہ خیال آخر کیوں پیدا ہوتا ہے کہ وہ معاشرے پر بوجھ اور دوسروں کے دست نگر ہیں! اس لئے انھیں اپنی معاشی کفالت کیلئے کوئی اور ہنر سیکھنا چاہئے؟

بعض حضرات دینی مدارس کے نصاب و نظام میں ترمیم کے اس بنا پر خواہشمند رہتے ہیں کہ ان مدارس کی سند دنیا کی دوسری یونیورسٹیوں میں تسلیم کر لی جائے، اور یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو ان یونیورسٹیوں میں داخلہ مل سکے، یا ان سندوں کے حامل طلبہ کو سرکاری اداروں وغیرہ میں ملازمتیں مل سکیں، اور چونکہ دوسری یونیورسٹیوں کے ساتھ معاملہ ان مدارس کے نصاب و نظام میں تبدیلی کئے بغیر ممکن نہیں نظر آتا، اس لئے وہ اس نظام میں ترمیم کی خواہش رکھتے ہیں۔

ہماری نظر میں یہ طرز فکر بھی درست نہیں، ہمارے نزدیک دینی مدارس کے نصاب و نظام

پر خالصۃً اس نقطۂ نظر سے غور ہونا چاہئے کہ ایک با استعداد اور صاحب بصیرت عالم دین کی حقیقی ضروریات کیا ہیں؟ اور وہ کس طرح پوری ہوسکتی ہیں؟ اس نقطۂ نظر سے نصاب ونظام میں جن ترمیمات کی ضرورت ہو، انکو بیشک اختیار کیا جائے، لیکن محض اس بنا پر ان مدارس کے مزاج و مذاق سے ہٹ کر کوئی تبدیلی کرنا کہ اُن کی سند دوسری یونیورسٹیوں یا سرکاری اداروں میں مقبول ہوجائے، ان دینی درسگاہوں کی بنیادی روح کے منافی ہے۔

دینی مدارس کی بنیاد جس اخلاص، للّٰہیت، ایثار اور جذبۂ خدمتِ دین پر رکھی گئی تھی اس میں اس بات سے کبھی کوئی بحث نہیں کی گئی کہ ان کی سندیں بازار میں کیا قیمت رکھیں گی،؟ اکابر علمائے دیوبند میں سے کتنے حضرات تھے جنھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کبھی سند لی ہی نہیں، اس کے بجائے اصل مسئلہ یہ تھا کہ یہاں کے فارغ التحصیل علماء میں دینی علوم کی اعلیٰ مہارت، اتباعِ سنّت کا جذبہ، خشیت وتقویٰ، انابت الی اللہ اور جذبۂ خدمتِ دین کس طرح پیدا ہو،؟

اور واقعہ یہ ہے کہ دینی مدارس اگر اپنے مطلوبہ معیار کے مطابق کام کریں، اور اُن سے اُسی صلاحیت کے اہل علم پیدا ہوں جس صلاحیت کے علماء کی ضرورت ہے اور جسکی آبیاری ان مدارس کا بنیادی مقصود ہے، تو اس بات کی ضرورت ہی باقی نہ رہے، کہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ دوسری یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے محتاج ہوں، یا سرکاری اداروں میں اپنی اسناد منظور کرانے کی درخواستیں لئے پھریں۔ اسکے بجائے ان مدارس کو خود اپنا تعلیمی اور تربیتی معیار بلند کرنے کی فکر کرنی چاہیئے، اور یقین ہے کہ اگر یہ مطلوبہ معیار حاصل ہوگیا تو تمام دوسرے ادارے چار ونا چار ان کی سند کو تسلیم کرنے پر از خود مجبور ہوں گے،

ہمارے دینی مدارس جس علم کے امین اور جس مزاج و مذاق کے وارث ہیں، اس میں یہ بات انکے لیئے عار ہے کہ وہ دوسروں سے اپنی علمی استعداد کی شہادت حاصل کرنے کیلئے درخواستیں اپیلیں یا مطالبے کرتے پھریں، اس علم کا مزاج تو یہ ہے کہ اپنے حصّے کا کام ٹھیک ٹھیک انجام دینے کے بعد انسان اپنی دھن میں لگ جائے، کسی کو ہزار مرتبہ ضرورت پڑے تو وہ اپنی غرض اور اپنی ضرورت سے اسطرف رجوع کرے ورنہ اسکو اپنی علمیت منوانے کی چنداں حاجت نہیں۔ اور ماضی کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ جن حضرات نے ان مدارس میں رہ کر علمی اور عملی کمال حاصل کرلیا، ان کو کبھی کہیں اپنی سند دکھانے کی ضرورت نہیں پڑی، اور ان کی خدمات

کے طلبا صرف دینی مدارس ہی میں نہیں بلکہ اعلیٰ یونیورسٹیوں سے لیکر سرکاری اداروں تک اتنے رہے ہیں کہ ان کو کبھی ناقدری کا شکوہ نہیں ہوا۔

لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ہوا جب انھوں نے اپنے آپ کو پورے اخلاص کے ساتھ زیور علم سے آراستہ کیا، اور صرف نام کے فارغ التحصیل ہونے کے بجائے واقعۃً علوم دین کیلئے اپنی زندگی وقف کردی، انھوں نے دنیا طلبی کے لئے علم حاصل نہیں کیا، بلکہ خدمتِ دین کو اپنا مشن بنایا، لیکن عملاً ہوا یہ کہ دنیا بھی ان کے قدموں میں ذلیل و خوار ہوکر پہنچی، اور معاشی اعتبار سے وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

لہٰذا محض اپنی سند کو تسلیم کرانے کی خاطر دینی مدارس کے نصاب و نظام میں کوئی ایسی تبدیلی کرنا جو ان کے مزاج و مذاق سے ہٹی ہوئی ہو ان مدارس کی روح کے یکسر منافی ہے۔

ان گذارشات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم دینی مدارس کے موجودہ نصاب و نظام میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس نصاب و نظام میں ترمیم و اضافہ پر غور کرنے سے پہلے ہمیں وہ مقصد متعین کرنا چاہئے جسکے تحت ہم ترمیم و اضافہ چاہتے ہیں۔ اگر مقصد ان تین باتوں میں سے کوئی ایک ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا تو ہم اس مقصد کے تحت کسی ترمیم کی نہ صرف یہ کہ ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ اسکے شدّت کیساتھ مخالف ہیں،

ہاں اگر نصاب و نظام پر نظر ثانی کا مقصد یہ ہے کہ ان مدارس سے فارغ ہونیوالے حضرات ایک عالم دین کی حیثیت میں زیادہ ٹھوس اور مستحکم استعداد کے حامل ہوں، اور زیادہ مؤثر اور زیادہ وسیع دینی خدمات انجام دے سکیں تو ایسی نظر ثانی ہماری نظر میں نہ صرف قابلِ خیر مقدم، بلکہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، لیکن اس کیلئے ذہن کو مذکورہ تین مقاصد کے تحفظات سے خالی کرکے خالصۃً اس نقطۂ نظر سے غور کرنا ہوگا کہ ایک عالم دین کی حقیقی ضروریات کیا ہیں؟ وہ موجودہ نصاب و نظام سے پوری ہو رہی ہیں یا نہیں؟ اگر وہ پوری نہیں ہو رہی ہیں تو اسکے کیا اسباب ہیں؟ اور ان اسباب کو دور کرکے کس طرح مطلوبہ معیار حاصل کیا جاسکتا ہے؟

اس ناقابلِ انکار حقیقت پر دلائل قائم کرنیکی ضرورت نہیں کہ دینی مدارس کا علمی اور عملی معیار مسلسل انحطاط کا شکار ہے، اور ان کی پیداوار اپنی صفات اور کیفیت کے لحاظ

سے روز بروز تنزل ہے اسکا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء کی ایک بہت بڑی تعداد وہ فرائض خاطر خواہ طور پر انجام دینے سے قاصر رہتی ہے جو بحیثیت عالم دین اس پر عائد ہوتے ہیں۔ دوسری طرف جس رفتار سے پوری دنیا میں اچھی استعداد اور اعلیٰ کردار کے حامل علماء کرام کی ضرورت بڑھ رہی ہے اتنا ہی ہمارے دینی مدارس کے فارغ التحصیل علماء کا دائرۂ اثر و نفوذ روز بروز سمٹ رہا ہے۔ اس بات سے کا اعتراف نہ کرنا حقیقت ناشناسی کے مرادف ہوگا کہ پہلے ایک عالم دین کی بات معاشرہ میں جس وزن اور جس تاثیر کی حامل ہوتی تھی اور اسکو جسقدر وسیع قبولیت عامہ حاصل ہوتی تھی، اب اس صورت حال میں بڑی تیزی کے ساتھ فرق آرہا ہے۔ اس کا ایک سبب بلاشبہ یہ بھی ہے کہ ذہنوں پر مادیت کا غلبہ پہلے سے زیادہ ہوگیا ہے، اور بحیثیت مجموعی لوگوں کے افکار و اعمال پر دین کی گرفت بھی ڈھیلی پڑگئی ہے، لیکن اس کا ایک بہت بڑا سبب خود ہمارے اپنے نقائص بھی ہیں، اور جب تک ان نقائص کا کھلے دل اور وسیع حوصلے کے ساتھ جائزہ لیکر انکے ازالے کی کوشش نہیں کیجائے گی، اس سنگین اور تشویشناک صورت حال میں تبدیلی لانا بہت مشکل ہے۔

اس جائزے کے بہت سے پہلو ہیں، لیکن اگر ان سب پر گفتگو کیجائے تو بات کے موضوع سے دور نکل جانیکا اندیشہ ہے، اسلئے فی الحال ہم گفتگو کو صرف دینی مدارس کے نصاب و نظام کی حد تک محدود رکھتے ہوئے اُن اسباب کا مختصراً جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں جنکی وجہ سے دینی مدارس کا مطلوبہ معیار گھٹ رہا ہے، اور ان کی افادیت محدود ہورہی ہے، ہماری یہ گفتگو دینی مدارس کے مزاج و مذاق، ان کے نصاب، ان کے طریق تدریس اور ان کے ماحول سے متعلق چار حصوں پر منقسم ہوگی واللہ سبحانہ الموفق۔

برصغیر کے دینی مدارس کی سب سے قیمتی، سب سے گرانقدر اور سب سے اہم پونجی انکا وہ مزاج و مذاق ہے جو انہیں اپنے اللہ والے اکابر سے ورثے میں ملا ہے، آج ہمارے دینی مدارس بنیادی طور پر دارالعلوم دیوبند کے خوشہ چیں اور اسی کے نقش قدم پر چلنے کے خواہشمند ہیں، اور دارالعلوم دیوبند کی بنیادی خصوصیت جو اُسے دنیا کے

دوسرے تعلیمی اداروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ اس کے اکابر کا مزاج و مذاق ہے جس میں علم کے رسوخ، مطالعے کی وسعت اور استعداد کی پختگی کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ اہمیت اپنی زندگی، اپنے ذہن و فکر اور اپنے جذبات و خیالات غرض ہر چیز میں سنّت کی اتباع، سلف صالحین کی پیروی، اللہ تعالیٰ سے رجوع، اسکی طرف انابت اور اسی کی رضا جوئی کی فکر کو حاصل تھی۔

دنیا میں مختلف علوم و فنون پر دادِ تحقیق دینے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی، اور نرے علم کی حد تک تحقیق و تدقیق کے شناور دوسری معاصر درسگاہوں میں بھی بہت ہوئے ہیں، لیکن دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ہی علم و عمل کے سنگم پر اٹھائی گئی تھی، اور اس میں جس قدر توجہ طلبہ کی علمی صلاحیت بڑھانے کی طرف دی جاتی تھی، اُس سے زیادہ ان کی عملی تربیت اور اُن پر اُدا دا میں اسلاف کا رنگ چڑھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا، یہاں دلوں میں خوف و خشیت کی آبیاری ہوتی تھی، وہاں عبادت کا ذوق پروان چڑھایا جاتا تھا، وہاں حلال و حرام، بلکہ مکروہ و مستحب، اور اولیٰ اور خلافِ اولیٰ کا صرف علم نہیں، بلکہ ان کی عملی فکر، اور ان کی اہمیت دلوں میں جاگزیں کی جاتی تھی، وہاں عبادات و طاعات کے علاوہ معاشرت، معاملات اور اخلاق کو سنّت کے مطابق ڈھالا جاتا تھا۔ وہاں ایثار، تواضع، تحمل، بردباری، سادگی، اخلاص اور للّٰہیت کے ملکات پیدا کئے جاتے تھے، وہاں ایک ایک فرد کے دل میں یہ بات بٹھا دی جاتی تھی کہ برائے علم اس کا مطمح نظر نہیں، اور نہ تحصیل علم کا مقصد مال و جاہ کا حصول ہے، بلکہ اصل مقصد اپنے آپکو اعلیٰ اسلامی اوصاف سے آراستہ کرنا اور اسکے بعد انہی اوصاف کو دوسروں تک منتقل کرنا ہے،

چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے اس دور میں، جب وہاں سے برصغیر بلکہ عالم اسلام کی تاریخ ساز شخصیتیں پیدا ہوئیں، ہر ہر طالب علم کا یہ لازمی معمول تھا کہ وہ صرف کتابیں پڑھنے پر اکتفا کے بجائے کسی نہ کسی مصلح یا مربّی سے اصلاح و تربیت کا خصوصی تعلق قائم کرتا تھا، اور شاید ہی کوئی فارغ التحصیل طالب علم ایسا ہو جو فراغت کے فوراً بعد کسی نہ کسی مربّی سے باقاعدہ رجوع نہ کرتا ہو، اور اسکی صحبت و تربیت سے مستفید ہوئے بغیر عملی میدان میں آجاتا ہو، آپ کے علماء دیوبند میں جتنی عظیم شخصیات نظر آئیں گی وہ سب کسی نہ کسی شیخ کی

تربیت یافتہ اور ان کی صحبت و خدمت سے فیض یاب تھیں۔

لیکن کچھ عرصے سے ہمارے دینی مدارس میں اس مزاج و مذاق کی بجلی آگئی ہے اب صرف کتاب کے پڑھنے پڑھانے ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے، اور اصلاح اعمال و اخلاق کی طرف توجہ باقی نہیں رہی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود مدارس کی عملی زندگی میں جائز و ناجائز اور مکروہ و مستحب کی فکر رفتہ رفتہ مفقود ہو رہی ہے۔ پہلے مدارس کے مہتمین اور اساتذہ کا حال یہ تھا کہ وہ مدرسہ کے پیسوں اور اسکی املاک کو پھونک پھونک کر استعمال کرتے تھے کہ کہیں حدود سے تجاوز نہ ہو جائے، اُن کو اپنی آمدنی بڑھانے کے بجائے اس بات کی فکر دامنگیر رہتی تھی کہ جو تنخواہ ہم وصول کر رہے ہیں، وہ ہمارے لئے حلال بھی ہے یا نہیں؟ اور اس کا حق ادا ہو رہا ہے یا نہیں؟ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں کتنی مثالیں ایسی ہیں کہ لوگوں نے اپنی تنخواہیں بڑھانے کی نہیں، کم کرنے یا کٹوانے کی درخواستیں دی ہیں۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی گائے ایک مرتبہ کسی نے مدرسے کے صحن میں لاکر باندھ دی، کسی شخص نے اس پر اعتراض کیا، حضرت مولانا نے اسکی جواب دہی کے بجائے وہ گائے ہی صدقہ کردی مظاہر علوم سہارنپور کے مہتمم حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحبؒ مدرسہ کے سالانہ جلسے کے موقع پر سینکڑوں افراد کے کھانے کا انتظام کرتے، لیکن خود کبھی مدرسے کے کھانے میں شریک نہ ہوتے، اور جب رات گئے انتظامات سے فارغ ہوتے تو اپنے گھر سے لایا ہوا ٹھنڈا سالن ایک کونے میں بیٹھ کر کھا لیتے تھے۔ اسی مدرسے کے دوسرے مہتمم حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحبؒ کو کبھی مطبخ کی کارکردگی کے معائنے کیلئے کھانا چکھنا ہوتا تو پہلے ایک خوراک خریدتے، اور پھر چکھ کر باقی سالن واپس کر دیتے تھے، دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ مہتمین اور طلبہ کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن جب آج ہم اپنا جائزہ لیتے ہیں تو بزرگوں کے اس طرز عمل کے ساتھ کوئی دُور کی نسبت بھی نظر نہیں آتی، غنیمت ہے کہ ابھی ظاہری وضع قطع اور کسی درجے میں عبادات واجبہ کی حد تک اتباع سنت کا کچھ اہتمام مدارس کے اندر باقی ہے، اور بعض جگہ وہ بھی ختم ہو رہا ہے، لیکن اتباع سنت اور احتیاط و تقویٰ کسی ایک شعبے کی حد تک محدود نہیں بلکہ وہ معاشرت، معاملات اور اخلاق ہر شعبۂ زندگی پر حاوی ہے، اور خاص طور پر

ان شعبوں میں تدین و تقویٰ اب ہمارے درمیان نایاب ہوتا جا رہا ہے

کوئی بات پیش کہہ سکتا ہے کہ ان باتوں کا مدرسے کے مقاصد پورے ہونے اور اچھے طلبہ کی پیداوار سے کیا تعلق ہے؟ لیکن ہم، جو اکابر علماء دیوبند کے نام لیوا ہیں، ان باتوں کو مدرسے کی کامیابی اور ناکامی سے بے تعلق قرار نہیں دے سکتے، ان مدارس کی بنیاد اخلاص، للٰہیت اور تقویٰ پر ہے، اور اس بنیاد میں جتنی کمزوری آئے گی، اس پر کھڑی ہونے والی عمارت، ظاہری اعتبار سے خواہ کتنی ہی خوشنما ہو لیکن نتائج و فوائد کے لحاظ سے اتنی ہی کمزور ہو گی۔

لہذا مدارس کے نصاب و نظام کا جائزہ لیتے وقت ہمارے نزدیک سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ مدارس کی اس رُوح کے احیاء کی فکر کی جائے۔ اس روح کے احیاء کا تعلق اصل میں تو اہلِ مدارس کی قلبی لگن سے ہے، لیکن اس سلسلے میں چند عملی تجاویز درج ذیل ہیں۔

(۱) تمام مدارس میں تصوف و احسان کو باضابطہ نصاب کا جزء بنایا جائے، (۲) اساتذہ و طلبہ پر لازم کیا جائے کہ وہ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ جمع ہو کر بزرگانِ دین اور بالخصوص اکابر علمائے دیوبند کے حالات و ملفوظات کا اجتماعی طور پر مطالعہ کریں۔ اس میں حضرت تھانویؒ قدس سرہ کی ارواحِ ثلٰثہ، تذکرۃ الرشید، حیاتِ قاسمی، تذکرۃ الخلیل، حیات شیخ الہندؒ، اشرف السوانح، اور حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ قدس سرہ کی "آپ بیتی" کا اجتماعی مطالعہ خاص طور پر مفید ہو گا (۳) ہر مدرسہ کے اساتذہ اور مہتممین کیلئے کسی شیخ طریقت سے باقاعدہ اصلاح و تربیت کا تعلق قائم کرنا ضروری سمجھا جائے، اور اساتذہ کے تقرر اور ترقی وغیرہ میں ان کے اس پہلو کو بطورِ خاص نظر میں رکھا جائے،

(۴) جس مدرسے کے قریب کوئی صاحب ارشاد بزرگ موجود ہوں، وہاں کے اساتذہ اور طلبہ ان کی صحبت و خدمت کو غنیمتِ کبریٰ سمجھ کر اختیار کریں۔ اور کبھی کبھی مدرسے میں انکے اجتماعی وعظ و نصیحت کا اہتمام کیا جائے،

امید ہے کہ ان شاء اللہ اس قسم کے اقدامات سے مدارس کی فضا بہتر ہو گی، اور ہم اپنے جس مرکز سے رفتہ رفتہ ہٹتے جا رہے ہیں، اس کی طرف لوٹنے میں مدد ملے گی۔

دوسرا مسئلہ نصابِ تعلیم کا ہے۔ دینی مدارس میں اس وقت جو نصاب رائج ہے وہ بنیادی طور پر درسِ نظامی کا نصاب ہے، یہ نصاب ایک عالمِ دین کی جملہ ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر مرتب

دیا گیا تھا، اور اس میں ہر علم وفن کے اندر ایسی کتابیں تجویز کی گئی تھیں جو سطحی اور سرسری معلومات کے بجائے اُس علم وفن میں مستحکم اور ٹھوس استعداد پیدا کریں، اور اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے نزدیک اس بنیادی ڈھانچے میں بہت زیادہ انقلابی تبدیلیوں کی اب بھی ضرورت نہیں، البتہ قویٰ کے انحطاط اور وقت کی علمی و دینی ضروریات کے پیش نظر اس نصاب پر مختلف حیثیتوں سے نظر ثانی کی ضرورت ہے، اس وقت ہمارے نظام تعلیم میں جو خلا محسوس ہوتا ہے، یا اس میں جو نقائص پیدا ہو گئے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں :-

دینی مدارس کو عربی زبان سے جو خصوصی تعلق ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں، عربی زبان تمام دینی علوم کیلئے بنیادی زینے کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن ہمارے مدارس میں عربیت کا ذوق، اور عربی تحریر و تقریر کا ملکہ افسوسناک حد تک نایاب ہے - اچھی استعداد رکھنے والے طلبہ زیادہ سے زیادہ عربی کتابیں سمجھنے کی صلاحیت تو پیدا کر لیتے ہیں لیکن عربی تحریر و تقریر کی مشق سے - الا ماشاء اللہ اکثر بالکل عاری ہوتے ہیں. اکثر متوسط درجے کے طلباء کی بھی عبارت خوانی تک درست نہیں ہوتی۔ اور عربی مضمون نگاری، تصنیف وتالیف یا تقریر وخطابت تو اچھے اچھے صاحب استعداد طلبہ کیلئے بھی کبریتِ احمر کا درجہ رکھتی ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ دینی مدارس میں عربی پڑھانے کا اصل مقصد کتاب وسنّت اور ان کے علوم کے اصل مآخذ تک رسائی ہے، جس کے لئے تحریر و تقریر کا ملکہ ناگزیر نہیں، لیکن اول تو اب مشاہدہ یہ ہے تحریر و تقریر کی مشق کے فقدان کا اثر عبارت خوانی اور عبارت فہمی پر بھی پڑ رہا ہے، دوسرے عربی تحریر و تقریر کی مشق اگر مقصود نہ ہو تو کم از کم اس کے محمود ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، اور صرف ونحو، اور بلاغت وادب کی اعلیٰ کتابوں کے پڑھنے کے بعد بھی اگر یہ وصفِ محمود حاصل نہ ہو تو یہ کوتاہی کچھ کم نہیں ہے. تیسرے عالم اسلام کے باہم مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ اب اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی ہے، کہ ہمارے مدارس سے عربی تحریر و تقریر کی اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے افراد پیدا ہوں جو عالم عرب سے روابط رکھ کر عرب ممالک میں دینی مدارس، ان کی دعوت اور ان کے پیغام کی صحیح نمائندگی کر سکیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان پاکستان کے علماء نے جو عظیم الشان علمی اور دینی ذخیرہ اُردو یا فارسی زبان میں چھوڑا ہے، اس سے عالم عرب کو روشناس کرا سکیں۔ اور یہ مقصد عربی تحریر و تقریر کے اعلیٰ ملکے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس وقت ہمارے نظامِ تعلیم میں عربی صرف ونحو، ادب اور بلاغت کی تدریس پر ایک معتد بہ وقت صرف ہوتا ہے، لیکن یہ سارے علوم خالص نظریاتی انداز سے پڑھائے جاتے ہیں، اور انکی عملی تربیت اور مشق کا کوئی اہتمام باقی نہیں رہا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض اوقات ایک طالب علم نحو وصرف کے قواعد ان کے خودساختہ فلسفے اور اس پر وارد ہونیوالے اعتراضات وجوابات کی تفصیل تو شرح جامی، عبدالغفور اور عصام وغیرہ کی مدد سے یاد کر لیتا ہے، لیکن اگر اس سے کہا جائے کہ وہ چند سطریں عربی زبان میں لکھ دے تو یہ بات نہ صرف یہ کہ اُس کے لئے سخت دشوار ہوتی ہے بلکہ وہ بسا اوقات انہی قواعد کے اطلاق میں غلطیاں کرتا ہے جن کا پورا فلسفہ اُسے ازبر ہے، اور اگر کوئی شخص نحو وصرف کی غلطیوں سے محفوظ رہ جائے تو اسلوب اور انشاء کی غلطیاں تو اس کی تحریر میں لازماً ہوتی ہی ہیں۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس میں عربیت کی تصحیح وتحسین کی طرف پوری توجہ دی جائے اور مدرسے کی پوری فضا ایسی بنائی جائے جس میں عربیت رچی بسی ہوئی ہو، اس کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

(الف) ابتدائی درجات کے نصاب میں صرف نحو کی ایسی کتابوں کا اضافہ کیا جائے جن میں قواعد کے بیان کے ساتھ ساتھ انکے عملی اجراء کا اہتمام ہو، ہر ہر قاعدے کے ساتھ اسکی بہت سی مثالیں دیکر قاعدے کو ذہن نشین کرایا گیا ہو، اور پھر تمرینات کے ذریعے طلباء کو ان قواعد پر عمل کا عادی بنانے کی کوشش کی گئی ہو، عرب ممالک میں اس غرض کے لئے بہت سی کتابیں تیار ہوئی ہیں مثلاً نحو وصرف کے ابتدائی اور متوسط درجات کے لئے "النحو الواضح" اور اعلیٰ درجات کیلئے "النحو الوافی" وغیرہ ان کتب سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

(ب) ادب کی تعلیم میں انشاء کیلئے مستقل وقت رکھ کر اسکی باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہے، اس غرض کیلئے بھی اسوقت بہت سی کتابیں دستیاب ہیں، مثلاً "الاسلوب الصحیح للانشاء" "معلم الانشاء" وغیرہ۔ ان سے اس سلسلے میں مدد لی جاسکتی ہے، اسی طرح "بلاغت" کی تعلیم کیلئے ہمارے نصاب میں مختصر المعانی بالکل ناکافی ہے، اور اس سے "بلاغت" کا اصل مقصد بالکل حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا اس کے بجائے یا اس کے ساتھ "دروس البلاغۃ" یا "البلاغۃ الواضحۃ" اس طرح پڑھانے کی ضرورت ہے

کہ اس سے بلاغت کا اصل مقصد حاصل ہو سکے

(ج) لیکن عربیت کا ذوق پیدا کرنے کیلئے ان تمام چیزوں سے زیادہ اہمیت جس بات کو حاصل ہے وہ مدرسے کی مجموعی فضا میں عربیت کا چلن ہے، اس غرض کیلئے ہماری رائے میں تو درجۂ رابعہ سے اوپر کے تمام اسباق عربی زبان میں ہونے چاہئیں، لیکن اگر یکایک یہ تبدیلی مشکل ہو تو کم از کم مدرسے کے تمام اعلانات دفتری اندراجات، تمام دفتری کارروائی، امتحانات کے پرچے اور ان کے نتائج وغیرہ فوری طور پر عربی میں منتقل کرنے چاہئیں، اور رفتہ رفتہ مدارس کے ماحول کو اس سطح پر لانا چاہئے کہ ان میں ذریعہ تعلیم مکمل طور پر عربی زبان بن جائے۔

(د) اساتذہ اور طلبہ کے درمیان باہمی گفتگو میں عربی بول چال کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے اگر اساتذہ و منتظمین اس بات کا اہتمام کریں کہ وہ آپس میں، نیز طلبہ سے صرف عربی میں گفتگو کریں گے تو بہت جلد عربیت کا ایک خوشگوار ماحول پیدا ہو سکتا ہے، عادت نہ ہونے کی بنا پر شروع میں شاید دشواری پیش آئے لیکن اگر اس دشواری پر اہتمام کے ساتھ قابو پا لیا گیا تو انشاء اللہ بہترین نتائج حاصل ہوں گے

(ہ) مہینے دو مہینے میں طلباء کے ایسے اجتماعات منعقد کرنے چاہئیں جن میں طلبہ عربی میں تقریریں کریں، اور مقالے پڑھیں۔

ان اقدامات کے ذریعے انشاء اللہ عربیت کی کوتاہی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

(۲) دارالعلوم دیوبند میں طریق کار شروع سے یہ تھا کہ قرآن کریم ختم کرنے کے بعد اور عربی کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے طالب علم کو ایک پانچ سالہ نصاب سے گذارا جاتا تھا جو "درجۂ فارسی و ریاضی" کے نام سے موسوم تھا۔ اس درجے میں اردو فارسی، دینیات، تجوید، حساب، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ کی اس قدر معیاری تعلیم دیدی جاتی تھی کہ ان مضامین میں ایک عالم دین کو جتنی واقفیت ضروری ہے، ایک طرف وہ تمام تر حاصل ہو جاتی تھی، اور دوسری طرف اگر کوئی شخص کسی وجہ سے اس درجے پر اپنی تعلیم ختم کرنے پر مجبور ہو جائے تو وہ دین و دنیا کی اتنی بنیادی معلومات حاصل کر چکا ہوتا تھا، کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اچھی زندگی گذار سکے،

یہ درجہ عربی اور اسلامی علوم کیلئے ایک بہترین بنیاد کا کام دیتا تھا، اور جب طالب علم اس درجے سے فارغ ہو کر عربی اور اسلامی علوم کی طرف متوجہ ہوتا تو وہ اردو اور فارسی میں تحریر و انشاء کی اچھی صلاحیت کا حامل ہوتا تھا جو اس کو عربی اور اسلامی علوم کی تحصیل میں بہت مدد فراہم کرتی تھی،

یہ درجہ موجودہ دینی مدارس میں عرصے سے یا تو ختم ہو چکا ہے، یا اس نے گھٹتے گھٹتے ایک سال کے درجۂ اعدادیہ کی صورت اختیار کرلی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طالبعلم عربی اور اسلامی علوم کی تحصیل شروع کرتا ہے تو عام طور سے اسکی تحریر خراب، املاء اور انشا ناقص، اور بنیادی معلومات کمزور ہوتی ہے، اس میں عربی صرف و نحو، ادب اور فقہ وغیرہ کے اہم مضامین کو کماحقہ سمجھنے اور انھیں اچھی طرح ہضم کرنے کی پوری صلاحیت نہیں ہوتی، اور یہ مضامین اُسے دشوار معلوم ہوتے ہیں اور جب بنیاد کمزور ہو جائے تو اس کمزوری کا اثر اگلے درجات تک پڑتا ہے،

لہذا یہ بات ہماری نظر میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مذکورہ بالا طریق کار کے مطابق درجۂ اعدادیہ کی یہ مدت بڑھائی جائے اور اُس میں اُردو، فارسی دینیات، سیرت، تجوید، حساب، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ کی اتنی معیاری تعلیم دیدی جائے جو اگلے مضامین کے لئے مناسب بنیاد فراہم کرسکے،

(۳) درس نظامی میں تاریخ کو بطور مضمون اس لئے باقاعدہ شامل نہیں کیا گیا تھا کہ قوتِ مطالعہ پیدا ہونے کے بعد یہ مضمون ذاتی مطالعہ سے بھی بخوبی حاصل کیا جاسکتا ہے، لیکن اب تجربہ یہ ہو رہا ہے کہ ذاتی مطالعے کا ذوق کم ہوتا جارہا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عربی درجات کے نصاب میں تاریخ اور سیر کو باقاعدہ مضمون کی حیثیت سے داخل نصاب کیا جائے،

(۴) یہی حال تصوف اور اخلاق کا ہے کہ اسکو باقاعدہ درس میں اسلئے شامل نہیں کیا گیا تھا کہ مدارس کا پورا ماحول بذاتِ خود اخلاق و طریقت کی عملی تربیت کرتا تھا، اور باقی ماندہ کسر ذاتی مطالعے اور کسی مرشد کے تعلق سے پوری ہو جاتی تھی، لیکن اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصوف اور اخلاق کی کتب باقاعدہ داخل درس ہوں اس مقصد کیلئے حضرت امام غزالیؒ کی "بدایۃ الہدایۃ" اور "اربعین، احیاء العلوم" کے منتخب حصے، حضرت امام سہروردیؒ کی "عوارف المعارف"، حکیم الامت حضرت تھانوی کی "التکشف" اور "التشرف" وغیرہ مختلف درجات میں رکھی جاسکتی ہیں

(۵) ایک عالم دین کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جن دوسرے مذاہب و ادیان کا براہ راست اسلام سے تصادم رہا ہے، اور جن کے تبلیغی مشن اب بھی سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل ہیں، نیز خود مسلمانوں کے وہ فرقے اور گروہ جنھوں نے اپنے کچھ مخصوص

کی بنا پر اپنا مستقل وجود قائم کیا ہوا ہے۔ اُن سب کے بنیادی عقائد پر کرے وہ فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو تاکہ بوقتِ ضرورت اُن کی جواب دہی کرسکے۔ لہٰذا درس میں "الملل والنحل، یا الادیان والفرق" کے نام سے ایک مستقل موضوع کا اضافہ ہونا چاہئے جس میں ان ادیان و فرق کا مختصر تعارف، اُن کے بنیادی عقائد و افکار اور ان کی تردید کے بنیادی دلائل بیان کر دئے جائیں جن کے ساتھ برِ صغیر کے مسلمانوں کو زیادہ واسطہ پیش آتا ہے، تاکہ ان سے متعلق ضروری اجمالی معلومات ہر طالب علم کو حاصل ہو جائیں اور جن لوگوں کو بعد میں ان میں سے کسی مذہب یا فرقے پر خصوصی کام کا موقع ملے، اس کیلئے یہ تعارف ایک بنیاد کا کام دے سکے۔

(۶) علوم عصریہ کو ذریعہ معاش بنانے کیلئے مدارس کے نصاب میں اُن کے اضافے کا جو تصور ہے اس کے بارے میں پیچھے ہم اپنی رائے تفصیل کے ساتھ عرض کر چکے ہیں، لیکن بعض عصری علوم ایسے ہیں کہ موجودہ دور میں دین کی مؤثر تبلیغ، اس کے کماحقہ دفاع اور اسکی صحیح خدمت کے نقطۂ نظر سے ایک عالم کیلئے بحیثیتِ عالم ان کی فی الجملہ واقفیت ضروری یا مفید ہوگئی ہے، مثلاً انگریزی زبان، جدید مغربی فلسفہ، معاشیات، سیاسیات اور اصولِ قانون۔ اسکی وجوہ مندرجہ ذیل ہے :-

الف: جدید مغربی تعلیم کے اثر سے دنیا میں جتنی گمراہیاں پھیلی ہیں، اُن سب کے سرچشمے انگریزی زبان میں ہیں، اور جب تک ان گمراہیوں کے اصل منابع سے کماحقہ واقفیت نہ ہو، انکی تردید اور اُن پر تنقید و تبصرہ اُن لوگوں کے لئے پوری طرح مؤثر نہیں ہوتا جو ان کے براہِ راست مطالعے سے مرعوب و متاثر ہوئے ہیں،

یہ تقریباً وہی صورتِ حال ہے جو عباسی خلافت کے زمانے میں یونانی فلسفے کے رواج عام سے پیدا ہوئی تھی، اُس وقت فکری اور عقلی گمراہیوں کا اصل سرچشمہ یونانی منطق اور فلسفہ تھا، اور جن لوگوں کے ذہن اُس سے مرعوب و متاثر تھے، ان کے شکوک و شبہات کا مؤثر علاج اسی طرح ہوسکتا تھا کہ علماءِ اسلام اُس منطق اور فلسفے پر عبور حاصل کرکے اُسی زبان و اسلوب میں اسکی تردید کریں، چنانچہ علماءِ اسلام نے اُس منطق اور فلسفے کو داخلِ نصاب کیا، اس میں اعلیٰ درجے کی مہارت پیدا کی، اور پھر وقت کی گمراہیوں کا ایسا مؤثر سدِّباب کیا کہ وہ ایک ایک کرکے اپنی موت آپ مر گئیں۔

اس وقت دینی علوم کے نصاب میں منطق اور فلسفہ کو اس لئے داخل نہیں کیا گیا تھا کہ علماء اسے ذریعہ معاش یا اپنا مستقل مشغلہ بنائیں گے، بلکہ اس کا مقصد وقت کی اہم دینی ضرورت کو پورا کرنا تھا

بعینہ اسی طرح آج مغرب سے اٹھنے والے نظریات اور انکی گمراہیوں نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور عالم اسلام کا بھی وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو معاشرے کی ایک مؤثر قوت کی حیثیت رکھتا ہے، انہی نظریات سے متأثر اور بڑی حد تک انکے رنگ میں رنگا ہوا ہے ان نظریات کی تردید میں اب تک جو کام ہوا ہے وہ اُن لوگوں کے ایمان ویقین کے تحفظ کے لئے تو کسی درجے میں کارآمد ہے جن پر دین کی گرفت پہلے ہی سے مضبوط ہے، لیکن جو لوگ ان نظریات سے ایسے متأثر ہوئے ہیں کہ اُن پر دین کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے، ان کو واپس لانے کیلئے کافی نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے اُسی طرز پر کام کی ضرورت ہے جس طرز پر یونانی نظریات کی یلغار کے مقابلے میں متکلمین اسلام نے انجام دیا تھا، یہ کام علماء امت کے ذمے ایک فرض ہے جسکی ادائیگی میں جتنی تاخیر ہوگی مغربی گمراہیوں کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہوتا جائیگا

(ب) چونکہ ان مغربی نظریات پر مؤثر اور بھرپور تنقید کیلئے ان کے اصل ماخذ تک رسائی ضروری ہے اس لئے اب تک یہ کام اُن لوگوں نے انجام دیا ہے جو ان ماخذ تک رسائی تو رکھتے تھے، لیکن انھوں نے دینی علوم باقاعدہ متوارث طور پر اساتذہ سے نہیں پڑھے تھے، اسلئے بجائے ان کی دینی معلومات متفرق مطالعے پر مبنی تھیں، جن سے ظاہر ہے کہ علم کا رسوخ حاصل نہیں ہوتا، اس لئے ان لوگوں نے ان مغربی نظریات کے مقابلے میں دین کی جو تشریح وتعبیر کی وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں پر مبنی تھی، اور اس سے مغربی گمراہیوں کا صحیح علاج ہونے کے بجائے اُلٹی کچھ نئی گمراہیاں، نئے فتنے اور نئی غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں جن سے خود مسلمانوں کے درمیان افتراق وانتشار کا دروازہ کھل گیا، ان نئی غلط فہمیوں کا مؤثر سدّباب صرف سلبی انداز میں نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ علم دین میں رسوخ رکھنے والے علماء بذاتِ خود ایجابی طور پر وہ کام کریں جسکی غلط انجام دہی نے ان نئی گمراہیوں اور غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے۔

(ج) مغرب کے مستشرقین نے عربی اور اسلامی علوم پر "تحقیق" کے نام سے ایسے زہریلے لٹریچر کا انبار تیار کر دیا ہے جس کا مقصد دین کے بنیادی مسلمات کو مشکوک بنانا ہے، یہ لٹریچر

جدید ذہن کی نفسیات کے مطابق اور اس اسلوب میں تیار کیا گیا ہے جو آج کے ذہن کو اپیل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، اور عالم اسلام کا کوئی خطہ اس کے زہریلے اثرات سے خالی نہیں، اس زہر کا تریاق فراہم کرنا بھی علماء ہی کی ذمہ داری ہے، اور اس کے لئے انگریزی زبان اور اُن عصری علوم کی تحصیل لازمی ہے جن کو اس کارروائی کا ذریعہ بنایا گیا ہے

(د) اس وقت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد یورپ، امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا، اور مشرق بعید کے ممالک میں آباد ہے، بالخصوص اُن کی نئی نسلوں کو اسلام پہنچانے کا کوئی راستہ انگریزی زبان کے بغیر ممکن نہیں، ان خطوں کے مسلمانوں کو اب اپنی نئی نسلوں کے دین کی حفاظت کا مسئلہ درپیش ہے، اور وہ اس غرض کے لئے کافی جدوجہد کے بعد مساجد اور دینی مراکز تعمیر کر رہے ہیں، ان مساجد و مراکز میں ایسے علماء کی ضرورت روز افزوں ہے جو علوم دین میں مہارت کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی جانتے ہوں، تاکہ وہ وہاں کے مسلمانوں کی دینی ضروریات پوری کر سکیں۔ راقم الحروف کو ایسے متعدد ممالک میں جانے کا بھی اتفاق ہوا ہے، اور یہاں رہتے ہوئے بھی شاید ہی کوئی مہینہ خالی گذرتا ہو جس میں وہاں سے انگریزی جاننے والے علماء کی طلب نہ آتی ہو،

چونکہ ایسے صحیح الفکر اور راسخ علماء کی تعداد ہمارے درمیان آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے، جو انگریزی جانتے ہوں، اس لئے ان تمام مقامات پر وہ لوگ پہنچ رہے ہیں جو انگریزی تو بیشک جانتے ہیں، لیکن یا تو ان کی دینی معلومات سطحی اور سرسری نوعیت کی ہیں، یا انکے نظریات "ما انا علیہ و اصحابی" کے مطابق نہیں ہیں۔

(ہ) مذکورہ ممالک کے مسلمانوں کو اپنے دین کے تحفظ کیلئے انگریزی زبان میں بڑے وسیع دینی لٹریچر کی ضرورت ہے، لیکن حال یہ ہے کہ انگریزی میں قرآن کریم کی کوئی ایک تفسیر بھی ایسی موجود نہیں ہے جس کے بارے میں آنکھ بند کرکے لوگوں کو اس کے مطالعے کا مشورہ دیا جا سکے، اسی طرح روزمرہ کے دینی اور فقہی مسائل پر مشتمل کوئی ایسی مستند کتاب ابتک تالیف نہیں ہوئی جو ان لوگوں کو دین کی تعلیمات سے ٹھیک ٹھیک روشناس کرا سکے اس وقت یا تو چند گنی چنی اردو کتابوں کے تراجم ہیں جن کی صحت کی بھی کوئی ضمانت نہیں، یا پھر اہل باطل کا فراہم کیا ہوا لٹریچر ہے جسے لوگ چار و ناچار پڑھنے پر مجبور ہیں، ان مسلمانوں کو دین کی تعلیمات سے روشناس کرانا اور ان کے دین و ایمان کی حفاظت علماء ہی کے فرائض

میں داخل ہے، جو انگریزی زبان کے بغیر ممکن نہیں۔

(و) موجودہ صنعتی دور نے تجارت و معیشت کے شعبے میں ایسے پیچیدہ معاملات کو رواج دیا ہے، کہ اب ایک مسلمان تاجر کو قدم قدم پر معاملات کی نئی نئی صورتیں پیش آتی ہیں ان صورتوں کا صریح شرعی حکم فقہ کی مروّجہ کتب میں اسلئے نہیں مل سکتا کہ یہ صورتیں عصر جدید ہی کی پیداوار ہیں، اور ان کا تصوّر پہلے نہیں ہو سکتا تھا، ان صورتوں کو سمجھ کر ان کا صحیح فقہی حکم بتانا علماء ہی کا کام ہے، اور یہ کام اسی وقت ٹھیک ٹھیک انجام پا سکتا ہے جب علماء ان صورتوں کو اُن کی تمام تفصیلات اور پس منظر کے ساتھ سمجھیں، اور اسکے بعد فقہی اصولوں کے مطابق ان کا حکم بتائیں۔ ابتک ہوتا یہ ہے کہ صورتِ مسئلہ بیان کرنے کی ذمہ داری مستفتی پر ہوتی ہے، اس لئے وہ جیسا سوال لکھ لاتا ہے، اسی کے مطابق جواب چلا جاتا ہے، لیکن مستفتی چونکہ عالم نہیں ہوتا اس لئے وہ بسا اوقات اپنی لاعلمی کی بنا پر صورتِ مسئولہ کے وہ اہم اجزاء جن پر جواب کا دار و مدار ہوتا ہے، بیان نہیں کر پاتا اس لئے جواب مختلف ہو جاتا ہے، اور یہ بھی صرف اُن معاملات میں ہوتا ہے جن کے بارے میں تاجر کے دل میں کوئی شبہ اور اسکی بنیاد پر استفتاء کا قوی داعیہ پیدا ہو جائے ورنہ اب اکثریت ان افراد کی ہے جنکو یا کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا، یا استفتاء کا تقاضا پیش نہیں آتا۔

لہٰذا جسطرح حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بازاروں میں گھوم گھوم کر تاجروں کے معاملات کو پہلے سے از خود سمجھنے کا اہتمام فرماتے تھے، تاکہ ان تمام معاملات کا شرعی حکم مدوّن کر جائیں، اور استفتاء کے موقع پر مستفتی کی تشریح کے محتاج نہ ہوں، موجودہ دَور کے اہلِ علم کا بھی یہ فریضہ ہے کہ وہ اہلِ عصر کے معاملات کو اچھی طرح سمجھیں، اور اسکے بعد حسبِ ضرورت تصنیف و تالیف اور فتویٰ کے ذریعے ان معاملات کا شرعی حکم امت پر واضح کریں، اس غرض کیلئے معاشیات کا اتنا علم جس سے اہلِ عصر کے معاملات اور اُن کے تجارتی مسائل کا ملی وجہ البصیرت علم ہو سکے، ایک عالمِ دین کیلئے ضروری ہو گیا ہے،

(س) اس وقت جدید معاشی اور سیاسی نظریات نے پوری دنیا کو متحارب کیمپوں میں بانٹ دیا ہے، اسلامی ممالک بھی عملاً انھیں میں سے کسی نہ کسی کیمپ کے ساتھ وابستہ ہیں، اور پھر پسماندہ یا ترقی پذیر ملک ان دونوں کی آویزش کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے، سرمایہ داری

اشتراکیت اور سیکولر سیاسی نظریات مسلمانوں کے درمیان اپنے افکار کے پرچار اور مسلمانوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کی پوری پوری کوشش کر رہے ہیں، اس صورتِ حال کا مقابلہ علماء ہی کے فرائض میں داخل ہے، کیونکہ وہی دین کا پورا تحفظ کرتے ہوئے مسلمانوں کو صحیح راہِ عمل بتا سکتے ہیں، لیکن اس غرض کیلئے ان تمام نظریات سے واقفیت ضروری ہے۔

(ح) اس وقت عالم اسلام میں رفتہ رفتہ یہ شعور جڑ پکڑ رہا ہے کہ ہم نے جدید عصری علوم کو مغربی قالب کے ساتھ جوں کا توں اپنا کر کس قدر سنگین اجتماعی غلطی کی ہے، چنانچہ ایسی آوازیں تقریباً ہر اسلامی ملک میں اُٹھ رہی ہیں کہ ان علوم کو اسلامی رنگ میں رنگ کر اپنے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانا چاہئے، اور ان علوم کی نصابی اور تحقیقی کتابوں میں اسلامی تعلیمات، علماء اسلام کے افکار اور ان کی خدمات کو اسطرح سمونا چاہئے کہ اس سے مغربی افکار کی بالادستی ختم ہو جائے۔ اس غرض کے لئے اب عالم اسلام میں جگہ جگہ مختلف علوم کے تحقیقی مراکز قائم ہو رہے ہیں، ان مراکز میں ایسے رجالِ کار کی ضرورت ہے جو دین کا وسیع و عمیق علم رکھنے کے ساتھ ساتھ متعلقہ موضوع سے بھی کما حقہٗ واقف ہوں، اور چونکہ راسخ الفکر علماء میں ایسے لوگ کمیاب، بلکہ نایاب ہیں، اس لئے ان مراکز میں وہ ذہن پہنچ رہا ہے جو دین کی صحیح بصیرت نہیں رکھتا۔

ان مراکز کے اثرات ونتائج جلدی تو ظاہر نہیں ہوں گے، لیکن دس بیس سال میں ان کے نتائج پوری طرح منظرِ عام پر آجائیں گے، اور علوم عصریہ کی تمام درسگاہوں میں انہی کی تحقیقات سکہ رائج الوقت بنیں گی، لہٰذا ان مراکز کی صحیح تحقیقی رہنمائی کا فریضہ بھی علماء دین پر عائد ہوتا ہے جس کے لیے متعلقہ موضوعات کی فی الجملہ واقفیت ناگزیر ہے۔

یہ تمام کام، جن کی ضرورت واہمیت سے شاید ہی کوئی دردمند اور سلیم الفکر مسلمان انکار کر سکے، ایک دو یا چند افراد کے بس کے نہیں ہیں۔ اور نہ یہ ساری ضروریات کسی مختصر مدت میں پوری ہو سکتی ہیں، اس کے لئے ایسے پختہ کار راسخ الفکر اور ذی استعداد علماء کی پوری کھیپ درکار ہے جو اپنی اپنی طبعی مناسبت کے لحاظ سے اپنے لئے کام کے مختلف دائرے تجویز کرے اور ان دائروں میں شب و روز محنت کر کے یہ فریضہ بجا لائے۔ مگر اس سارے کام کی بنیاد دینی مدارس ہی میں فراہم کرنی ہوگی،

یہاں یہ وضاحت بھی مناسب ہے کہ دینی مدارس میں ان مضامین کی تدریس کا یہ مطلب

ہرگز نہیں ہے کہ ان تمام مضامین کے تخصصین پیدا کرنے مقصود ہیں، اور نہ یہ تأثر درست ہے کہ ان مضامین کی تدریس کیلئے کوئی بہت زیادہ وقت صرف کرنا ضروری ہوگا، اسلئے بفضلہ تعالیٰ درس نظامی کی یہ خاصیت ہے کہ جو شخص اس نصاب کو قرارِ واقعی طور پر پڑھ لے، اس کا ذہن منضبط اور علمی و فکری باتوں کیلئے پوری طرح تیار ہو جاتا ہے، اور وہ ایسی باتوں کا ادراک بہت جلد کر لیتا ہے جسے سمجھنے میں دوسرے لوگوں کو کافی دیر لگتی ہے، اس لئے اگر دینی مدارس کے طالب علم کو انگریزی زبان کے ساتھ مذکورہ بالا چند مضامین کی بنیادی واقفیت حاصل ہو جائے تو وہ ضرورت کے وقت انشاء اللہ اس بنیاد پر عمارت خود کھڑی کر سکے گا، اس لئے ان مضامین کی تدریس کیلئے بہت زیادہ وقت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

ہمارے نزدیک موجودہ دور میں علماء کی خدمات اور ان کی کوششوں کو مؤثر بنانے اور ان کا دائرۂ اثر بڑھانے کیلئے مذکورہ بالا اقدامات نہایت ضروری ہیں، لیکن۔ (اور یہ «لیکن» بھی ہمارے نزدیک بیحد اہمیت رکھتا ہے) ان اقدامات سے پہلے یا ان کے ساتھ ساتھ اس بات کا پورا اطمینان ضروری ہے کہ دینی مدارس میں اتباعِ سنّت کا وہ مزاج و مذاق جو ان مدارس کی اصل رُوح اور ان کی سب سے قیمتی متاع ہے، اُسے کسی بھی مرحلے پر ادنیٰ ٹھیس نہ لگے، اس مزاج و مذاق کے بارے میں ہم اپنی گذارشات اسی مضمون کے ابتدائی حصے میں پیش کر چکے ہیں، اور اس کا تحفظ ہر قیمت پر ضروری ہے، کیونکہ اسکو مجروح کر کے جو کام بھی کیا جائے گا وہ ان مدارس کو تباہی کی طرف لیجائے گا،

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جن مضامین کے اضافے کی تجویز سابقہ صفحات میں پیش کی گئی ہے، وہ اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب ان مدارس کے اصل علوم عالیہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ وغیرہ کے معیارِ تعلیم میں نہ صرف یہ کہ کوئی ادنیٰ خلل یا نقص واقع نہ ہو بلکہ ان کے معیارِ تعلیم کو مزید مضبوط اور مستحکم بنایا جائے،

ان دونوں ناگزیر شرطوں کے پیش نظر ہمارے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جن عصری مضامین کو داخل نصاب کیا جائے۔ انکے لئے ایسے پڑھانے والے تلاش کئے جائیں جو اپنے مزاج و مذاق کے اعتبار سے دینی مدارس سے فکری اور عملی طور پر پوری طرح ہم آہنگ ہوں، اور اپنی تدریس کے دوران طلبہ کا ذہن ان مضامین کے مقصدِ تدریس کے لئے تیار کرتے رہیں، اس غرض کیلئے اگر مدارس کو اپنے بعض اساتذہ کو رخصت دیکر تیار کرنا پڑے تو اسمیں بھی دریغ نہ

حرج نہیں، اور ظاہر ہے کہ مضامین کا یہ اضافہ تدریج ہی مناسب ہوگا، اس لئے اگر ایک مرتبہ اصولی طور پر مذکورہ بالا مقاصد کی تحصیل کی طرف توجہ ہو جائے تو رفتہ رفتہ اس کے مناسب وسائل، انشاء اللہ فراہم ہوتے جائیں گے۔

(۷) نصاب سے متعلق ساتویں بات منطق اور فلسفے کی تعلیم سے متعلق ہے، بعض حضرات یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ یونانی فلسفے کے زوال کے بعد ان مضامین پڑھانے کی چنداں حاجت باقی نہیں رہی، لیکن ہمارے نزدیک یہ بات بوجوہ درست نہیں، ان مضامین کی اہمیت کیلئے تنہا یہ بات بھی کافی ہے کہ ہمارے اسلاف کی کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ، بالخصوص اصولِ فقہ، انہی علوم کی اصطلاحات اور منطقی انداز و اسلوب پر مشتمل ہے، اسکو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور اس سے استفادہ کیلئے منطق اور فلسفے کی واقفیت ضروری ہے، آج تفسیر کبیر، جیسے دریائے علم سے استفادہ اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ انسان منطق اور فلسفے کا علم رکھتا ہو، لہٰذا ان مضامین کو بالکل ختم کر دینا ہمارے نزدیک سخت نقصان دہ ہوگا، لیکن ان مضامین کو اسی حد تک پڑھانا چاہیے جس حد تک وہ اسلامی علوم کیلئے زینے کا کام دیں، ان کو ایک مستقل علم مقصود کے طور پر پڑھنے پڑھانے کا واقعی اب کوئی جواز نہیں، لہٰذا جہاں ان مضامین کی تعلیم مذکورہ ضرورت سے زائد ہو رہی ہو، وہاں اسکو ضرورت کی حد تک محدود کر کے دوسرے مضامین کیلئے گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے اسکے علاوہ فلسفے میں عنصریات اور فلکیات کے جو حصے اب تحقیق و مشاہدے سے غلط ثابت ہو چکے ہیں انکی غلطی پر تنبیہ کے ساتھ جدید تحقیقات بڑھانا ضروری ہے جسکے لئے علامہ نجیت کی توفیق الرحمٰن، علامہ آلوسیؒ کی ما دلّ علیہ القرآن، اور مولانا محمد موسیٰ صاحب کی جدید فلکیات سے مدد لیجا سکتی ہے۔

(۸) نصاب کے سلسلے میں آخری گذارش یہ ہے کہ قومی کے سلسل انحطاط اور وسائل کی پیچیدگیوں کی بنا پر عرصے سے یہ بات محسوس ہو رہی ہے کہ دَورۂ حدیث کیلئے ایک سال کی مدت ناکافی ہے، اس مختصر وقت میں حدیث پاک پڑھنے پڑھانے کا حق ادا نہیں ہو پاتا، اور عموماً ہوتا یہ ہے کہ حدیث کے صرف معدودے چند ابواب تحقیق و تفصیل کے ساتھ ہو پاتے ہیں کہ سال ختم ہونے لگتا ہے، اور اسکے بعد کے حصے تکمیل نصاب کی بھاگ دوڑ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ایک صحیح بخاری ہی کو لے لیجئے، استاذ اور شاگرد شب و روز مثالی محنت کرنے کے باوجود آخر سال میں انتہائی بھاگ دوڑ پر مجبور ہو جاتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ صحیح بخاریؒ کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں جسے رواروی میں گذار دیا جائے۔

اسی طرح دَورۂ حدیث کی بعض انتہائی اہم کتب مثلاً طحاوی شریف اور موطأین اسی وقت کی

قلت کی بنا پر اکثر برائے نام ہوتی ہیں، حالانکہ انکو اہتمام کے ساتھ پڑھنے پڑھانے کی ضرورت ہے، اگر دورۂ حدیث کو دو سالوں پر منقسم کر دیا جائے تو امید ہے کہ انشاء اللہ علم حدیث کے ساتھ مطلوب مناسبت پیدا ہو سکے گی اور طالب علم حدیث کے تمام ابواب علی وجہ البصیرۃ پڑھ سکے گا اور اسکے ساتھ اصولِ حدیث کی کوئی معیاری کتاب مثلاً تدریب الراوی یا فتح المغیث وغیرہ بھی اہتمام کے ساتھ ہو سکے گی جو ایک حدیث کے طالب علم کیلئے ازبس ضروری ہے۔

یہ چند تجاویز ہیں جو اہلِ علم کی خدمت میں طالب علمانہ طور پر برائے غور پیش خدمت ہیں، وفاق کی سابقہ نصاب کمیٹی جس نے سال گذشتہ نصاب میں کچھ ترمیمات یا اضافے کئے تھے، اس نے اپنی خطوط پر سوچنا شروع کیا تھا، لیکن چونکہ اسکے ساتھ ہی معادلہ کا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا، اس لئے بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ اس تمام کارروائی کا مقصد معادلہ ہے، ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں کہ صرف معادلہ کے نقطۂ نظر سے مدارس کے نصاب و نظام میں ترمیم ہماری رائے میں کسی طرح مستحسن نہیں البتہ ایک عالم کی حقیقی ضروریات اور اسکی خدمات کو زیادہ مؤثر بنانے کیلئے مندرجہ بالا تجاویز پیش کی گئی ہیں، نصاب کے بعد کچھ باتیں اندازِ تدریس وغیرہ سے متعلق بھی عرض کرنے کا خیال تھا لیکن یہ گذارشات بھی اختصار کی انتہائی کوشش کے باوجود اندازے کیا کم کہیں زیادہ طویل ہو گئیں، اسلئے انکو کسی اور صحبت کیلئے ملتوی رکھتے ہوئے فی الحال اتنے ہی پر اکتفا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جو کچھ تجاویز اوپر عرض کی گئی ہیں، ان میں درد مندی اور اخلاص کے ساتھ اپنے دل کی بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضروری نہیں کہ ان میں سے ہر بات درست ہو، لیکن اہلِ علم کی خدمت میں پیش کرنے کا منشاء ہی یہ ہے کہ ان میں سے جو بات دلائل کی رو سے درست ہو، اس پر کوئی عملی قدم اٹھایا جائے، اور اگر دلائل سے کسی بات کی غلطی واضح ہو جائے تو اُسے رد کر دیا جائے۔ لیکن اس موقع پر جبکہ وفاق المدارس، نصاب کے مسئلے پر غور کر رہا ہے، اور یہ غور بار بار نہیں ہوتا، اتنی امید ضرور ہے کہ مذکورہ بالا نکات میں سے ہر نکتے پر اطمینان اور ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے گا، ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

بشکریہ البلاغ

بمسافر شوق

عازم بیت اللہ کے نام

از
مولانا ریاست علی صاحب ظفر

ہوا ہے شوق سرگرم مذاقِ آبلہ پائی
دلِ بیتاب سے رخصت ہوئی تابِ شکیبائی

جمالِ روئے عالمتاب منزل کارفرما ہے — مگر وہ پردۂ دیوانگی ہے کارفرمائی
مرتب جنبشِ چشمِ کرم سے جذبِ محکم ہے — بہانہ لطف کا ہے کاروبارِ جادہ پیمائی
جنوں کے بازوؤں میں قوتِ پروازِ پیدا ہے — زبانِ شوق تک آنے لگی آہنگِ یکتائی
تفکر لطف آموزِ تعیّن ہوتا جاتا ہے — کہ چشمِ آرزو تک آگئے انوارِ سیلائی
تڑپ کر موج اک آغوشِ ساحل سے نکل آئی — کہ اینک آنکھ سے مستور تھی دریا کی پہنائی
خرد لیکر چلا ہے آج نذرِ چاکِ دامانی — زہے لطفِ کریمانہ زہے اندازِ شیدائی
انھیں دو حرف میں پنہاں ہے تعبیرِ جہانگیری — نظر کا اکتسابِ نور اور دل کی جبیں سائی

جنونِ گردشِ پیہم دلیل کامرانی ہے
جنوں کی آخری منزل مقامِ جانفشانی ہے

مبارک اے مسافر شیوۂ اہلِ رضا تجھ کو — مبارک اضطرابِ طائرِ قبلہ نما تجھ کو
مبارک ہو جبیں کو انتسابِ عتبۂ عالی — مبارک ہو کرم کی ابتدائے انتہا تجھ کو
مبارک ہو شکستِ حلقۂ زنجیرِ امکانی — مبارک ہو چمن زارِ تجلّی کی ہوا تجھ کو
قدم راہِ محبت پر، نظر حسنِ عنایت پر — مبارک ہو کرم کا اک مرتب سلسلہ تجھ کو
خوشا وہ تشنہ کامی جس پہ ساقی کو پیار آئے — مبارک مے گسارِ عشق تحریکِ عطا تجھ کو

مبارک ہو شریکِ زمرۂ اہلِ وفا ہونا
مبارک ہو جنوں کی آخری منزل عطا ہونا

کھلے گا اے مسافر تجھ پہ اصلِ سرخوشی کیا ہے — قیامِ زندگی کیا ہے مقامِ بندگی کیا ہے
یہ طوفان و تلاطم صورتِ تادیبِ ہستی ہے — گھر چھاپا نتا ہے صورتِ تابندگی کیا ہے
بنامِ حج بیت اللہ تکمیلِ جنوں ہو گی — کرم کھولے گا تجھ پر سوز و سازِ سرمدی کیا ہے
وقوفِ بارگاہِ حق شبابِ زندگانی ہے — کسی کو کیا خبر ہے لذتِ دیوانگی کیا ہے
دلِ پروانۂ فطرت اور شمعِ جلوہ گستر ہو — کوئی اس وقت دیکھے صورتِ پروانگی کیا ہے
تمنا بھی اسی کی ہو، وہی ہو جادۂ منزل — مسافر تو نے سمجھا ہے عروجِ زندگی کیا ہے

زمیں والوں کا ملجا، مہبطِ انوارِ رحمت ہے
تجھے جس کی تمنا ہے، تجھے جس سے عقیدت ہے

مسافر بارگاہِ آیتِ رحمت میں کہہ دینا — کہ اپنی زندگی مجملۂ خوابِ پریشاں ہے
وہ جس کو تو نے بخشا تھا مقامِ ناز آرائی — وہ مردِ حق نما گویا چراغِ زیرِ داماں ہے
طلب آلودۂ امکاں، توکل خاک آلودہ — دلِ بدبخت اپنی بے یقینی پر پشیماں ہے
کوئی بھی میکدہ ہو تشنہ سامانی نہیں جاتی — کہ صدہا سال سے برپا وہ تفریقِ دل و جاں ہے
مسافر عرض کر دینا کہ آخر ہم کہاں جائیں — ہمارا بابِ زنداں ہے نہ ایوانِ گلستاں ہے
مسافر ان سے کہنا کس کو جا کر زخم دکھلائیں — یہاں پر تیر اندازی مدادائے دل و جاں ہے

سیہ کاروں کی جانب قصدِ رحمت کی ضرورت ہے
کہ اس امت کو پھر چشمِ عنایت کی ضرورت ہے

مسافر عرض کرنا، روضۂ اطہر کی جالی پر — خدارا برق آسودہ کو جیدِ رم عطا کیجئے
ادب سے پوچھنا ان سے کہ آخر کیا کہوں جا کر — کہا تھا بینواؤں نے کہ ہم کو بھی بلا لیجئے

مسافر اُن کو ساری سرگذشتِ غم سنا دینا
اگر کچھ اور پوچھیں پھر کر سینہ دکھا دینا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلس تعلیمی دارالعلوم دیوبند

جدید طلباء کیلئے

قواعد داخلہ

اور قدیم طلباء کے ترقی و تنزل و تکمیلات وغیرہ کے شعبوں میں داخلہ کے ضروری ضابطے

مدارس عربیہ کے ذمہ داروں سے ضروری درخواست

حامداً و مصلیاً! حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے طلبہ عزیز کے ساتھ خیر خواہی کی وصیت فرمائی ہے، آپؐ کا ارشاد ہے۔

ان رجالاً یاتونکم من اقطار الارض یتفقھون فی الدین فاذا اتوکم فاستوصوا بھم خیرًا۔ (رواہ الترمذی)

بے شک بہت سے لوگ زمین کے گوشے گوشے سے علم دین میں تفقہ حاصل کرنے کیلئے تمہارے پاس آئیں گے جب وہ آئیں تو تم انکے بارے میں خیر خواہی کی وصیت قبول کرو۔

اس لئے طلبہ عزیز کے ساتھ خیر خواہی تمام مدارس عربیہ کے ذمہ داروں کا فرض اولین ہے طلبہ کیلئے بہتر تعلیم عمدہ تربیت اچھا انتظام اور حسب استطاعت راحت رسانی خیر خواہی کے ضمن میں آتی ہے، اور الحمد للہ مدارس عربیہ کے ذمہ دار بڑی حد تک اس وصیت پر عمل پیرا بھی ہیں۔

مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ مدارس عربیہ کی اس خیر خواہی سے اہل طلبہ کے ساتھ نا اہلوں نے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور انھوں نے ذمہ داروں کیلئے طرح طرح کی عملی مشکلات پیدا کر دی ہیں جبکہ نا اہلوں کے بارے میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم — علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

وواضع العلم عند غیر اھلہ کمقلد الخنازیر الجوھر واللؤلؤ والذھب (رواہ ابن ماجہ)	اور نااہلوں کے سامنے علم پیش کرنیوالا خنزیر کی گردن میں جوہر، موتی اور سونے کا ہار پہنانے والے کی طرح ہے،

علم دین کے حصول میں جن کی نیت پاک نہ ہو اور ان کا نقطۂ نظر سند کا حصول یا کوئی دنیوی مقصد ہو ان کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا۔

من تعلم علماً مما یبتغی بہ وجہ اللہ لا یتعلمہ الا لیصیب بہ عرضاً من الدنیا لم یجد عرف الجنۃ یوم القیامۃ (مشکوٰۃ)	رضائے خداوندی کیلئے حاصل کیے جانیوالے علم دین کو جس شخص نے دنیوی مفاد کیلئے حاصل کیا وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا۔

پھر ان مدارس عربیہ میں جو طلبہ عزیز کے ساتھ خیر خواہی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں دارالعلوم دیوبند کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اسکی ترقی علم و فن کی ترقی ہے دین و دیانت کی ترقی ہے اور مسلمانانِ عالم کی ترقی ہے۔

چنانچہ اسبابِ طلبہ عزیز کی خیر خواہی اور معیارِ تعلیم کی بلندی کیلئے چند ضروری اصول و ضوابط کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

آپ حضرات سے مخلصانہ درخواست ہے کہ ان چیزوں پر عمل درآمد کے سلسلہ میں اربابِ دارالعلوم کا تعاون فرمائیں اور درج ذیل ضروری باتوں پر عمل فرما کر ممنون فرمائیں۔

۱ - آپ دارالعلوم دیوبند میں صرف ان صالح اور ذی استعداد طلبہ کو روانہ فرمائیں جو ہر اعتبار سے اس مرکزی درسگاہ کے شایانِ شان ہوں۔

۲ - تعلیمی اور اخلاقی تصدیق نامہ دینے میں دیانت و امانت کی بھرپور رعایت فرمائیں بعض مدارس کے بارے میں یہ اطلاع ملی ہے کہ ان کے یہاں اس سلسلہ میں کوئی اہتمام نہیں ہے،

۳ - جن افراد کا آپ کے یہاں سے کسی اخلاقی جرم یا جعلسازی وغیرہ میں اخراج ہوا ہے انکے بارے میں صحیح تفصیلات سے دارالعلوم کے ذمہ داروں کو مطلع فرمائیں۔

۴ - امتحان داخلہ میں استعداد کی صحیح جانچ کی جا رہی ہے اور نظام کار میں سفارش بے جا کے تمام دروازوں کو بند کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ امید ہے کہ آپ اسکو پسند فرمائیں گے اور اس سلسلہ میں تعاون فرمائیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً۔ دارالعلوم دیوبند کا مقصد رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی تبلیغ واشاعت عہد رسالت سے لیکر آج تک کے علمی ورثہ کی حفاظت اور تعلیم وتعلم کے ذریعہ ایسے رجال کار کی تیاری ہے جو ہر میدان میں دین مبین کی بہتر خدمات انجام دے سکیں۔

چنانچہ ماضی بعید یعنی اپنے قیام کے ابتدائی دور میں اس ادارہ نے اتنی جلیل القدر خدمات انجام دیں اور ایسے ایسے نابغۂ روزگار افراد تیار کئے جن کی نظیر تاریخ اسلام میں شاذ ونادر ہی نظر آتی ہے، افراد سازی کی اس حیرت انگیز مہم میں اساتذہ کرام کا بے پایاں اخلاص ان کا بے مثال علمی رسوخ اور ان کی انتھک جدوجہد بھی کارفرما تھی، اور طلبہ علم کی پاک نیتوں اور شمع علم پر ان کی پروانہ وار جاں نثاری کا بھی بڑا دخل تھا۔

پھر عصر حاضر میں طلبہ اور اساتذہ دونوں ہی کی جدوجہد میں کمی آئی۔ لیکن سب سے زیادہ علمی انحطاط اس بنیاد پر رونما ہوا کہ طلبہ عزیز کے معاشرہ میں علم دین اور دینی اقدار سے محبت نہ رکھنے والے افراد نے دنیوی مفادات کیلئے شمولیت اختیار کرلی ابتداء میں یہ تناسب اتنا معمولی رہا کہ اس کے مضر اثرات کا ادراک نہ کیا جاسکا، پھر آہستہ آہستہ ایسے افراد کا تناسب اتنا زیادہ ہوگیا کہ محنتی، مخلص اور باذوق طلبہ کے لئے میدان تنگ ہوگیا۔

اب اساتذہ کرام اور ارباب انتظام کی توجہ ادھر مبذول ہوئی اور انھوں نے طلب علم کا صحیح ذوق رکھنے والوں کی سہولت اور ہمت افزائی نیز بدشوق افراد کے نقصان سے طلبہ اور ادارہ محفوظ رکھنے کیلئے کچھ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے، اس لئے مجلس تعلیمی اور اساتذہ دارالعلوم نے درج بالا مصلحتوں اور معیار تعلیم کی بلندی کے لئے کچھ تجاویز منظور کی ہیں جن پر شوال ۱۴۰۲ھ سے عمل شروع کیا جائے گا، انشاء اللہ

ان تجاویز کو سالانہ امتحان ۱۴۰۲ھ کے ساتھ کرکے عام کیا جارہا ہے تاکہ آئندہ سال داخلے کے خواہشمند طلبہ معیار مطلوب کے مطابق اپنے آپ کو تیار کرنے کی کوشش کریں۔

جدید داخلے کے ضروری قواعد

۱۔ شعبۂ اردو دینیات، شعبۂ حفظ،

درجۂ فارسی میں صرف مقامی بچوں کو داخلہ دیا جائے گا، ان مقامی طلبہ کے داخلے درج ذیل طریقوں پر ہوں گے۔

(الف) سال اول دینیات اردو اور شعبۂ حفظ میں داخلہ ہمہ وقت ممکن ہوگا،

(ب) بقیہ درجات میں داخلہ کی آخری تاریخ ۲۵ر شوال ہوگی۔

(۲) مذکورہ بالا درجات میں بیرونی طلبہ کو داخل نہیں کیا جائے گا۔ اور جب تک زیر تجویز دار التربیت کا مستقل نظم نہیں ہو جاتا ہے اس وقت تک ان درجات میں داخلے موقوف رہیں گے۔ کم عمر بچوں کے داخلے سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کا بیان مشکل ہے،

(۳) سال اول و دوم عربی میں بھی نابالغ بیرونی بچوں کا داخلہ نہیں ہوگا،

(۴) جو طالب علم اپنے ساتھ صغیر السن بچوں کو لائے گا اس کا داخلہ بھی ختم کر دیا جائے گا،

(۵) سال سوم عربی کے لئے امتحان داخلہ تقریری ہوگا اور اسکی آخری تاریخ ۲۰ر شوال ہوگی،

(۶) سال چہارم عربی سے دورۂ حدیث تک کے لئے امتحان داخلہ تحریری ہوگا۔

(۷) داخلے کے تحریری امتحان ۱۳ تا ۱۸ر شوال کے درمیان مکمل کر لئے جائیں گے اور نتائج کا اعلان ۲۰ر شوال تک کر دیا جائے گا۔

(۸) ناکام امیدواروں کو کسی بھی درجہ میں داخلہ نہیں دیا جائے گا۔

(۹) جن امیدواروں کی وضع قطع طالب علمانہ نہ ہوگی مثلاً غیر شرعی بال، ریش تراشیدہ ہونا یا پینٹ وغیرہ کا استعمال یا دارالعلوم کی روایات کے خلاف کوئی بھی وضع ان کو شریک امتحان نہیں کیا جائے گا۔ ایسے امیدوار دارالعلوم میں داخلہ کے لئے حاضر نہ ہوں، درمیان سال میں اگر کسی نے وضع بدلی تو حسب قواعد دار الاقامہ عمل درآمد کیا جائے گا۔

(۱۰) بہار کے سرحدی اضلاع کے امیدواروں کو تصدیق نامۂ وطنیت پیش کرنا ضروری ہوگا۔

سرحدی اضلاع یہ ہیں | (۱) پورنیہ، (۲) کٹیہار، (۳) سنتھال پرگنہ (۴) انگلش بازار۔

(نوٹ) صوبہ آسام اور صوبہ بنگال کے تمام اضلاع سے حسب سابق تصدیق نامہ وطنیت لانا ضروری ہوگا۔

(۱۱) جدید امیدواروں کو سابقہ مدرسہ کا تعلیمی اور اخلاقی تصدیق نامہ اور مارکشیٹ (نمبرات کتب) درخواست کے ساتھ پیش کرنا ضروری ہوگا،

(۱۲) امتحان داخلہ کی کاپیاں امیدواروں کے نام اور نمبر کے بغیر کوڈ نمبر ڈالکر حضرات ممتحین کو دی جائیں گی، تاکہ امیدواروں کو صرف استعداد کے مطابق نمبر دیئے جاسکیں۔

(۱۳) ماہ رمضان ۱۴۰۴ھ میں دفتر تعلیمات سے امتحان کی تاریخوں اور ضروری وقتی ضوابط نیز درخواست برائے شرکت امتحان داخلہ کا اجراء کردیا جائے گا۔ جدید امیدوار ۲۰ رمضان تک تمام کاغذات اور درخواست برائے شرکت امتحان منگالیں اور منظوری کے بعد دارالعلوم میں حاضر ہوں۔

(۱۴) ڈاک ٹکٹ بھیجے تاکہ کاغذات بھیجے جاسکیں۔

قدیم طلبہ کے لئے

(۱) آئندہ سال داخلہ کے خواہشمند قدیم طلبہ (باستثناء امیدواران تکمیلات) ماہ شعبان ہی میں فارم داخلہ کی خانہ پُری کردیں گے اور جو طلبہ تمام کتابوں میں کامیاب ہوں گے ان کو ترقی دیجائیگی۔ ان تمام طلبہ کیلئے ۲۰ر شوال تک حاضر ہوجانا ضروری ہوگا۔

(۲) جو طلبہ سال ممتحنہ کی دو کتابوں میں ناکام ہوں گے اور دونوں میں ان کے نمبرات ۲۵ یا اس سے زائد ہوں گے یا صرف ایک کتاب میں ناکام ہوں گے خواہ ان کے نمبر ۲۵ سے کم ہی ہوں، ان کو ضمنی امتحان کا موقع دیا جائے گا،

(۳) ضمنی امتحانات باقاعدہ تحریری ہوں گے اور کامیاب ہونے کی صورت میں ترقی دیدی جائے گی ورنہ سال کا اعادہ کردیا جائے گا۔

(۴) جو طلبہ سال ممتحنہ کی دو اہم کتابوں میں ناکام ہوں گے اور ایک کتاب میں انکے نمبرات ۲۵ سے کم ہوں گے یا دو سے زائد اہم کتابوں میں ناکام ہوں گے خواہ انکے نمبرات ۲۵ سے زائد ہی ہوں ان کے سال کا اعادہ کردیا جائے گا۔

(۵) ہر سال کی اہم کتابوں کی تفصیل یہ ہے،

سال دوم: قدوری - ہدایۃ النحو، علم الصیغہ، نفحۃ ، مرقات،
سال سوم: ترجمۃ القرآن، قدوری، ابن عقیل، نفحۃ العرب، قطبی تصدیقات
سال چہارم: ترجمۃ القرآن، مختصر المعانی، شرح وقایہ، اصول الشاشی، سلم العلوم۔
سال پنجم: ہدایہ اولین۔ مقامات حریری، نورالانوار، ملاحسن،
سال ششم: جلالین شریف۔ حسامی، خیالی، میبذی،
سال ہفتم: ہدایہ آخرین، شرح عقائد، بیضاوی شریف، سورہ بقرہ، مشکوٰۃ شریف،

(۶) اہم کتابوں کے علاوہ اگر صرف ذیلی اور غیر اہم کتابوں میں ناکام ہوں تو خواہ ان کی تعداد دو یا اس سے زائد ہو اور خواہ ان کے نمبرات ۲۵ سے کم ہی ہوں ضمنی امتحان کا موقع دیا جائے گا،

(۷) تکمیلات میں صرف ان فضلاء کا داخلہ ہوسکے گا جن کا دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں اوسط کامیابی ۴۰ رہا ہو، اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ ہوں۔

(۸) امیدوار جس تکمیل میں داخلہ کا خواہش مند ہوگا اس سے متعلق استعداد کی صحیح جانچ کی جائیگی اور اس کے لئے تقریری و تحریری امتحان لیا جائے گا۔

(۹) ایک تکمیل کے بعد دوسری تکمیل میں داخلہ کیلئے ضروری ہوگا کہ امیدوار نے سابقہ تکمیل میں کم از کم ۴۴ اوسط حاصل کیا ہو اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ ہو۔

(۱۰) ایک تکمیل کی درخواست دینے والے دوسری تکمیل کیلئے امیدوار نہ ہوسکیں گے۔

(۱۱) دارالافتاء کے فضلاء کا کسی شعبہ میں داخلہ نہیں لیا جائے گا۔

(۱۲) تکمیلات یا دارالافتاء میں منقطع الدراسہ طلبہ کو داخل نہیں کیا جائے گا۔

(۱۳) کسی بھی تکمیل میں داخلہ کی تعداد ۲۰ سے زائد نہ ہوگی۔

دوسرے شعبوں کے بارے میں

دارالعلوم دیوبند کا بنیادی کام اگرچہ عربی دینیات کی تعلیم ہے، لیکن حضرات اکابر رحمہم اللہ نے مختلف دینی اور دنیوی فوائد اور مصالح کے پیش نظر مختلف شعبے جاری فرمائے، شعبۂ تجوید اردو و عربی، شعبۂ خوشنویسی اور دارالصنائع وغیرہ۔ ان شعبوں کی افادیت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا مگر افسوس ہے کہ یہ شعبے طلب علم کا صحیح ذوق نہ رکھنے والوں کیلئے جائے پناہ کا کام بھی دے رہے ہیں اسلئے مجلس تعلیمی نے طے کیا ہے کہ ان شعبوں میں داخلہ صرف ان دیندار اور پابند شرع امیدواروں

کو دیا جائے گا جو ان چیزوں کی تکمیل کے خواہش مند ہوں، اور اس کے لئے درج ذیل ضابطوں پر عمل کیا جائے گا۔

شعبۂ تجوید حفص اردو و عربی حفص اردو میں وہ طلبہ داخل ہو سکیں گے جو حافظ ہوں اور قرآن کریم ان کو یاد بھی ہو اور وہ اردو کی اچھی استعداد بھی رکھتے ہوں۔ نیز ان کی عمر اٹھارہ سال سے کم نہ ہو۔
ان طلبہ میں ۳۰ کی امداد بھی جاری ہو سکے گی۔

(۲) حفص عربی میں ان طلبہ کا داخلہ ہو سکے گا جو حافظ ہوں اور قرآن کریم یاد بھی ہو، اور عربی کی شرح جامی یا سالِ سوم تک تعلیم حاصل کر چکے ہوں۔ ان طلبہ میں سے دس کی امداد بھی جاری ہو سکے گی۔

(۳) ان درجات میں داخل طلبہ کیلئے اوقات مدرسہ میں مکمل حاضری ضروری ہو گی۔

قرأت سبعہ و عشرہ (۱) ان درجات میں داخلے کیلئے حافظ ہونا ضروری ہے اور یہ کہ وہ عربی کی شرح جامی یا سالِ سوم تک جید استعداد بھی رکھتے ہوں

(۲) داخل شدہ طلبہ کیلئے اوقاتِ مدرسہ میں مکمل چھ گھنٹے درسگاہ میں حاضر رہنا ضروری ہو گا ——— (۳) اس درجہ میں داخل دس طلبہ کی امداد جاری کی جا سکے گی۔

شعبۂ خوشنویسی (۱) اس شعبہ میں داخلہ کے امیدواروں میں فضلائے دار العلوم کو ترجیح دی جائے گی۔

(۲) مستقل داخلہ کے امیدوار کو امتحان داخلہ دینا ضروری ہو گا۔ اور صرف اس فن کی ضروری صلاحیت رکھنے والوں کو داخل کیا جائے گا۔

(۳) اس شعبہ میں داخل امدادی طلبہ کی تعداد تیس ہو گی، اور یہ امداد صرف ایک سال کیلئے دی جائیگی۔ (۴) قدیم امدادی طلبہ اگر فن کی تکمیل نہیں کر سکے ہیں تو ناظم شعبہ کی سفارش پر ان کا مزید ایک سال کیلئے غیر امدادی داخلہ کیا جا سکے گا۔

(۵) جو طلبہ مستقل امدادی یا غیر امدادی داخلہ لیں گے ان کو مدرسہ کے تمام اوقات میں کامل چھ گھنٹے درسگاہ میں حاضر رہ کر مشق کرنا ضروری ہو گا۔

(۶) جو طلبہ عربی تعلیم کے ساتھ کتابت کی بھی مشق کر چکے ہیں پھر ناظم شعبہ انکی صلاحیت کی تصدیق کریں ایسے طلبہ اگر دورۂ حدیث کے بعد مستقل داخلہ کے خواہشمند ہوں گے تو داخلہ اور امداد

یا انکو ترجیح دیجائیگی۔ (۷) اس شعبہ میں داخل تمام طلبہ کیلئے طالب علمانہ وضع قطع اختیار کرنا ضروری ہوگا۔ (۸) پہلی سہ ماہی میں مقرر کردہ تمرینات کی تکمیل نہ کی گئی تو داخلہ ختم کردیا جائے گا۔

دارالصنائع

طالب علمانہ وضع قطع کے بغیر داخلہ نہیں لیا جائے گا۔ (۲) معلم دارالصنائع جن کی صلاحیت کی تصدیق کریں انکو داخل کیا جائے گا۔ (۳) پہلی سہ ماہی کے مقرر کردہ کام کی تکمیل نہ کی گئی تو داخلہ ختم کردیا جائے گا۔ (۴) دارالصنائع میں داخلہ دس طلبہ سے زائد کا نہیں ہوگا۔ (۵) اوقاتِ مدرسہ میں پورے وقت حاضر رہکر کام کرنا ضروری ہوگا۔

جامعہ طبیہ

(نوٹ) چونکہ ڈپلوما کی مدت ختم ہوچکی ہے اور ڈگری کورس ابھی منظوری کے مرحلہ میں ہے اسلئے داخلہ کے ہر امیدوار سے یہ تحریر لیجاتی ہیکہ آپ منظوری کی امید پر داخلہ لے سکتے ہیں، ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا) ——— (۱) جامعہ طبیہ میں پری طب۔ بی، یو، ایم، ایس کے داخلے کیلئے ۲۰ر شوال تک درخواستیں لیجائیں گی (۲) داخلے کے مجاز وہی طلبہ ہوں گے جنھوں نے دارالعلوم سے فاضل کی سند یا کسی ایسے مستند دینی درسگاہ سے فراغت حاصل کی ہو جسکی سند بارہویں کلاس کے برابر سمجھی جاتی ہو، (۳) درخواست کے ساتھ مندرجہ ذیل کاغذات کا داخل کرنا ضروری ہوگا (الف) تعلیمی اسناد کی مصدقہ نقول، (ب) تاریخ پیدائش کا مصدقہ سارٹیفکٹ۔ (ج) کردار کا سارٹیفکٹ جو چھوڑتے ہوئے آخری ادارہ کے سربراہ سے حاصل کیا ہو، (د) سرحدی اضلاع کے طلبہ کیلئے تصدیقنامہ شہریت، (ہ) سرپرست کا ضمانت نامہ جسمیں صراحت کی گئی ہو کہ وہ دارالعلوم اور جامعہ طبیہ کے قوانین کا پابند ہوگا۔ (۴) جامعہ طبیہ میں داخلہ کیلئے بالکل شرعی وضع قطع ضروری ہے،

دارالافتاء

(۱) دارالافتاء میں داخلہ کے امیدوار طلبہ کیلئے وضع قطع کی درستگی کی اہمیت سب سے زیادہ ہوگی، (۲) دورۂ حدیث سے دارالافتاء کیلئے صرف وہ طلبہ امیدوار ہونگے جن کا اوسط کامیابی ۴۲ ہو، (۳) کسی بھی تکمیل سے دارالافتاء میں داخلہ کے امیدوار کیلئے سابقہ تکمیل میں ۴۵ اوسط حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ (۴) ان تمام امیدواروں کا الگ سے امتحان لیا جائے گا۔ (۵) دارالافتاء میں داخلہ کی تعداد ۲۰ر سے زائد نہ ہوگی، اور کوشش کیجائیگی کہ معیار مذکور کو پورا کرنیوالے ہر صوبے کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے، لیکن اگر کسی صوبہ سے کوئی امیدوار مندرجہ بالا شرائط کا حامل نہ پایا گیا تو دوسرے صوبوں سے یہ تعداد پوری کرلی جائیگی۔

(۶) ان بیس طلبہ کی امداد ہو سکے گی۔

(نوٹ) جن درجات میں داخلہ کیلئے کسی طرح کا دوسرا شرط نہیں ہے جیسے شعبۂ خوشنویسی، دارالصنائع اور جامعہ طبیہ ان میں داخلہ کیلئے اس سال دارالاقامہ اور دفترِ تعلیمات سے حاصل کردہ تصدیق نامہ اخلاق داخل کرنا ضروری ہوگا۔

Regd. No. SHN-13-NP-21-84

DARUL-ULOOM MONTHLY
DEOBAND (U.P.)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دارالعلوم دیوبند
کے ترقیاتی منصوبے

(۱) [illegible] کی دوسری منزل اور مزید جدید دارالاقامہ کی تعمیر جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو

(۲) دارالتربیت (دارالاطفال) کا قیام اور اس کی تعمیر

(۳) ایک وسیع مسجد کی تعمیر جس میں اضافہ شدہ تمام طلبہ کی گنجائش ہو (قدیم مسجد ناکافی ہو چکی ہے)

(۴) علمی و دینی اجتماعات کے لئے ایک وسیع ہال کی تعمیر —— (۵) ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر

(۶) مہمان خانہ کی توسیع —— (۷) نئی درسگاہوں کی تعمیر —— (۸) لائبریری کی تعمیر جدید

(۹) اساتذۂ دارالعلوم کی علمی ترقی کے لئے عالم اسلام سے علمی کتابوں کی فراہمی کا انتظام

(۱۰) تمام دنیا میں پھیلے ہوئے فضلاء دارالعلوم سے روابط اور ان سے متعلق معلومات

(۱۱) نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر تمام ذمہ داران مدارس عربیہ کا اہم کنونشن طلب کرنا۔

(۱۲) تعلیم و تربیت کے نئے اصول و ضوابط کی ترتیب اور ان کا اجراء۔

اس ادارے کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے

دستِ تعاون بڑھانے کی شدید ضرورت ہے

مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی امداد روانہ فرمائیں —————— شکریہ

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب) دارالعلوم دیوبند یوپی

ایس جے پرنٹرس دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی اصلاحی ماہنامہ

دارالعلوم

زیر سرپرستی

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

مدیر مسئول

ریاست علی بجنوری

نگرانِ اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا علمی و دینی

ماہنامہ

دارالعُلوم

شمارہ نمبر ۳	جون ۱۹۸۲ء مطابق رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۲ھ	جلد نمبر ۶۶

مجلس ادارت

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی

مولانا ریاست علی صاحب (مدیر مسئول)

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی (مدیر)

طابع و ناشر

دارالعلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مطبوعہ

محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند

سالانہ زرِ اشتراک

ہندوستان سے ۲۵/- روپے

سعودی عرب، کویت، ابوظبی وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل ۹۰/- روپے

جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے

بذریعہ ایرمیل ۱۰۵/- روپے

امریکہ کناڈا وغیرہ سے بذریعہ ایرمیل ۱۱۶/- روپے

پاکستان سے بذریعہ رجسٹری ۴۵/- روپے

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

ضروری گذارش

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینہ یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو چکی ہے۔ بذریعہ سرخ نشان اس کی آپ کو اطلاع بھی دی جا چکی ہے لہٰذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی، پی ہی سے زرِ اشتراک ارسال کرنے میں سہولت ہے اگلا شمارہ ۳۷/- روپے کے مطالبہ میں وی، پی کر دیا جائے گا۔

(مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۴۵/- روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والا تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیج دیں اور انہیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(مدیر)

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی حسبِ ذیل بیان کئے ہیں (۱) تلاوت آیات (۲) تعلیم کتاب (قرآن) وحکمت (سنت) (۳) تزکیۂ قلوب۔ جیساکہ ارشاد خداوندی ہے:۔

لقد من اللّٰه على المؤمنين اذ بعث فيهم رسولاً منهم يتلوا عليهم اٰياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة (الآیۃ)

اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان میں بھیجا ایک رسول انہی میں سے، پڑھتا ہے ان پر اس کی آیتیں اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے مقصد بعثت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے "بُعثت معلمًا" اور بعثت لأتمم مکارم الاخلاق" یعنی میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام و فرمان سے باخبر کروں اور انسانوں کو تمام مراتب شرک، معصیت اور نفسانی آلائیشوں سے پاک وصاف کرکے انہیں اخلاق وکردار کے بلند مقام پر پہنچادوں۔

قرآن وحدیث کی ان تشریحات سے پتہ چلتا ہے کہ "اسلام" اور تعلیم وتزکیہ کی تاریخ ساتھ ساتھ چلتی ہے اسلام کا آغاز ہی تعلیم وتزکیہ کی ابتداء ہے اور ان میں باہم چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسلئے اسلام بغیر علم وتزکیہ کے ایک جسد بے روح ہے اور تزکیہ وتعلیم کا تصور بغیر اسلام ایک فریب محض ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی تبلیغ ودعوت کے ساتھ تعلیم وتزکیہ کا بھی پورا پورا اہتمام فرماتے تھے۔ مکہ کی زندگی جہاں مالک حقیقی کا نام لینا ہی سب سے بڑا گناہ، اور فکر ورائے کی آزادی سنگین جرم تھا۔ شرک وکفر اور ظلم وجبر کی اس گھٹی ہوئی فضا میں آپ جہاں ایک طرف چل پھر کر اسلام کی دعوت کا فریضہ انجام دیتے تھے وہیں دوسری طرف دارارقم میں بیٹھ کر مسلمانوں کو کتاب وسنت کی تعلیم اور تزکیۂ اخلاق کا کام بھی انجام

دیتے تھے۔

ہجرت مدینہ کے بعد جب یک گونہ اطمینان نصیب ہوا اور آزادی کا ماحول میسر آیا تو مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ مسجد سے متصل جانب شمال الگ سے ایک مدرسہ اور تربیت گاہ بھی تعمیر کرائی جو اسلامی تاریخ میں "صفۃ المسجد" اور مختصر لفظوں میں "صفہ" کے نام سے معروف و مشہور ہے یہ اسلام کی اولین اقامتی درسگاہ تھی جہاں طالبانِ علوم و تزکیہ کا ہمہ وقت قیام رہتا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت سے مستفیض ہوتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرات خلفاء نے اس سلسلے کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کو مزید آگے بڑھایا بالخصوص خلیفۂ ثانی حضرت فاروق اعظم نے تو اسے مستقل نظام بنادیا حکومتی سطح پر اس کوشش کے ساتھ ساتھ حضرات صحابہ بطور خود بھی اپنی اپنی جگہوں پر تعلیم و تربیت اور تزکیۂ اخلاق کی خدمات انجام دیتے تھے گویا جو صحابی جہاں پہنچ جاتا تھا وہیں ایک مدرسہ اور خانقاہ قائم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ان حضرات کے تلامذہ یعنی حضرات تابعین حدیث، تفسیر، فقہ اور مغازی و سیر کے امام ہونے کے ساتھ زہد و تقویٰ اور مکارم اخلاق کے بھی پیکر ہوتے تھے۔ امام حسن بصری، امام محمد بن سیرین، سعید بن المسیب، امام زہری، امام اوزاعی وغیرہ حضرات تابعین کے تذکرے پڑھ کر دیکھ لیجئے ان کا ہر ہر فرد علمی عبقریت کے ساتھ اعمال و اخلاق کا مجسمہ ملے گا۔

پھر یہ زریں سلسلہ حضرات تابعین ہی پر ختم نہیں ہو گیا بلکہ تراجم اور تذکروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری تک علماء میں بالعموم یہی جامعیت موجود رہی کہ وہ بیک وقت محدث، مفسر، متکلم، ادیب اور مورخ ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجے کے متقی پارسا اور اصطلاحی الفاظ میں صوفی و شیخ ہوتے تھے۔ چوتھی صدی کے بعد اس جامعیت میں اضمحلال آنا شروع ہو گیا جو دھیرے دھیرے اس حد تک پہنچ گیا کہ علماء مختلف طبقات میں تقسیم ہو گئے اور ہر طبقہ کسی ایک فن کے ساتھ مخصوص ہو گیا لیکن علم و عمل میں توافق اور یکسانیت پہلے کی طرح قائم رہی اگر کہیں اس میں تضاد یا کمی نظر آتی ہے تو وہ بالعموم انفرادی اور شخصی حد تک ہے جسے معاشرۂ علماء نے برداشت نہیں کیا اور ایسے شخص کو وہ اپنی جماعت میں شمار نہیں کرتے تھے۔

علم وعمل یا تعلیم وتزکیہ کا یہ باہمی ارتباط اسلامی ہند کے آخری عہد تک قائم رہا چنانچہ مسند ہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا خانوادہ جو اسی آخری دَور کی یادگار ہے اس کا ایک ایک فرد علوم وفنون اور سلوک وتصوف کا جامع تھا بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ اس گنج گرانمایہ اور متاع گم گشتہ کو اگلی نسلوں تک پہنچانے میں اسی خاندان نے تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) کے سیاسی انقلاب نے مسلمانوں کی قوت وشوکت کے مناروں کے ساتھ ان کے تعلیمی وتربیتی مراکز کو بھی تہ وبالا کر دیا۔ اس اتھل پتھل کے وقت اسی خانوادۂ ولی اللہی کے چند حاشیہ نشینوں اور فیض یافتوں نے اسلام اور اس کی روایات کی حفاظت کے لئے نہایت خاموشی کے ساتھ " دیوبند " جیسے کوردہ اور گمنام مقام میں ایک ایسے مدرسہ کی بنیاد رکھدی جو بیک وقت مدرسہ اور خانقاہ دونوں کی ضرورت پوری کرے اور اسلام کے ایسے مبلغ وسپاہی تیار کرے جو فی اللیل رھبان و فی النہار فرسان "کے نمونہ ہوں۔ اور حضرات بانیین کے اخلاص نیت کی برکت سے تھوڑی ہی مدت میں یہ قصباتی مدرسہ اسلامیہ ایک عظیم بین الاقوامی دارالعلوم بن گیا اور اس کے علماء وفضلاء کو ایسی مقبولیت ومرجعیت حاصل ہوئی کہ ان کے سامنے کسی کا چراغ روشن نہ رہ سکا حالانکہ علماء دیوبند کے علاوہ دیگر علمی حلقوں میں ایسے علماء فضلاء کی خاصی تعداد اس وقت موجود تھی جو تبحر علمی میں علماء دیوبند سے کسی طرح فروتر نہیں تھے لیکن علم وعمل یا عالمیت ومشیخت کی وہ جامعیت جو علماء دیوبند کی خصوصیت تھی ان میں یہ حضرات ہمارے علماء کا مقابلہ نہ کر سکے اس لئے پیچھے رہ گئے۔

علم وعمل کی جامعیت ہی " دارالعلوم دیوبند" کی وہ خصوصیت ہے جس نے اسے ماضی میں چہار دانگ عالم میں شہرت ومقبولیت سے ہمکنار کیا اور آج بھی اس کی نیک نامی اسی جامعیت پر موقوف ہے۔ دارالعلوم کا یہ وہ منہاج اور نصب العین ہے جو اسے دیگر علمی اداروں سے ممتاز بناتا ہے۔ مقام شکر ہے کہ دارالعلوم کی موجودہ انتظامیہ اس بات کو پورے طور پر محسوس کرتی ہے اور اسی جامعیت کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں پوری طرح سے کوشاں ہے۔

سلام اور اسلام

تحیۃ کے لغوی معنی ہیں کسی کو "حیاک اللہ" کہنا۔ یعنی اللہ تم کو زندہ رکھے۔ قبل از اسلام عرب کی عادت تھی کہ جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو "حیاک اللہ" یا "انعم اللہ بک عینا" یا "انعم صباحاً" وغیرہ الفاظ سے سلام کیا کرتے تھے۔ اسلام نے اس طرز تحیۃ کو بدل کر السلام علیکم کہنے کا طریقہ جاری کیا جس کے معنی ہیں "تم ہر تکلیف اور رنج و مصیبت سے سلامت رہو"۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ لفظ سلام اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے اور السلام علیکم" کے معنی یہ ہیں کہ "اللہ رقیبٌ علیکم" یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے۔

اسلامی سلام تمام دوسری اقوام کے سلام سے بہتر ہے

دنیا کی ہر مہذب قوم میں اس کا رواج ہے کہ جب آپس میں ملاقات کریں تو کوئی کلمہ آپس کی موانست اور اظہار محبت کے لئے کہیں لیکن موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی سلام جتنا جامع ہے کوئی دوسرا ایسا جامع نہیں، کیونکہ اس میں صرف اظہار محبت ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ ادائے حق محبت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ آپ کو تمام آفات اور آلام سے سلامت رکھیں، پھر دعا بھی عرب کے طرز پر صرف زندہ رہنے کی نہیں بلکہ حیاتِ طیبہ کی دعا ہے یعنی تمام آفات اور آلام سے محفوظ رہنے کی، اسی کے ساتھ اس کا بھی اظہار ہے کہ ہم اور تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، ایک دوسرے کو کوئی نفع بغیر اس کے اذن کے نہیں پہنچا سکتا، اس معنیٰ کے اعتبار سے یہ کلمہ ایک عبادت بھی ہے اور اپنے بھائی مسلمان کو خدا تعالیٰ کی یاد دلانے کا ذریعہ بھی۔

اسی کے ساتھ اگر یہ دیکھا جائے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگ رہا ہے کہ ہمارے ساتھی کو تمام آفات اور تکالیف سے محفوظ فرما دے تو اس کے ضمن میں وہ گویا یہ وعدہ بھی کر رہا ہے کہ تم میرے ہاتھ اور زبان سے مامون ہو، تمہاری جان، مال، آبرو کا میں محافظ ہوں۔ ابن عربی نے احکام القرآن میں امام ابن عیینہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

أَتَدْرِیْ مَا السَّلَامُ؟ یَقُوْلُ أَنْتَ آمِنٌ مِنِّیْ۔

"تم جانتے ہو کہ سلام کیا چیز ہے؟ سلام کرنے والا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے مامون رہو"

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تحیہ ایک عالمگیر جامعیت رکھتا ہے (۱) اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے (۲) تذکیر بھی (۳) اپنے بھائی مسلمان سے اظہارِ تعلق و محبت بھی (۴) اس کے لئے بہترین دعا بھی، (۵) اور اس سے یہ معاہدہ بھی کہ میرے ہاتھ اور زبان سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد وارد ہے:۔

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَیَدِهٖ (الحدیث)	"یعنی مسلمان تو وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے سب مسلمان محفوظ رہیں، کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

کاش مسلمان اس کلمہ کو عام لوگوں کی رسم کی طرح ادا نہ کرے بلکہ اس کی حقیقت کو سمجھ کر اختیار کرے تو شائد پوری قوم کی اصلاح کے لئے یہی کافی ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے باہم سلام کو رواج دینے کی بڑی تاکید فرمائی۔ اور اس کو افضل الاعمال قرار دیا، اور اس کے فضائل و برکات اور اجر و ثواب بیان فرمائے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہ ہو، اور تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو، میں تم کو ایسی چیز بتاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کر لو تو تمہارے آپس میں محبت قائم ہو جائے گی وہ یہ کہ آپس میں سلام کو عام کرو، یعنی ہر مسلمان کے لئے خواہ اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو۔"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کے اعمال میں سب سے افضل کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو کھانا کھلاؤ، اور سلام کو عام کرو خواہ تم اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو (صحیحین)

مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد نے حضرت ابوامامہؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں ابتدا کرے۔

مسند بزار اور معجم کبیر طبرانی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا ہے، اس لئے تم آپس میں سلام کو عام کرو، کیونکہ مسلمان آدمی جب کسی مجلس میں جاتا ہے

اور ان کو سلام کرتا ہے تو اس شخص کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت کا ایک بلند مقام حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس نے سب کو سلام یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد دلائی۔ اگر مجلس والوں نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا تو ایسے لوگ اس کو جواب دیں گے جو اس مجلس والوں سے بہتر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتے۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بڑا بخیل وہ آدمی ہے جو سلام میں بخل کرے (طبرانی، معجم کبیر عن ابی ہریرہ رضؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا صحابہ کرام پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اکثر بازار میں صرف اس لئے جایا کرتے تھے کہ جو مسلمان ملے اس کو سلام کر کے عبادت کا سلام حاصل کریں، کچھ خریدنا یا فروخت کرنا مقصود نہ تھا۔ یہ روایت موطأ امام مالک میں طفیل بن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

قرآن مجید کی جو آیت اوپر ذکر کی گئی ہے اس میں ارشاد یہ ہے کہ جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس کا جواب اس سے بہتر الفاظ میں دو، یا کم از کم ویسے ہی الفاظ کہہ دو، اس کی تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس طرح فرمائی کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا "السّلام علیک یا رسول اللہ" آپؐ نے جواب میں ایک کلمہ بڑھا کر فرمایا: "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ"۔ پھر ایک صاحب آئے اور انہوں نے سلام میں یہ الفاظ کہے: "السّلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ" آپؐ نے جواب میں ایک اور کلمہ بڑھا کر فرمایا: "وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔ پھر ایک صاحب آئے انہوں نے اپنے سلام ہی میں تینوں کلمے بڑھا کر کہا: "السّلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔ آپؐ نے جواب میں صرف ایک کلمہ "وعلیک" ارشاد فرمایا۔ ان کے دل میں شکایت پیدا ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان، پہلے جو حضرات آئے آپ نے ان کے جواب میں کئی کلمات دعاء کے ارشاد فرمائے اور میں نے ان سب الفاظ سے سلام کیا تو آپ نے "وعلیک" پر اکتفاء کیا آپؐ نے فرمایا کہ تم نے ہمارے لئے کوئی کلمہ چھوڑا ہی نہیں کہ ہم جواب میں اضافہ کرتے، تم نے سارے کلمات اپنے سلام ہی میں جمع کر دیئے اس لئے ہم نے قرآنی تعلیمات کے مطابق تمہارے سلام کا جواب بالمثل دینے پر اکتفاء کر لیا۔ اس روایت کو ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے مختلف اسانید کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حدیث مذکور سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ سلام کا جواب اس سے اچھے الفاظ میں دینے کا جو حکم آیت مذکورہ میں آیا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ سلام کرنے والے کے الفاظ سے بڑھا کر جواب دیا جائے۔ مثلاً اس نے کہا "السّلام علیکم" تو آپ جواب دیں "وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ" اور اس نے کہا "السّلام علیکم ورحمۃ اللہ" تو آپ جواب میں کہیں "وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہ کلمات کی زیادتی صرف تین کلمات تک مسنون ہے اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں۔ اور حکمت اس کی ظاہر ہے کہ سلام کا موقع مختصر کلام کرنے کا مقتضی ہے، اس میں اتنی زیادتی مناسب نہیں جو کسی کام میں مخل یا سننے والے پر بھاری ہو جائے، اسی لئے جب ایک صاحب نے اپنے ابتدائی سلام میں ہی تینوں کلمے جمع کر دیئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے اور زیادتی سے احتراز فرمایا، اس کی مزید توضیح حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس طرح فرمائی کہ مذکورہ تینوں کلمات سے زیادہ کرنے والے کو یہ کہہ کر روک دیا کہ "ان السّلام قد انتہیٰ الی البرکۃ (مظہری عن البغوی) یعنی سلام لفظ برکت پر ختم ہو جاتا ہے اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں ہے (دوسری عن ابی کثیر)

تیسری بات حدیث مذکور سے یہ معلوم ہوئی کہ سلام میں تین کلمے کہنے والے کے جواب میں اگر صرف ایک کلمہ ہی کہدیا جائے تو وہ بھی ادار بالمثل کے حکم میں حکم قرآن اَوْ رُدُّوْهَا کی تعمیل کے لئے کافی ہے جیسا کہ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک کلمہ پر اکتفاء فرمایا ہے (تفسیر مظہری)

مضمون آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی مسلمان کو سلام کیا جائے تو اس کے ذمہ جواب دینا تو واجب ہے، اگر بغیر کسی عذر شرعی کے جواب نہ دیا تو گنہگار ہوگا۔ البتہ جواب دینے میں دو باتوں کا اختیار ہے، ایک یہ کہ جن الفاظ سے سلام کیا گیا ہے ان سے بہتر الفاظ میں جواب دیا جائے، دوسرے یہ کہ بعینہ انہی الفاظ سے جواب دیدیا جائے۔

اس آیت میں سلام کا جواب دینے کو تو لازم واجب صراحۃً بتلا دیا گیا ہے، لیکن ابتداءً سلام کرنے کا کیا درجہ ہے اس کا بیان صراحۃً نہیں ہے، مگر اذا حییتم میں اس کے حکم کی طرف بھی اشارہ موجود ہے کیونکہ اس لفظ کو بصیغۂ مجہول بغیر تعیین فاعل ذکر کرنے میں اشارہ ہو سکتا ہے کہ سلام ایسی چیز ہے جو عادۃً سب مسلمان کرتے ہیں۔

مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب وہ شخص ہے جو سلام کی ابتدا کرے۔

اور سلام کی تاکید اور فضائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ابھی آپ سن چکے ہیں ان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً سلام کرنا بھی سنت مؤکدہ سے کم نہیں، تفسیر بحر محیط میں ہے کہ ابتدائی سلام تو اکثر علماء کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: السلام تطوع والرد فریضۃ، یعنی ابتداءً سلام کرنے میں تو اختیار ہے لیکن سلام کا جواب دینا فرض ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم قرآنی کی مزید تشریح کے طور پر سلام اور جواب سلام کے متعلق اور بھی کچھ تفصیلات بیان فرمائی ہیں وہ بھی مختصر طور پر سن لیجئے، صحیحین کی حدیث میں ہے کہ جو شخص سوار کیا ہو اس کو چاہیئے کہ پیادہ چلنے والے کو خود سلام کرے اور جو چل رہا ہو وہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور جو لوگ تعداد میں قلیل ہوں وہ کسی بڑی جماعت پر گذریں تو ان کو چاہیئے کہ سلام کی ابتداء کریں۔

ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جب آدمی اپنے گھر میں جائے تو اپنے گھر والوں کو سلام کرنا چاہیئے کہ اس سے اس کے لئے بھی برکت ہوگی اور اس کے گھر والوں کے لئے بھی۔

ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک مسلمان سے بار بار ملاقات ہو تو ہر مرتبہ سلام کرنا چاہیئے اور جس طرح اول ملاقات کے وقت سلام کرنا مسنون ہے اسی طرح رخصت کے وقت بھی سلام کرنا مسنون اور ثواب ہے۔ ترمذی اور ابوداؤد میں یہ حکم بروایت قتادہ و ابوہریرہ رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے۔

اور یہ حکم جو ابھی بیان کیا گیا ہے کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے اس سے چند حالات مستثنیٰ ہیں۔ جو شخص نماز پڑھ رہا ہے اگر کوئی اس کو سلام کرے تو جواب دینا واجب نہیں، بلکہ مفسد نماز ہے، اسی طرح جو شخص خطبہ دے رہا ہے یا قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہے یا اذان یا اقامت کہہ رہا ہے یا دینی کتابوں کا درس دے رہا ہے یا انسانی ضروریات استنجاء وغیرہ میں مشغول ہے اس کو اس حالت میں سلام کرنا بھی جائز نہیں اور اس کے ذمہ جواب دینا بھی واجب نہیں۔

ضرورت رسالت

من املی شیخ الاسلام حضرت مولانا السید حسین احمد المدنی قدس اللہ سرہم

از مرتب درس ترمذی مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی اعظم گڈھ، یوپی

اس کتاب کا تعلق فن حدیث سے ہے تو مباحث کتاب شروع کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا موضوع کیا ہے اور غایت کیا ہے (اور حدیث کسے کہتے ہیں) ورنہ طلب مجہول لازم آوے گی اس لئے سب سے پہلے یہ غور کرنا چاہیئے کہ جس عالم میں ہم موجود ہیں وہ حادث ہے کہ اس کا وجود ضروری نہیں ہے اس لئے انسان، حیوانات، نباتات اور فلکیات سب کے سب اپنے وجود کے لئے کسی کے محتاج ہیں تو ان کے لئے کوئی (مرکز وجود اور) محدث ضروری ہے اور وجود ہی تمام نعمتوں کی اصل ہے تو اللہ تعالیٰ مبدأ عالم ہے اس نے تمام موجودات کو وجود بخشا ہے اس لئے وہی موجد وہی محدث عالم ہے. ظاہر ہے کہ وجود عطا کرنے والی ذات خود بھی موجود ہوگی اور اس کا وجود وجوبی ہوگا امکانی نہیں ہوگا کیونکہ عقلاً ہر چیز کی انتہا ایک ایسی چیز پر ماننی پڑتی ہے جس کا وجود بالذات ہو اور وہ سب کو وجود بخش سکتا ہو اپنے وجود میں کسی کی محتاج نہ ہو، اپنے کمال میں ناقص نہ ہو (جیسے روشنی کے لئے سورج، پانی کے لئے سمندر، شرارت کے لئے شیطان) یہ ایک عقلی مسئلہ ہے اس پر علم کلام میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے. تو ایسی ذات جس کا وجود ذاتی ہو اور وہ صفات کاملہ میں اس قدر کامل ہو کہ اس میں کوئی نقص نہ ہو، اس ذات کو ہم اللہ کہتے ہیں وہی تمام صفات کمالیہ سے متصف ہے اور وہی کائنات کی تمام نعمتوں کا مرجع ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہر طرح کی عاجزی کا اظہار اسی سے ہو اور عبادت اسی کی کی جائے یہ ہے مقدمہ اولیٰ.

مقدمہ ثانیہ یہ ہے کہ جو کوئی منعم ہو اس کا شکریہ بقدر انعام واجب ہے یہ اصول سب کا مسلمہ ہے. اللہ تعالیٰ ہمارا محسن ہے بلکہ محسن اعظم ہے اس کا انعام جس قدر انسان پر ہے کسی دوسری نوع پر نہیں ہے

پہلا انعام اس کا پہلا عظیم انعام یہ ہے کہ اس نے تمہیں وجود بخشا، وجود وہ نعمت ہے

جس کی خواہش ہر چیز کے اندر [illegible] اور عدم سے ہر ایک کو نفرت ہے چاہے کتنا ہی پریشان ہو عدم کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

دوسرا انعام | اس کا دوسرا عظیم انعام یہ ہے کہ اس نے اشرف المخلوقات بنایا۔ انسان چونکہ مادی ہے اس لئے عناصر کا محتاج ہے اور مادیات میں بڑا درجہ نباتات کا ہے جس میں نشو و نما موجود ہے۔ اس سے بھی اعلیٰ درجہ حیوانات کا ہے جس میں احساس موجود ہے حرکت بالارادہ کی طاقت موجود ہے۔ پھر اس سے اگر ترقی کرے تو عقل و فہم پاکر انسان بن جائے تو قدرت کا بڑا احسان ہے کہ اس نے انسان بنایا اور خود اس کی حیثیت واضح کردی کہ ولقد کرمنا بنی آدم وحملناہم فی البر والبحر۔ پھر انسان کی اس حیثیت پر تنبیہ کرنے کے لئے باری تعالیٰ نے چار قسمیں کھاکر فرمایا ہے والتین والزیتون وطور سینین وہذا البلد الامین تب فرمایا لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔

آیت کا انداز بیان دیکھئے کہ قد کے ساتھ لام تاکید لایا گیا ہے اور خلقت کی جگہ خلقنا فرمایا ہے کیونکہ جب کوئی (صاحب حیثیت آدمی) بڑائی ظاہر کرنا چاہتا ہے تو اپنے لئے جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے کہ ہم نے یہ کام کردیا ہے۔ اگر وہ کہے کہ میں نے یہ کیا ہے تو وہ تعظیم نہ ہوئی جو مقصود تھی پھر یہاں فی لائے جو ظرفیت بتلاتی ہے کہ اور ظرف مظروف کو ہر طرف سے گھیرے رہتا ہے کہ احسنیت انسان کے ہر جزء میں موجود ہے ہر طرف ہے اگر مع احسن تقویم ہوتا تو یہ مبالغہ نہ ہوتا، نیز مفضل علیہ کو حذف کردیا تو اس سے عموم پیدا کردیا کہ احسن من کل شئی۔ اتنی تاکید کے بعد احسنیت انسان سے بڑھ کر یا اس کے برابر کس میں ہوسکتی ہے اس سے ثابت ہوا کہ جتنا احسان خالق نے انسان پر کیا ہے اتنا کسی پر نہیں ہے۔

قوموں کی گمراہی | بہت سی قوموں کو اشکال ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے کہ نہیں؟ اسی وجہ سے انہوں نے غیر انسان کے سامنے سر جھکانا شروع کردیا حتیٰ کہ بعض بیوقوفوں نے اشجار اور احجار تک کی عبادت کر ڈالی، لیکن عقل سلیم نے اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کیا ہے (اور اب تو سائنس نے ثابت کردیا ہے کہ الوہیت کائنات کی کسی شئی میں نہیں ہے تو لا الٰہ ثابت ہے، الا اللہ ثابت ہونا باقی ہے اور مسلمانوں پر دنیا کا قرض ہے کہ ثابت کردیں)

شرافت انسانی | نقلاً بھی ثابت ہے کہ انسان سب سے اشرف اور اعلیٰ ہے چنانچہ (قرآن شاہد ہے کہ شیطان نے جب اپنی اصلیت اور انسان کی اصلیت) کو دیکھ کر اپنے کو افضل سمجھا اور اس [illegible]

سمجھا کہ اس کو خدا کی طرف سے سجدے کا حکم دیا گیا تو انکار کر دیا اور اس کی وجہ بتائی کہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین۔ ظاہر ہے کہ آگ عناصر میں سب سے قوی اور برتر ہے اور مٹی سب سے ارذل اور کمزور ہے اور جس کی اصل قوی ہوگی اس کی فرع قوی ہوگی، جس کی اصل کمزور ہوگی اس کی فرع کمزور ہوگی۔ اسی اصل کو اس نے معیار سمجھ کر اپنے آپ کو بڑا سمجھ لیا مگر باری تعالیٰ نے اس (نظریے) کو رد کر دیا اور فرمایا "مامنعک ان تسجد لما خلقت بیدی" کہ انسان کی خصوصی حیثیت یہ ہے کہ اس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے (تو نے اس حیثیت کو نظر انداز کر دیا۔

<u>کرشمۂ قدرت</u> ہاتھوں سے قدرت کا اظہار ہوتا ہے (قدرت دو طرح کی ہے قدرت ظاہرہ قدرت باطنہ) قدرت ظاہرہ کا مظاہرہ فلکیات، حیوانات اور نباتات ہیں اور قوت باطنہ کے مظاہر وہ ہیں جو ہمارے ادراک سے باہر ہیں مثلاً ملائکہ، جنات (ارواح) یا کوئی اور ہوں۔

باری تعالیٰ نے انسان کی خلقت میں اپنی دونوں قدرتوں کا مظاہرہ فرمایا ہے (ایک سے جسمانی قوتیں ہیں دوسری سے روحانی قوتیں) تو باری تعالیٰ کا خلیفہ وہی ہو سکتا ہے کہ جو ان دونوں کا جامع ہو اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کا جامع نہ ہو تو وہ خلیفہ نہیں ہو سکتا کسی شہنشاہ کا وزیر اعظم وہی بن سکتا ہے جو سلطنت کے تمام امور سے واقف ہو، سب کے اغراض و مقاصد جانتا ہو، سب میں تصرف کر سکتا ہو اس لئے خدا کا خلیفہ وہی ہو سکتا تھا جو کائنات کے تمام اسماء سے واقف ہو چنانچہ حضرت آدم علیہ السّلام کو بنانے کے بعد ان کو تمام اسماء سے واقف فرمایا۔

خیال ہو سکتا تھا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی پوری مملکت کا نظام چلاتے ہیں کوئی پانی برساتا ہے کوئی جان قبض کرتا ہے کوئی دوسرے زمین و آسمان کے کام انجام دیتا ہے پھر فرشتوں میں کسی قسم کی احتیاج نہیں ہے جبکہ انسان میں ہر طرح کی احتیاج ہے اس لئے فرشتوں کو انسان پر برتری حاصل ہے ان ہی کو خدائی خلافت ملنی چاہیے۔

چنانچہ یہ شبہ ظاہر کیا گیا اور خود ملائکہ نے کیا اور بہت قوت سے کیا کہ نحن نسبح بحمدک و نقدس لک، اور اس کے بعد اس شبہ کی تائید میں انسان کے حالات پیش کئے گئے کہ انسان اپنے منعم حقیقی کا باغی و دغاباز ہوگا اور اپنے ابنائے جنس سے بے وفائی کرنے کا حتیٰ کہ قتل کرنے کا انہوں نے کہا

اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء، افساد اگرچہ یہاں عام ہے مگر اس کی تفسیر شرک سے کی گئی ہے، تو جناب باری تعالیٰ نے فرشتوں کو اس شبہ پر جھڑک دیا اور فرمایا انی اعلم مالا تعلمون۔

خدائی انٹرویو | اگر کسی میں کسی نظام کے سنبھالنے کی صلاحیت نہیں ہے تو اس کو وہ نظام دینا عقل کی بات نہیں ہے۔ میزان و منشعب پڑھانے والے کو بخاری دیدینا حماقت ہے — باری تعالیٰ کے یہاں بخل نہیں ہے لیکن مبدأ فیاض کا فیض باعتبار استعداد کے ہے ملائکہ کو ان کی استعداد کے مطابق تعلیم دی گئی تھی آدم کو ان کی استعداد کے مطابق، اسی لئے فرشتوں سے (مقابلہ کرانے کے لئے) کہا گیا انبئونی باسماء ہؤلاء ان کنتم صادقین (تو وہ عاجز ہو گئے اور انہوں نے اپنی لاعلمی تسلیم کر لی قالوا لاعلم لنا الا ما علمتنا)

اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر کام کے لئے الگ الگ شعبے ہیں اور ہر شعبے کو اس کے ماہر فن کے سپرد کرنا حکمت ہے اگر کسی کو زراعت سے مناسبت ہے تو اسے وزیر زراعت بنانا چاہیئے اور کسی میں تجارت کا سلیقہ ہے تو اسے تجارت سپرد کرنی چاہیئے اسی طرح یہاں (مقابلہ کا) امتحان اس مقصد سے لیا گیا کہ خلیفہ بننے کی صلاحیت کون رکھتا ہے آدم یا ملائکہ؟

دونوں سے ان کی اس استعداد کے مطابق جو مبدأ فیاض نے ان میں رکھی تھی امتحان لیا گیا تو ثابت ہوا کہ خلیفہ بننے کی صلاحیت آدم رکھتے ہیں ملائکہ نہیں رکھتے (اور صلاحیت کا دارومدار علمی استعداد پر ہے) اس علم کے بعد فرشتوں نے سر جھکا دیا لیکن شیطان اس (حقیقت) کو نہیں سمجھا (اپنے نظریے پر قائم رہا اور) مردود ہوا۔

تیسرا انعام | تیسرا عظیم انعام یہ ہے کہ ہمارے لئے زمین سے آسمان تک مسخر کر دیا ارشاد ہے وسخر لکم الشمس والقمر، فرمایا گیا ہے وخلق لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا، یعنی ہمارے لئے جمادات نباتات اور حیوانات ہی کو نہیں بلکہ عنصریات و فلکیات کو بھی مسخر کر دیا ہے۔

خدمت کرنے والے چار قسم کے ہوتے ہیں ایک ملازم، دوسرا مزدور، تیسرا غلام، چوتھا بیگار۔ اگر ملازم کو تنخواہ نہ دیجئے تو حکومت سے شکایت کرے گا، مزدور کو مزدوری نہ دیجئے تو وہ بھی شکوہ شکایت کرے گا، غلام اگرچہ ان سب سے کم رتبہ ہے مگر وہ بھی روٹی کپڑے اور مکان کا مطالبہ کرتا ہے لیکن بیگار اور مسخر تم سے کسی مطالبے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ تو باری تعالیٰ نے انسان کے لئے تمام مخلوقات کو بیگار بنا دیا ہے۔ سورج چاند تمہارے بیگاری ہیں۔ بادل

تمہارے کھیتوں، باغوں وغیرہ کو سیراب کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح ساری چیزیں تمہارے لئے اپنی اپنی ڈیوٹی دیا کرتی ہیں۔ اور بیگار بن کر کام کرتی ہیں مافی السمٰوات وما فی الارض۔ اسی وجہ سے کہ تم کو سب سے افضل بنایا ہے مگر تم نے اپنی حیثیت نہیں سمجھی اس لئے چاند سورج کی پوجا کرنے لگے۔ شہنشاہ کو چھوڑ کر سپاہی کے سامنے جھک گئے اس سے زیادہ عقل و دماغ کی کمزوری اور کیا ہو سکتی ہے حتیٰ کہ اس پتھر کو پوجنے لگے جسے اپنے ہاتھوں سے گڑھ لیا تھا یہی وجہ ہے کہ پھر سزا بھی سخت سے سخت دی گئی، ارشاد ہے ثم رددناہ اسفل سافلین۔

اور یہ سزا اس وجہ سے سخت دی گئی ہے کہ معمولی آدمی کے بالمقابل وزیر اعظم غلطی کرے تو سخت سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ جس انسان پر خدا نے اتنے عظیم الشان احسانات کئے وہ ناشکری کرے احسان فراموشی کرے اور دوسروں کے سامنے جا کر جھک جائے تو یہ اس کی غداری اور نمک حرامی ہے ان الانسان لربہ لکنود، اور وانہ لظلوم کفار اسی وجہ سے کہا گیا ہے۔

چوتھا انعام | یہ ہے کہ ہماری حفاظت کے لئے ملائکہ مقرر کر دیئے ہیں، ارشاد ہے "ان علیکم لحافظین کراماً کاتبین، نیز رحم مادر میں جنوں وغیرہ کی شرارتوں سے حفاظت کا بھی انتظام کر دیا ہے۔ ارشاد ہے ان کل نفس لما علیہا حافظ، اور لہ معقبات من بین یدیہ۔

نیز فرشتوں میں سب سے بڑا درجہ حاملین عرش کا ہے مگر وہ بھی انسان کے لئے دعائیں کرتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے استغفار، اور صرف مسلمان مردوں کے لئے نہیں بلکہ ان کی عورتوں اور بچوں کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ تو ملأ سافل کے فرشتے جس طرح آپ کے کام میں لگے ہیں اسی طرح ملأ اعلیٰ کے فرشتے آپ کی خدمت، حفاظت اور استغفار کیا کرتے ہیں اس لئے ارشاد ہے ان اللہ بالناس لرؤف رحیم، لام تاکید کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لئے راحت و رحمت کثرت سے ہوتی رہتی ہے لیکن اس راحت و رحمت پر کوئی بھول میں نہ پڑ جائے کیونکہ اس غفور رحیم کی جب کسی قوم نے مسلسل نافرمانی اور ناشکری کی ہے تو وہ برباد کر دی گئی ہے جیسا کہ قوم عاد و ثمود، قوم نوح اور قوم لوط وغیرہ غداری کی اور تباہ کر دی گئیں۔

چھٹا انعام | ان تمام انعامات کے ساتھ انسان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ قطرہ منی سے پیدا کیا گیا جو سب سے گندہ ہے پاخانہ پیشاب نکلے تو اطراف و جوانب دھونے سے پاک ہو جاؤ گے لیکن منی نکلے تو پورا جسم دھونا پڑے گا، تو اس سے زیادہ غلیظ کوئی نجاست نہیں ہے پھر جس کی منی

بھی نجس ہے اور ایسا نجس کہ عورت روزہ نماز کی نہیں رہ جاتی تم اس سے جماع نہیں کر سکتے اس قدر نجاست و غلاظت کے باوجود اسی قطرہ منی اور اسی دم حیض سے اولیاء و انبیاء تک بنائے گئے اور نو ماہ تک بچہ اس سے بنتا رہتا ہے اسی کو ہضم کرتا رہتا ہے مگر کس قدر کمال ہے اس بنانے والے کا کہ اسی سے اتنا باکمال انسان بنا دیا کرتا ہے۔

سونے سے زیور سب بنا سکتے ہیں مگر مٹی اور راکھ سے زیور بنا دینا کمال فن کا مظاہرہ کرنا ہے اس کے بعد عقل ایسی عظیم نعمت عطا کر دی کہ اس سے تم عقول مجردہ میں بحث و اختراع کرنے لگے، علوم و فنون کے انبار لگائے طرح طرح کی چیزیں ایجاد و اختراع کرنے لگے حالانکہ ہو وہی دم حیض وہی قطرہ منی۔

عقل کا تقاضا تھا کہ تم اپنی ہستی پر بھی غور کرتے مگر بھول جاتے ہو اس لئے قرآن کے نزول کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد تذکیر بآلاء اللہ ہے کہ پرانی باتوں کو یاد کرکے آدمی اپنی قدر پہچانے مگر انسان غیر ضروری باتوں میں پڑ کر اپنا مقصود بھول جاتا ہے اس لئے اس کو بار بار یاد دلانا پڑتا ہے۔ مختلف پیرایوں سے سمجھایا جاتا ہے کیونکہ یہ بھی قرآن کا مقصود ہے۔

انعامات کا تسلسل پھر یہ نہیں کہ انسان پر جو انعامات کئے تھے وہ ختم ہوگئے، نہیں بلکہ ہر ہر منٹ فیضان رحمت ہوتا رہتا ہے اور ہر وقت صحت و عافیت عطا ہوتی رہتی ہے حفاظت کا سامان بھی ہوتا رہتا ہے اور مسلمانوں کے لئے تو ہر وقت جنت تک تیار رہتی ہے اس لئے انسان پر ہر وقت شکر کرنا واجب ہے۔

پھر نعمتیں چونکہ لاتعد ولاتحصیٰ ہیں اس لئے شکر بھی اسی قدر ہونا چاہیئے۔ جب نعمتیں زیادہ ہیں، تو ذمہ داریاں اور حقوق بھی زیادہ ہوں گے۔ پہلا حق یہ ہے کہ کفران نعمت نہ کرے، دوسرا حق یہ ہے کہ خدا کے شکر سے غافل نہ ہو ورنہ یہی انسان ظلوم کفار کہلانے کا مستحق ٹھہریگا۔

رسول کی ضرورت ادائے شکر کے لئے ضروری ہے کہ منعم کی مرضی معلوم کی جائے کہ وہ کن چیزوں سے خوش ہوتا ہے کن چیزوں سے ناخوش، تاکہ مرضیات کا اہتمام کریں نامرضیات سے احتراز کریں تب جاکر ہم منعم کے لائق جو شکر ہے اسے ادا کرسکیں گے، پھر منعم کی مرضیات معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ منعم کی طرف سے اخبار ہو کہ ہم فلاں فلاں چیزوں سے راضی ہیں فلاں فلاں چیزوں سے ناراض، یہ پسند یہ ناپسند، ظاہر ہے کہ باری تعالیٰ [illegible]

کی وجہ سے نہ ہر ایک کو اس کی خبر دے سکتا ہے نہ ہر ایک اس کا تحمل کر سکتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ کسی کو اپنا مخصوص و مقرب بنا کر ہمیں خبر دے ایسے ہی شخص کو ہم نبی اور رسول کہتے ہیں ۔ اور اسی کی شخصیت واسطہ ہوگی ہمارے درمیان اور منعم حقیقی کے درمیان ، جیسے عام بادشاہ اور امراء اپنے احکام اپنے خاص وزیروں اور حکام کو دیتے ہیں اور وہ اس حکم کو سارے ملک میں پہنچایا کرتے ہیں۔

اسی طرح باری تعالیٰ نہ زید و بکر کو اپنی بات بتا سکتا ہے نہ ابوجہل و ابوطالب کو، بلکہ کسی ایسے شخص کو منتخب کر کے پیغام پہنچاتا ہے جو اس کے نزدیک معتمد، دیانت دار اور قابل اعتبار ہو۔ اس لئے عقلاً ضروری ہے کہ رسالت کو تسلیم کیا جائے، اسی وجہ سے جس کو یہ خدمت سپرد ہوتی ہے اسے ابتداءً منتخب کر لیا جاتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ سے کہا گیا واصطنعتک لنفسی ایسے ہی کو مجتبیٰ کہا جاتا ہے (اور خود اس کی نگرانی اور تربیت کرائی جاتی ہے ارشاد ہے لتصنع علی عینی) ایسے شخص کے اندر نافرمانی کا مادہ ہی نہیں ہوگا اس لئے وہ معصوم ہوتا ہے۔

<u>دلائل نبوت</u> (نبی و رسول جب مبعوث ہوتا ہے تو اپنی نبوت و رسالت کا اعلان کرتا ہے پھر) اپنے دعویٰ پر دلائل و شواہد پیش کرتا ہے مگر اس کے امتیاز کا کوئی سلسلہ ہونا چاہیئے تاکہ ہر بوالہوس نبوت کا دعویٰ نہ کر سکے تو جن باتوں سے امتیاز حاصل ہوتا ہے وہ معجزات ہیں اور ہر معجزہ خرق عادت سے ہوتا ہے کہ عام مخلوق سے اس کا صادر ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے ہر معجزہ نبی کے لئے بطور سند اور سرٹیفکیٹ ہوتا ہے جیسے امتحان کی کامیابی پر سند اس کی نشانی ہوتی ہے اسی طرح باری تعالیٰ کسی بندے کے ہاتھوں سے ایسے افعال کا صدور کراتا ہے جو عام انسانوں کے لئے محال ہوں۔

<u>معجزات رسالت</u> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معجزات عطا کئے گئے وہ دس ہزار تھے ان میں سے سات ہزار علمی معجزات تھے باقی عملی، آپ کے علمی معجزات میں قرآن کی آیات بھی شامل ہیں کیونکہ قرآن پاک آپ کا سب سے بڑا علمی معجزہ ہے۔ وہ اہل عرب جو ۱۰۰ برس سے عربی ادب میں بڑی مہارت پیدا کر چکے تھے اور نثر و نظم دونوں پر بڑی قدرت رکھتے تھے اور اپنی فصاحت و بلاغت کے قصیدے پڑھا کرتے تھے لیکن جب قرآن نے بطور تحدی انہیں للکارا ہے تو سارا عرب خاموش ہو گیا اور آج تک قرآن کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔ حضور کا یہ معجزہ اب تک زندہ ہے کہ حضرت موسیٰ کا عصا اور ید بیضاء اور حضرت عیسیٰ کی شفاء

امکہ دلیر صنم ہو گئی۔

امت کے لئے نعمت عظمیٰ | قرآن امت محمدیہ کے لئے خدا کی عظیم ترین نعمت ہے۔ اتنی بڑی دولت کسی امت کو کبھی نہیں دی گئی کیوں کہ باری تعالیٰ نے حضور کی نبوت ثابت کرنے کے لئے قرآن کی شکل میں اپنی صفت کلام عطا کر دی ہے باری تعالیٰ کی صفت کلام نفسی ہے مگر امت کی خاطر اسے کلام لفظی کے لباس میں کر کے ہمیں سپرد کر دیا ہے۔ کیوں کہ انسان کلام نفسی کا ادراک نہیں کر سکتا تھا یہ خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے یہ اس امت کی اہم ترین خصوصیت ہے لیکن بد قسمتی سے ہم اس کی طرف توجہ نہیں کرتے، نہ ترجمہ دیکھتے ہیں اور نہ تفسیر پڑھتے ہیں نہ تلاوت سے لذت حاصل کرتے ہیں۔

شواہد رسالت | بہرحال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کرنے کے لئے بہت سے عقلی و نقلی دلائل موجود ہیں، بہت سے واقعات کا اس طرح ظہور رہا جس طرح آپ ؐ نے پیشین گوئی فرمائی تھی، ان کی پیشگوئی کے مطابق قیصر و کسریٰ تباہ ہو گئے، مقوقس ختم ہو گیا، مصر و ایران کی سلطنتیں تہ و بالا ہو گئیں اور آپ کے جانشین زمانے میں پھیل گئے تو جس نے مقابلہ کیا تباہ ہو گیا۔

نبوت کے کارنامے | خدا کی مرضیات و نامرضیات بتانے والے کا نام رسول ہے۔ اس سلسلے میں خدا نے آپ کے لئے چار وظیفے مقرر کئے تھے یتلوا علیہم آیاتہ ویعلمہم الکتاب والحکمۃ، اور یزکیہم،

(۱) ان میں سے تلاوت یہ ہے کہ جو آیات آپ پر اترتی ہیں انہیں لوگوں کو خود سنادیں (اور برابر سنایا کرتے رہیں) چنانچہ ساری عمر آپ نے اس وظیفہ کو اس قدر ادا کیا کہ اب تک تلاوت کا تسلسل جاری ہے۔

(۲) تعلیم کتاب یہ ہے کہ آیات کے معانی سمجھائے جائیں (سوال یہ ہے کہ اہل عرب کو عربی سمجھانے کی کہاں ضرورت تھی) تو اس کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ جس امت کو یہ کتاب دی گئی تھی اگرچہ وہ اسی کی زبان میں دی گئی کیونکہ کبھی کوئی نبی کسی قوم میں غیر قومی زبان کا نہیں بھیجا گیا اس لئے عرب میں قرآن آیا تو عربی میں آیا مگر محاورات میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے اس میں ایک معانی اولیہ ہوتے ہیں جو ہر صاحب زبان سمجھ لیتا ہے لیکن کچھ معانی ثانویہ ہوتے ہیں ان کا سمجھنا ہر شخص کے لئے آسان نہیں مشکل ہوتا ہے مثلاً کثیر الرماد دیکھے تو اس کے معانی اولیہ بہت راکھ والا، حالانکہ متکلم کی مراد یہ نہیں ہے۔ محاورہ ہے اور اس میں معانی ثانویہ مراد ہیں۔

سیحی بڑا احسان نواز ذکر کثرت طعام سے راکھ کا ڈھیر لگ جاتا ہے ، تو کلام اللہ اور کلام الرسول میں معانی اولیہ کم مراد لئے جاتے ہیں معانی ثانویہ زیادہ مراد ہوتے ہیں اس لئے الفاظ سے متکلم کی منشا و مراد سمجھنا آسان کام نہیں ہے بہت ذکی و فہیم ہو تب سمجھ سکتا ہے ۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضہ ابن عباس کو بہت پاس بٹھایا کرتے تھے اور اپنی مجلس میں شریک رکھتے تھے کیونکہ بہت ذکی و ذہین تھے ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے فرمایا کہ ان کے برابر تو میرے بیٹے اور پوتے ہیں آپ انہیں ہمارے ساتھ بٹھاتے ہیں ۔

حضرت عمر فاروق سُن کر ٹال گئے جواب نہیں دیا کیونکہ ان کے رتبے سے واقف تھے مگر ایک مرتبہ مجلس میں لوگوں سے سوال کیا کہ اذا جاء نصر اللہ والفتح کا مقصد نزول کیا ہے جتنے صحابہ موجود تھے سب نے اس کے معانی اولیہ بتائے لیکن معانی ثانویہ جو مراد متکلم ظاہر کرے کسی نے نہیں بتائے تو حضرت عمر نے حضرت ابن عباس سے پوچھا جو اپنی عمر میں قریب البلوغ تھے کہ ایکذا انزل ، تو انہوں نے جواب دیا کہ اس سے حضور کے وصال کی اطلاع دی گئی ہے اس پر حضرت عمر بولے کہ اس سے زیادہ میں بھی نہیں جانتا ہوں ۔ مگر یہ ایسے معانی تھے جو حضرات صحابہ بھی نہیں سمجھ سکے (حالانکہ اہل زبان بھی تھے صحابی بھی) لیکن حضرت عمر اور حضرت ابن عباس اس کو سمجھ گئے ، تو قرآن و حدیث کے معانی اولی اور ہوتے ہیں اور ان کے مقاصد اور ، ان ہی مقاصد قرآن کے بیان کے لئے نبی کی بعثت ہوتی ہے اور وہ یعلمہم الکتاب کرتا ہے ۔

تفسیر اذا جاء | واقعہ بھی اسی طرح تھا کیونکہ آپ کی بعثت اس وقت ہوئی تھی جب بت پرستی عام تھی ، توحید کا نام مِٹ رہا تھا خود خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت موجود تھے اور باہر تو معلوم نہیں کتنے کہاں تھے ، برائیوں کو مستحسن سمجھا جاتا تھا ۔ غرض انسانوں کا روحانی مزاج خراب ہو گیا تھا ۔ تو جس طرح امراض مادیہ کی دوا ہوتی ہے اسی طرح امراض روحانیہ کے علاج کے لئے انبیاء تشریف لاتے ہیں ۔

حضور تشریف لائے اور آپ نے بے پناہ جد و جہد فرمائی تو بت پرستی ختم ہو گئی بُت نکال دیئے گئے حکومتیں فرماں بردار ہو گئیں قومیں فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگیں تو اذا جاء نصر اللہ نازل ہوا کہ آپ کی بعثت کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا ۔

تسبیح بحمد ربک سے آپ کے وصال ہی کی خبر ہے جیسے طلباء مدرسہ کی سند حاصل ہونے کے بعد مدرسہ میں نہیں رہتے اسی طرح سلطنت خداوندی کو اعداء اللہ سے خالی کرا کے آپ تشریف

لے گئے صلی اللہ علیہ وسلم ۔

ابن عباس | یہ حضور کے چچازاد بھائی ہیں آپ کے دور میں مراہق تھے (۱۲ برس کی عمر تھی) بہت سمجھدار تھے حضور کی خصوصی دعائیں ان کے ساتھ تھیں۔ ایک مرتبہ حضور استنجا کے لئے گئے تو یہ چھاگل میں پانی بھر کر لئے کھڑے رہے، آپ نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے، دعائیں دیں اللہم علمہ الکتاب وفقہہ، ان کو حدیث و قرآن کی بہت جستجو رہتی تھی جب کوئی بات کھٹکتی تو صحابہ کرام سے بے جھجک پوچھ لیا کرتے تھے کیونکہ شرم سے علم نہیں حاصل ہوتا اور تکبر انسان کو علم سے محروم کر دیتا ہے۔

حضرت عمر ان کی ذکاوت اور جد وجہد سے واقف تھے اسی وجہ سے انہیں اپنی مجلس میں بٹھایا کرتے تھے (اسی طرح کی تربیت سے بچے، حضرت ابن عباس بن جایا کرتے ہیں) شوق کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حضور کی تہجد دیکھنے کے لئے حضور کی اہلیہ حضرت میمونہ کے گھر جا کر لیٹ رہے وہ ان کی حقیقی خالہ تھیں پھر حضور نے تہجد شروع کی تو جا کر آپ کے بائیں کھڑے ہو گئے آپ نے سر پکڑ کر دائیں کر دیا (یہ باتیں بہت بچپن کی ہیں مگر علمی ذوق وشوق بتلاتی ہیں) تہجد کی روایات اکثر ان ہی سے مروی ہیں۔

تعلیم حکمت | آپ کا تیسرا وظیفہ تھا تعلیم حکمت یعنی احکام الٰہی کی علت و غایت بیان کرنا۔

تزکیہ باطن | آپ کا چوتھا وظیفہ تھا تزکیہ نفس" چنانچہ صحابہ فرماتے ہیں کہ جب ہم حضور کی خدمت میں رہتے ہیں تو سب چیزیں بھول جاتے ہیں صرف خدا رسول ہمارے سامنے ہوتے ہیں لیکن جب گھر جاتے ہیں تو وہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ حضرت حنظلہ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ اس صورت حال کو محسوس کر کے گھر بیٹھ گئے اور اسے انہوں نے نفاق سمجھ لیا پھر بہت پریشان ہوئے اور گھر سے نہیں نکلے، آپ نے مجلس میں دریافت فرمایا کہ حنظلہ کہاں ہیں؟ اور حضرت ابوبکر کو بھیجا انہوں نے آکر بیوی سے پوچھا کہ حنظلہ کہاں ہیں؟ اس نے اندر بتا دیا وہاں جا کر دیکھا تو ایک گوشے میں پڑے رو رہے ہیں، حال پوچھا تو انہوں نے اپنے قلبی احساسات بتائے اور کہا کہ حضور کی مجلس میں والا کا حال اور ہوتا ہے گھر پہنچ کر اور ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ یہی حال تو میرا بھی ہے اس پر دونوں مل کر خوب روئے، اس کے بعد علاج کے لئے حضور کے پاس دونوں حضرات آئے، آپ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ اسی طرح ہر وقت رہنے لگو جس طرح میرے پاس رہتے ہو تو دنیا سے قطع تعلق کر لوگے، بیویوں کو چھوڑ دوگے اور جنگلات میں روتے پھروگے۔ چنانچہ

حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ جب آپ مدینہ تشریف لائے تھے تو تمام لوگوں کو مدینہ کی در و دیوار روشن نظر آتی تھیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کو دفن کر کے ہاتھ کی مٹی نہیں جھاڑی تھی کہ اپنے دلوں میں تاریکیاں دیکھنے لگے۔

مقاصد بعثت یہ تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام پر روحانی اثر کہ آپ کی صحبت میں پہنچ کر دلوں کی گندگیاں ختم ہو جاتی تھیں لیکن یہ اثر ابوجہل وغیرہ پر اس وجہ سے نہیں پڑا کہ ان کے قلوب میں صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔ ورنہ آپ کی روحانیت روح کی تمام کثافتوں کو جلا کر خاک کر دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ولی بھی کسی بدری صحابی سے افضل تو کیا برابر نہیں ہو سکتا۔

تو تزکیہ باطن حضور کا چوتھا وظیفہ تھا، اور چاروں وظائف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعثت کا مقصود سمجھ کر انجام دیا کرتے تھے۔ اسی کے بارے میں قرآن کہتا ہے
ان میں سے تین چیزیں آپ کے اقوال سے متعلق ہیں ایک چیز تزکیہ قلوب وہ آپ کے قلبی عمل سے متعلق ہے تو امور دینیہ کے تمام کے تمام کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور آپ کی بعثت کا مقصد ہیں۔ یہاں سے حدیث کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

قسط ۵

از :- مولانا جمیل الرحمٰن پرتاب گڈھی

تفہیم القرآن

ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

قوم لوط قوم ابراہیم کے بعد ہمارے سامنے وہ قوم آتی ہے جس کی اصلاح پر حضرت ابراہیم کے بھتیجے حضرت لوطؑ مامور کئے گئے تھے اس قوم کے متعلق بھی قرآن کریم سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ تو اللہ کے وجود کی منکر تھی۔ نہ اس بات کی کہ اللہ خالق اور رب بمعنی اوّل و دوم ہے، البتہ اسے انکار اس سے تھا کہ اللہ ہی کو تیسرے، چوتھے اور پانچویں معنی میں بھی رب مانے اور اسکے معتمد علیہ نمائندے کی حیثیت سے رسول کے اقتدار کو تسلیم کرے، وہ چاہتی تھی کہ اپنی خواہش نفس کے مطابق خود جس طرح چاہے کام کرے یہی اس کا اصل جرم تھا اور اسی پر وہ عذاب میں مبتلا ہوئی ۔" ص۴۸

قوم لوط کے سلسلے میں کچھ آیتوں کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں ۔

"پس معلوم ہوا کہ ان کا اصلی جرم انکارِ الوہیت اور ربوبیت نہ تھا۔ بلکہ یہ تھا کہ اگرچہ وہ فوق الفطری معنی میں اللہ کو اللہ اور رب مانتے تھے، لیکن اپنے اخلاق و تمدن اور معاشرت میں اللہ کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کرنے سے انکار کرتے تھے اور اس کے رسول کی ہدایت پر چلنے کیلئے تیار نہ تھے ۔" ص۴۹

قوم شعیبؑ حضرت شعیبؑ کی ساری تقریروں اور ان کے جوابات کو دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا

کہ وہ ایک ایسی قوم تھی جو اللہ کو مانتی تھی اسے معبود اور پروردگار بھی تسلیم کرتی تھی، مگر وہ دو طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئی تھی ایک یہ کہ فوق الفطری معنی میں اللہ کے سوا دوسروں کو بھی الٰہ اور رب سمجھنے لگی تھی۔ اس لئے اسکی عبادت صرف اللہ کیلئے مختص نہ رہی تھی، دوسرے یہ کہ اس کے نزدیک اللہ کی ربوبیت کو انسان کے اخلاق، معاشرت، معیشت اور تمدن و سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا اس بنا پر وہ کہتی تھی کہ اپنی تمدنی زندگی میں ہم مختار ہیں۔" ص۵۵

قومِ فرعون

حضرتِ موسیٰؑ کی دعوت کو ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں۔

اگر معاملہ صرف پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا ہوتا تو اسکو (فرعون کو) اس سے کوئی بحث نہ تھی کہ حضرت موسیٰ دوسرے دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ رب العالمین کو اس کا مستحق سمجھتے ہیں، اگر صرف اس معنی میں توحید فی العبادت کی دعوت موسیٰ علیہ السلام نے اسکو دی ہوتی تو اسے غضبناک ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ اگر وہ کچھ کرتا تو بس یہ کہ اپنا دین آبائی چھوڑنے سے انکار کر دیتا۔ یا حضرت موسیٰ سے کہتا کہ میرے مذہب کے پنڈتوں سے مناظرہ کر لو۔ لیکن جس چیز نے اسے غضبناک کر دیا وہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب العٰلمین کے نمائندے کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کر کے اسے اسطرح ایک سیاسی حکم پہنچایا کہ گویا وہ ایک ماتحت حاکم ہے اور ایک حاکم برتر کا پیغامبر آ کر اس سے اطاعتِ امر کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اس معنی میں وہ اپنے اوپر کسی کی سیاسی و قانونی برتری ماننے کیلئے تیار نہ تھا بلکہ وہ یہ بھی گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اسکی رعایا میں سے کوئی فرد اس کے بجائے کسی اور کو حاکم برتر مانے اسی لئے اس نے پہلے رب العٰلمین کی اصطلاح کو چیلنج کیا۔ کیونکہ اسکی طرف سے لائے ہوئے پیغام میں محض مذہبی معبودیت کا نہیں بلکہ کھلم کھلا سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کا رنگ نظر آتا تھا۔ پھر جب حضرت موسیٰ نے بار بار تشریح کر کے بتایا کہ جس رب العٰلمین کا وہ پیغام لائے ہیں وہ کون ہے تو اس نے صاف صاف دھمکی دی کہ ملک مصر میں تم نے میرے اقتدار اعلیٰ کے سوا کسی اور کے اقتدار کا بھی نام لیا تو جیل کی ہوا کھاؤ گے۔ تفہیم القرآن ص۴۸۵ سورۃ الشعراء۔

ایک دوسری جگہ مولانا مودودی صاحب فرعون اور اسکی قوم کے نظریات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

- اب ہمیں اس قوم کو دیکھنا چاہئے جسکے باب میں نمرود اور اسکی قوم سے بھی زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ فرعون نہ صرف خدا کی ہستی کا منکر تھا بلکہ خدا ہونے کا مدعی تھا یعنی اس کا دماغ اتنا خراب ہو گیا تھا کہ وہ دنیا کے سامنے کھلم کھلا یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں خالق

ارض وسما، ہوں اس کی قوم اتنی پاگل تھی کہ اس کے اس دعوے پر ایمان لاتی تھی۔

حالانکہ قرآن اور تاریخ کی شہادت سے اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ الوہیت اور ربوبیت کے باب میں اس کی گمراہی نمرود کی گمراہی سے اور اسکی قوم کی گمراہی قوم نمرود کی گمراہی سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی، (یعنی فرعون اللہ کی ہستی کا قائل تھا اس کے خالق ومدبر کائنات ہونے کا معتقد تھا اور اس کی قوم اللہ کے وجود کو مانتی تھی اس کی عبادت سے بھی وہ منکر نہ تھی، فرعون کی اصل گمراہی یہ تھی کہ وہ سیاسی رب کے اعتبار سے اپنی ربوبیت کا دعویٰ کرتا تھا، اور اس کی قوم اس معنی میں اپنے بادشاہ ہوں کو رب تسلیم کرتی تھی)

فرق جو کچھ تھا وہ اس بنا پر تھا کہ یہاں سیاسی اسباب سے بنی اسرائیل کے ساتھ ایک قوم پرستانہ ضد اور متعصبانہ ہٹ دھرمی پیدا ہو گئی تھی، اس لئے محض عناد کی بناء پر اللہ کو الٰہ اور رب ماننے سے انکار کیا جاتا تھا اگرچہ دلوں میں اس کا اعتراف چھپا تھا

ص۲۵ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

فرعون کا اصل دعوے فوق الفطرت خدائی کا نہیں، بلکہ سیاسی خدائی کا تھا وہ ربوبیت کے تیسرے چوتھے اور پانچویں معنی کے لحاظ سے کہتا تھا کہ میں سرزمین مصر اور اس کے باشندوں کا رب اعلیٰ (LORD) ہوں اس ملک اور اس کے تمام وسائل و ذرائع کا مالک میں ہوں، یہاں کی حاکمیت مطلقہ کا حق مجھ ہی کو پہنچتا ہے۔ یہاں کے تمدن اور اجتماع کی اساس میری ہی مرکزی شخصیت ہے۔ یہاں قانون میرے سوا کسی اور کا نہ چلے گا،، ص۲۷

یہود و نصاریٰ

اس طرح یہ لوگ ان ہی دو عظیم الشان بنیادی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے، جن میں قوم نوح، قوم ابراہیم عاد، ثمود اہل مدین اور دوسری قومیں مبتلا ہوئی تھیں۔ ان کی طرح انھوں نے بھی فوق الطبعی ربوبیت میں فرشتوں اور بزرگوں کو اللہ کا شریک بنایا اور ان ہی کی طرح انھوں نے تمدنی و سیاسی ربوبیت اللہ کے بجائے انسانوں کو دی اور اپنے تمدن، معاشرت، اخلاق، اور سیاست کے اصول و احکام اللہ کی سند سے بے نیاز ہو کر انسانوں سے لینے شروع کر دیئے،، ص۶۵

مشرکین عرب

کچھ آیتوں کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں!

،، ان تصریحات کے بعد اب یہ سوال حل طلب رہ جاتا ہے کہ ربوبیت

کے باب میں ان کی وہ اصل کیا تھی جس کی اصلاح کرنے کے لئے اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا اور کتاب نازل کی؟ اس سوال کی تحقیق کے لئے جب ہم قرآن میں نظر کرتے ہیں تو ان کے عقائد و اعمال میں بھی ہم کو ان ہی دو بنیادی گمراہیوں کا سراغ ملتا ہے جو قدیم سے تمام گمراہ قوموں میں پائی جاتی رہی ہیں۔ یعنی:۔ ایک طرف فوق الطبیعی ربوبیت و الٰہیت میں وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہوں اور اربابوں کو شریک ٹھہراتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ سلسلۂ اسباب پر جو حکومت کارفرما ہے اس کے اختیارات و اقتدارات میں کسی نہ کسی طور پر ملائکہ اور بزرگ انسان اور اجرام فلکی وغیرہ دخل رکھتے ہیں اسی بنا پر دعا اور استعانت اور مراسم عبودیت میں وہ صرف اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے بلکہ ان بناوٹی خداؤں کی طرف بھی رجوع کیا کرتے تھے۔

دوسری طرف تمدنی و سیاسی ربوبیت کے باب میں ان کا ذہن اس تصور سے بالکل خالی تھا کہ خدا اس معنی میں بھی رب ہے۔ اس معنی میں وہ اپنے مذہبی پیشواؤں، اپنے سرداروں اور اپنے خاندان کے بزرگوں کو رب بنائے ہوئے تھے اور ان ہی سے اپنی زندگی کے قوانین لیتے تھے۔،، ص۹۹

پہلی اقوام کے تذکرے کے بعد مجموعی انداز میں مولانا مودودی صاحب قرآن کی دعوت کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں

قرآن کی دعوت

گمراہ قوموں کے تخیلات کی یہ تحقیق جو پچھلے صفحات میں کی گئی ہے اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیتی ہے کہ قدیم ترین زمانے سے لیکر زمانۂ نزول قرآن تک جتنی قوموں کا ذکر قرآن نے ظالم، فاسد العقیدہ اور بدراہ ہونے کی حیثیت سے کیا ہے ان میں سے کوئی بھی خدا کی ہستی کی منکر نہ تھی، نہ کسی کو اللہ کے مطلقاً رب اور الٰہ ہونے سے انکار تھا البتہ ان سب کی اصل گمراہی اور مشترک گمراہی یہ تھی کہ انہوں نے ربوبیت کے ان پانچ مفہومات کو جو ہم ابتداء میں لغت اور قرآن کی شہادتوں سے متعین کر چکے ہیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

رب کا یہ مفہوم کہ فوق الفطری طور پر مخلوقات کی پرورش، خبرگیری، حاجت روائی، اور نگہبانی کا کفیل ہوتا ہے، ان کی نگاہ میں ایک الگ نوعیت رکھتا تھا۔ اور اس مفہوم کے اعتبار سے وہ اگرچہ رب اعلیٰ تو اللہ ہی کو مانتے تھے، مگر اس کے ساتھ فرشتوں اور دیوتاؤں کو جنوں اور غیر مرئی قوتوں کو، ستاروں اور سیاروں کو انبیاء اور اولیاء اور روحانی پیشواؤں کو بھی ربوبیت میں شریک ٹھہراتے تھے۔

اور رب کا یہ مفہوم کہ وہ امر و نہی کا مختار، اقتدارِ اعلیٰ کا مالک، ہدایت و رہنمائی کا منبع، قانون کا ماخذ، مملکت کا رئیس اور اجتماع کا مرکز ہوتا ہے، ان کے نزدیک بالکل وہی دوسری حیثیت رکھتا تھا، اور اس کے مفہوم کے اعتبار سے وہ یا تو اللہ کے بجائے صرف انسانوں ہی کو رب مانتے تھے یا نظری طور پر اللہ کو رب ماننے کے باوجود عملاً انسانوں کی اخلاقی و تمدنی اور سیاسی ربوبیت کے آگے سرِ اطاعت خم کئے رہتے تھے۔

اس گمراہی کو دور کرنے کے لئے ابتدا سے انبیاء علیہم السّلام آتے رہے ہیں اور اسی کے لئے آخر کار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی (۱) تمام مفہومات کے اعتبار سے رب ایک ہی ہے اور وہ اللہ جل شانہٗ ہے، ربوبیت ناقابلِ تقسیم ہے، اس کا کوئی جز کسی معنی میں بھی کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے۔ کائنات کا نظام ہے جس کو ایک ہی خدا نے پیدا کیا جس پر ایک ہی خدا فرمانروائی کر رہا ہے جس کے سارے اختیارات و اقتدارات کا مالک ایک ہی خدا ہے، نہ اس نظام کے پیدا کرنے میں کسی کا کچھ دخل ہے نہ اس کی تدبیر و انتظام میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کی فرمانروائی میں کوئی حصہ دار ہے۔ مرکزی اقتدار کا مالک ہونے کی حیثیت سے وہی اکیلا خدا تمہارا فوق الفطری رب بھی ہے اور اخلاقی و تمدنی اور سیاسی رب بھی ہے۔ وہی تمہارا معبود ہے، وہی تمہارے سجدوں اور رکوع کا مرجع ہے، وہی تمہاری دعاؤں کا ملجا و ماویٰ ہے وہی تمہارے توکل و اعتماد کا سہارا ہے وہی تمہاری ضرورتوں کا کفیل ہے

ص۳۳-۷۲

یہاں تک تو مولانا مودودی صاحب کے ان تراشوں کو ہدیۂ ناظرین کیا گیا جس میں انہوں نے دو چیزوں پر زور دیا ہے۔

(۱)۔ وہ تمام گمراہ قومیں جنکا تذکرہ قرآن نے کیا ہے ان کی اصل گمراہی یہ نہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو رب تسلیم نہیں کرتے تھے، یہ لوگ اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے، انھیں اللہ کے خالق اور رب ہونے سے انکار نہ تھا، ان کو اس بات سے بھی انکار نہ تھا کہ اللہ ان کا الٰہ ہے، ان میں سے کوئی یہ بھی نہیں کہتا تھا کہ اللہ ہمارا رب نہیں ہے، یا زمین و آسمان کو اور ہم کو اس نے پیدا نہیں کیا، زمین و آسمان کا یہ سارا انتظام وہ نہیں کر رہا ہے، انہیں اس کی عبادت سے بھی انکار نہ تھا، اور فرعون و نمرود جیسے خدا سے باغی انسانوں نے نہ تو اپنے کو خدا کہلوایا اور نہ ہی انھیں اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے

سے انکار تھا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے کے معتقد تھے۔

(۲) ۔ جملہ انبیاء کرام کی بعثت کے دو مقصد تھے ۔ وہ تمام گمراہ قومیں جنہوں نے رب کے فوق الفطری معنی میں (یعنی حاجت روائی، پناہ دہندگی، خالق ہونا، مالک ہونا، کائنات کو وجود بخشنے والا، رزق پہونچانے والا وغیرہ) جنوں، دیوی، دیوتاؤں کو شریک کرلیا تھا، ان کو اس سے روکنا تھا، اور یہ بتانا مقصود تھا کہ اس معنی میں اگر کوئی رب ہے تو وہ صرف اللہ ہے ۔ اور دوسرا مقصد خداوندِ عالم کی حاکمیت، بالادستی اور سیاسی وتمدنی معبود ہونے کو تسلیم کروانا تھا۔

لیکن مولانا مودودی صاحب کے نزدیک انبیاء کرام کے اپنے بیان کردہ ان دونوں مقصدوں میں فرق ہے، پہلا مقصد ایک جزوی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا مقصد کہ وہ خداوند عالم کی حاکمیت، بالادستی، سیاسی وتمدنی رب ہونے کو تسلیم کروائیں تاکہ حکومت الٰہیہ قائم ہوسکے اصل دعوت سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ موصوف خود ہی ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں ۔

"آج کی طرح قدیم زمانے میں بھی معبود کا تصور صرف مذہبی معنوں تک محدود تھا ۔ یعنی یہ کہ اسے بس پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا استحقاق پہنچتا ہے اور اپنے فوق الفطری غلبہ و اقتدار کی وجہ سے اسکا یہ منصب بھی ہے کہ انسان اپنے معاملات میں اس سے استمداد و استعانت کے لئے دعائیں مانگیں لیکن کسی معبود کی یہ حیثیت کہ وہ قانون اور سیاسی معنوں میں بھی بالادست ہے ۔ اور اسے یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ معاملات دنیا میں وہ جو حکم چاہے دے ۔ اور انسانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کے امر و نہی کے قانون کو برتر مان کر اس کے آگے جھک جائیں ۔ یہ چیز زمین کے مجازی فرمانرواؤں نے نہ پہلے کبھی مان کر دی تھی ۔ نہ آج وہ اسے ماننے کے لئے تیار ہیں ۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ دنیا کے معاملات میں ہم مختارِ مطلق ہیں کسی معبود کو ہماری سیاست، ہمارے قانون میں دخل دینے کا حق نہیں ہے ۔ دنیوی حکومتوں اور بادشاہوں سے انبیاء علیہم السلام اور ان کی پیروی کرنے والے مصلحین کے تصادم کی اصل وجہ یہی رہی ہے انھوں نے ان سے خداوند عالم کی حاکمیت وبالادستی تسلیم کرانے کی کوشش ہے اور یہ اس کے جواب میں نہ صرف یہ کہ اپنی حاکمیت مطلقہ کا دعویٰ پیش کرتی رہی ہیں بلکہ انھوں نے ہر اس شخص کو مجرم اور باغی

پیغمبر ایلیے جوان کے سوا کسی اور کو قانون وسیاست کے میدان میں معبود مانے۔

تفہیم القرآن صفحہ ۴۸۷ ج ۳ سورہ شعراء حاشیہ ۱۲۱

مولانا مودودی صاحب کے ان واضح ارشادات سے کی بنا پر ہر سلیم الطبع ہر ذی عقل انسان اسی نتیجہ پر پہونچے گا کہ جملہ انبیاء کرام حضرت آدمؑ سے لیکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کی اصل دعوت حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی تھی اور یہی جماعت اسلامی کا نصب العین بھی ہے۔ اور باقی دوسری چیزیں جنکا تعلق رب کے حق الفطری معنی سے ہے وہ جزوی حیثیت رکھتی ہیں۔ جناب کی نگاہ میں انبیاء علیہم السلام کی اصل دعوت جو صریح آیات میں موجود ہے وہ ایک ضمنی شئی نظر آرہی ہے اور سیاسی وتمدنی رب کی دعوت جس کا ثبوت قرآن کی کسی آیت میں واضح طور پر موجود نہیں ہے اصل دعوت قرار پا گئی ہے۔

مودودی صاحب کی یہ تحقیق قرآن کے معنوی انحراف کی کھلی دلیل ہے۔ کیونکہ جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان اقوام کے حالات کا سرسری جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان کے درمیان جو مشترکہ گمراہی ملتی ہے وہ یہی ہے کہ جب بھی ان کے نبیوں نے باری تعالیٰ کا پیغام پہنچایا تو انھوں نے اسکو ٹھکرا دیا، اور اپنے من گھڑت بتوں ہی کی پرستش میں لگے رہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی اس تحقیق قرآنی کے بعد قرآن کا تقابلی مطالعہ کر لیا جائے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے وہ کونسی دعوت تھی جسے جملہ انبیاء کرام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور وہ کونسی تعلیم تھی جسے بارگاہِ خداوندی سے لاکر اپنی بے راہ قوموں کو دی، وہ کونسی گمراہی تھی جس کی وجہ سے انھیں عذاب الٰہی کا مستحق ہونا پڑا۔ قوم لوط کا تذکرہ ہمیں ان الفاظ میں ملتا ہے

آئینۂ فطرت

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا

آگے کی تجھ کو نظر صانع عالم کی جھلک
سامنے کچھ نہ رکھو آئینۂ فطرت کے سوا

تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا
ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

(اکبر الٰہ آبادی مرحوم)

ملفوظات حضرت تھانویؒ

بقلم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

مدارسِ عربیہ اور انکے طلبار کیلئے خاص نصیحت

ارشاد فرمایا کہ ہمارے زمانہ میں طلبار پر اپنے اساتذہ کے سوا کسی کا رنگ اثر نہ جمتا تھا۔ طلبار کو اپنے اساتذہ سے خاص عقیدت و محبت اور اساتذہ کو ان پر خاص شفقت ہوتی تھی اب مزاج و مذاق بدل گئے۔ طلبار و اساتذہ میں وہ تعلق قائم نہیں رہا اس لئے علمی ذوق اور عملی رنگ بھی ان میں پیدا نہیں ہوتا۔ اور کسی رنگ میں بھی پختہ نہیں ہوتے۔ علمی استعداد اور عملی تربیت سبھی کمزور ہوگئیں۔ اس لئے مدارس میں طلبار کی عملی تربیت اور اساتذہ کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا اور ایسے طریقے اختیار کرنا بہت ضروری ہیں کہ طلبار اساتذہ میں باہم ربط و مناسبت پیدا ہو اور استعداد کی کمی پوری کرنے کیلئے فرمایا کہ میرے نزدیک اس وقت بہت ضروری ہے کہ ہمارے مدارس میں تفسیر جلالین سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ التزام سے پڑھایا جائے۔

فرمایا الحمد للہ مجھے یوں تو اپنے سبھی اساتذہ سے محبت و عقیدت تھی خصوصیت سے حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ سے قلب میں خاص محبت تھی اس زمانے میں حضرت گنگوہی رحؒ کے یہاں گنگوہ میں دورۂ حدیث ہوتا اور صحاح ستہ کا درس خود حضرت گنگوہیؒ دیتے تھے۔ دیوبند سے اکثر طلبار دورۂ حدیث سے پہلے کی کتابیں دیوبند میں پڑھ کر دورۂ حدیث کے لئے گنگوہ چلے جاتے تھے دیوبند میں کم رہ جاتے تھے۔ مجھے چونکہ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ سے گہری محبت تھی مجھے بے وفائی معلوم ہوتی کہ میں دورۂ حدیث کے لئے ان کو چھوڑ کر کہیں جاؤں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے حدیث میں بھی مجھے اپنے دوسرے ساتھیوں سے کم نہیں رکھا۔

عوام کا دین و ایمان علماء سے رابطہ اور اعتقاد پر موقوف ہے

ارشاد فرمایا کہ جب کوئی عام آدمی علماء پر اعتراض کرتا ہے تو اگر وہ اعتراض صحیح بھی ہو جب بھی یہ جی چاہتا ہے کہ علماء کی نصرت کروں بوجہ ظاہر عصبیت ہے مگر حقیقت در حقیقت یہ ہوتی ہے کہ عوام علماء سے غیر معتقد نہ ہوں ورنہ ان کے دین و ایمان کا کہیں ٹھکانہ نہیں۔

حقیقتِ تصوّف

مولانا حکیم حبیب شفیق الٰہی آمبوری

درکفِ جامِ شریعت درکفِ سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

تصوف تحریر میں آنے کی چیز نہیں ہے وہ تو کیفیات کا نام ہے، اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد میں اپنی بساط بھر کوشش سے اصل تصوف کو ثابت کرنے اور تصوف میں جو بدعنوانیاں زمانہ کے ساتھ چلی آرہی ہیں ان کے اسباب بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کا نام تزکیہ، حدیث کی اصطلاح میں اس کا نام احسان اور بعض علماء متاخرین کے پاس تصوف فقہ باطن ہے، اس کا موضوع تہذیب اخلاق اور غرض رضائے الٰہی ہے۔

اس کے حصول کا ذریعہ شریعت کے حکموں پر پورے طور سے چلنا ہے، گویا کہ تصوف، دین کی روح، وصفی یا کیفیت و کمال کا نام ہے۔ تصوف ایک ایسا علم ہے کہ جس کے ذریعہ نفوس کا تزکیہ، اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر و باطن کی تعمیر کے احوال پہچانے جاتے ہیں جس کی غرض ابدی سعادت کی تحصیل ہے۔ تصوف کی تعریف مختصر لفظوں میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں کی ہے۔

"وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جس طاعت میں سستی محسوس ہو سستی کا مقابلہ کرکے اس طاعت کو کرے اور جس گناہ کا تقاضا

ہو، تقاضے کا مقابلہ کر کے اُس گناہ سے بچے جس کو یہ بات حاصل ہو گئی اُس کو پھر کچھ بھی ضرورت نہیں، کیونکہ یہی بات تعلق مع اللہ پیدا کرنے والی ہے اور یہی اُس کی محافظ ہے اور یہی اس کو بڑھانے والی ہے"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ تصوف دراصل شریعت کا مغز اور روح ہے جیطرح مسکہ اور گھی دودھ ہی سے نکلی ہوئی چیزیں ہیں، اسی طرح تصوف وطریقت شریعت ہی کا نچوڑ اور حاصل ہے، ہر چیز کے دو رُخ ہیں ایک ظاہری دوسرا باطنی ۔، شریعت کا وہ جُز جو اعمال ظاہری سے متعلق ہے، فقہ کہلاتا ہے، اور وہ جُز جو اعمال باطنی سے متعلق ہے تصوف وسلوک کہلاتا ہے۔ دراصل یہ تصوف ہر مومن مسلمان کے سمجھنے اور برتنے کی چیز ہے، ہر مومن مسلمان کے لئے تصوف سے استفادہ کرنا لازمی ہے۔ بعض حضرات مسکر اس قول سے اختلاف کریں گے، اس اختلاف کی وجہ تصوف کو سمجھنے میں غلطی ہو سکتی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ بعض نادان دوستوں نے تصوف کو زبردست نقصان پہونچایا۔ جس کی وجہ سے اس میں طرح طرح کی بدعنوانیاں پیدا ہو گئیں اور بعد کے زمانہ میں اس کا غلط مفہوم سمجھا جانے لگا۔ لوگ مقصود سے لاپرواہ ہو کر وسائل اور اصطلاحات ہی میں الجھ کر رہ گئے۔ اور ضرورت تھی کہ مقصود اور غیر مقصود میں تفریق کی جاتی، بدعات اور رسومات سے اجتناب کی ترغیب دلائی جاتی۔ الحمد اللہ یہ کام اس دور کے مجدد حضرت حکیم الامت مولانا الشاہ اشرفعلی صاحب تھانوی قدس سرہ العزیز نے بحسن خوبی انجام دیا۔ اور ان کے متعلقین نے اس کو اور ترقی دی۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی مدظلہ العالی نے حضرت شیخ الحدیثؒ کی کتاب "اکابر کا سلوک واحسان" کے مقدمے میں بڑے دل نشین پیرایہ میں تصوف کی بدنامی کے اسباب تحریر فرماتے ہیں۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب لکھتے ہیں۔

"مذاہب، اخلاقیات، تعلیم وتربیت، اصلاح وتجدید اور علوم وفنون سب کی تاریخ میں دو مرحلے بڑے سخت پیش آتے ہیں اور ان سے کسی کو بھی مفر نہیں۔ ایک جبکہ وسائل مقاصد بن جاتے ہیں دوسرے جب اصطلاحات حقائق کے لئے حجاب ہو جاتی ہیں، وسائل

اور اصطلاحات دونوں نہایت ضروری اور بالکل قدرتی اور طبعی چیزیں ہیں جنکے بغیر ان مقاصدِ عالیہ کی تبلیغ و توسیع اور تشریح و تفہیم عام طور پر ممکن نہیں ہوتی، لیکن وسائل ہوں یا اصطلاحات مقاصد و حقائق کے لئے ان کا درجہ خادم و معاون کا ہے انکو وقتی طور پر ایک ضرورت کی تکمیل کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اور بعض اوقات ان پر مقاصد و حقائق ہی کی طرح زور دیا جاتا ہے اور ان کا مطالبہ کیا جاتا ہے، لیکن انمیں سے ہر فن کا مجتہد جب ضروری سمجھتا ہے ان سے نہ صرف استغنا اختیار کرتا ہے بلکہ بعض اوقات بطور علاج ان کے ترک کا بھی حکم دیتا ہے، وہ ان کا محکوم ہونے کے بجائے ان کا حاکم ہوتا ہے، وہ اس کا بھی لحاظ رکھتا ہے کہ وہ اس تناسب سے آگے نہ بڑھنے پائیں کہ بجائے مفید ہونے کے مضر اور موصل الی المطلوب ہونے کے بجائے سدِّ راہ اور طریق کے راہزن ثابت ہوں،

لیکن اس تاریخی حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ان مقاصدِ عالیہ کو یہ ابتلاء بار بار پیش آیا ہے کہ وسائل مقاصد بن گئے ہیں اور اصطلاحات نے حقائق پر ایسے دبیز پردے ڈالدیئے ہیں کہ وہ نہ صرف نگاہوں سے اوجھل ہو گئے بلکہ ان سے ان تلخ تجربوں اور غلطیوں کی بناء پر جو ان اصطلاحات کے علمبرداروں سے سرزد ہوئیں ایسی شدید غلط فہمیاں پیدا ہوئیں کہ حق جو اور سلیم الفطرت انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو ان مقاصد کے حصول اور تحصیل اور ان حقائق کے قدر و اعتراف پر آمادہ کرنا ایک نہایت دشوار کام بن گیا، جب ان کے سامنے ان مقاصد کی تحصیل کی ضرورت پر تقریر کی جاتی یا ان کو ان کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی تو وسائل کے وہ پہاڑ ان کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے جن کے بارے میں خام اور غیر محقق داعیوں نے سخت مبالغہ اور غلو سے کام لیا تھا اور ہر شخص سے ان کے بارے میں بیجا اصرار کیا تھا اور وہ انہیں میں الجھ کر رہ گئے تھے کہ مقصد ہی بالکل فراموش اور نظر انداز ہو گیا تھا، اسی طرح جب ان حقائق کی دعوت دی گئی جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں اور جو بدیہیات میں داخل ہیں تو وہ اصطلاحات ان کے لئے حجاب بن گئے جنکے بارے میں نہ صرف یہ کہ اختلاف کی گنجائش تھی بلکہ وہ خاص ماحول، مخصوص حالات، اور عام طور پر بہت بعد کے زمانہ میں ان حقائق کو ذہن کے قریب کرنے کے لئے اور خاص

مصالح کے ماتحت وضع کئے گئے تھے۔

آگے فرماتے ہیں۔

"تصوف ایک متفق علیہ اور بدیہی حقیقت ہے، لیکن اس کو انہیں دو چیزوں نے نقصان پہنچایا کہ ایک وسائل کے بارے میں غلو اور افراط سے کام لینا دوسرے اصطلاح پر غیر ضروری حد تک زور دینا اور اس پر بیجا اصرار کرنا"

اگر کسی سے پوچھا جائے کہ اخلاص و اخلاق ضروری ہیں یا نہیں، یقین کا پیدا ہونا مطلوب ہے یا نہیں، فضائل سے آراستہ ہونا اور رذائل سے پاک ہونا، حسد، کبر، ریا، بغض، اور کینہ، حب مال، حب جاہ، اور دوسرے اخلاق ذمیمہ سے نجات پانا نفس امارہ کی شدید گرفت سے خلاصی پانا کسی درجہ میں ضروری یا مستحسن ہے یا نہیں، نماز میں خشوع و خضوع۔ دعا میں تضرع اور ابتہال کی کیفیت محاسبۂ نفس، کی عادت اور سب سے بڑھ کر اللہ اور رسول کی محبت، حتیٰ حلاوت ولذت کا حصول یا کم از کم اس پر شوق و اہتمام، صفائی معاملات، صدق و امانت، اور حقوق العباد کی اہمیت اور فکر نفس پر قابو رکھنا، غصہ میں آپے سے باہر نہ ہونا کسی درجہ میں مطلوب ہے یا نہیں تو ہر سلیم الفطرت انسان اور خاص طور پر وہ مسلمان جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے یہی جواب دیگا کہ یہ چیزیں نہ صرف مستحسن بلکہ شرعاً مطلوب ہیں، قرآن و حدیث کا سارا ذخیرہ اس کی ترغیب و تاکید سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن اگر کہا جائے کہ انہیں صفات کے حصول کا ذریعہ وہ طریق عمل ہے، جس کو بعد کی صدیوں میں تصوف کے نام سے پکارا جانے لگا تو اس کے سنتے ہی بعض لوگوں کی پیشانی پر شکن پڑجائے گی۔ اس لئے کہ اس اصطلاح سے ان کو وحشت اور اس کے بعض پرخود غلط علمبرداروں اور دعویداروں کے متعلق ان کے تجربات نہایت تلخ ہیں۔

اگر وجہ صرف یہی ہے اور وحشت لفظ "تصوف" سے ہو رہی ہے تو اس کا نام "تزکیۂ احسان" رکھ لیا جائے۔ ہمارے اکابرین مثلاً پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رح اور شیخ شہاب الدین سہروردی رح سے لیکر مجدد الف ثانی رح، حضرت شاہ ولی اللہ رح، حضرت سید احمد شہید رح، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح، حکیم الامت حضرت

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے جو تصوف کی اصطلاح پیش کی ہے اور برت کر بتایا ہے اس کو سمجھئے اور بتایئے تصوف میں ان کا کونسا عمل شرع کے خلاف تھا آیا ان کا تصوف قرآن و حدیث کا ترجمان اور عکاسی کرنیوالا ہے یا نہیں؟ ہر شخص کو اس کا قائل ہونا پڑے گا۔ جبکہ ان بزرگوں کے یہاں مقصود اور غیر مقصود میں فرق صاف صاف بتایا جاتا ہے، رسوم و بدعات جو غلط قسم کے لوگوں نے تصوف میں داخل کرادی تھیں اس کی شدت سے یہاں تردید کی جاتی ہے جو دراصل غیر مسلموں کے اختلاط سے یا صوفیائے خام کے اثر سے داخل ہوگئی تھیں۔ ہمارے ان بزرگوں نے اس پر مستقل کام کیا ہے اور تصوف کو اس کی اصل شکل میں پیش کرنے کی بھرپور محنت اور جد وجہد کی ہے اور اسی کا ثمرہ ہے کہ تصوف آج بھی اصل حالت میں موجود ہے اور لاکھوں تشنگان حق اس کے چشمۂ حیات سے سیراب ہو رہے ہیں۔

یہ سلیم الفطرت انسان کے لئے اس طریق تصوف کا قائل ہونا لازمی ہے، اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہوسکتی، خصوصًا حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے اور ان کے بعد ان کے خلفاء کرام نے خصوصًا حضرت حکیم الامت مجدد ملت الشاہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ العزیز اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے تصوف میں پیدا ہونے والی خامیوں کو چھانٹ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے اُمّتِ مسلمہ پر بڑا احسان کیا ہے۔

ہمیں اس سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر بھی اگر کسی کو انکار ہے تو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی گرفت میں آئے گا۔

وہ فرماتے ہیں۔

"شریعت بغیر طریقت کے فلسفہ ہے، اور
طریقت بغیر شریعت کے زندقہ والحاد"

سبحان اللہ کتنا بڑا مضمون ایک چھوٹے سے جملے میں ادا کر دیا حضرت

شاہ صاحبؒ کے اس قول سے ایک طرف تصوف وطریقت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف شریعت کا طریقت سے لگاؤ، اور تعلق بھی معلوم ہوتا ہے۔

اگر شریعت ڈھانچہ ہے تو طریقت کی مثال روح ہے۔ دونوں کو ساتھ ساتھ اعتدال سے لیکر چلنے کا نام ہی اسلام ہے۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ نے تصوف کو اعتدال اور میانہ روی میں رکھا ہے اور افراط و تفریط سے بچا کر ایک ایسی راہ بتائی ہے جو بے شک صراط مستقیم ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

آمین

∴ ∴ ∴

بقیہ:۔ قرآن مجید ایک لازوال دستور حیات ہے

دنیا کی ہر آبادی اور بستی تک ہر زبان میں پہنچائے، کیوں کہ یہی وہ حیات آفریں پیغام ہے جو ایک مکمل، مدلل اور مفصل جامع ترین ضابطۂ حیات اور دستور زندگی ہے۔ اور موجودہ دور الحاد، انتشار و پراگندہ و پریشان حال دنیا کی جملہ مشکلات کا تسلی بخش حل پیش کرتا ہے۔

مولوی
محمد سعید الرحمن شمس
مدیر
ماہنامہ نصرۃ الاسلام
کشمیر

قرآن مجید ایک لازوال دستورِ حیات ہے

قرآن مجید حضرت حق جل مجدہٗ کا وہ آخری اور ابدی پیغام ہے، جو کورے عالمِ انسانیت کی رہنمائی، خیر خواہی، صلاح و فلاح پانے کا ایک جامع، مکمل اور مدلل ضابطۂ حیات ہے۔ اس پیغامِ ربانی کی سب سے بڑی خوبی اور برتری یہ ہے کہ یہ قومی، وطنی، صوبائی، مُلکی، رنگ و نسل، خاندانی، قبائلی، اور شخصی تعصب سے بالاتر ہو کر تمام بنی نوعِ انسان سے مخاطب ہے اور تمام اولادِ آدم کے لئے رحمت، افادیت، اور یکسانیت کا علمبردار اور خیر خواہ ہے
شاعرِ مشرق علامہ اقبال مرحوم، اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم
نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃ للعالمیں،

عصرِ حاضر میں انسانی تہذیب اور انسانی قدریں جس طرح انحطاط اور زوال کا

شکار ہیں، حقوق تلفی، اور کردار کشی کے جو دردناک مناظر اور واقعات دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں، جغرافیائی حد بندیاں، نسلی امتیازات کی وبا، کالے گورے کی تفریق، حقوقِ انسانیت کا استحصال، بربریت، تشدد اور ننگی جارحیت کا مظاہرہ، ملکی، جسمانی اور ذہنی غلام بنانے کے ناپاک اور مکروہ ہتھکنڈے، کمزور قوموں اور چھوٹے ملکوں کو محکوم بنانے کی سازش توسیع پسندی کے مکروہ عزائم، دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے، زرپرستی، زن پرستی، اور نفس پرستی، کی بے پناہ اور بے جا خواہشات اور ان کے حصول میں جو خطرناک حد تک خون خرابہ ہو رہا ہے۔ ان سب مہلک امراض کا مؤثر ترین علاج ان کی واقعی اصلاح اور انسداد حرف "قرآن مجید" پر صدق وصفا سے ایمان رکھنے اور اسے عملی زندگی میں اپنانے سے ہی ممکن ہے۔

تاریخ عالم اس بات پر گواہ ہے کہ جب بھی حضرت انسان نے خدا کے اس پیغام حق پر صدق و یقین سے عمل کیا تو دنیا میں اخلاق و کردار کی فصلِ بہار خوش حالی، تعمیر و ترقی اور پاس وفا کا ایک دور جدید وجود میں آیا،

ذیل میں قرآن حکیم سے متعلق اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند بنیادی اور اہم خصوصیات پیش کی جاتی ہیں جو موزوں بھی ہیں، اور مقتضائے وقت بھی۔

۱۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور پوری انسانیت کے لئے اللہ کا آخری اور ابدی پیغام ہدایت ہے، اس کی حفاظت اور بقا کا ذمہ بھی رب العزت نے خود لیا ہے،

ارشادِ ربانی ہے:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (القرآن) — کہ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

۲۔ ہر پیغمبر کا ایک معجزہ ہوتا ہے اور پیغمبر آخر الزمان کا معجزہ قرآن ہے جو پیغمبر قیامت تک کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا اس کا معجزہ کو بھی ابدی معجزہ ہی ہونا چاہئے، خدا نے قرآن مجید کو پیغمبر آخر الزماں کا ابدی معجزہ بنا دیا۔

۳۔ جتنی بھی قدیم کتابیں آج دنیا میں پائی جاتی ہیں ان میں قرآن ایک حیرت انگیز

استثناء ہے۔ تمام مقدس کتابوں کی اصل زبانیں تاریخ کی الماری میں بند ہو چکی ہیں، مگر قرآن کی زبان (عربی) آج بھی دستور زندہ ہے آج بھی کروڑوں انسان اس زبان کو بولتے ہیں اور لکھتے ہیں جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار برس قبل قرآن اتارا گیا تھا۔

۴۔ امت مسلمہ کے ذمہ یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ قرآن پاک کی تعلیمات کا نمونہ بنے اور قرآن مجید کا عملی نمونہ خود نبی آخرالزماں کی سیرت مقدسہ اور اخلاق کریمہ ہے اس لئے آپکی اطاعت کرنا گویا خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے

"ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ" (القرآن) جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

شاعر اسلام علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے ع

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

۵۔ قرآن پاک میں ہر قسم کی علمی، مذہبی، تاریخی، معاشرتی، تہذیبی تمدنی، طبعیاتی، ارض و سما کے حالات، فلسفہ کائنات، تخلیق کائنات اور تخلیق آدم، حیوانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۶۔ قرآن نے تاریخ ادب میں پہلی بار واقعہ نگاری کو رواج دیا، پہلے زمانہ میں جنگ اور عاشقی سب سے زیادہ مقبول مضامین تھے۔ قرآن نے اخلاق، قانون، نفسیات، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ وغیرہ مضامین کو اپنے اندر شامل کیا۔ اور عام لوگوں کو اس میں غور و خوض کی کھلی دعوت دی۔

۷۔ قرآنی زبان انتہائی سلیس، فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ اور قابل فہم، اس کے علوم و اسرار بحر بیکراں، " لا تنقضی عجائبہ " کا مصداق، اور اس کی حقیقت جستہ جستہ وقتاً فوقتاً دنیا کے رہنے والوں پر واضح ہوتی رہتی ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے ۔

اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعَالَمِیْن وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَہٗ بَعْدَ حِیْن (القرآن)

یہ قرآن مجید تمام جہانوں کے لئے ایک تذکرہ ہے اور اس کی حقیقت وقتاً فوقتاً ہمیں معلوم ہو جائے گی ۔

۸ یہ وہ مقدس صحیفۂ آسمانی ہے جس میں کسی قسم کی ترمیم واضافہ آج تک نہیں ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا ۔

۹ قرآن وہ مقدس کتاب ہے جس نے ہر قسم کے مضامین کو تہذیب ومتانت سے ادا کیا ہے ۔

۱۰ قرآن وہ مقدس پیغام ہے جس کی شرح و وضاحت سے صدہا علوم فنون وجود میں آئے ہیں ، اور ہنوز سلسلہ جاری ہے ۔

۱۱ یہی وہ دستورالعمل ہے جس سے قوانین ، دیوانی ، فوجداری ، زراعتی، معاشرتی مالی، صنعت وتجارت ، عبادات واعتقادات ، معاملات واخلاقیات ، وغیرہ کے لاتعداد مسائل نکالے گئے ہیں ۔ صرف امام اعظم ابوحنیفہؒ نے تقریباً تیرہ لاکھ مسائل استنباط اور اخذ فرمائے ہیں ، ان کے علاوہ سینکڑوں ائمہ کرام گذرے ہیں جنہوں نے اس بحرِ ذخّار سے خوشہ چینی کی ہے ۔

۱۲ قرآن مجید سے علماء، دانشور، مفکرین ، عام لکھے پڑھے اور ان پڑھ سب ہی اپنی اپنی بساط کے مطابق استفادہ کرتے ہیں اور انشاء اللہ رہتی دنیا تک کرتے رہیں گے ۔

۱۳ یہ مقدس کتاب تمام حروف ثقیلہ ، محاورات ، اور امثال رکیکہ اور تاویلات باردہ سے پاک ہے ۔

۱۴ اس کتاب پاک کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس کی تلاوت رات دن برابر چوبیس گھنٹے اقصائے عالم میں جاری وساری ہے ۔

۱۵ اس وحی الٰہی نے حضرتِ انسان کو اصلی اور حقیقی جمہوریت اور شوریٰ کے قیام کی ہدایات دی ہیں ۔

۱۶ یہ جلیل القدر کلام الٰہی عقل سلیم اور حضرتِ انسانی کے عین موافق ہے ، اس میں

عدل و مساوات کی تعریف و تحسین کی گئی ہے اور غلط سرمایہ داری کی شدید مذمت کی گئی ہے، ملک گیری اور ہوس رانی کو ناروا اور ظلم قرار دیا ہے۔

۱۷۔ اس خدا کی روشنی نے مکمل قانونِ وراثت، موافق عقل و فطرت پیش کرکے عورتوں کے سماجی حقوق بھی قائم کئے ہیں۔

۱۸۔ اسی کلام قدیم نے غلاموں کی آزادی کا دروازہ کھول کر غلاموں کو آزادی اور انسانیت کی پہلی صف میں جگہ عطا کی ہے۔

۱۹۔ فرد اور جماعت دونوں کے لئے یکساں راہیں کھول دی ہیں۔

۲۰۔ قرآن مجید الفاظ، حروف، عبارات، ترتیب، معانی، مطالب گہرائی، گیرائی، تواتر حفاظت ہر ہر پہلو سے زندہ جاوید معجزہ ہے۔ دنیا کا کوئی کلام اس کی فصاحت و بلاغت، ہمہ گیری اور جامعیت تشہیر و اشاعت میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا ہے۔

۲۱۔ قرآن کے عجائبات اور اسرار ایسے کہ معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی اگر غور و فکر کرے اور انصاف سے کام لے تو بے ساختہ بول اٹھے گا کہ "ماہذا کلام البشر" بے شبہ یہ خدا کا کلام ہے کسی بشر کا نہیں۔

۲۲۔ مگر قرآن مجید نے اخلاقی، سماجی اور تہذیبی زندگی سے متعلق جو بھی ہدایات دی ہیں وہ صرف ان لوگوں کے لئے مفید اور کارآمد ہیں جنہوں نے ان کی اساسی تعلیمات کو دل سے قبول کیا ہو اور اپنے اندر جذب کرلیا ہو۔

۲۳۔ غور کیا جائے اس آخری صحیفۂ آسمانی کی حفاظت و صیانت کے لئے کتنے مستحکم ذرائع ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے تمام حروف اور الفاظ، نقاط اور اعراب کو بھی شمار کیا گیا ہے۔

۲۴۔ قرآن نے عربی زبان میں تصرف کرکے جو اعلیٰ تر ادب تیار کیا وہ اتنا ممتاز اور جداگانہ ہے کہ کوئی بھی عربی جاننے والا شخص کسی بھی دوسری عربی کتاب کی زبان سے قرآن کی زبان کا تقابل کرکے ہر وقت اسے دیکھ سکتا ہے۔

۲۵۔ قرآن کا الٰہی ادب عام انسانی ادب سے اتنا نمایاں طور پر فائق ہے کہ کوئی عربی داں اسکو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اوپر ان تفصیلات کے ذکر کرنے کا منشا سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ نئی نسل کو اپنا بھلایا ہوا سبق یاد دلایا جائے کہ "امت مسلمہ" کی موجودہ نسل پر سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ قرآن پاک کی صاف تعلیمات پر خود بھی سختی سے عمل کرے اور اس ابدی و لازوال پیغام کو انسانی [illegible]

دیکھئے [illegible]

ایک رائے ـــــــ ایک مشورہ

ـــــــ مولانا کفیل احمد علوی، کیرانوی

کچھ عرصہ سے مدارس اسلامیہ میں مروجہ نصاب میں تبدیلی کی بات سننے میں آرہی ہے، لیکن بعض گوشوں سے اس کی مخالفت بھی شروع ہوگئی ہے، نصاب کا مسئلہ درحقیقت ایک بہت اہم مسئلہ ہے، اس پر ماہرین تعلیم اور اکابر علماء کو حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے، اس کا تعلق ایک دو یا چند مدارس سے نہیں بلکہ وسیع ملک میں پھیلے ہوئے ہزاروں مدارس سے ہے، کیونکہ تمام دینی مدارس میں یکساں ہی نصاب تعلیم مروج ہے، ڈر یہ ہے کہ کہیں اور مسائل کی طرح اس مسئلہ پر بھی ہمارے درمیان نقصان دہ حد تک اختلافات نہ پیدا ہوجائیں۔ خدا کرے ایسا نہ ہو اور ہم اتفاق رائے سے مثبت نتائج تک پہنچ سکیں۔

ویسے دینی مدارس سے تعلق رکھنے والے خصوصًا اہل علم حضرات کو اس سلسلے میں اپنی رائے کے اظہار کا پورا حق حاصل ہے اور یہ اظہار رائے بشرط خلوص ہو تو ان شاء اللہ اس کے بہتر نتائج بھی سامنے آئیں گے۔ لیکن اس کا فیصلہ ہمیں.. اپنے ذی رائے اور خلوص کیش اکابر پر ہی چھوڑ دینا چاہئے، اور توقع رکھنی چاہئے کہ وہ اپنے ٹھوس تجربات، علمی تفوق و بصیرت اور وقت کے شدید تقاضوں کے مطابق ہی فیصلہ کن رائے قائم کریں گے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اول تو سبھی اہم مسائل میں اور خاص طور پر نصاب تعلیم کے مسئلہ میں ذاتی مفاد سے بلند ہوکر سوچیں اور ملی و قومی اور دینی مفاد کی خاطر زیادہ خلوص اور زیادہ وسعت نظر سے کام لیں۔

اس سلسلے میں پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے ان مدارس کے بنیادی مقاصد پر غور کریں جنھیں

ملت اسلامیہ کے نیک دل اور فراخ حوصلہ حضرات اپنے نامساعد اقتصادی حالات کے باوجود کثیر سرمایہ دیکر آگے بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے،

مقاصد یہ ہیں کہ قرآن کریم نے انسانی فلاح و بہبود کے لئے جو اعلیٰ اصول اور بہترین ہدایات پیش کی ہیں اور جنھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور سے سمجھایا ہے اور جن پر حضرات صحابہؓ کا متواتر عمل رہا ہے، انھیں ہمارے طلبہ پڑھیں، سیکھیں اور پھر احساس ذمہ داری کے ساتھ دور دور تک فروغ دینے کی ہمہ تن جد وجہد کریں، اپنی ملی امتیازی حیثیت اور اعلیٰ تشخص کو صرف باقی رکھنے کی فکر کریں بلکہ انھیں نمایاں کرنے کا عظیم جذبہ بھی ان کے سینوں میں موجزن ہونا چاہئے۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ وہ اخلاقیات و معاملات سے متعلق ہو یا عبادات سے، انفرادی زندگی سے متعلق ہو یا اجتماعی زندگی سے، ایسا نہیں ہے جس میں اسلام نے واضح اور مناسب ترین ہدایات پیش نہ کی ہوں، مقاصد چونکہ اہم ہیں اس لئے زیادہ سے زیادہ باصلاحیت، جواں ہمت، باشعور اور فعال افراد تیار کرنا ہی ہمارے مدارس کے بنیادی اور اعلیٰ مقاصد ہیں۔

ہمارے سمجھنے کے مطابق اگر اسلامی مدارس کے اصل مقاصد یہی ہیں تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا یہ مدارس مذکورہ صفات کے حامل افراد تیار کر رہے ہیں یا نہیں؟ نیز یہ کہ ہمارے مروجہ نصاب میں ایسے فعال اور باشعور افراد تیار کرنے کی صلاحیت ہے یا نہیں جو مذکورہ، مقاصد کی تکمیل کے لئے میدان عمل میں آنے کی قوت رکھتے ہوں، وقت کے شدید تقاضوں کو حالات کی نزاکتوں اور لوگوں کی نفسیات کو پوری طرح سمجھتے ہوں، افہام و تفہیم کا پورا شعور رکھتے ہوں، اپنے علوم میں دستگاہ رکھنے کے ساتھ ان عصری علوم سے بھی واقف ہوں، جنھیں قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہو۔ اس کے بعد ہی ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے افکار و نظریات سے یا نصب العین سے متاثر کرسکیں گے۔

ہمارا موجودہ نصاب تعلیم بلاشبہ کسی زمانہ میں وقت کے تقاضوں اور حالات کے مطابق تھا، اس کی تکمیل کے بعد فضلاء میں وہ تمام اعلیٰ صلاحیتیں پیدا ہوجاتی تھیں جن کی ضرورت تھی، منطق و فلسفہ بھی اس دور کی اہم ضرورت تھی، ان علوم کو بڑی قدر کی نگاہ

سے دیکھا جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ بغیر منطق و فلسفہ کے آدمی پڑھا لکھا ہی نہیں سمجھا جاتا تھا، اسی لئے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان علوم کا چشمہ یونان کی تاریک تر، الحاد پسندانہ وادیوں سے پھوٹا ہے، اسلافِ صالحین نے ان کو آگے بڑھ کر اپنایا، کیونکہ وہ اس وقت کی ایک بڑی ضرورت تھی، شدید تقاضا تھا، وہ باہوش حضرات خصوصًا علمی میدانوں میں دوسری قوموں سے کم تر رہنا یا پسماندہ رہنا گوارا نہیں کرتے تھے، وہ اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ کم تر رہکر لوگوں کو اپنے نظریات سے متأثر نہیں کیا جا سکتا۔

آج کے حالات بالکل بدلے ہوئے ہیں، مروّجہ علم منطق و فلسفہ دنیا میں متروک ہو چکا ہے، لوگ ان کی اصطلاحوں تک سے واقف نہیں، اور نہ انھیں اس کی ضرورت ہے۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ لے لیجئے اس میں منطق و فلسفہ کی آپ کو کہیں بھی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ جو علوم اسقدر فرسودہ اور متروک ہو چکے ہوں ان سے قدرتی طور پر دلچسپی کا بھی کوئی مطلب نہیں۔ ہمارے مدارس میں ان کا تسلسل اور ان میں سخت دماغ سوزی فیثا غورث اور بطلیموس وغیرہ کی روحوں کو آسودہ کرنے کا باعث تو ہو سکتا ہے لیکن ہمارے لئے فائدہ مند نہیں ہو سکتا، فائدہ مند تو کیا ہوتا اُلٹا نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے، کیونکہ طلبہ کا بہت قیمتی وقت انھیں کی بھول بھلیوں میں صرف ہو جاتا ہے اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگر یہ وقت کتاب و سنت، تاریخ، معلومات عامہ اور نفسیات وغیرہ دیگر علوم میں صرف کیا جائے تو بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔

بعض لوگ . . . جو مروجہ نصاب کو بجالہ گلے لگائے رکھنے کے حامی ہیں کہتے ہیں کہ منطق و فلسفہ کے بغیر قرآن و حدیث کو سمجھنا مشکل ہے اور علم میں گہرائی و گیرائی انہیں علوم سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے ان کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ در حقیقت یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے، اور خدا جانے کیوں پیدا ہوئی۔ قرآن و حدیث کے سمجھنے کا اس سے دور کا بھی تعلق نہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن و رسول کے مخاطبِ اوّل حضراتِ صحابہؓ تھے۔ جن میں کسی ایک کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ منطقی یا فلسفی تھے۔ وہ نیک دل اور بلند کردار انسان تو انتہائی سیدھی سادی زندگی گذارنے کے عادی تھے، کاشتکار تھے یا خانہ بدوش تاجر یا پھر مزدوری پیشہ

بے ٹوک صاف اور سچی بات کہنے کے خوگر۔ آخر انہوں نے قرآن وحدیث کو کیسے سمجھ لیا؟ یہ تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ معاذ اللہ انہوں نے قرآن وحدیث کو نہیں سمجھا۔ یا پورے طور پر نہیں سمجھا، یا ان کے علم میں گہرائی وگیرائی نہیں تھی؟

واقعہ یہ ہے کہ کتاب وسنت کو سمجھنے کا مدار منطق وفلسفہ پر ہرگز نہیں، عربی دانی پر ہے، اور حضرات صحابہؓ اہل زبان تھے۔ اس لئے انھیں سمجھنے میں کوئی دقت یا پریشانی نہیں تھی،

اسلام ایک فلاحی مذہب ہے، وہ تمام انسانوں کو مخاطب کرتا ہے، اسی لیئے اس کے مسائل وہدایات، اسلوب بیان اور طرز ادا سادہ، خوبصورت اور عقل وفہم کے عین مطابق ہے۔

یہ صحیح ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے تعلیمی اداروں میں منطق وفلسفہ ملتاہے، مگر وہاں اس کی نوعیت صرف ایک تاریخی علم کی ہے، ہمارے بڑے مدارس میں بھی اگر ضروری سمجھا جائے تو ان کی تاریخی حیثیت کو باقی رکھنے کے لئے فنون کے درجہ میں رکھا جاسکتاہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ، جو طالب علم فراغت کے بعد منطق وفلسفہ پڑھنا چاہیں انھیں پڑھا دیا جائے، کورس میں داخل کرکے سب کو اس کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔

یہ بات تو تھی قدیم علم منطق وفلسفہ کی، اب آیئے ذرا ان کی حقیقت پر غور کریں گاندھی کا "عدم تشدد" کا فلسفہ دنیا بھر میں مشہور ہے اور لوگ جسطرح اس کی تعریف کرتے ہیں، وہ سب کو معلوم ہے، کیا گاندھی جی کے اس فلسفہ میں یونانی یا کتابی فلسفہ کو بھی کوئی دخل ہے؟ ذرہ برابر نہیں، معلوم ہوا کہ اصل فلسفہ صحیح خطوط پر غور وفکر کے بعد حکمت عملی کے تعین کا نام ہے۔ اور منطق کا مفہوم علمی، وتجرباتی قوت سے اپنے افکار ونظریات کو صحیح ثابت کرناہے اسی لئے منطق ودلائل کا مطلب زور استدلال لیا جاتا ہے۔ ان معنوں میں منطق وفلسفہ ہر دور کی ضرورت ہے، اور یہ ضرورت ہمیشہ رہے گی، مگر اس کا تعلق نصابی منطق وفلسفہ سے نہیں، فہم وشعور سے ہے۔ تجربات سے ہے، صحیح غور وفکر کی اعلیٰ صلاحیتوں سے ہے، جس کے لئے دینی علوم کے ساتھ عصری علوم وفنون کی ضرورت ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس منطق وفلسفہ کو اسلامی مدارس سے نکالدینے کی باتیں ہورہی ہیں، اہل یورپ نے اسی کی خوشہ چینی سے حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں۔ یہ بھی سراسر غلط ہے، غلط ہی نہیں مضحکہ خیز بھی ہے، سوال یہ ہے کہ اہل یورپ نے تو ان کی خوشہ چینی سے اتنا کچھ حاصل کرلیا کہ دنیا پر چھا گئے مگر ہم صدیوں سے اس کی آبیاری میں لگے رہنے کے باوجود حاصل کچھ بھی نہ کرسکے، حاصل تو کیا کرتے خود اپنا ہی بہت کچھ گنواں بیٹھے۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کیا ہوسکتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یورپی اقوام کی ترقیات یونانی فلسفہ کی مرہون منت نہیں، بلکہ یورپ کی حدود میں ہمارے فلک شگاف نعروں نے ان قوموں میں سوئے ہوئے قومی شعور کو جگا دیا تھا جسکے نتیجہ میں ان لوگوں میں قومی و مذہبی بیداری پیدا ہوئی، اتحاد کا زبردست جذبہ پیدا ہوا۔ ہر رخ سے آگے بڑھنے کی امنگ پیدا ہوئی، مؤثر وسائل کی فراہمی کا شدید احساس پیدا ہوا اور پھر انہوں نے قوت تجسس سے صحیح کام لیکر وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے اور دیرہے ہیں جو ساری دنیا کے سامنے ہیں۔ ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ ہم انھیں جگا کر خود خواب غفلت میں جا پڑے، طوائف الملوکی کا شکار ہوگئے، اور آج تک ہیں عبرتناک بات یہ ہے کہ وہ قومیں تو ہمارے نعروں سے جاگ اٹھیں اور ہم ان کے خوفناک دھماکوں سے بھی بیدار نہ ہوسکے! واحسرتا!!

منطق وفلسفہ کے بعد بھی ہمارے نصاب میں مزید تبدیلیوں کی اشد ضرورت ہے، یہ بات بھی انتہائی افسوسناک ہے کہ ہمارے طلبہ نو دس سال کی لمبی مدت مسلسل عربی پڑھنے کے باوجود نہ عربی بولنے پر قادر ہوتے ہیں، نہ لکھنے پر اور درسی کتابوں سے ہٹ کر نہ سمجھنے پر، کورس کی کتابوں میں بھی طلبہ کی استعداد کی جو رفتار رہتی ہے، اسے ہمارے اساتذہ خوب جانتے ہیں۔ سبھی مدارس میں تین ابتدائی سال تقریبًا عربی قواعد کے لئے خاص ہیں۔ لیکن یہ قواعد پڑھانے کا جو پرانا طریقہ چلا آرہا ہے وہ درست نہیں۔ اسی لئے طلبہ میں بہت کمزوری رہتی ہے۔ اور لکھنے پڑھنے کی صلاحیت بھی یونہی پیدا نہیں ہوتی۔ اس میں اگر تھوڑی سی تبدیلی کردی جائے تو یہ بنیادی کمی جو آخر تک پریشان رکھتی ہے یقینًا دور ہوسکتی ہے، قواعد سے متعلق اساتذہ اگر شروع ہی سے عربی سے اردو

اور اردو سے عربی جملوں کی مشق کرالیں اور کبھی کبھی گرامر بھی بتاتے جائیں تو اس سے زیادہ فائدہ ہوگا۔ ان تین سال ہی کے زمانے میں طلبہ اچھی خاصی عربی پڑھنے لکھنے اور بولنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ اس طریق کار کو الگ سے۔۔ طلبہ کے اپنے شوق اور تمرین ہی پر نہ چھوڑا جائے بلکہ اسکو نصاب کا ایک حصہ قرار دیا جائے، اس کے علاوہ فقہ کی ایسی کتابیں نصاب میں شامل ہونی چاہئیں جن کے تمام مسائل مفتی بہ ہوں، اس کا فائدہ بھی ظاہر ہے یعنی جو مسائل طلبہ کے ذہن نشیں ہوں گے وہ سب مفتی بہ ہوں گے، جنھیں لوگوں کو بتانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی جائے گی۔ علاوہ ازیں بنیادی طور پر پورے کورس میں وقت اور حالات کے پیش نظر طلبہ کی دلچسپی کا کافی حد تک لحاظ رکھا جانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے،

بہتر اور مفید ترین نصاب کی تشکیل یا مناسب ترمیم کے بعد دوسری بہت ضروری بات وہ ہے جسے مارچ کے "دارالعلوم" میں مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی نے لکھا ہے یعنی تعلیم کے ساتھ طلبہ کی تربیت کا خاص اہتمام،

ہمارے لئے کس قدر شرم کی بات ہے کہ جس قوم کے ملک میں ہزارہا مدارس چل رہے ہیں وہ قوم پھر بھی علمی پسماندگی میں مبتلا رہے۔ اس کے افراد کو تعلیم یافتہ نہ سمجھا جائے، اور انھیں قدر و عزت کا وہ مقام نہ مل سکے جو پڑھے لکھے لوگوں کو ملتا ہے، اس کی بنیادی وجہ ہمارا موجودہ نصاب اور طریق تعلیم ہی ہو سکتا ہے۔ ہمارے نوے فی صد طلبہ غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں، درسیات سے فراغت کے بعد ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ اقتصادیات کا ہوتا ہے، جب وہ ان میدانوں کی طرف دیکھتے ہیں تو انھیں ہر طرف تاریکی دکھائی دیتی ہے، وہ سرکاری ملازمتوں کے قابل نہیں، حتی کہ کلرکی تک بھی نہیں کر سکتے، کارخانوں میں کام کرنے کی لیاقت نہیں۔ اس لئے کہ وہ دستکاری نہیں جانتے، اپنا کاروبار کرنے کے لئے ان تہی دستوں کے پاس نہ سرمایہ ہوتا ہے نہ کام کا تجربہ، اسوقت انکی مشکلات کا اندازہ صحیح طور پر وہ لوگ کر سکتے ہیں جو ان سنگلاخ راہوں سے گذر چکے ہیں یا گذر رہے ہوں، ان ہوشربا حالات میں کیا آپ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ پریشان حال فضلاء علم و دین کی ٹھوس پیمانے پر خدمات سرانجام دے سکیں گے؟ یہ واقعات کے بالکل خلاف ہے اگر اسکی مثالیں دو تین فیصد مل بھی جائیں تو وہ نہ ہونے کے درجہ میں ہیں۔ اسلئے ان کی اقتصادیات کے بارے میں بہتر طریقہ پر سوچنا اور نصاب تعلیم میں اس کا لحاظ رکھنا بھی ناگزیر ہے ـــــــ وما علینا الا البلاغ۔

کوائفِ دار العلوم

حامداً و مصلیاً! الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ دار العلوم دیوبند کا ۱۴۰۳ھ-۱۴۰۴ھ کا تعلیمی سال ماہ شعبان کی ۹؍تاریخ کو مکمل ہوگیا تھا، ۱۹؍شعبان کو سالانہ امتحان سے فراغت ہوئی، اردو دینیات، حفظ، فارسی تجوید کے امتحانات تقریری ہوئے۔ ان امتحانات میں تقریباً چھ سو طلبہ شریک تھے۔ عربی درجات، جامعہ طبیہ اور تجوید عربی کے امتحانات تحریری تھے، ان طلبہ کی تعداد تقریباً اٹھارہ سو تھی، رمضان کے پہلے ہفتہ میں تمام نتائج مکمل ہوگئے تھے، ان تمام درجات میں تقریباً ایک ہزار چھ سو طلبہ کامیاب ہوئے، نوّے طلبہ ناکام رہے اور ایک سو پچاس طلبہ ضمنی امتحان کے مستحق قرار پائے۔

سالانہ امتحان سے پہلے قدیم و جدید طلبہ کے لئے قواعد داخلہ اور قواعد امتحان شائع کرکے عام کردئے گئے تھے، اور اعلان کے مطابق داخلہ کے جدید امیدواروں کے خطوط رمضان شریف میں آتے رہے اور ان کا جواب دیا جاتا رہا، قرب و جوار کے مدارس عربیہ سے داخلہ کے جدید امیدوار رمضان شریف ہی میں آنا شروع ہوگئے تھے اور چونکہ داخلہ کے امتحانات تحریری کردئے گئے ہیں اسلئے پورے رمضان یہ جدید طلبہ مطالعہ و تکرار میں منہمک رہے، اعلان کے مطابق ۱۴؍۱۵؍۱۶؍شوال کو دار الحدیث تحتانی میں داخلہ کے امتحانات لئے گئے، آٹھ سو طلبہ شریک ہوئے، اور ان میں تقریباً چار سو طلبہ کامیاب ہوسکے،

مجلس تعلیمی کی ہدایت کے مطابق امتحانِ داخلہ کیلئے تیار کئے گئے سوالات کے پرچے نہایت آسان مرتب کئے گئے تھے، ہر سوال میں کتاب کی عبارت دی گئی تھی، اور عبارت پر اعراب لگانے اور ترجمہ کرنے کے علاوہ عام طور پر کوئی بات نہیں پوچھی گئی تھی، مگر افسوس ہے کہ اس قدر آسان سوالات کے باوجود امتحان داخلہ میں کامیاب ہونے والے طلبہ کی تعداد بہت کم رہی۔

عرصۂ دراز سے یہ صورت حال چل رہی تھی کہ تقریری امتحانات میں سفارشوں کی بے جا بھرمار نے امتحانِ داخلہ کی افادیت ختم کردی تھی، سال گذشتہ مجلس تعلیمی نے طے کیا کہ امتحانات تحریری لئے جائیں اور کامیابی کی حد نمبر ڈال کر متعین کردی جائیں۔ پچھلے سال یہ تجربہ بہت کامیاب رہا، لیکن مدارس عربیہ کے بعض ذمہ داروں نے یہ کہا کہ دار العلوم میں یکبارگی اس طرح کی تبدیلی سے انھیں دشواریوں کا سامنا ہے اس لئے اس سال کچھ رعایت برتی جائے۔ نیز طلبہ نے بھی درخواست کی کہ چونکہ ان قواعد کی اشاعت نہیں ہوئی اور انھیں اسکے مطابق تیاری کا موقع نہیں ملا۔ اسلئے اس سال رعایت دیجائے چنانچہ سال گذشتہ کچھ نام

طلبہ کو بھی لیا گیا۔ اور جن طلبہ نے امتحانِ داخلہ میں ۲۵ تا ۲۹ نمبر حاصل کئے تھے انھیں منتخبہ درجہ ہی میں لے لیا گیا، اور اس کے علاوہ بھی رعایتیں دی گئیں، لیکن امسال اوّل تو ماہ شوال ۱۴۱۵ھ ہی میں ان قواعد کا اعلان ہو گیا تھا، طلبہ اور مدارسِ عربیہ کے ذمہ داروں کے علم میں پورا طریقۂ کار آ گیا تھا۔ نیز یہ کہ ماہ رجب میں ان قواعد کی عام اشاعت کر دی گئی تھی، پھر مجلسِ شوریٰ منعقدہ شعبان میں ان کی توثیق ہو گئی تھی اسلئے امسال مطبوعہ قواعد کے مطابق عمل درآمد کیا گیا۔

آسان امتحان اور آسان جانچ کے باوجود اتنی تعداد کی ناکامی کو تعلیم کا نقصان ہی قرار دیا جائے گا، لیکن خوشی یہ ہے کہ مدارسِ عربیہ کے اکثر ذمہ داروں نے امتحان کے اس طریقہ کو خوش آمدید کہا ہے اور ان کی رائے یہ ہے کہ انشاء اللہ دارالعلوم کے اس طریقۂ کار سے معیارِ تعلیم کو بلند کرنے میں مدد ملے گی۔

امتحانات کے نتائج ۱۹ شوال کو مکمل ہو گئے تھے، اور ناکام طلبہ کی اکثریت دوسرے مدارس عربیہ میں منتقل ہو گئی تھی۔ لیکن سفارشوں پر اعتماد، اور دارالعلوم کی موجودہ تبدیلی پر صدق دل سے یقین نہ کرنے والے بعض امیدوار اب بھی ناکامی کے باوجود کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں مگر مجلسِ تعلیمی کے ذمہ داروں نے سفارشوں کو قبول کرنے سے معذرت کر دی ہے۔

قدیم و جدید داخلوں کے مکمل ہونے کے ساتھ تعلیم کے اجراء کا اعلان کر دیا گیا ہے، کتب خانہ سے کتابوں کی تقسیم جاری ہے نصف سے زائد طلبہ کو کتابیں دی جا چکی ہیں۔ اور ۲۲ شوال سے تعلیم کا باقاعدہ آغاز کر دیا گیا ہے، جو طلبہ کامیاب ہوئے ہیں وہ اسباق میں حاضری دے رہے ہیں، البتہ ضمنی امتحان میں آنے والے طلبہ کا ابھی تک امتحان نہیں ہوا ہے اسلئے وہ اسباق کے بجائے امتحان کی تیاری میں مصروف ہیں، نو منتخب اعادۂ سال والے ناکام طلبہ میں بھی ابھی تک معدودے چند طلبہ نے اعادہ قبول کیا ہے، بقیہ طلبہ اس انتظار میں ہیں کہ ان کے معاملہ پر نظر ثانی کی جائے، مگر معیارِ تعلیم کی بلندی اور دارالعلوم کی خیر خواہی کے پیش نظر مجلسِ تعلیمی نے ان کے پر نظر ثانی سے معذرت کر دی ہے۔

امتحانِ سالانہ اور امتحانِ داخلہ کے ہنگامی کاموں کے باوجود الحمد للہ کہ دارالعلوم کے حالات بالکل پرسکون ہیں، اس وقت دفتر تعلیمات کا کام تقریباً مکمل ہے، اور دفتر دارالاقامہ میں ہنگامی کام ہو رہا ہے۔ نظماء دارالاقامہ اپنے اپنے حلقوں کا گشت کر رہے ہیں اور مطبوعہ قواعد کے مطابق سیٹیں نامزد کی جا رہی ہیں ایک سے چار سیٹ تک کے چھوٹے کمرے اعلان کے مطابق ان طلبہ کو دیئے جا رہے ہیں جن کا سالانہ امتحان میں اوسط ۴۰ یا اس سے زائد رہا ہے۔ دارالعلوم کے موجودہ نظم و نسق اور امتحان کے طریقوں پر مجلس عاملہ منعقدہ [illegible] اطمینان کا اظہار کیا ہے، مدارس عربیہ کے ذمہ داروں کی اکثریت نے بھی معیار تعلیم کی بلندی کے لئے ان قواعد کی حمایت [illegible]

Regd. No. SHN-13-NP-21-84

DARUL-ULOOM MONTHLY
DEOBAND (U.P.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالعلوم دیوبند
کے ترقیاتی منصوبے

(۱) رواق خالد کی دوسری منزل اور مزید جدید دارالاقامہ کی تعمیر جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو

(۲) **دارالتربیت** (دارالاطفال) کا قیام اور اس کی تعمیر

(۳) ایک وسیع مسجد کی تعمیر جس میں اضافہ شدہ تمام طلبہ کی گنجائش ہو (قدیم مسجد ناکافی ہو چکی ہے)

(۴) علمی و دینی اجتماعات کے لئے ایک وسیع ہال کی تعمیر۔ ——— (۵) ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر

(۶) مہمان خانہ کی توسیع ——— (۷) نئی درسگاہوں کی تعمیر ——— (۸) **لائبریری کی تعمیر جدید**

(۹) اساتذۂ دارالعلوم کی علمی ترقی کے لئے عالم اسلام سے علمی کتابوں کی فراہمی کا انتظام

(۱۰) تمام دنیا میں پھیلے ہوئے فضلاء دارالعلوم سے روابط اور ان سے متعلق معلومات

(۱۱) نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر تمام ذمہ داران مدارس عربیہ کا اہم کنونشن طلب کرنا۔

(۱۲) تعلیم و تربیت کے نئے اصول و ضوابط کی ترتیب اور ان کا اجراء۔

اس ادارے کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے

دست تعاون بڑھانے کی شدید ضرورت ہے

مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی امداد روانہ فرمائیں ——— **شکریہ**

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب) دارالعلوم دیوبند یوپی

این جے پرنٹرس دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی اِصلاحی ماہنامہ

دارالعلوم

زیرِ سرپرستی

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

مدیر مسئول

ریاست علی بجنوری

نگرانِ اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند، یو۔پی

دار العلوم دیوبند کا علمی دینی

ماہنامہ دار العلوم

شمارہ نمبر ۱	جولائی سنہ ۱۹۸۴ء مطابق شوال المکرم سنہ ۱۴۰۴ھ	جلد نمبر ۶۶

سالانہ زر اشتراک

ہندوستان سے ۲۵/-

سعودی عرب، کویت، ابوظبی وغیرہ سے

بذریعہ ایر میل ۹۰/- روپے

جنوبی شرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے

بذریعہ ایر میل ۱۰۵/- روپے

امریکہ، کناڈا وغیرہ سے بذریعہ ایر میل ۱۱۶/- روپے

پاکستان سے بذریعہ رجسٹری ۴۵/- روپے

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

ضروری گذارش

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینہ یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ بذریعہ سرخ نشان اس کی آپ کو اطلاع بھی دی جا چکی ہے۔ لہٰذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی۔ پی سے زر اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے اگلا شمارہ ۳۱/- روپے کے مطالبہ میں وی۔ پی کر دیا جائے گا۔ (مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اوّل فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۔/۴۵ روپے مولانا عبد الستار صاحب مقام کرم علی والا تحصیل شجاع آباد (ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیجدیں اور انھیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حسب میں جمع کریں۔

خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(مدیر)

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن القاسمی

شمارہ ماہ فروری ۱۹۸۵ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ کے حرفِ آغاز میں دلائل و شواہد کی روشنی میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ انقلاب ایران کے قائد اور لیڈر علامہ خمینی نہ صرف شیعی معتقدات کے پابند ہیں بلکہ وہ مذہب شیعیت کے زبردست داعی اور مبلغ بھی ہیں اس لئے ان کی سرکردگی اور سرپرستی میں ایران کے اندر جو انقلاب رونما ہوا ہے وہ ایک خالص شیعی انقلاب ہے، جس کا اسلامی انقلاب سے ادنیٰ سا بھی تعلق نہیں ہے۔ لیکن تقیہ (جھوٹ اور فریب) کے عام تر ذریعہ اور پروپیگنڈہ کی غیر معمولی طاقت کے ذریعہ دنیا کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ علامہ خمینی شیعہ، سُنّی اختلاف سے بیزار، وحدت اسلامی کے علم بردار ہیں اور مذہب شیعہ کے برخلاف وہ حضرات صحابہ بالخصوص خلفاء راشدین کی عزت و حرمت سنّیوں ہی طرح کرتے ہیں۔ اس پروپیگنڈے سے متأثر ہو کر عوام کے علاوہ بہت سے ارباب علم و تحقیق بھی علامہ خمینی کو ایسا ہی یقین کرتے ہیں اور اس بنیاد پر ایران میں ان کے برپا کئے ہوئے انقلاب کو اسلامی انقلاب کہتے اور سمجھتے ہیں۔

اس بارے میں ہمارے پاس کثرت سے خطوط آئے جن میں عام طور پر صحیح صورت حال سے بےخبری کی بناء پر غلطی میں پڑ جانے کا اعتراف ہے لیکن ان میں ایک خط ایسا بھی ہے جس میں حرفِ آغاز کے مندرجات سے اختلاف کیا گیا ہے۔ یہ مکتوب بنگلور کے ایک مسجد کے امام صاحب کی جانب سے لکھا گیا ہے۔ اس کے لب و لہجہ اور انداز تحریر کے متعلق ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص اپنی ہمت و اندازہ کے مطابق ہی گفتگو کرتا ہے۔ البتہ موصوف کی دلیل جو انھوں نے پیش کی ہے مزید محل نظر ہے وہ اپنی رائے کی اصابت کو مدلل کرنے کے لئے لکھتے ہیں۔ ایران کے انقلاب کو جماعت اسلامی ہند و پاک متفقہ طور پر اسلامی انقلاب سمجھتی اور کہتی ہے۔ اسلئے اسے شیعی انقلاب کہنا صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں اتنی گذارش ہے کہ اگر موصوف کے نزدیک جماعت اسلامی ہی معیار حق ہے تو پھر مزید گفتگو بے سود ہے لیکن اگر کھلے دل و دماغ سے حقائق کو دلائل و براہین کی روشنی میں دیکھا جائے تو

بات وہی درست ہے جو فروری کے شمارہ میں لکھی گئی ہے۔

شیعی معتقدات میں مسئلہ امامت، تبرا، تحریف قرآن اور تقیہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ علامہ خمینی ان عقائد میں اپنے پیش رو علماء کے بالکل نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی دو چار قدم آگے ہی ہیں۔ چنانچہ فروری کے شمارہ میں مسئلہ امامت سے متعلق علامہ خمینی کی رائے خود ان کی مشہور تصنیف "الحکومۃ الاسلامیہ" کے حوالہ سے وضاحت کے ساتھ بیان کردی گئی ہے کہ وہ اپنے ائمہ کو نہ صرف معصوم سمجھتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک ائمہ کا درجہ اور مقام ملائکہ مقربین اور حضرات انبیاء صلوات اللہ علیہم سے بھی بلند تر ہے اور یہی نہیں بلکہ وہ اپنے ائمہ کو خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی طرح ہر قسم کے خطاء و نسیان اور بھول چوک سے بری سمجھتے ہیں۔ اور ان کی تعلیمات پر قرآن حکیم کی تعلیمات کی طرح سے عمل کرنا فرض اور ضروری سمجھتے ہیں۔ (دیکھئے کتاب مذکور کے صفحات ۱۳ اور ۵۲ وغیرہ)

اسی طرح مسئلہ تبرا میں وہ کسی شیعی عالم سے پیچھے نہیں ہیں چنانچہ صحابی رسول حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ پر صاف لفظوں میں وضع حدیث کی تہمت لگاتے ہیں (الحکومۃ الاسلامیہ ص۷۱) کاتب وحی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر خاص تبرائی انداز میں یوں کرتے ہیں (ومعاویہ تراس قومہ اربعین عاماً ولکنہ لم یکسب لنفسہ سوی لعنۃ الدنیا وعذاب الآخرۃ الجہاد الاکبر ص۱۸) معاویہ نے چالیس سال اپنی قوم پر حکومت کی لیکن اس مدت میں اپنے لئے دنیا کی لعنت اور آخرت کے عذاب کے علاوہ کچھ نہیں حاصل کیا۔

اپنی ایک اور تصنیف "کشف الاسرار" میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اگر قرآن میں صراحت کے ساتھ امام کا نام ذکر کردیا جاتا تو اس اہم ترین مسئلہ میں امت کے درمیان اختلاف نہ پیدا ہوتا؟ لکھتے ہیں۔

> فرضاً در قرآن اسم امام راہم تعیین می کرد از کجا خلاف بین مسلمانہا واقع نمی شد آنہا نیکہ سالہا در طمع ریاست خود را بدین پیغمبر چسپانده بودند و دستہ بندیہا میکردند ممکن نبود بگفتہ قرآن از کار خود دست بردارند باہر حیلہ بود کار خود را انجام می دارند بلکہ شاید در ایں صورت خلاف بین مسلمانہا طورے می شد کہ بانہدام اصل اسلام منتہی می شد زیرا کہ ممکن بود آنہا کہ در صدد ریاست بودند چوں دیدند کہ باسم اسلام نمی شود مقصود خود را پیش ببرند یکسرہ حزبے برضد اسلام تشکیل میدادند (ص۱۱۳، ۱۱۴)

یعنی بالفرض اگر قرآن میں امام کا نام متعین طور پر ذکر کر دیا جاتا تو اس سے مسئلہ امامت میں باہمی نزاع کا ختم ہونا کیونکر لازم آتا ہے۔ جن لوگوں نے حکومت، ریاست کی لالچ ہی میں اپنے آپ کو مدت دراز تک دین پیغمبر کے ساتھ چپکا رکھا تھا اور فرماں بردار بنے ہوئے تھے ان سے ممکن نہیں تھا کہ وہ قرآن کے حکم کو مان کر اپنے مقصد سے دست بردار ہو جاتے۔ جس حیلے سے بھی ان کی مقصد برآری ہوتی وہ اسے قطعی طور پر اختیار کرتے۔ بلکہ شاید امام کے نام کی تصریح کی صورت میں مسلمانوں کے درمیان ایسا اختلاف ہوتا کہ اسلام کی بنیاد ہی اکھڑ جاتی۔ کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ اسلام لانے سے جن کا مقصد حصول ریاست وحکومت تھا وہ جب دیکھتے کہ اسلام کے نام سے وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے تو وہ اسلام ہی کے خلاف ایک پارٹی بنا کر میدان میں آجاتے۔

علامہ خمینی اپنی تحریر انہا نیکہ سالہا در طمع ریاست خود بدین پیغمبر چسپانده بودند الخ سے حضرات خلفاء ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کی جانب تعریض کر رہے ہیں۔ جیسا کہ مذہب شیعہ سے واقفیت رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں۔

علامہ خمینی نے اپنی اسی کتاب "کشف اسرار" میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کا نام لے کر ان پر قرآن کی مخالفت کا الزام و اتہام لگایا ہے اور اس پر بھی جب ان کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا تو "حدیث قرطاس" کی بحث میں حضرت فاروق اعظم کو (نعوذ باللہ) کافر اور زندیق تک لکھ گئے۔ ملاحظہ ہو اصل عبارت "این کلام یاوہ کہ از اصل کفر و زندقہ ظاہر شد مخالف است با آیاتے از قرآن کریم" کشف الاسرار ص۱۱۹

کیا ان واضح تصریحات کے ہوتے ہوئے بھی علامہ خمینی کے بارہ میں یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ شیعہ سنی اختلاف سے بیزار ہیں اور حضرات صحابہ بالخصوص خلفاء اربعہ کا احترام کرتے ہیں؟ علامہ خمینی کے انھیں شیعی معتقدات کی بناء پر ملت اسلامیہ کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ پروپیگنڈہ کے فریب میں نہ آئیں۔ انقلاب ایران درحقیقت ایک شیعی انقلاب ہے اور اس کی نگاہیں حرمین شریفین پر لگی ہوئی ہیں"۔ اب رہا جماعت اسلامی کا مسئلہ تو یہ جماعت اور اس کے بانی شیعیت سے بہت قرب رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی حمایت اس انقلاب کے اسلامی ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔

اسلام میں سنت و حدیث کا تشریعی مقام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد خاتم النبیین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین ؛

اما بعد! حق تعالیٰ شانہٗ نے روزِ اوّل سے اولادِ آدم کی ہدایت و رہنمائی کے لئے وحی آسمانی کا سلسلہ جاری فرمایا ہے۔ اس آسمانی ہدایت کی روشنی میں نسلِ انسانی کی علمی اور عملی تعلیم و تربیت کے لئے ہر زمانہ میں جن برگزیدہ نفوسِ قدسیہ کا انتخاب فرمایا ہے اسلامی زبان میں ان کو انبیاء و رسل کہتے ہیں اسی لئے ایک طرف ان مقدس ہستیوں کے معصوم ہونے کی ضمانت دی ہے کہ ان حضرات کا دامنِ عصمت شیطانی تسلط اور استیلاء ہوائے نفس سے قطعاً پاک ہے یہ جو زبان سے کہتے ہیں وہ

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۔ — اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا وہ تو وحی ہوتی ہے جو بھیجی جاتی ہے۔

کے بموجب وحیِ ربانی ہوتی ہے اور جو کچھ کرتے ہیں وہ بھی :-

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ — میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے

کے بموجب وحی ربانی ہوتی ہے۔ دوسری طرف ان مقدس و معصوم ہستیوں کو پوری نوعِ انسانی کے لئے آسمانی حکم۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ۔ — اور جو رسول بھی ہم نے بھیجا صرف اس لئے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

کے بموجب مُطاع یعنی واجب الاطاعت قرار دیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے مخلوق کی ہدایت کیلئے مبعوث (فرستادہ) اور کائنات میں حق تعالیٰ کی خلافتِ الٰہیہ قائم کرنے پر مامور ہونے کے ثبوت کے طور پر جو دلائل و براہین ان کو دئے جاتے ہیں تاکہ مخلوق پر حجت قائم ہو اور وہ صدق دل سے ان کی تصدیق کرسکے اور ایمان لا سکے ان دلائل و براہین کا نام اسلامی زبان میں معجزات اور آیات بیّنات ہے۔

درحقیقت ارشاداتِ ربّانی اور ہدایات آسمانی کے سلسلہ کا مدار اس ربط و تعلق پر ہے جو حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کا حق جل و علا کی بارگاہِ قدس سے بلا واسطہ اور انبیاء کرام کے واسطہ سے تمام مخلوق کا خالقِ کائنات سے قائم و دائم ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت حق تعالیٰ کی بارگاہ سے برابر انبیاء کرام کو پیغامات و احکامات ملتے رہتے ہیں اور وہ مخلوق تک پہونچاتے رہتے ہیں۔

ان پیغامات کا سلسلہ کبھی براہِ راست بصورت "القاء فی القلب" قائم ہوتا ہے اور کبھی فرشتہ کے ذریعہ یہ پیغامات انبیاء کے پاس آتے ہیں۔ جس فرشتہ کو اس اہم کام۔ پیغام رسانی۔ کے لئے انتخاب فرمایا ہے۔ اس کا نام جبرئیل ہے۔ ارشاد ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	"کسی بھی بشر کیلئے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے
اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاۤءِ حِجَابٍ	(رُو در رو) کلام کرے بجز اس کے کہ وحی
اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ	کے ذریعہ "یا پردہ کے پیچھے سے (کلام کرے)
بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ۔	یا فرشتہ بھیجے اور وہ اللہ کے حکم سے
	جو اللہ چاہے۔ وحی پہونچاتے"۔

فرشتہ جو پیغام — وحی — لاتا ہے ضروری نہیں کہ آسمانی صحیفہ یا کتاب آسمانی کی شکل میں ہو بلکہ بسا اوقات وہ پیغام — وحی — فرشتہ کی زبانی یا "نفث فی الروع" — دل میں پھونک دینے — کی شکل میں ہوتا ہے

فرشتہ کے ذریعہ جو پیغام — وحی — الفاظ کی صورت میں منضبط کرکے پہنچایا جاتا ہے تاکہ امت اس کو پڑھے پڑھائے زبانی یاد کرے اور قیامت تک نسلاً بعد نسلٍ اس کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھے اس پیغام کا نام شریعت کی زبان میں وحی متلو، کلام اللہ، کتاب اللہ، صحیفہ ہے اور اس کے علاوہ جو پیغام الٰہی فرشتہ کے واسطہ کے بغیر یا فرشتہ

کی زبانی آتا ہے اس کا نام شریعت کی زبان میں وحی غیر متلو ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے، چار اولوالعزم انبیاء علیہم السلام پر نازل شدہ چار کتابیں۔ توراۃ، زبور، انجیل اور قرآن اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہے اور صحائف وکتب کی تعداد معدودہ چند ہے اس لئے صحائف وکتب کے علاوہ بقیہ تمام تر وحی الٰہی نیز ان انبیاء کے علاوہ باقی تمام انبیاء کرام کے پاس پیغام الٰہی اور وحی آسمانی یا براہِ راست آیا ہے یا فرشتہ کی زبانی القاء فی القلب کی شکل میں آیا ہے۔ ایسی صورت میں تمام احکامِ شرع کا مدار یقیناً کسی کتاب یا صحیفہ پر نہیں ہے۔ بلکہ نبی اور رسول کی معصوم ذات گرامی پر ہے۔ اور جس طرح امت کے لئے کتاب اللہ پر ایمان لانا اور اس کی پیروی کرنا فرض ہے ٹھیک اسی طرح نبی اور رسول کا ہر حکم بھی واجب الاطاعت ہے اور اطاعت و اتباع کے لحاظ سے وہی درجہ رکھتا ہے جو کتاب اور صحیفہ کا ہوتا ہے حضرات صحابہؓ کے حق میں قرآنی وحی اور حدیثی احکام دونوں یکساں طور پر واجب الاطاعت تھے بقیہ امت کیلئے جو نبوت کے عہد میں موجود نہ تھے قرآن کا حکم قطعی ہے۔ اور احادیث یا سنت اگر تواتر سے پہنچی ہیں تو وہ بھی قطعی ہیں البتہ جو تواتر سے نہیں پہنچیں قطعیت کے درجہ کو تو نہیں پہنچیں لیکن ان پر عمل کرنا واجب ہے۔ قرآن کریم کی تصریح۔

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَ	(جو تم کو رسول (حکم) دے اس کو لو
مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔	(قبول کرو) اور جس سے تمہیں منع کریں
	اس سے باز آؤ)

نیز

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي	(اے نبی) کہدو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو
يُحْبِبْكُمُ اللهُ ـــــــ	میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

کے مطابق ان کو ماننا اور ان پر عمل کرنا امت پر واجب اور فرض ہے۔

اور یہ حقیقت بھی بلاشبہ مسلم ہے کہ جس طرح ہدایات ربانی اور احکام خداوندی بصورت قرآن عظیم رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئے ہیں اسی طرح بہت سے پیغامات الٰہیہ اور احکام ربانیہ قرآن کے علاوہ بھی بصورت وحی خفی رسول پر نازل ہوئے ہیں، اور امت کو بتلائے گئے ہیں اور احکام خداوندی کی حیثیت سے ان پر عمل کرایا گیا ہے۔ قرآن کو

کی اصطلاح میں دوسری صورت میں دی ہوئی تعلیمات کا عنوان الحکمۃ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے متعدد مقامات میں الحکمۃ کے لئے بھی انزل کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ان بنیادی حقائق وارشادات کو سمجھ لینے کے بعد یہ باور کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ درحقیقت دین کا دار ومدار حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر ہے۔ دین کا سرچشمہ آپ ہی کی تعلیمات وہدایات اور اقوال وافعال ہیں قرآن کریم میں ان کا ذکر ہو یا نہ ہو۔

اسلام کے تشریعی نظام کی تشکیل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر وبیشتر اہم ترین احکامات حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی نافذ فرمایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ احکامات وحی الٰہی خفی کے ذریعہ ہی آپ... جاری فرماتے تھے لیکن قرآن کریم میں اس وقت تک ان کا ذکر نہیں ہوتا تھا بعد میں قرآن کریم میں ان احکام سے متعلق آیات نازل ہوتی تھیں گویا قرآن کریم آپ کے جاری کئے ہوئے احکامات کی تصدیق وتوثیق کرتا تھا۔ حسب ذیل، چند مثالوں سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے۔

(۱) عقیدۂ توحید کے بعد سب سے پہلی اور اہم عبادت صلوٰۃ یعنی نماز ہے۔ ابتداء اسلام سے ہی اس عبادت کے ادا کرنے کا سلسلہ قائم اور اس پر عملدرآمد شروع ہو گیا تھا۔ لیلۃ الاسراء یعنی شب معراج سے قبل دو نمازیں پڑھی جاتی تھیں ایک صبح ایک شام اسراء کے بعد نمازیں پانچ ہو گئیں لیکن اس وقت تک نہ قرآن کریم میں اس طرح نماز کا ذکر تھا نہ ہی نماز کی تشکیل اور عملی صورت مذکور تھی، امت نے اس فریضہ کو حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور فعلی ہدایات کے تحت ہی قبول کیا تھا۔ اور عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔

(۲) ارشاد مبارک :۔ صَلّوا کما رأیتمونی اُصَلّی کے تحت نماز کی جو عملی صورت آپ نے عملاً اور قولاً پیش فرمائی ہے کہ اللہُ اکبر سے شروع ہوتی ہے اور السّلام علیکم ورحمۃ اللہ پر ختم ہوتی ہے۔ قیام ہوتا ہے۔ قرأت قرآن ہوتی ہے، رکوع ہوتا ہے سجدہ ہوتا ہے، پھر دو رکعت پر قعود ہوتا ہے۔ دو دو رکعتیں ہوتی ہیں یا چار چار یا تین رکعتیں اگرچہ بطور تصدیق قرآن کریم میں جستہ جستہ ان تمام تفصیلات کی طرف رہنمائی ہوتی رہی۔ مگر امت نے پنج وقتہ نماز اور اس کی تفصیلات کو آپ کی قولی اور فعلی ہدایات سے ہی سیکھا سمجھا اور عمل کیا ہے۔ نہ نزول قرآن کا انتظار کیا نہ اس پر مدار رکھا۔ قرآن کریم نے

نہ ابتداء میں "اقیموا الصلوٰۃ" کا حکم دیا تھا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کی تعلیم و ارشاد سے نماز کا وہ نقشہ قائم فرمایا جس پر امت عمل پیرا ہے قرآن کریم کا جو ارشاد ہے۔ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم۔ یہ اسی کی عملی تفسیر ہے۔

(۳) نماز ادا کرنے کے لئے طہارت اور وضو یا غسل کی تمام تفصیلات بھی آپ نے ہی بتائیں، کپڑوں اور جگہ کے پاک ہونے کے احکامات بھی آپ نے ہی بتلائے اور امت نے ان پر عمل کیا۔ تقریباً اٹھارہ سال بعد طہارت اور وضو وغیرہ سے متعلق سورۃ مائدہ والی آیات نازل ہوئیں۔ حالانکہ ان پر امت کا عمل محض آپ کے فرمانے سے اٹھارہ سال پہلے سے جاری تھا۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لائے، تو آپ نے حکم دیا کہ "نماز میں بیت المقدس کا استقبال کرو" یعنی بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھو، سولہ، سترہ مہینے تک اس پر عمل ہونے کے بعد قرآن کریم میں بیت اللہ شریف کے استقبال کا حکم آیا، باوجودیکہ استقبال بیت المقدس کا حکم قرآن کریم نے نہیں دیا تھا تاہم حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی جو خود آپ نے دیا تھا تصدیق و توثیق فرمادی اور فرمایا سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۔ نہ صرف یہ بلکہ آیت کریمہ ذیل ۔ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا ۔ الآیۃ میں آپ کے حکم کو اپنے حکم سے تعبیر کیا اور فرمایا وماجعلنا۔

(۵) جنگ کے موقعہ پر یہود بنی نضیر کے کچھ کھجور کے درختوں کے کاٹ ڈالنے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت دیا تھا جبکہ بنو نضیر سے جنگ کرنے کا حکم ہوا تھا اور جنگی مصلحت کے تحت اسکی ضرورت تھی۔ یہودیوں نے جب اس پھلدار درختوں کے کاٹ ڈالنے پر واویلا مچائی تو حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں آپ کے اس حکم کی تصدیق و توثیق فرمادی ارشاد ہوا وَمَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ

ان چند مثالوں سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ امت کی رہنمائی کے لئے سرچشمہ ہدایت نبی ورسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی ہوتی تھی آپ کے احکامات پر عمل کیا جاتا تھا نہ کسی بھی معاملہ میں قرآن کریم پر توقف ہوتا تھا نہ انتظار

صحابہ کرام احکام الٰہیہ کے سب سے پہلے مکلف اور کتاب و سنت کے براہِ راست مخاطب

تھے اور آپ کی دونوں حیثیتیں ان کے نزدیک مسلم تھیں کہ آپ "نبی معصوم" بھی ہیں اور رسول مطاع بھی اس لئے وہ قرآنی احکامات کو اور حدیث نبوی کے احکامات کو جو وہ براہ راست آپ کی زبانِ مبارک سے سنتے تھے۔ دونوں کو یکساں طور پر قطعی اور واجب الاتباع جانتے اور مانتے تھے۔

احادیث اور تعلیمات نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا بڑا حصہ تو وہ ہے جو قرآن حکیم کے احکامات و تعلیمات کی تشریح و توضیح اور بیان معانی و مصادیق پر مشتمل ہے اور لتبین للناس ما نزل الیھم کے تحت آپ کا منصبی فریضہ تھا چنانچہ قرآن کریم میں اقیموا الصلوٰۃ کا حکم فرمایا تو آپ نے قولاً اور فعلاً نماز کی تفصیلات تبلائیں اور ارشاد فرمایا۔ صلوا کما رأیتمونی اُصلی اور قرآن حکیم کے حکم و آتوا الزکوٰۃ کے تحت اموال زکوٰۃ اور نصاب زکوٰۃ کی تعیین فرمائی اور ہر مال میں سے مقدار زکوٰۃ متعین کی اور اسی کے مطابق زکوٰۃ وصول کی گئی۔ علیٰ ہذا القیاس۔

اسی لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود با جود اور آپ کی حیات طیبہ عملی قرآن ہے یعنی قرآنی تعلیمات و احکامات کا عملی نمونہ اور زندہ مثال ہے اسی لئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک سوال کے جواب میں فرماتی ہیں۔

کان خلقہ القرآن "آپ کے اخلاق قرآن کریم تھا۔"

اور ظاہر ہے کہ دین اسلام ایک ایسا وسیع نظام حیات ہے جس میں عقائد و عبادات، احکام و معاملات، آداب و اخلاق اور معاشرت کے تمام شعبے جہاد و قتال، صلح و جنگ حکومت و سیاست وغیرہ انسانی معیشت و معاشرت کے تمام تر مسائل پر حاوی ہے اور ظاہر ہے کہ تعلیمات نبوت اور احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی ان سب پر حاوی ہیں ان میں بہت سے ایسے احکامات و ہدایات بھی ہیں جن کا قرآن کریم میں صراحتاً ذکر تک نہیں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی وحی الٰہی خفی کے تحت امت کو بتلائے اور نافذ کئے ہیں۔

بہر حال اس میں تو ذرہ برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ دین اسلام کا تفصیلی اور عملی نقشہ نہ انفاس قدسیہ یعنی احادیث نبویہ کے انضمام کے بغیر تیار ہو سکتا ہے اور نہ دین متین کی تکمیل و تشریع سنت نبویہ کے بغیر ممکن ہے۔ احادیث رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی وہ سد منبع (مضبوط بند) ہے جس کے ذریعہ الحاد و زندقہ اور دین میں تصرفات و تحریفات کے سیلاب کو روکا جا سکتا ہے اور خود ساختہ و دور از کار تاویلات و تلبیسات کے دروازے بند کئے جا سکتے

میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور عملی زندگی یعنی احادیث نبویہ کو قرآن سے علیحدہ کر دیا جائے تو صرف قرآن عظیم کی مجمل تعبیرات اور ذومعنی الفاظ کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں ان ملحدین ونافقین کی زبانیں بند کرنا مشکل اور من مانی تاویلات و تحریفات کے راستے بند کرنا دشوار ہے۔

علاوہ ازیں دین اسلام جس کی تکمیل کا اعلان قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی زندگی کے بالکل آخری حصہ میں یعنی حجۃ الوداع کے عظیم ترین تاریخی اجتماع کے موقعہ پر کیا ہے ارشاد ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

"آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ اور تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا"

۞ ۞ ۞ ۞ ۞ ۞ ۞

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور حیات طیبہ کو نظر انداز کر دینے کے بعد صرف قرآن کریم کی روشنی میں دین اسلام کا ایسا نقشہ جسے انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جائے کبھی تیار ہو ہی نہیں سکتا اور اگر اس زمانہ کے ظروف وماحول کو سامنے رکھ کر ادھورا سدھورا نقشہ تیار بھی کیا جائے تو وہ ہر زمانہ ہر ملک ہر قوم اور ہر ماحول کے لئے رہنما نہیں بن سکتا اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں دین اسلام کی نت نئی تعبیریں اور خود ساختہ نو بنو تشریحیں ہوتی رہیں گی اور بقول شاعر ؎

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت

قرآن کریم اور دین اسلام بازیچۂ اطفال اور انسانی اغراض وخواہشات کی آماجگاہ بنا رہے گا۔ حالانکہ قرآن کریم اعلان کر رہا ہے۔

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ

"اس قرآن میں باطل (کسی بھی راستہ سے) نہیں آسکتا نہ آگے سے اور نہ پیچھے سے"

نیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم ہے:

وَاتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ

"اے نبی! جو کتاب تمہارے پاس بھیجی گئی ہے اسے پڑھ کر سنایا کرو اس کے کلمات (و احکام) کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے"

اس لحاظ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دینِ اسلام کی وہ تکمیل جس کا اعلان آپ کی حیاتِ طیبہ کے بالکل آخری ایام میں کیا گیا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئیس ۲۳ سالہ تشریعی زندگی کے ذریعہ ہی ہوتی ہے اور اسی لئے کتب سابقہ سماویہ کی طرح قرآن عظیم ایک ہی مرتبہ کتابی شکل میں نازل نہیں کیا گیا بلکہ تدریجی طور پر تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا اور آپ اپنے انفاس طیبہ اور عملی زندگی کے ذریعہ اللہ جل جلالہ کے منشا اور حکم کے مطابق اس کے معانی و مصادیق متعین کرتے رہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی عملی تشکیل فرماتے رہے اسی حقیقت کے پیش نظر بعض کبار محدثین فرماتے ہیں۔

الکتاب احوج الی السنۃ "قرآن کے لئے سنت کی بہت زیادہ حاجت ہے"

بہرحال نہ قرآن عظیم کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات یعنی احادیث سے الگ کرنا ممکن ہے اور نہ ہی قرآن عظیم اور دین اسلام حدیث کے بغیر زائغین و ملحدین کی دست برد سے محفوظ رہ سکتا ہے بلکہ بقول ہمارے شیخ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کے، "ہمارا تو دعویٰ یہ ہے کہ حدیث کے بغیر نہ قرآن پر ایمان لانا ممکن ہے اور نہ عمل کرنا ممکن ہے" عبادات و احکام سے متعلق قرآن عظیم کی کسی بھی آیت کریمہ کو لے لیجئے چاہے واقیموا الصلوٰۃ ہو یا للہ علی الناس حج البیت ہو چاہے وان تصوموا خیر لکم ہو حدیث کے بغیر آپ نہ اس کے معنیٰ متعین کر سکتے ہیں نہ مصداق، نہ اس پر ایمان لا سکتے ہیں نہ عمل کر سکتے ہیں اس لحاظ سے بھی اسلام کی تشریع حدیث کے بغیر ممکن نہیں۔

بہرحال متن قرآن کی حفاظت کا ذمہ تو رب العالمین نے لیا تھا اور اعلان ہو چکا تھا

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ "بلاشبہ ہم ہی نے اس ذکر (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

اس لئے اس کا تو امکان نہ تھا کہ قرآنی کلمات میں کسی بھی قسم کا تغیر و تبدل، محو و اثبات اور قطع و برید کی جا سکے اسی لئے اعداء اسلام جو ہمیشہ اس تاک میں رہے ہیں کہ دینِ اسلام کے محکم حصار میں رخنے ڈال کر مداخلت اور من مانی تبدیلی پیدا کر سکیں وہ قرآن کریم سے تو مایوس تھے اس لئے انھوں نے کوشش کی کہ اپنی مقصد برآری کے لئے کوئی چور دروازہ تلاش کریں چنانچہ انھوں نے چاہا کہ حدیث جس کے ذریعہ اسلام کی تشکیل و تکمیل ہوئی تھی اس کو ناقابل

اعتبار ثابت کردیں تو آپ سے آپ اسلام کی پوری عمارت منہدم ہوجائے گی

اسی لئے اسلام کے ابتدائی دور کے تمام ملاحدہ اور زائغین نے اور عصر حاضر میں یورپ کے تمام مستشرقین اور ان کے پروردہ مسلمان مصنفین نے تمام ذخیرۂ حدیث کو بے وقعت اور ناکارہ بنانے میں اپنی تمام دماغی اور قلمی طاقتیں مختلف پہلوؤں سے حدیث کے خلاف صرف کی ہیں، اور انہی قدیم وجدید دشمنانِ اسلام کی رہنمائی میں "اسلام کی تعمیر نو" کے نام سے اس زمانہ میں بھی اسلام کے خلاف تخریبی کام کیا جارہا ہے۔ وقد قال اللہ تعالیٰ وقولہ الحق۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ "اور بلاشبہ ابلیس لعین نے اُن کے بارے میں اپنے گمان کو صحیح پایا"

عنوان نہایت دلکش اور سحور کن تھا، نئی نسل اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ جس کو نہ دینی تربیت حاصل تھی۔ نہ تعلیم دین نصیب تھی، اس دام ہمرنگ زمین کا یعنی ان ملحدانہ افکار وخیالات کا شکار ہوگیا۔

انکار حدیث کی ابتداء

فتنۂ انکار حدیث [illegible] قدیم ہے، سب سے پہلے اسلام کے ابتدائی دور میں واقعۂ تحکیم (ثالثی) کے بعد اسلام کے انتہائی سرسخت دشمن فرقہ خوارج نے اس بنیاد پر حدیث کا انکار کیا کہ، تحکیم (ثالثی) کو .... قبول کرنے کی وجہ سے تمام صحابہ کافر ہوگئے اور کسی روایت کو قبول کرنے کی پہلی شرط راوی کا مسلمان ہونا ہے" اور صرف کتاب اللہ (قرآن) کو حجت مانا اور اسی پر پورے دین کا دارومدار رکھا۔ اس کے ذرا ہی بعد ردعمل کے طور پر خوارج کے بالمقابل روافض اور شیعہ کا فرقہ ظہور میں آیا انھوں نے بھی قرآن کریم میں کمی بیشی اور مسخ وتحریف کے دعوے کے علاوہ ائمہ اہل بیت کے سوا تمام صحابہ کی روایات کا انکار کردیا اور پورے دین کو اپنے ائمہ کی روایات اور انہی کے اتباع میں محدود ومنحصر کردیا۔ اسی طرح مسلمانوں میں سب سے پہلے عقلیت پرست فرقہ یعنی معتزلہ نے بھی اپنی عقل اور عقلی معتقدات کے خلاف تمام احادیث کا انکار کرکے اس فتنۂ انکار حدیث کو مزید تقویت پہونچائی اور منکرین حدیث کے ہاتھ خوب مضبوط کئے۔

لیکن وہ دور اسلام کی شوکت وعظمت کا دور تھا حدیث کے خلاف محاذ بنانے والے

تمام فتنہ پردازوں کی کوششیں انتہائی فتنہ انگیزیوں اور خونریز ہنگاموں کے باوجود ناکام رہیں اور مسلمانوں نے جس طرح قرآن عزیز کو سینے سے لگایا اور حفظ قرآن وعلوم قرآن کی خدمت کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھا اسی طرح سنّت مطہرہ اوراحادیث نبویہ کو بھی سر آنکھوں پر رکھا اور پوری جد وجہد اور عقیدت و اخلاص کے ساتھ خدمتِ دین کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انفاس مقدسہ اور حیات طیبہ کو اس طرح محفوظ کیا کہ تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے قدیم وجدید تمام علماء رجال کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے ابتدائے ولادت سے لیکر آخری لمحات حیات تک کی پوری زندگی کے نہ صرف پیغمبرانہ تشریعی امور، بلکہ بعثت سے پہلے اور بعد کا بھی ایک ایک جزئی واقعہ اور سفر وحضر، درون خانہ وبیرون خانہ کے تفصیلی حالات کسی بھی ہستی کے اس طرح محفوظ نہیں کئے گئے جیسے محدثین کرام نے سرور کائنات خاتم الانبیاء فداہٗ ابی وامّی کے انفاس قدسیہ اور حیات طیبہ کے واقعات وحالات کی حفاظت کی ہے کہ مخالفین تک کی عقل حیران ہے۔

بقیہ صـ ۳۸ کا

الاان ثمودًا کفروا ربھم الابعدا لثمود" خوب سن لو ثمود نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا

(ایضًا) خوب سن لو رحمت سے ثمود کو دوری ہوئی!

اس مرکزی مضمون کو سورۂ اعراف اور سورۂ شعراء میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان تمام آیتوں میں بھی علاوہ توحید کی تعلیم کے باری تعالیٰ کا کوئی سیاسی حکم، حاکمیت، بالادستی اور سیاسی وتمدنی ربوبیت کو نہیں بیان کیا گیا ہے۔

ذکر و فکر

بُلبل ہے جہاں میں جو نوا کوش چمن ✻ اور گل ہیں کہ زبان پر نہیں لاتے ہیں سخن
اُس کی کرتے ہیں ثنا خوانی مگر یہ سب حال میں مست کوئی قال میں ہے کوئی مگن

ہم خطا کار ہیں اور تو ہے خطا پوش کریم ہم جفا کار ہیں اور تو ہے وفا کوش کریم!
ہم گنہگار، زیاں کار، سیہ کار مگر تیری رحمت نے کیا ہے نہ فراموش کریم،

نصاب مدارس عربیہ کی تشکیل جدید کا مسئلہ

درسِ نظامی، پس منظر، پیش منظر

از مولانا عبدالقیوم حقانی مدرس دارالعلوم حقانیہ۔ اکوڑہ خٹک

"نصاب تعلیم" کا مسئلہ آج کل علماء ہند و پاک کے درمیان موضوع بحث و نظر بنا ہوا ہے اور عصر حاضر کے تمام موقر رسائل میں اس موضوع پر مضامین آتے رہتے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں مولانا عبدالقیوم صاحب نے نہایت بالغ نظری سے اس موضوع کا احاطہ کیا ہے، پھر حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے اس پر ایک تبصرہ رقم فرمایا ہے۔ جو اس شمارے میں شریک اشاعت کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

درس نظامی ہندوستان کی علمی تاریخ اور علمی زبان کا سب سے زیادہ نمایاں لفظ ہے۔ سہالی نامی ایک گاؤں (جو لکھنؤ سے کوئی تینتیس ۳۳ میل کے فاصلہ پر ہے جس نے آگے چل کر فرنگی محل کا لقب اختیار کیا) میں ملا نظام الدین نے قیام اختیار فرمایا۔ جو رفتہ رفتہ ایک عظیم مدرسہ اور زندہ کالج کی شکل اختیار کر گیا۔ جہاں ملا نظام الدین کے فیض کا بادل شب و روز برستا رہا۔ چنانچہ آپ کے گرد استفادہ کرنے والوں کی ایک جماعتِ کثیر جمع ہو گئی۔

شب و روز میں جس وقت بھی جو کچھ بولتے تھے وہی ان کا علمی لکچر ہوتا تھا۔ ان کی حرکات سکنات وضع قطع اور طور طریقے سارے خاموش لیکچر تھے۔ تلامذہ اور افادہ کا حلقہ وسیع ہوتا چلا جا رہا تھا اور طلباء علوم و معارف کی دولت سے مالا مال ہو رہے تھے۔ دلّی اور لکھنؤ اگرچہ دارالسلطنت اور پایۂ تخت تھے مگر علمی فیض رسانی کی وجہ سے سہالی کو بجا طور دارالسلطنت سے ہمسری کرنے کا دعویٰ کرنے کا حق حاصل تھا۔ جس کے پرتوِ فیض سے نہ صرف ایشیا بلکہ آج پوری دنیا روشن اور مستنیر ہے۔

جب سہالی درسگاہ کے فیض یافتہ ملکوں ملکوں پھیلنے لگے تو دنیا ثمر کو دیکھ دیکھ کر

درخشت کو بھی پہچاننے لگی۔ اور ملا نظام الدین کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیل گیا۔ ابوالمعالی نامی ایک ایرانی فاضل ملا نظام الدین کی علمی عظمتوں کا شہرہ سُن کر ملاقات کے لئے جب سہالی آیا تو دیکھا کہ ملا صاحب اپنی درسگاہ میں چٹائی پر بیٹھے درس دے رہے ہیں۔ چونکہ ابوالمعالی نے ایرانی علماء کا جاہ جلال دیکھا تھا۔ چٹائی بیٹھے ہوئے سبق پڑھانے والے ملا نظام الدین کی طرف اس کا خیال بھی نہ جا سکا پوچھا!

مولانا نظام الدین کہاں تشریف رکھتے ہیں؟

آپ نے فرمایا۔ مولانا کا حال تو میں نہیں جانتا البتہ نظام الدین میرا ہی نام ہے۔ پھر ایرانی فاضل نے آپ سے اولاً مذہب شیعہ کی روایات اور مسائل دریافت کئے اور پھر اہل سنت کے مسائل و روایات پوچھے۔ آپ نے تسلی بخش جواب دیے تو ایرانی فاضل آپ کی تقریر اور علمی بحث سے بیحد متأثر ہوا اور غش کر اٹھا۔

ملا نظام الدین نے کثیر تصنیفات بھی لکھی ہیں۔ مثلاً شرح مسلم الثبوت۔ صبح صادق۔ شرح منار۔ حاشیہ صدرا، حاشیہ شمس بازغہ۔ حاشیہ بر حاشیہ قدیمہ۔ لیکن ملا صاحب کی شہرت ان تصنیفات سے کم اور اپنے مخصوص طریقہ درس کی بدولت زیادہ ہوئی ہے۔ آپ کے حلقۂ درس سے علامہ بحر العلوم عبدالعلی[۱] ملا کمال الدین کے دامن فیض میں حمداللہ جیسے بیگانہ روزگار نے تربیت حاصل کی ہے اور جن کی شرح سلم نظام تعلیم میں باقاعدہ طور داخل ہے)۔ جیسے عالم و فاضل اور ماہر اساتذۂ فن پیدا ہوئے۔ ملا حسن کو بھی آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ غیر منقسم ہندوستان میں دو سو سال سے علوم و معارف کے گلشنوں میں جو بہاریں نظر آتی ہیں اور رنگ برنگے پھول کھلے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ملا نظام الدین اور آپ کے باکمال تلامذہ نے اپنا پسینہ اور خون نچوڑ کر اس کی آبیاری کی ہے۔ خدا کرے کہ اہلِ گلستان اس کی آبروؤں کی لاج رکھ سکیں ؂

گلوں کی آبرو لٹتی ہے لیکن کچھ نہیں کہتے
خدا جانے کہ غیرت کیا ہوئی اہل گلستاں کی

---

[۱] علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ در حقیقت ہندوستان کی خاک سے کوئی شخص اس جامعیت کا شروع اسلام سے آج تک پیدا نہیں ہوا۔ (ع ق)

آج جہاں کہیں بھی علوم عربیہ کا نشان باقی ہے۔ یہ درحقیقت ملا نظام الدین اور آپ کے باکمال تلامذہ کا پرتو فیض ہے۔ ہندوستان کے جس شخص نے بھی تحصیل علم کا احرام باندھا۔ اس کا رخ درس نظامی کی طرف رہا تب کامیاب۔ جب درس نظامی کی تکمیل کی۔ افسوس کہ اب اس کعبہ کو بھی ویران کیا جارہا ہے۔

درس نظامی سے پہلے ہندوستان کے علماء کی ایک تصنیف بھی داخل نصاب نہ تھی۔ ملا نظام الدین نے ہندوستان اپنے معاصر علماء کی اہم تصنیفات داخل درس کردیں۔ مثلاً مسلم۔ نورالانوار مسلم، رشیدیہ۔ شمس بازغہ وغیرہ۔ یہ کارنامہ آپ کی انصاف پرستی اور بلند حوصلگی کا بڑا ثبوت ہے علماء میں یہ چیز بہت کم پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے معاصرین کی علمی برتری کا اعتراف کریں۔ مگر ملا صاحب نے اپنے وقت کے باکمال علماء کی عزت کی۔ اور ان کی کتابیں داخل درس کردیں۔ جب کہ اپنی کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ اپنی کوئی تصنیف بھی نصاب میں داخل نہ کرسکے۔ اس حاوی اور ہمہ گیر نصاب تعلیم میں سب سے زیادہ اہم اور مقدم خصوصیت جو ملا نظام الدین اور آپ کے باکمال تلامذہ کے پیش نظر رہی یہ تھی کہ "اس نصاب کے پڑھنے والوں میں قوت مطالعہ اس قدر قوی ہوجائے کہ نصاب کی تکمیل کے بعد طالب علم جس فن کی جونسی کتاب بھی چاہے بآسانی سمجھ سکے۔

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ:۔

اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ درس نظامی کی کتابیں اگر اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لی جائیں تو عربی زبان کی کوئی کتاب لاینحل نہیں رہ سکتی۔ بخلاف درس قدیم (درس نظامی سے قبل) کے اس سے یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔"

درس نظامی کے روشن اور تاریخ ساز اور آدم گر نصاب تعلیم اور دو سو سالہ تجربات کے آئینہ میں بغیر کسی ریب و تردد کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ درس نظامی کا فاضل اور فارغ التحصیل مشکل سے مشکل نظریہ اور جدید علوم کو سمجھنے کی پوری صلاحیت اور قابلیت رکھتا ہے۔ مثلاً بطلیموسی یا فیثاغورثی علم ہیئت سمجھنے والا آج بھی یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ محض مطالعہ سے جدید ہیئت وجدید فلسفہ اور سائنس کو سمجھ لے۔ کیا شرح چغمینی۔ صدرا، شمس بازغہ اور شرح اشارات سمجھنے والا یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ جدید طبیعات و ریاضیات کی کتابوں کو سمجھ سکے؟

درس نظامی کی دوسری خصوصیت علامہ شبلی نعمانی نے یہ بیان فرمائی ہے کہ:۔

درس نظامی کو قدیم نصاب پر اس لئے ترجیح حاصل ہے کہ ایک متوسط الذہن طالب علم سولہ سترہ

برس کی عمر میں تمام کتب درسیہ سے فارغ ہو سکتا ہے چنانچہ علماء فرنگی محل میں اکثر اتنی ہی عمر میں فارغ ہو جاتے ہیں۔"

علامہ شبلی نعمانی تیسری خصوصیت یہ تحریر فرماتے ہیں کہ

" اس نصاب میں جس قدر فقہ کی کتابیں رکھی گئی ہیں ان میں معقولی استدلال سے کام لیا گیا ہے اس لئے اس نصاب سے وہ تقشف ظاہر پرستی اور مذہب کا بے جا تعصب پیدا نہیں ہوتا۔ جو سطحی فقہا کا خاصا ہے"

درس نظامی جس پر آج دست ستم دراز ہے اور ایک ایک کر کے سب کتابوں کو نصاب تعلیم سے یا تو خارج کر دیا گیا ہے یا خارج کرنے کے منصوبے اور تجاویز بن رہی ہیں۔ اس مفید اور بنیادی نظام تعلیم کی کس کس کتاب کا نام لیا جائے۔ علم حدیث میں صحت و قوت اور عظیم تر مقبولیت کے لحاظ سے محدث جلیل امام الحدیث محمد بن اسمٰعیل کی جامع صحیح سے لے کر درس نظامی کی ابتدائی کتابوں علم الصیغہ فصول اکبری، نور الایضاح، تہذیب اور ایساغوجی وغیرہ تک کونسی کتاب ہے جس کے بغیر نصاب تعلیم کو مکمل کہا جا سکے۔

علامہ قاضی ناصر الدین بیضاوی کی تفسیر "انوار التنزیل فی اسرار التاویل" جو کشاف کے محتویات کو صاف اور سلیس کر کے مناسب اور ضروری حذف و ترمیم اور جرح و تعدیل کے بعد مرتب کی گئی ہے کو خارج کر کے (وفاق کے مجوزہ نصاب میں اُسے خارج کر دیا گیا ہے) یہ توقع عبث ہے کہ طلباء میں اعجاز قرآنی اور تفسیر کشاف کو سمجھنے کی صلاحیت و استعداد پیدا ہو جائے۔ فن بلاغت اور تعبیر عبارت کی سلاست و جودت میں علامہ سعد الدین تفتازانی اور فن منطق میں جلال الدین دوانی اور حمداللہ سندیلی کے مقابلہ کی وہ کونسی چیز ہے جو مجوزہ نصاب میں رکھی گئی ہو اور یہ بتایا جا سکے یہ ان کا متبادل ہے۔ درس نظامی میں سید السند کو لے لیں جن کے علم کا بحر ذخار تمام علوم و فنون پر حاوی ہے۔ شرح مواقف سے لیکر نحو میر تک ان تمام کی تمام کتابیں انفید وانفع ہیں۔ آپ اس قدر نقاد ذہن کے مالک ہیں کہ خطیب قزوینی کی شرح مفتاح دیکھ کر فرماتے۔

انہ کلحم بقر علیہ ذباب

اب کس کس کتاب کا رونا رویا جائے نحو میر اور اس کی جاندار مختصر مگر پُرشکوہ عبارت، میزان الصرف، صرف میر، علم الصیغہ، مراح الارواح اور فصول اکبری اور اس کی خاصیات اور درسی خصوصیات سے طلبہ کے اندر جو ملکہ علمی رسوخ اور پختگی حاصل ہوتی ہے کیا مولانا مشتاق احمد کے اردو رسائل علم النحو

اور علم الصرف ت سے یہ کمالات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ یا یہ اُن اُردو کے رسائل کو مذکورہ کتابوں کا متبادل قرار دیا جا سکتا ہے اور اگر ایک مدرسہ میں مذکورہ ساری کتابیں پڑھائی جا رہی ہوں ...... اور مدرسہ میں صرف اُردو کے دو رسائل تو کیا دونوں کو ایک برابر سند دینا علمی صلاحیتوں کو خون کر دینے کے مترادف نہیں ؟

مجوزہ نصاب میں اس بات کی اجازت دے دی گئی ہے کہ اگر مدارس چاہیں تو مولانا مشتاق احمد کے اُردو کے علم الصرف کو درس نظامی کے تمام صرفی نصاب کے متبادل اختیار کر سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ اُردو رسائل اس مختصر نصاب میں داخل ہونا چاہیئے۔ جن کو درس نظامی کی تحصیل نہیں بلکہ عدیم الفرصتی کی بناء پر صرف عربی علوم سے مناسبت کے لئے دو تین سال صرف کر کے طلباء پڑھنا چاہیں الانسب بھی یہی ہے۔

تحقیق و تدقیق، سوال و جواب اور تشحیذ اذہان جو درس نظامی کے مزاجی خصوصیات سے ہے۔ ان ہی خصوصیات کے بقاء تحفظ اور استحکام کے لئے علامہ عبدالحیٔ لکھنوی نے بھی ضرورت محسوس کی اور معلمین کو دورانِ درس، درسِ نظامی کا مخصوص انداز تدریس اپنانے کے لئے "التبیان" کے نام سے میزان الصرف تک کی شرح تحریر فرمائی۔

علامہ ابن حاجب کی اختصار پسندی اور جچے تلے جملے جن میں بال برابر حک اور اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن جامی کے تیور احترازات یا صدر الشریعہ کا بارعب اور باوقار طرزِ بیان جس میں کچھ شوشے نکالنے کے لئے علامہ تفتازانی جیسوں کی کوششیں بھی ناکام رہیں۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جس سے طلبہ کی ذہانت بڑھتی اور ملکہ منجھتا ہے۔ حیرت ہوئی تو اس بات پر کہ مجوزہ نصاب سے شرح جامی (مبنیات) بھی خارج کر دی گئی ہیں۔ فیا للعجب۔ اور نعم البدل کچھ بھی نہیں۔ اور وہ کونسی چیز ہو سکتی ہے جسے اس کا نعم البدل قرار دیا جا سکے۔

علامہ محب اللہ بہاری کی دونوں درسی کتابوں کو لے لیا جائے جن میں سلم العلوم تو منطق کی کلیات مسلمات، خلافیات اور بلند و بالا تحقیقات کا ایک شاہکار ہے۔ اور اصول فقہ میں مسلم الثبوت تک بھی مسلّم الثبوت ہے۔ جس میں علامہ محب اللہ بہاری نے مسائل خلافیہ، عقلیہ، نقلیہ، کلامیہ، اصولیہ کو تقلید و اتباع سے بالا بالا ہو کر "تعادلہم" اولیٰ و ثانیاً، ثالثاً و رابعاً فصل علاً کہہ کر طرزِ استدلال کا ایک عمدہ اور مختصر ڈھنگ نکالا ہے۔

وفاق کے مجوزہ نصاب میں منطق و فلسفہ اور تمام معقولات کو چھٹی دے دی گئی ہے قطبی تک

منطق جو نظر آتی ہے کیا اسے پڑھ لینے کے بعد واقعۃً بھی طالب علم منطق کے مصطلحات سے آشنا ہوجاتا ہے؟ میرے نزدیک قطبی پڑھنے والا منطق کا مبتدی طالب علم ہے۔ ابھی اس نے منطق کے ابجد پڑھنا شروع کئے تھے کہ مجوزین نے کامل سمجھ کر دروازہ ہی بند کر دیا۔ مجوزہ نصاب سے میبذی بھی خارج ہے۔ البتہ شرح عقائد کو بدستور رہنے دیا گیا ہے۔ سلم الثبوت کا ایک حصہ بھی باقی رکھا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ جس نے صرف قطبی تک منطق .... پڑھی ہو، سلم العلوم اور ملا حسن وغیرہ اور صدرا و شمس بازغہ وغیرہ سے محروم رہا ہو جیسا کہ مجوزہ نصاب نے محروم کر دیا ہے تو ایسے طالب علم کو سلم الثبوت اور شرح عقائد اور ان کے منطقی استدلالات[1] قضایا اور نتائج کیسے پڑھائے اور سمجھائے جائیں گے۔ علاوہ سمجھے گا کیا؟ چاہئے تو یہ کہ نصاب تعلیم کو اس قدر جاندار بنایا جائے کہ اسلاف کے علوم و معارف سے وابستگی مضبوط اور علمی سلسلہ مربوط ہو مگر مجوزہ نصاب میں جو راستہ اختیار کیا گیا ہے اس سے امام رازی اور امام غزالی تو کٹ کر رہ گئے۔ امام الہند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا نہ ہو سکے گی۔

درسِ نظامی کا ایک خاص مزاج یہ ہے کہ خالص علوم یعنی قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم میں ذہانت، جودت، ذکاوت اور تحقیق و گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کے لئے طلباء کی دماغی صلاحیتوں کو خوب ابھارا جاتا ہے۔ اور دماغی ورزشوں والے علوم کے اکھاڑوں میں ان سے کشتیاں اور مشق کرتب کرائے جاتے ہیں۔ اور ان کے ذہنوں سے تحقیق و تنقید، تجسس و تدقیق اور بحث و تمحیص اور دماغی بیداریوں کا کام لیا جاتا ہے جس سے غور و فکر کا اعلیٰ ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے درسِ نظامی کی روح قرار دیا جاسکتا ہے۔ بقول حضرت الاستاذ شیخنا المکرم شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ کے "مجوزہ نصاب" درس نظامی کی اس روح سے یکسر خالی ہے۔ یہ بھی غلط اور بے بنیاد سوال ہے کہ درس نظامی کے طالب علم کو عربی ادب پر عبور حاصل نہیں ہو سکتا۔ علامہ قاسم نانوتوی، شیخ الہند اور علامہ انور شاہ کشمیری کی عربی دانی کون سے نصاب تعلیم کی مرہون منت ہے۔ لامع الدراری کے مصنف، کوکب الدری کے مرتب و محشی فتح الملہم کے مصنف، اوجز المسالک کے مصنف بذل المجہود کے مصنف، محشی، اعلاء السنن کے مصنف معارف السنن کے مصنف اور

---

[1] سلم الثبوت کو علامہ بہاری نے منطقی انداز میں تحریر فرمایا ہے مقالہ اولیٰ میں لکھتے ہیں۔ منہا المنطقیہ لانہم جعلوہ جزءا من الکلام وقد فرغنا منہا فی السلم،

دیگر سیکڑوں عربی کتب و شروح کے مصنفین درس نظامی ہی کے فاضل اور فارغ التحصیل ہیں۔ بلکہ نزہتہ النظر کا مصنف بھی وہی ہے جس نے تاریخ اور عربی ادب کا ذوق وملکہ درس نظامی سے حاصل کیا ہے۔

آخر جس نصاب میں مفید الطالبین، روضتہ الادب، نفحۃ العرب، نفحۃ الیمن۔ مقامات۔ متنبی اور حماسہ کے علاوہ قصیدہ بردہ، قصیدہ بانت سعاد جیسی اہم ادبی ومعیاری کتابوں کو تحقیق وتدقیق سے پڑھایا جائے۔ ہر لفظ کی تحقیق، ہر صیغہ کی تحقیق، ہر جملہ کی ترکیب، بلکہ پڑھاتے وقت الفاظ کے بالوں کی کھال تک اتار دی جائے تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے پڑھنے والے عربی ادب سے محروم رہیں گے۔

البتہ ایک اعتراف ہمیں بھی ہے، اور ہم سے پہلوں کو بھی، کہ ہمارے ہاں عربی، بطور عربی لینگویج کے نہیں پڑھائی جاتی۔ یہ ایک خامی ہے۔ جس پر غور کیا جاسکتا ہے۔ اور جس کے لئے ایک صحیح اقدام کی ضرورت ہے۔

خلاصہ یہ کہ درس نظامی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ طلباء کی استعداد اور صلاحیتوں کو مانجھ مانجھ کر ان کی کایا پلٹ کر رکھ دیتا ہے۔ مستقبل کی تعمیر میں ماضی کے تجربات کو یکسر فراموش کر دینا کوئی دانشمندانہ اقدام نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ماضی میں درس نظامی کی اصلاح کے عنوان وتحریک سے جو مختلف مدارس قائم ہوئے تو کیا وہ کوئی انقلاب برپا کر سکے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ مدرسۃ الٰہیہ کانپور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، جامعہ اسلامیہ دہلی، جامعہ عباسیہ بہاولپور ان سب چوٹی کی درسگاہوں کو جو درس نظامی کی اصلاح کا تجربہ گاہ بنایا گیا۔ کیا اس کے مفید اور انقلاب انگیز نتائج کی نشاندہی کی جاسکتی ہے؟ کیا بتایا جاسکتا ہے کہ وہ زندگی میں کوئی مفید اور کامیاب انقلاب برپا کر سکے ہوں خود سید سلیمان ندوی کی زندگی میں جو انقلاب آیا یا آج سید ابوالحسن علی ندوی کو جو عظمتیں حاصل ہیں اس کا اصل سبب بھی یہی ہے کہ ان حضرات نے درس نظامی کے فضلاء میں سے اپنے ربط وتعلق کو اتنا مربوط اور مضبوط کیا کہ دوسرا پہلے کی علامت بن کر رہ گیا۔

ضرورت نصاب کے بدلنے کی نہیں بلکہ جزوی اصلاح کی ہے۔ یکسر نصاب کو پلٹ کر رکھ دینا اسلاف کی کاوشوں پر پانی پھیر دینے کے مترادف ہے۔ بڑا دکھ پہنچا کہ مجوزہ نصاب میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ مولانا محمود الحسن۔ مولانا اشرف علی تھانوی۔ علامہ انور شاہ کشمیری اور مولانا حسین احمد مدنی کے دورۂ حدیث کو بھی توڑ دیا گیا ہے۔ ع

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

اگر اس طرح راستہ کھول دیا گیا تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آئندہ اخلاف، اس کا حلیہ۔۔۔۔
۔۔۔ اور کیا بگاڑیں گے۔

۔۔۔۔۔ حضرت علامہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب جن کی ساری زندگی درس نظامی سے وابستہ رہی یہی پڑھتے اور پڑھاتے رہے، ہر فن اور ہر کتاب کے بارے میں ان کی رائے کو بلا ریب قول فیصل قرار دیا جا سکتا ہے افسوس کہ سید ابوالحسن علی ندوی جیسے یگانۂ روزگار بھی نصاب تعلیم سے متعلق حضرت شیخ الحدیث کے نظریہ کو اپنی تالیف "سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا" میں جگہ نہ دے سکے۔

حضرت شیخ الحدیث آپ بیتی ص۲۱۱ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اسی طرح یہ ناکارہ تبدیل نصاب کا بھی سخت مخالف ہو گیا۔۔۔ اپنی ابتدائے مدرسی میں تو تبدیل نصاب کا خبط مجھ پر بھی سوار تھا۔ شطرنج کے کھلاڑیوں کی طرح میرا دماغ دن رات ان ہی میں گھومتا رہتا تھا۔ لیکن جوں جوں تدریس کا زمانہ یا تجربہ بڑھتا رہا تبدیل نصاب کا خبط میرے دماغ سے نکلتا رہا۔ ایک دو کتاب کا تغیر علوم آلیہ میں ہو جائے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن فقہ، اصول حدیث وتفسیر اور علوم آلیہ کی اہم کتب کافیہ، شرح جامی جیسی کتب میں تغیر کا بالکل قائل نہیں۔ بڑی وجہ یہ ہے کہ انگریزی نصاب کے آئے دن کے تغیرات دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ اگر مدارس عربیہ میں بھی یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور ہر دس بارہ برس کے بعد نئی نسل اپنی جولانیاں دکھانی شروع کریگی تو یہ نصاب رفتہ رفتہ وہ شیر بن جائے گا جس کی تصویر اپنی کمر پر گھودانی چاہی تھی لیکن دُم، ہاتھ پاؤں، ناک، کان اور ہر ایک کے بنانے میں جو تکلیف ہوئی تو وہ یہ کہہ کر انکار کرتا رہا کہ بقیہ دم کے بغیر بھی شیر ہوتا ہے۔ اور بغیر ہاتھ کے بھی تو شیر ہوتا ہے (۲) ہر محقق اور یا اثر یہ چاہے گا کہ اس کی تصنیف ضرور داخل نصاب ہو جس کی نظیریں اپنی ابتدائے مدرسی سے لیکر اب تک رہا خوب دیکھیں لیکن درس نظامی کو اللہ نے وہ مقبولیت عطا فرمائی ہے کہ اس میں عمومی کھپت کی گنجائش نہیں رہی۔ (۳) مروج نصاب کے شروح وحواشی ضرورت سے زیادہ لکھے گئے ہیں۔ متبدل نصاب کی اتنی خدمت کرنے والے میرے خیال میں اب پیدا نہیں ہوں گے۔

لیجئے حضرت العلامہ مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی رائے گرامی بھی سنتے جائیے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

ڈھاکہ میں علمائے کرام کا اجلاس تھا۔ عصری علوم کا نصاب مروجہ کے ساتھ جوڑ کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ میرے دل میں بھی اس وقت یہ خیال آیا کہ علوم عصریہ کو داخل نصاب کرنے میں کیا حرج ہے۔ رات کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ ایک مسجد میں کھڑا ہوں اور سامنے چٹائی بچھی ہے۔ اور

س میں یہ عبارت بنی ہوئی ہے ۔
النجاۃ فی علوم المصطفیٰ" اور فرمایا کہ اس خواب میں پھر میں دونوں کانوں میں انگلیاں ڈال کر پوری قوت کے ساتھ ان کلمات کے ساتھ اذان دیتا ہوں ۔
" النجاۃ فی علوم المصطفیٰ اسید السادات" آخری دو کلمے سید السادات میں نے خود بڑھائے ہیں فرمایا کہ صبح جاگنے کے بعد دل میں سے خیال نکل گیا اور یقین ہو گیا کہ اس دور میں بھی صرف علم نبوت سے کامیابی ممکن ہے ۔ عصری علوم کا جوڑ بالکل بے معنیٰ ہے ۔

مجوزہ نصاب میں مضامین کی کثرت ، وقت کی قلت اور کتابوں کی بھرمار ہے ۔ ایک ہی روز میں مسلسل گیارہ بارہ کتابیں پڑھانا ۔ جب کہ ہر کتاب تحقیق طلب اور بحث طلب ہو گیا رہویں (جو درحقیقت درس نظامی کا تیسرا درجہ ہے) سے لے کر سولہویں (دورۂ حدیث) تک وہ کون سی کلاس ہے جس کا کوئی ایک پیریڈ ، مطالعہ تکرار یا تفریح کے لئے فارغ ہو ۔

کتابوں کا حجم ، بحث و تحقیق ، اوقات اور ان کی تقسیم ، نئے مضامین انٹر اور بی ، اے کی کتب (جیسا کہ مجوزہ نصاب میں ان کا مطالعہ و استفادہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے ۔) سب کچھ کو مدنظر رکھ کر کافی غور و خوض کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ :۔

۱۔ مجوزہ نصاب کی رو سے طالب علم کو تمام دن خوشی آسودگی اور تفریح کا کوئی وقت نہیں ملے گا ۔
۲۔ اسباق کے تسلسل سے ذہن و دماغ پر شدید بوجھ پڑے گا اور دماغی سکون حاصل نہ ہو سکے گا ۔
۳۔ تکرار اور مطالعہ کے لئے بھی وقت نکالنا مشکل ہو جائے گا اور اگر کچھ وقت مل بھی جائے تو سارے دن کا تھکا ہارا طالب علم مطالعہ کی ہمت کیسے کرے گا ۔ اور اگر مطالعہ کرے بھی تو کس کس چیز کا ۔
۴۔ مدرسین بھی تکمیل نصاب اور وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھاتے وقت اختصار اور تیز رفتاری سے کام لیں گے ۔ جس سے درس نظامی کی اصل روح (بحث و تحقیق اور سوال و جواب) مجروح رہے گی ۔

وفاق المدارس کے ارباب حل و عقد کو بھی مجوزہ نصاب کے بارے میں " رد عمل " کے پیش نظر ۲۸ نومبر ۱۹۸۵ء کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں نصاب کمیٹی میں مزید چودہ ارکان کا اضافہ کرنا پڑا ۔ اب گویا اکیس ۲۱ ارکان پر مشتمل کمیٹی نصاب تعلیم کی تشکیل جدید کرے گی ۔ جس کا پہلا اجلاس مارچ کے وسط میں ملتان میں ہو گا ۔

ہم بھی اس سلسلہ میں نصاب کمیٹی کے فاضل ارکان کو چار بنیادی اور اصولی نکات فراہم کرتے ہیں :

اگر انھیں ملحوظ رکھا گیا تو یقین ہے کہ بعد کا ردعمل حوصلہ افزا رہے گا۔

۱۔ درس نظامی کو جوں کا توں باقی رکھا جائے۔ البتہ نظم وضبط اور درجہ بندی کی ضرورت کے پیش نظر اس کی تشکیل جدید کی جائے۔

۲۔ منطق کی ادنیٰ کتابوں سے لے کر اعلیٰ تک سب کو حسب معمول پڑھایا جائے۔ البتہ ملا حسن سے اوپر کی کتابوں کو اگر شدید ضرورت ہو تو درجہ تخصص میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔

۳۔ عربی ادب (تحریر وتقریر) پر خاص توجہ دی جائے اور اگر ضرورت ہو تو اس سلسلہ میں مفید کتابوں کا اضافہ کیا جائے

۴۔ نصاب تعلیم کا واحد مقصد "الدین" ہو ماضی میں یہی مقصد رہا اور آئندہ بھی باقی رہے "الدنیا" کا کسی قسم کا پیوند لگانے کی اجازت نہ دی جائے۔

مجوزہ نصاب کی تشکیل کا اصل سبب یہی بتایا جا رہا ہے۔ اور اس کا اعتراف بھی سب کو ہے کہ حالات کے تقاضے زمانہ کی رفتار، یونیورسٹی اور کالج کے معیار کے ساتھ چلا جا سکے۔ اور ایک ایسا نصاب بنایا جائے۔ وہ بھی سمجھ سکیں کہ واقعتہً اس میں سولہ برس صرف ہوتے ہیں۔ اور واقعتہً یہ نصاب ایم۔ اے کے برابر ہے۔ اور غالباً یہی چیز۔ غالب تھی کہ انٹر اور بی اے کی کتب کے علاوہ دسیوں مضامین کے غیر مربوط کتابوں کے پشتارہ سے بے چارے طلباء اور اساتذہ کی پیٹھ لاد دی گئی ہے۔

مگر یاد رہے کہ ملت اسلامی کی علمی تاریخ میں یہ حقیقت مسلّم ہے کہ علمی و روحانی کمالات کو دنیوی جاہ منصب کی خواہش سے کم تعلق رہا ہے۔ سلسلۂ انتظام اصول ترقی، انضباط قواعد اور کثرت مصارف کے لحاظ سے جس قدر بھی بلند معیار تک پہنچ جائیں اور ان کے فضلاء کو کثرت سے اہم ملکی عہدے ملتے رہیں مگر یاد رہے کہ جس قدر بھی تحصیل جاہ ومنصب کا پلہ بھاری ہوتا جائے گا علمی کمالات کا وزن کم ہوتا جائیگا یہی وجہ ہے کہ ترکوں کے مدارس سے چھ سو برس کی مدت میں ایسے لوگ بہت کم اٹھے جو حکیم یا محقق کا لقب حاصل کر سکے ہوں

۴۵۹ھ کو نظام الملک طوسی کے ہاتھوں نظامیہ بغداد، جو ایک بہت بڑی اسلامی یونیورسٹی تھی، کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۰ ذی قعدہ ۴۵۹ھ کو اسے بڑی شان وشوکت سے کھولا گیا۔ علماء اور عام طلباء کے لئے بھی شاہی دربار سے وظائف اور تنخواہیں مقرر ہوئیں مگر جب ماوراء النہر کے علماء کو نظامیہ کے قائم ہونے کے حالات سے اطلاع ہوئی تو سب نے ایک مجلس ماتم منعقد کی اور اس بات پر رو دئے کہ

"اب علم علم کے لئے نہیں بلکہ جاہ وثروت حاصل کرنے کے لئے سیکھا جائے گا۔

نصاب مدارس عربیہ کی تدوین جدید

حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب مدظلہم رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے مولانا عبدالقیوم صاحب کے مضمون کو اہمیت دیتے ہوئے نصاب تعلیم کے موضوع پر جن افکار وخیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ اس موضوع پر سوچنے لکھنے اور عمل کرنے والوں کیلئے بے حد مفید اور ضروری ہیں، ادارہ حضرت موصوف کے شکریہ کے ساتھ ان کو شریک اشاعت کر رہا ہے (ادارہ)

آج کل، ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ، مدارس عربیہ دینیہ کے نصاب تعلیم کا مسئلہ زور شور سے زیر بحث ہے۔ کچھ وہ علماء کرام ہیں جو قدیم نصاب تعلیم، درس نظامی کو بدستور جاری رکھنے کے حامی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو اس میں ترمیم تغیر کے حق میں ہیں۔ پاکستان میں تو "وفاق المدارس العربیہ" کی تنظیم اس موضوع پر کئی اجتماعات منعقد کر چکی ہے۔ ہندوستان میں ابھی حال میں پہلے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ایک سمینار منعقد ہو چکا ہے۔ اس کے کچھ ہی روز بعد جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام دہلی میں ایک کانفرنس منعقد ہو چکی ہے۔ دونوں اجتماعات میں (جن میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا) فی الحال کسی فیصلہ پر نہیں پہنچا جا سکا۔ بلکہ فیصلہ اور غور و فکر کے لئے کمیٹیاں بنادی گئیں ہیں۔ خدا کرے کوئی نتیجہ نکلے اور ہمارے اہل علم و فکر اس مسئلہ کو حل کر سکیں۔

اس سلسلہ میں مختلف اہل علم واصحاب قلم کے مضامین بھی دونوں ملکوں میں شائع ہو رہے ہیں۔ جمادی الثانیہ ۱۴۰۳ھ کے "الحق" (اکوڑہ پاکستان) میں حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب مدرس دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ کا مضمون "نصاب مدارس عربیہ کی تشکیل جدید کا مسئلہ" کے زیر عنوان نظر سے گذرا۔ مضمون قدیم نصاب تعلیم درس نظامی کی حمایت میں ہے اور موئیدین درس نظامی کی طرف سے ایک مدلل وجامع بیان ہے۔ اس مضمون کے پڑھنے کے دوران، بعض نکات میرے ذہن میں بھی آئے۔ میں انھیں درج ذیل کر رہا ہوں تاکہ ان پر بھی غور فرمالیا جائے

(۱) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرح، (جس کا ذکر صاحب مضمون نے اپنے مضمون میں کیا ہے) یہ خاکسار بھی اب سے تقریباً چالیس سال پہلے درس نظامی کی تبدیلی کے حق میں تھا اور اس تبدیلی کو عمل میں لانے کے لئے، بعض عملی اقدامات بھی کئے تھے۔ مگر حضرت شیخ رح کی طرح عمر اور تجربہ کے اضافہ کے ساتھ ساتھ اس جنون میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔ اب میری رائے یہ ہے کہ اصل مسئلہ

قابل توجہ نصاب تعلیم کا نہیں بلکہ طرز تعلیم کا ہے۔ اگر اساتذہ کرام لائق اور محنتی ہوں اور طلبہ کو بنانے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو ہر نصاب اپنے اپنے دائرہ میں مفید اور کارگر ہو سکتا ہے۔ درس نظامی اگر کامل توجہ سے پڑھایا جائے اور پڑھنے والے بھی کتابوں کا اچھی طرح مطالعہ کرکے اُسے پڑھیں تو بقول مولانا عبدالقیوم صاحب طالب علم جس فن کی جو کتاب چاہے آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور کوئی کتاب لاینحل نہیں رہ سکتی۔

مگر مشکل یہ ہے کہ بڑے مدارس (دارالعلوم دیوبند وغیرہ) میں ہر درجہ میں اتنے طلبہ ہوتے ہیں کہ اساتذہ اور طلبہ کے درمیان کوئی ربط و تعلق نہیں ہوتا اور اساتذہ کا درس جلسۂ عام کی تقریر ہو کر رہ جاتی ہے اساتذہ طلبہ کی مشکلات سے واقف نہیں ہوتے اور یہ جان بھی نہیں پاتے کہ کچھ ان کے پلّہ پڑا کہ نہیں۔ اس لئے ضروری ہے، خصوصًا نیچے کے درجات میں کہ طلبہ کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ نہ ہو اور استاد طلبہ کا محاسبہ کرتے رہا کریں کہ وہ مطالعہ کرکے آتے ہیں یا نہیں اور سبق سمجھ کر اٹھتے ہیں یا نہیں۔ میری رائے ہے کہ بڑے مدارس کے ممتاز فارغ التحصیل جنھوں نے علمی دنیا میں نام پایا، زیادہ تر ان میں وہ ہیں جنھوں نے ابتدائی اور وسطانی تعلیم چھوٹے مدرسوں میں شفیق اساتذہ کی آغوش میں پائی۔ اور بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لئے دیوبند یا سہارنپور گئے۔

(۲) مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ "درس نظامی" کے نام سے ہمارے ہاں جو نصاب مروج ہے وہ منجمد ہے گذشتہ تین سو سال کے عرصہ میں، اس میں بے شمار تبدیلیاں ہوئی ہیں صحاح ستّہ تو درس نظامی کا جزو ہی نہ تھی یہ تو خانوادۂ ولی اللّٰہی کی دین ہے۔ فلسفہ و منطق، صرف و نحو اور ادب کی بھی بہت سی کتابیں، ملّا نظام الدین رح کے عہد کے بعد کی تصنیف ہیں جو وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتی رہیں۔ مثلاً مرقات، ملّا حسن، شرح ہدایۃ الحکمۃ (خیرآبادی) حمداللہ قاضی مبارک ملّا مبین، علم الصیغہ، دستور المبتدی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، نفحۃ العرب وغیرہا۔ اب موجودہ حالات میں اس میں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں موجودہ درس نظامی جسے میں نصاب ولی اللّٰہی کہنا زیادہ صحیح سمجھتا ہوں کے نصاب کے تغیرات کا اگر تاریخی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے دارالعلوم کے قیام کے بعد ۱۲۸۵ھ میں، پھر ۱۲۸۹ھ میں، پھر ۱۲۹۰ھ میں پھر ۱۳۰۱ھ میں نصاب میں تغیرات ہوتے رہے ہیں۔ اس کے بعد بھی اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ مجلس شوریٰ اور مجلس تعلیمی اس پر وقتاً فوقتاً غور کرتی رہتی ہے۔

جہاں تک علوم عصریہ کا تعلق ہے اس میں بھی معتدل اور متوازن راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے مدارس میں ان پر زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا۔ نہ طلبہ ہی یہ دوہرا بوجھ اٹھا سکتے ہیں نہ ہمارے غریب مدارس ہی ان کی تعلیم کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اشاعتِ اسلام اور تبلیغ دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے تاریخ، جغرافیہ اور معلوماتِ عامہ وغیرہ سے تھوڑی بہت واقفیت بہت ضروری ہے۔ بعض اوقات تو ہمارے علماء ان علوم سے کورے ہونے کی وجہ سے مذاق بن جاتے ہیں۔ اور ان کو پڑھے لکھے لوگوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ تاریخ اسلام کو تو علوم جدیدہ میں شمار کرنا ہی غلط ہے۔ آخر جس علم کو مسلمانوں نے، قصہ خرافات سے ممتاز کرکے بارہ سو سال پہلے، مستقل علم کا درجہ دیا۔ اس کے اصول وضع کئے اور اسے علمی و عقلی بنیادوں پر مدوّن کیا۔ اُسے علوم جدیدہ میں شمار کیا جا سکتا ہے؟ اور اس سے بے بہرہ رہ کر کیا کوئی اہل علم کی صف میں شمار ہو سکتا ہے؟ اپنے اکابر کے شاندار کارناموں سے ناواقف رہ کر کوئی قوم ترقی کی منزلیں طے نہیں کر سکتی۔ پھر سیرۃ نبویہ اور سیرۃ خلفاء راشدین سے واقف ہوئے بغیر تو اسلام کی عملی تصویر ہی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔

شاید کم لوگوں کو معلوم ہو (خصوصًا پاکستان میں) کہ غالبًا ۱۳۹۰ھ سے دارالعلوم دیوبند میں علوم جدیدہ کا اضافہ کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ اب سال پنجم و ششم میں، (مختصر المعانی وجلالین کے ساتھ) تاریخ اسلام مکمل، تاریخ ہند (از عہد سلطان محمود غزنوی تا ۱۹۴۷ء) جغرافیہ عالم، جغرافیہ جزیرۃ العرب وبلاد اسلامیہ، جنرل سائنس، فلاسفہ جدیدہ کے نظریات، حفظانِ صحت، دستور ہند) بحیثیت مضامین درسی داخل نصاب تعلیم ہیں۔ اور ان کی مختصر اور سہل کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں۔ انگریزی بھی اختیاری طور پر، داخل نصاب کی گئی تھی اور اس کے لئے ایک ڈگری کالج کے ریٹائرڈ پرنسپل صاحب کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ مگر یہ تجربہ مفید اور کامیاب ثابت نہ ہوا

(۳) صرف ونحو کی کتابوں کی تبدیلی کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا صاحب مضمون (مولانا عبدالقیوم صاحب فرماتے ہیں:۔

"نحو میر اور اس کی جاندار مختصر مگر پرشکوہ عبارت، میزان الصرف، صرف میر، علم الصیغہ سراج الارواح اور فصول اکبری اور اس کی خاصیات اور درسی خصوصیات سے طلبہ کے اندر جو ملکہ علمی رسوخ اور پختگی حاصل ہوتی ہے، کیا مولانا مشتاق احمد کے اردو رسائل علم النحو اور علم الصرف سے یہ کمالات حاصل ہو سکتے ہیں!۔

یہ صحیح ہے مگر مولانا مشتاق احمد کے رسائل کے علاوہ اور بھی کئی اچھی کتابیں ہندوستان اور مصر میں تیار ہو چکی ہیں - ان میں سلجھے انداز میں قواعد عربی کو سمجھانے اور ان کے عملی اجراء پر زور دیا گیا ہے - مثلاً حافظ عبدالرحمٰن امرتسری کی کتابیں کتاب الصرف و کتاب النحو وغیرہ اچھی کتابیں ہیں ان میں کافیہ اور پنج گنج تک کے مسائل اچھی ترتیب اور سلجھے ہوئے انداز میں جمع کر دئے گئے ہیں - پھر یہ کتابیں اردو زبان میں ہیں اس لئے طلبہ پر دوہرا بوجھ نہیں پڑتا ابتدائی تعلیم کی مادری زبان میں ضرورت و اہمیت ماہرین تعلیم کے نزدیک مسلم ہے

خاکسار نے بھی ایک چالیس سال پہلے "کلام عربی" کے نام سے صرف و نحو عربی کے اہم مسائل پر، دو حصوں میں ایک کتاب لکھی تھی - جو ابتدائی صرف و نحو کی تعلیم کے لئے مدارس میں پسند کی گئی - ان پر شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح نے ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا تھا -

" ماشاء اللہ کتاب اپنے مقصد میں کامیاب ہے - ترتیب بہت سہل الحصول ہے - جو لوگ عربی زبان کی دشواری کا عذر کر کے ادھر متوجہ نہیں ہوتے تھے، ان کے لئے آپ نے کوئی عذر کا موقعہ نہیں چھوڑا "

دیگر اکابر ملت حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الادب مولانا اعزاز علی وغیرہ نے بھی بلند پایہ الفاظ میں تحسین فرما کر ذرہ نوازی فرمائی تھی اور حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی رح نے تو النظام العربی فی التقریظ علی الکلام العربی" کے عنوان سے ایک رسالہ ہی اس کی تعریف و تعارف میں ارقام فرما دیا تھا -

عربی زبان میں مصر کی جدید مطبوعات النحو الواضح از علی الجازم و مصطفیٰ امین کے چھ حصے بھی بہت مفید اور سلجھے ہوئے انداز میں لکھے گئے ہیں - ان کی خاص خوبی یہ ہے کہ قواعد عربی کا عملی اجراء بھی ساتھ ساتھ ہوتا جاتا ہے اور عربی زبان کے قواعد اس طرح پڑھائے جاتے ہیں جس طرح ایک زندہ زبان کے پڑھائے جانے چاہئیں -

(۴) موجودہ نصاب درس نظامی کے ناقدین کا بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں سب سے زیادہ زور منطق و فلسفہ پر دیا گیا ہے - جس کے متعلق حضرت مجدد الف ثانی رح کی رائے ہے -

" اکثر آں مسائل لا طائل است و بے حاصل "

ان علوم کی تقریباً بمثل کتابیں (صغریٰ سے قاضی مبارک تک) داخل درس تھیں - حالانکہ تفسیر کی صرف دو کتابیں (جلالین اور بیضاوی) اور بیضاوی بھی صرف سورہ بقرہ -

مولانا عبدالقیوم صاحب کا ارشاد ہے کہ "وفاق کے مجوزہ نصاب میں قطبی تک منطق نظر آتی ہے۔ کیا اسے پڑھ لینے کے بعد واقعۃً بھی طالب علم منطق کے مصطلحات سے آشنا ہو جاتا ہے؟"

وفاق کا مجوزہ نصاب تو سامنے نہیں۔ البتہ درس نظامی میں قطبی تک منطق کی چھ کتابیں داخل درس ہیں۔ اگر کسی فن کی چھ کتابیں پڑھ لینے کے بعد بھی، طالب علم اس فن کی مصطلحات سے واقف نہ ہو سکے تو اسے اس طالب علم کی دماغی صلاحیت کا قصور ہی کہا جائے گا۔

حضرت مولانا کو غالباً علم ہی نہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے موجودہ نصاب میں منطق کی لازمی کتابوں میں قطبی کے بعد صرف دو کتابیں سلم العلوم اور ملا حسن ہی داخل درس ہیں۔ اور یہاں اُسے اس فن کی ضروری واقفیت کے لئے کافی سمجھا گیا ہے۔ البتہ فضیلت کے بعد تکمیل معقولات کے درجہ میں، منطق و فلسفہ کی کتابیں حمداللہ، قاضی مبارک، صدرا اور شمس بازغہ داخل ہیں۔ مگر یہ درجہ عملاً معطل ہو کر رہ گیا ہے۔

منطق کے حامیوں کو یہ حقیقت ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ ہمارے اکابر کبھی اس کی بھرمار کے حق میں نہ رہے۔ مولانا عاشق الٰہیؒ "تذکرۃ الرشید" میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اسی طرح منطق و فلسفہ کے ساتھ آپ کا تنفر عداوت کے درجہ پر پہنچا ہوا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ" میرا جو مرید اور شاگرد فلسفہ کا شغل رکھے گا وہ میرا مرید اور شاگرد نہیں" آپ فرمایا کرتے تھے کہ" اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر کہ اس سے دنیا کے نفع کی امید تو ہے۔"

(۵) ادب" کی کتابوں کے سلسلہ میں بھی افراط و تفریط سے بچکر ایک معتدل اور متوسط طریق کار اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا کی یہ رائے صحیح ہے کہ" اگر نفحۃ الیمن، مقامات، متنبی اور حماسہ وغیرہ کتابوں کو تحقیق و تدقیق سے پڑھا جائے تو اس کے پڑھنے والے عربی ادب سے محروم نہیں رہ سکتے" بے شک قرآن و حدیث کے معانی و مفاہیم سے واقف ہونے کے لئے عربی قدیم میں مہارت ضروری ہے۔ جو زمانہ نزول قرآن میں رائج تھی۔ جدید عربی پر قدرت اس کے لئے بالکل ضروری نہیں۔ بلکہ واقعہ ہے کہ جدید عربی کے اسالیب بیان اور اس کی تعبیرات قدیم عربی سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان سے شغف اور ممارست کے بعد قرآن و حدیث کی زبان سے بعد پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ عالم عرب سے

ربط و تعلق پیدا کرنے کیلئے جدید زبان کی ضرورت ناقابل انکار ہے ۔ اس لئے دونوں کو اپنی اپنی جگہ سیکھنا ضروری ہے ۔ لیکن ہمارے قدیم مدارس کا چونکہ مقصد اساسی تعلیم کتاب و سنت ہے اس لئے اولیت بہر حال عربی قدیم کو حاصل رہے گی ۔

تبدیلی نصاب کے علم بردار، ادب کی کتابوں میں "مقامات حریری" پر بہت اعتراض کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی اپنی کچھ خصوصیات بھی ہیں ۔ اس کے داخل نصاب کرنے کا ایک خاص مقصد لغات عرب پر عبور ہے میرے ایک استاذ (جو عربی کے اچھے ادیب تھے) حضرت مولانا اختر شاہ امروہی ؒ، فرمایا کرتے تھے کہ مقامات میں "صراح" (لغت عربی کی متداول کتاب) کے تمام لغات آگئے ہیں ۔ اس کو یاد کرنے کے بعد طالب علم عربی ادب کے پورے ذخیرہ پر حاوی ہو جاتا ہے ۔ اسی لئے ہمارے طالب علمی کے زمانہ میں اسے حفظ کرایا جاتا تھا ۔

دارالعلوم دیوبند میں ۔ حضرت مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا درس مقامات بہت مشہور تھا، وہ ایک ایک لفظ کو پوری تحقیق و تدقیق کے ساتھ اس طرح حل کرتے تھے کہ اختلاف ابواب اور تغیر صلات سے معانی میں جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ اچھی طرح طلبہ کے ذہن نشین ہو جائے

البتہ یہ صحیح ہے کہ ہمارے قدیم نصاب میں نظم کا حصّہ زیادہ ہے ۔ کسی زبان کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لئے ادب منثور سے زیادہ مدد ملتی ہے ۔ ادب منظوم سے نہیں ۔

میری رائے میں ، عالم اسلامی کے نامور ادیب عالم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدت مکارمہم کی کتاب مختارات ادب عربی کی ایک اچھی کتاب ہے ۔ اس کا اضافہ ضروری ہے ۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی یہ کتاب عرصہ تک داخل نصاب رہ چکی ہے ۔ میری رائے میں اسے پھر داخل ہونا چاہیئے ۔ اس میں عہد قدیم سے زمانہ حاضر تک کے ادباء و بلغاء کے طرز تحریر کے عمدہ نمونے تاریخی ترتیب سے جمع کر دئے گئے ہیں ۔

عربی جدید کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ آج کل اسفار کی سہولتوں اور معاشی و سیاسی ضرورتوں کی وجہ سے بلاد عربیہ سے تعلقات وسیع تر ہو گئے ہیں ، اسلئے جدید عربی کے بولنے اور لکھنے پر قدرت بھی اہم ہے ۔

دارالعلوم دیوبند میں بھی عربی جدید کا مستقل شعبہ عرصے سے قائم ہے ۔ اس کے سربراہ مولانا وحیدالزماں کیرانوی نے ، (جو ایک شامی عالم ، عبداللہ المامون کے شاگرد رشید ہیں) چند ہی سال میں دارالعلوم کے اس خلاء کو پُر کر دیا ہے ۔ اور کئی ستھرے تلامذہ پیدا کر دئے ہیں جو بلا تکلف

عربی تحریر و تقریر پر قادر ہیں۔ ان میں سے کئی مختلف جرائد و مجلات کے ادارتی فرائض انجام دیکر دیار عرب سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

آخر میں ایک بات ادب کے ساتھ اور عرض کردوں، قدیم نصاب کے غالی حامی اکثر فرمایا کرتے ہیں اور ہمارے مولٰنا عبدالقیوم نے بھی لکھا ہے کہ ہمارے اکابر حضرت علامہ کشمیریؒ حضرت مولٰنا مدنیؒ، حضرت مولانا عثمانیؒ وغیرہم نے یہی درس نظامی پڑھکر علمی کمال اور شہرت و عزت کا مقام حاصل کیا، بلکہ صاحب نزہتہ النظر نے بھی عربی ادب کا ذوق اسی درس نظامی سے حاصل کیا ہے"۔ اور اس سے اس امر پہ استدلال کرتے ہیں کہ موجودہ نصاب میں تغیر و اصلاح کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ ایک مغالطہ ہے۔

ترمیم نصاب کے حامی اس کا جواب یہ دے سکتے ہیں کہ، درس نظامی ترتیب سے پہلے جو لاکھوں اجلہ علم اور اساتذہ فنون گزرے، جن میں درس نظامی کے مرتب بھی شامل ہیں۔ کیا انھوں نے بھی درس نظامی ہی پڑھکر اپنے علمی کمالات حاصل کئے تھے۔ پھر انھوں نے جس نصاب قدیم سے یہ کمالات حاصل کئے اس میں تغیر و تبدیلی کی ضرورت کیا پیش آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ دماغی و ذہنی صلاحیتوں کے حاملین کے لئے کسی خاص نصاب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک قوی و تندرست جوان، معمولی غذا سے بھی پوری طاقت حاصل کر لیتا ہے مگر ایک کمزور اور لاغر آدمی کے لئے، ہلکی زود ہضم اور مقوی غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسئلہ اوسط درجہ کے ذہن و دماغ کے لوگوں کا ہے۔ ان کے لئے ضرورت ہے کہ بہتر سے بہتر اور سہل سے سہل نصاب تعلیم تیار کیا جائے اور طریق تعلیم میں بھی سابقہ تجربوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ مؤثر ہو۔

یہ خیالات پراگندہ جو حضرت مولٰنا عبدالقیوم صاحب حقانی کا مضمون پڑھکر فوراً دماغ میں آئے بے تکلف اور برجستہ قلم بند کر دئے گئے ہیں۔ اپنی ہیچمدانی کا اعتراف کرتے ہوئے اہل علم سے درخواست ہے کہ لغزشوں سے درگزر فرمایا جائے۔

وما علینا الا البلاغ

قسط ۶

مولانا جمیل الرحمٰن پرتاب گڈھی

تفہیم القرآن

ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

حضرت نوح علیہ السلام کی اصل دعوت اور قوم کی بنیادی گمراہی

ولقد ارسلنا نوحًا الی قومہ فقال یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہٍ غیرہ ۖ انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم ۝ قال الملأ من قومہ انا لنراک فی ضلالٍ مبین ۔ قال یا قوم لیس بی ضلالۃ ولکنی رسول من رب العٰلمین ۝ ابلغکم رسٰلٰتِ ربی وانصح لکم واعلم من اللہ ما لا تعلمون ۝ او عجبتم ان جاءکم ذکر من ربکم علی رجل منکم لینذرکم ولتتقوا ولعلکم ترحمون ۝ فکذبوہ فانجینٰہ والذین معہ فی الفلک واغرقنا الذین کذبوا بآیٰتنا انھم کانوا قومًا عمین ۝

(سورۂ اعراف رکوع ۸ پ ۸)

ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ سو انھوں نے فرمایا کہ اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ مجھکو تمہارے لئے ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ ان کی قوم کے آبرودار لوگوں نے کہا کہ ہم تم کو صریح غلطی میں دیکھتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ اے میری قوم مجھ میں تو ذرا بھی غلطی نہیں۔ لیکن میں پروردگار عالم کا رسول ہوں۔ تم کو اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیرخواہی کرتا ہوں۔ اور میں خدا کی طرف سے ان امور کی خبر رکھتا ہوں جن کی تم کو خبر نہیں۔ اور کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا بشر ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی

ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ
ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ
ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ
ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ
ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ
ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ

تاکہ وہ شخص تم کو ڈرا دے اور تاکہ تم ڈر جاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جاوے۔ سو وہ لوگ ان کی تکذیب کرتے رہے تو ہم نے نوح کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں تھے بچالیا۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو ہم نے غرق کر دیا۔ بیشک وہ لوگ اندھے ہو رہے تھے

سورہ ہود میں یہ الفاظ آتے ہیں۔

ولقد ارسلنا نوحًا الی قومہ انی لکم نذیر مبین الا تعبدوا الا اللہ انی اخاف علیکم عذاب یوم الیم۔ فقال الملأ الذین کفروا من قومہ ما نرٰک الا بشرًا مثلنا وما نرٰک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا بادی الرای وما نرٰی لکم علینا من فضلٍ بل نظنکم کٰذبین

سورۃ ھود - پ ۱۲

اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کے پاس رسول بنا کر بھیجا کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو میں تم کو صاف صاف ڈراتا ہوں۔ میں تمہارے حق میں ایک بڑے تکلیف دینے والے دن کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں سو ان کی قوم میں جو کافر سردار تھے وہ کہنے لگے ہم تو تم کو اپنا ہی جیسا آدمی دیکھتے ہیں کہ تمہارا اتباع انہیں لوگوں نے کیا ہے جو ہم سے بالکل رذیل ہیں سو بھی محض سرسری رائے سے۔ اور ہم تم لوگوں میں کوئی بات اپنے سے زیادہ بھی نہیں پاتے بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ

سورہ مومنون میں بھی تقریبًا یہی الفاظ آتے ہیں

ولقد ارسلنا نوحًا الی قومہ فقال یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ افلا تتقون فقال الملؤُ الذین کفروا من قومہ ما ھٰذا الا بشر مثلکم یرید ان یتفضل علیکم ولو شاء اللہ لانزل ملٰئکۃً

اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف پیغمبر بنا کے بھیجا، سو انھوں نے فرمایا۔ اے میری قوم اللہ ہی کی عبادت کیا کرو، اس کے سوا کوئی تمہارے لئے معبود بنانے کے لائق نہیں، پھر کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔ پس ان کی قوم میں جو کافر رئیس تھے کہنے لگے کہ یہ شخص بجز اس کے کہ تمہاری طرح کا ایک آدمی ہے

ماسمعنا بھذا فی آبائنا الاولین ۵
(سورہ مومنون رکوع ۲ پ ۱۸)

اور کچھ نہیں ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ تم سے برتر ہو کر رہے اگر اللہ کو منظور ہوتا تو فرشتوں کو بھیجتا ہم نے یہ بات اپنے پہلے بڑوں میں بھی نہیں سنی۔

یہی مضمون سورہ شعراء رکوع ۵ پ ۱۹ میں بھی بیان ہوا ہے۔ اور اسی مرکزی مضمون اور حضرت نوحؑ کی دعوت کو سورۂ نوح پ ۲۹ میں بھی بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس سورت میں ان معبودانِ باطلہ کی بھی صراحت کر دی گئی ہے جس کو ان لوگوں نے اپنا معبود بنا رکھا تھا۔

وقالوا لاتذرنّ آلھتکم ولاتذرنّ ودًّا ولا سواعًا ولا یغوث ویعوق ونسرًا
(سورہ نوح پ ۲۹ ع ۲)

اور بولے ہرگز نہ چھوڑنا اپنے معبودوں کو اور نہ چھوڑنا ودّ کو اور سواع کو اور یعوق کو اور نسر کو

ودّ، سواع، یعوق اور نسر قوم نوح کے ان بتوں کے نام ہیں جن کی یہ لوگ مطلب برآری کے لئے پرستش کیا کرتے تھے۔ قرآن حکیم کی ان مذکورہ آیتوں کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی اس قوم کو جو راہِ حق سے بھٹک کر کفر کی تاریکی میں زندگی گذار رہی تھی۔ مختلف معبودوں، ودّ، سواع، یغوث اور یعوق کی عبادت میں مصروف تھی دعوت دی کہ اعبدوا اللہ صرف اللہ کی عبادت کرو، اسی میں تمہاری نجات ہے۔ اور ان تمام معبودانِ باطلہ سے بیزاری کا اعلان کرو جن کو تم نے اپنی غلطی سے معبود قرار دے لیا۔ ورنہ عنقریب تم پر ایک ایسا خوفناک دن آنے والا ہے جس کے عذاب سے تم بچ نہیں سکتے اس پر آپ کی قوم کے ان کافروں نے جو سرپنچ گنے جاتے تھے آپ کو گمراہ اور جھوٹا قرار دیا اور اپنے کفر پر اڑے رہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے ان دعوتی الفاظ پر غور کیجئے جس کو قرآن یوں بیان کرتا ہے

وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی آذانھم واستغشوا ثیابھم واصرّوا واستکبروا استکبارًا۔ (سورہ نوح رکوع ۱ پ ۲۹)

اور میں نے جب کبھی ان کو بلایا تاکہ آپ ان کو بخش دیں تو ان لوگوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں اور اپنے کپڑے لپیٹ لئے اور اصرار کیا اور غایت درجہ کا تکبر کیا۔

اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں مفسرین کرام نے اصرّوا کا مطلب اصرار علی الکفر لکھا ہے۔

واصرّوا علی کفرھم واستکبروا تکبروا من الایمان استکبارًا ۵
جلالین شریف صفحہ ۴۷۵ سورہ نوح

ان لوگوں نے اپنے کفر پر اصرار کیا اور ایمان سے نہایت درجہ کا تکبر کیا۔

واستروا ای اکبوا علی الکفر والمعاصی — استروا یعنی کفر اور عصیان پر اوندھے منہ گرے
واتھمکوا۔ (روح المعانی ۲۹/۹۷) — رہے اور انھیں چیزوں میں منہمک رہے

ان گذارشات سے شاید آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی اصل دعوت کس نوعیت کی تھی۔ کیا آپ اپنی قوم سے خداوند عالم کی حاکمیت، بالادستی، سیاسی اور تمدنی رب ہونے کو تسلیم کروا رہے تھے یا انھیں اس چیز کی دعوت دے رہے تھے کہ فوق الفطری معنیٰ میں جو تم مختلف معبودوں کی پرستش میں لگ گئے ہو، انھیں اپنا حاجت روا، پناہ دہندہ اور خبر گیری کرنے والا سمجھتے ہو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کی عبادت کرو، اسی سے اپنی ساری ضروریات وابستہ کر دو اور توحید خالص کے علمبردار بن جاؤ؟

قرآن حکیم کے بیان کردہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت الی اللہ سے نتیجتاً دو باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ آپ کی قوم نہ صرف گمراہ تھی بلکہ باری تعالیٰ کی وحدانیت کی بھی منکر تھی، کفر اور عصیان کی تاریکی میں اپنی زندگی گذار رہی تھی۔ جب حضرت نوح علیہ السلام نے اعبدوا اللہ کی دعوت دی۔ تو اس نے آپ کو جھوٹا قرار دیا اور آپ کی قوم کے جفا دریوں نے قوم سے تلقین کی کہ اپنے معبودوں، ود، سواع، یغوث اور یعوق کی پرستش کو نہ چھوڑیں۔ جسکی وجہ سے وہ اور بھی کفر پر مصر رہے۔

۲۔ حضرت نوح علیہ السلام کی اصل دعوت یہ تھی کہ اعبدوا اللہ اللہ کی عبادت کرو وہی تمام مخلوقات کی پرورش کرنے والا، خبر گیری اور حاجتوں کو پورا کرنے والا ہے وہی تم سب کا نگہبان اور وہی ماویٰ اور ملجا ہے دوسرے معبودوں کو چھوڑ دو کیونکہ ان سب کی وجہ سے تم توحید پرستی کے اصل راستے سے ہٹ گئے ہو۔ وہ نہ تو تمہاری حاجتیں پوری کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہماری کوئی مدد۔ اب اگر اس سے باز نہیں آئے، تو میں تم سب پر ایک ایسے دردناک دن کا اندیشہ کرتا ہوں جس کی زد میں تم سب آجاؤ گے۔ اور تمہارا نشان تک روئے زمین پر باقی نہ رہے گا۔

آپ کی دعوت، باری تعالیٰ کی حاکمیت، بالادستی، سیاسی و تمدنی ربوبیت کو تسلیم کرانے کی نہ تھی جیسے کہ مولانا مودودی صاحب نے حکومتِ الٰہیہ کے مشن کو ثابت کرنے کے لئے یہی باور کرانے کی کوشش کی ہے۔

مولانا مودودی صاحب کے بیان کردہ قرآنی مفہوم اور صحیح مفہوم میں کس قدر فرق ہے کیا یہ

کہنا غلط ہوگا کہ مودودی صاحب کا یہ کھلا ہوا انحراف ہے۔ جسے اپنے مزعومہ اپنے مقصد حکومت الٰہیہ کو ثابت کرنے کیلئے ایسا کیا ہے۔

قوم عاد قوم نوح کے بعد قرآن عاد کا ذکر کرتا ہے۔ یہ قوم بھی اللہ کی وحدانیت کی منکر تھی اس نے بھی حق تعالیٰ کے ساتھ کفر کا معاملہ کیا، وہ بتوں کو پوجتی تھی جس طرح قوم نوح نے حضرت نوح علیہ السلام کو گمراہ اور جھوٹا قرار دیا اسی طرح اس قوم نے بھی اپنے نبی حضرت ہود علیہ السلام کو کم عقل اور جھوٹا قرار دیا۔ جس طرح اس نے اپنے معبودانِ باطلہ کو نہ چھوڑا اسی طرح اس قوم نے بھی باپ داداؤں کے بنائے ہوئے بتوں کو نہ چھوڑا۔ جس طرح قوم نوح ایمان سے مشرف نہ ہو سکی اسی طرح یہ قوم بھی ایمان سے دور رہی۔ اس کی گمراہی بھی وہی تھی جو اوپر قوم نوح کے سلسلے میں بیان ہو چکی ہے۔ چنانچہ قرآن کی حسب ذیل آیات اس پر صاف دلالت کرتی ہیں۔

والیٰ عادٍ اخاھم ھودًا قال یٰقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہٍ غیرہ افلا تتقون قال الملاء الذین کفروا من قومہٖ انا لنرٰلک فی سفاھۃٍ وانا لنظنّک من الکٰذبین۔ (اعراف۔ ۹)

اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا انھوں نے فرمایا اے میری قوم تو اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں سو کیا تم نہیں ڈرتے۔ ان کی قوم میں جو آبرو دار لوگ کافر تھے انھوں نے کہا کہ ہم تم کو کم عقل دیکھتے ہیں۔ اور بیشک ہم تم کو جھوٹے لوگوں میں سمجھتے ہیں۔

وقطعنا دابر الذین کذبوا بایٰتنا وما کانوا مومنین " (اعراف - ۹)

اور ہم نے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔

وتلک عاد جحدوا بایٰتِ ربھم وعصوا رسلہ واتبعوا امر کل جبّار عنید، واتبعوا فی ھٰذہ الدنیا لعنۃ و یوم القیٰمۃ الا ان عادًا کفروا ربّھم الا بعدًا لعاد قوم ھود"
سورۂ ہود رکوع ۵

اور یہ قوم عاد تھی جنھوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کا کہنا نہ مانا اور تمام تر ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم ضدی تھے اور اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ ساتھ رہی۔ اور قیامت کے دن بھی خوب سن لو قوم

* * * * * * * * عادنے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا۔ خوب سن لو
* * * * * * * * رحمت سے دوری ہوئی عاد کو جو کہ ہود کی قوم تھی

اسی مرکزی مضمون کو اور حضرت ہودؑ کی دعوت کو سورۂ ہود اور سورۂ شعراء میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان مذکورہ آیات سے جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہی کہ قوم عاد باری تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ کر آباء واجداد کے بتوں کی پوجا کرنے لگی تھی۔ اسی گمراہی کو دور کرنے کیلئے حضرت ہود علیہ السلام تشریف لائے تاکہ آپ بھٹکی ہوئی قوم کو توحید کا سیدھا راستہ تبلادیں اور وہ عذاب الٰہی سے محفوظ رہ سکیں۔ لیکن بدقسمتی سے انھوں نے آپ کی باتوں کو ٹھکرا دیا۔ اور عذاب الٰہی میں گرفتار ہوکر رہے

حضرت ہودؑ باری تعالیٰ کے پاس سے کوئی سیاسی حکمنا نہ لیکر نہیں آئے تھے اور نہ ہی خداوند عالم کی حاکمیت، بالاتری اور سیاسی وتمدنی ربوبیت تسلیم کروانے آئے تھے جیساکہ مولانا مودودی صاحب نے سمجھا۔

ثمود اب قوم ثمود کو لیجئے جو سرکشی اور نافرمانی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اصولاً اس کی گمراہی بھی اسی قسم کی تھی۔ جو قوم نوح اور قوم عاد کی بیان کی ہوئی۔ یہ بھی باری تعالیٰ کی وحدانیت کی منکر تھی۔ بتوں کو اپنا معبود بنا رکھا تھا۔ اور کفر کی تاریکی میں بھٹک رہی تھی۔ اسی گمراہی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ قوم ثمود کی گمراہی اور حضرت صالحؑ کی دعوت حسب ذیل آیات سے ثابت ہے۔

والی ثمود اخاھم صالحًا قال یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہٍ غیرہ ھو انشاء کم من الارض واستعمرکم فیھا فاستغفروہ ثم توبوا الیہ ان ربی قریب مجیب۔

اور ہم نے ثمود کے پاس ان کے بھائی صالح کو پیغمبر بنا کر بھیجا انھوں نے فرمایا اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔ اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور تم کو اسمیں آباد کیا تو تم اپنے گناہ اس سے معاف کراؤ پھر اس کی طرف متوجہ رہو بیشک میرا رب قریب ہے قبول کرنے والا ہے۔

قالوا یاصالح قد کنت فینا مرجوا قبل ھذا اتنھنا ان نعبد مایعبد اٰباؤنا و اننا لفی شک مما تدعونا الیہ مریب

(سورۂ ھود۔ رکوع ۶)

وہ لوگ کہنے لگے کہ اے صالح تم تو اس کے قبل ہم میں ہونہار تھے کیا تم ہم کو ان چیزوں کی عبادت سے منع کرتے ہو جن کی عبادت ہمارے بڑے کرتے آتے ہیں اور جس دین کی طرف تم ہم کو بلا رہے ہو واقعی ہم تو اس کی طرف سے بڑے شبہ میں ہیں (بقیہ صفحہ

محترمہ مریم جمیلہ کا کھلا خط

اپنے غیر مسلم والدین کے نام

مترجم:۔ محمد حسنین قادری

انگریزی کی مشہور اہل قلم اور اسلامیات پر متعدد انگریزی کتابوں کی مصنفہ اور نومسلمہ محترمہ مریم جمیلہ نے اپنے غیر مسلم والدین (مقیم امریکہ) کو دعوتِ اسلام کے لئے ایک کھلا خط لکھا ہے۔ افادہ عام کی خاطر تعمیر حیات کے شکریہ کے ساتھ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مجھے پاکستان میں رہتے ہوئے بائیس سال سے زیادہ مدت گذری اور اس درمیانی عرصے میں وہاں محبت کرنے والے خاندان میں ایک خوش گوار اضافہ ہوا۔ جس نے آپ لوگوں کے دامن میں خوشیوں کے پھول چُن دیئے۔ آپ لوگوں نے عمر کی ایک طویل مسافت طے کی ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میری امیدوں سے کہیں زیادہ بہتر صحت کے مالک ہیں۔ جیساکہ مجھے علم ہے۔ آپ لوگوں نے میری وقتاً فوقتاً بھیجی کتابیں اور اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کشادہ ذہنی اور وسیع النظری سے کیا ہے۔ لہٰذا یہ موضوع جس پر میں آپ سے گفتگو کرنے جا رہی ہوں۔ نہ آپ کے لئے نیا ہے اور نہ ہی آپ لوگوں کو اس کے مزید تعارف کی ضرورت محسوس ہوگی۔ مجھے تعجب ہوگا اگر آپ لوگ یہ محسوس کریں کہ آپ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں کہ اتنی لمبی مدت تک اتنی اچھی صحت کے مالک ہیں اور اپنی نگہداشت کر سکنے کے قابل ہیں۔ جس سے ایک شاندار زندگی کی لطافتوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی آپ لوگوں نے دوسرے سیکڑوں اور ہزاروں معمر امریکیوں کے لیے پر بھی غور کیا ہے۔ جو شدید قسم کی بیماریوں اور ضعف پیری کا شکار ہیں۔

اور ہسپتالوں اور نرسنگ ہوم دماغی شفاخانوں کے کمرۂ امراض پیری اور بوڑھوں کے گھر کے کثرتِ آبادی کا سبب بنتے ہیں (جوکہ صحیح معنوں میں مردہ گھر ہیں) اور کیا آپ لوگوں نے ان معمر لوگوں کے بارے میں بھی کبھی سوچنے کی تکلیف گوارہ فرمائی ہے۔ جن کی ایک اچھی خاصی تعداد نے بیوادُں سے شادی کرلی ہے اور اپنی تنگ وتاریک کوٹھریوں میں جسمانی اذیت برداشت کررہے ہیں اور نوجوانوں کے اس مجرم گروہ کے (جوکمزور اور ضعیف لوگوں کو بلا خوف وخطر شکار کرتے ہیں) ڈاکو ڈکیت کے خوف ..... کی وجہ سے خوف وہراس کی زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔

معمر لوگوں کے ساتھ یہ برے سلوک ٹوٹے ہوئے سماجی ڈھانچے اور بکھرے ہوئے خاندانی اصولوں کے سیدھے نتیجے کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

آپ روز روشن کی طرح اس حقیقت سے یقیناً واقف ہیں کہ وہ سماج جس میں ہم نے آنکھیں کھولی ہیں اور سانسیں لے رہے ہیں تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ درحقیقت ہمارے تمدنی انحطاط کا دور پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی شروع ہوگیا تھا۔ لیکن چند صاحب فہم اشخاص اور اصحاب بصیرت کے علاوہ سبھی لوگ بعد میں پیش آنے والے واقعات سے لاعلم تھے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم سے اور خاص طور سے ان دو دہائیوں کے دوران یہ انحطاط اس تیزی سے آیا ہے کہ کوئی بھی شخص زیادہ دنوں تک سے نظر انداز نہیں کرسکتا ہے۔

بغیر کسی لحاظ کے اخلاقی گراوٹ، اخلاقی اطوار کا مخصوص معیار، تفریح میں گمراہ کن جنسی رجحان، معمر اشخاص کے ساتھ بے ادبی اور بدسلوکی، نئی نسل میں شرح طلاق کا اضافہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا غیر فطری اختلاط سے پیدا ہونے والے امراض جنسی، خوشگوار شادی شدہ زندگی کے دیرپائی میں روز بروز کی کمی، بچوں کا استحصال، فطری ماحول کی بربادی، کم یاب اور قیمتی ذرائع کی بربادی، لاعلاج وبائی امراض، دماغی عدم توازن، دواؤں کی لت، نشے کی عادت، خودکشی کے بکثرت واقعات، جرائم غنڈہ گردی حکومت میں رشوت اور بدعنوانی، قانون کا عدم احترام، یہ سب روزمرہ کے واقعات ہیں اور یقیناً کچھ نہ کچھ وجوہات کے حامل ہیں۔

ان کی وجہ سیکولرزم اور مادیت کی ناکامی اور مذہبی اقدار کی اہمیت میں کمی ہے حتی تجزیہ سے یہ ثابت ہے کہ عمل عقائد پر منحصر ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر غلط مقصد کے حصول کے لئے کیا گیا عمل ضرر رساں ثابت ہوگا۔

بلاشک و شبہ اس خط کا پڑھنا آپ کے لئے اکتا دینے والا ہوگا۔ اور آپ احتجاج کریں گے۔ کہ ہم نہ تو مذہبی ہیں، نہ فلسفی اور نہ ماہر سماجیات تو پھر تم کیوں ہم لوگوں کو ان عمیق معاملوں میں الجھا رہی ہو، جب کہ اس سے ہم لوگوں کا کوئی تعلق نہیں۔ بہرحال آپ اپنے طرزِ زندگی پر خوش اور مطمئن ہیں۔ آپ لوگوں کی واحد خواہش گذرتے ہوئے اور آنے والے لمحوں میں مکمل طور پر زندگی سے لطف اندوز ہونے کی ہے اگر زندگی ایک سفر ہے تو کیا دورانِ سفر کے خاتمے کے بعد کی زندگی سے آنکھیں بند کر لینا اور زادِ سفر کو ہی سفر کا ماحصل سمجھنا بے وقوفی اور احمقانہ بات نہ ہوگی؟ ہم لوگوں کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ زندگی کا مفہوم و مقصود کیا ہے؟ موت یقینی کیوں ہے؟ اور موت کے بعد کیا کچھ ہونے والا ہے؟

آپ دونوں نے متعدد بار مجھ سے کہا ہے کہ آپ لوگ کسی روایتی مذہب کو قبول نہیں کریں گے۔ کیونکہ آپ لوگوں نے یہ باور کر لیا ہے کہ مذہبی تعلیمات سائنس سے ٹکراتی ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے یقینی طور پر ہم لوگوں کی طبیعاتی اور مادی دنیا کو بہت ساری معلومات فراہم کی ہیں۔ ہم لوگوں کو بہت ساری آسانیاں فراہم کی ہیں۔ مہلک قرار دی جانے والی بہت سی بیماریوں کے علاج ڈھونڈھ نکالنے کے ساتھ ساتھ ہماری رفتار اور صلاحیت کار میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن سائنس یہ نہیں بتاتی ہے اور نہ ہی بتا سکتی ہے کہ حیات و موت کے رموز کیا ہیں؟ سائنس ہمیں "کیسے" بتاتی ہے لیکن "کیوں" نہیں بتا سکتی ہے اس کے پاس وہ آنکھ ہے جو ہونے والے ہر عمل کو دیکھ سکتی ہے اور سمجھا سکتی ہے کہ یہ عمل یوں ہو رہا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ اس قوت تمیز سے ناآشنا ہے جو غلط اور صحیح میں بھلائی اور برائی میں اور حسن و قبح میں فرق کر سکے۔ اور ہمیں یہ بتا سکے کہ ان میں کیا فرق ہے۔ وہ ہمیں یہ بھی نہیں بتاتی کہ ہم جس کے جواب دہ ہیں اس کے لئے کیا کہیں۔

آج امریکہ بہت سے طریق عمل میں روم کے انحطاط اور گراوٹ کے آخری دور کا اعادہ کر رہا ہے۔ ٹھیک یہی بات یورپ، ایشیاء اور افریقہ کے لئے اور جہاں بھی مغربی تہذیب اثر انداز ہے، کے لئے کہی جا سکتی ہے۔ صاحب دماغ اور صاحب فکر اشخاص ہر جگہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ سیکولرزم ہمارے سماجی ڈھانچہ کی مضبوط بنیاد رکھنے میں ناکام ہو چکا ہے۔

اس وقت مشرق و مغرب کا ہر ذی فہم، متفکرانہ اور مضطربانہ انداز میں اس بحران کے حل کی تلاش میں دوسری سمت دیکھ رہا ہے لیکن ابھی اس سے ناآشنا ہے کہ وہ اسے کہاں سے

حاصل کرے۔ مندرجہ بالا حقائق صرف چند خود رائے قسم کے ذی فہم اشخاص اور ماہرین سماجیات ہی کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ انتشار کے اثرات سیدھے طور پر ہم پر، آپ پر اور ہم میں سے ہر ایک پر مرتب ہو رہے ہیں۔

اپنے انتہائی نازک دور میں قدیم روم نے عیسائیت کو اپنے نجات دہندہ کے طور پر اپنایا نتیجۃً کلیسا کا ہزاروں برس تک یورپ پر تسلط رہا۔ جس نے انحطاط پذیر روم کی بہت ساری سماجی برائیوں اور اخلاقی اقدار کا اور روحانی معیار کو بڑی حد تک جلا بخشی، بدقسمتی سے اس تاریخی اور تابناک دور میں چرچ نے سیکولرزم اور اہل کتاب کی تعلیمات سے باغی تحریک وخیال سے مفاہمت کرلی۔ اور ناقابلِ فہم مذہبی تعلیمات اور پاپائیت کی توسیع کی جو Reliance کے اثرات کا مقابلہ نہ کرسکی۔ جو مادّیت کی تجدید اور سیکولرزم کی ایک نئی شکل تھی۔ جب عیسائیت امریکہ اور یورپ میں کلی طور پر اپنا اثر کھوچکی اور چرچ قریب قریب خالی رہنے لگے۔ تو کلب کی مشنریوں نے افریقہ اور ایشیا میں مغربی شہنشاہیت کے ناجائز مفاد کے ہراول دستہ کا کام شروع کردیا۔

عیسائیت کے بعد یہودی امریکہ میں دوسرا بڑا مذہبی گروہ ہے۔ جو قابل فہم حد تک ذرائع ابلاغ پر قبضہ کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشی میدانوں پر بھی حاوی ہے۔ لیکن یہودیت ہمیشہ محدود اور نسلی مذہب رہا ہے۔ اور شاید ہی کوئی شخص تبدیلِ مذہب کے بعد یہودی ہوا ہو اس کی حیثیت کبھی بھی عالمی نہیں رہی ہے۔ تحریک یہودیت جس سے کہ مملکت اسرائیل وجود میں آئی صرف نسلی تعصب اور ملک پرودری کی پہچان بن چکی ہے۔ مقبوضہ عرب علاقہ میں اسرائیلیوں کے وحشت ناک مظالم، لبنان اور متعلقہ علاقہ پر بغیر کسی اشتعال انگیزی کے جارحانہ حملہ، لبنانی کیمپ میں اجتماعی قتل وغارت گری، فلسطینی عربوں کی نسل کشی کی کوشش اور ان انسانی اور جائز سیاسی حقوق سے محرومی سب کا سب یہودی نسلی تعصب اور تنگ نظری کے منطقی نتیجہ میں ظہور میں آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدامت پسند یہودی پادری بھی اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں کہ اسرائیلی کچھ غلطی بھی کرسکتا ہے اور بغیر کسی تنقید کے اسکے ہر عمل کی تائید کرتے ہیں۔ ایسی ہی اخلاقی گراوٹ اور روحانی خرابی خود بخود یہودیت کو مستقبل کے نجات دہندہ مذہب کی حیثیت سے ناموزوں قرار دیتی ہے۔

اب اسلام تیسری دنیا اور تیزی سے بڑھتے ہوئے عقیدہ کا نام ہے۔ اب یہ افریقہ اور ایشیا

کے جنگلوں اور ریگستانوں میں محصور مذہب نہیں رہا بلکہ یورپ و امریکہ کا اٹوٹ حصہ بن چکا ہے امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد چار ملین ہے جو روز افزوں ترقی پذیر ہے۔ جہاں مسلم ممالک کے ہزاروں طلباء امریکی اور یورپی جامعات میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہیں اچھے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ نوجوان بھی ہر شعبۂ زندگی میں دخیل ہیں۔ پچھلی دو دہائیوں میں خود امریکیوں کی اور مغربی یورپ سے ہجرت کرنے والے باشندوں کی اچھی خاصی تعداد نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہے۔ (شروع میں) امریکی سیاہ فاموں نے اسلام قبول کیا تھا جس کی وجہ اپنے وقار اور کھوئی عظمت کو بحال کرنا اور نسلی تفاوت کو کم کرنا تھی۔ لیکن حالیہ قبولِ اسلام کی تعداد میں یورپی گورے عوام زیادہ ہیں۔ جنھوں نے اسلام کو اپنی بکھری ہوئی پریشان کن اور ہنگامہ خیز زندگی سے فرار حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا ہے اور اس سلسلہ میں ان لوگوں نے بہت سی قربانیاں بھی دی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں کو اس عمل میں دشوار گذار مراحل سے گذرنا بھی پڑا ہے۔ اس میں سے کچھ خوش نصیب ایسے بھی ہیں جنھیں پیار کرنے والے ذی فہم والدین کا سایہ بھی نصیب ہے۔ جیسے کہ میں۔ لیکن ان کی اکثریت غیر مسلم والدین قرابت داروں اور دوستوں کے ساتھ تنازع اور کشمکش کی شکار ہو گئی ہے۔ آج کلیسا اور یہودی عبادت خانے قریب قریب ویران ہیں۔ لیکن امریکہ و یورپ کے ہر اہم شہر اور نواحی علاقہ کے نو تعمیر اسلامی مراکز اور مساجد حیرت انگیز طور پر عوام کو اپنی جانب متوجہ کر رہی ہیں۔ مغربی ممالک میں نو مسلموں کی زیادہ تر تعداد ذہین اور ذی فہم اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ہے۔ آخر کیا چیز ہے جو ان امریکیوں کو قبولِ اسلام کی طرف متوجہ کر رہی ہے۔

ہر امریکی چاہے وہ نوجوان ہو یا معمر اس بے چینی میں رہبری کی تلاش میں ہے انھیں اس تلخ تجربے کا شدید احساس ہے کہ انفرادی آزادی اور مواقع جو آج امریکی کو حاصل ہیں اور وہ اس سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ بغیر کسی مناسب رہبری، جہت اور مقصد کے بے معنیٰ ہیں بلکہ یہ راہ راہِ نجات کے بجائے اندھے کنوئیں میں لے جاکر گرانے والی ہے۔ سیکولرزم اور مادیت امریکیوں کی انفرادی زندگی یا اجتماعی نظام حیات کو مثبت تعمیر حیات مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ عیسائیت اور یہودیت کی ناکامی کے بعد مغربی عوام اسلام کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ ہر نو مسلم کی زندگی قبولِ اسلام

کے بعد دانائی، پاکی اور ایمانداری کے محور پر گھومنے لگتی ہے۔ جس سے وہ اپنے آپ کو سکون اور اطمینان کے ماحول میں پاتا ہے۔ اور مسلمانوں کا مسئلہ بھی صرف مابعد الموت کا ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ لازوال مسرت سکون اور صحیح خوشی کے بھی طالب ہیں۔

یہ رہبری ہمیں قرآن وحدیث کی تعلیمات سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تعلیمات صرف مشرق کے دور دراز بسنے والی اقوام کے لئے ہی راہبر نہیں ہیں بلکہ یورپ کو متفکر کر دینے والی سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی مسائل کا بھی صحیح حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں مزید برآں مسلمان اپنے اس خدا پر یقین رکھتا ہے۔ جس نے نہ صرف اس کی تخلیق کی ہے، اس کی دست گیری کرتا ہے اور جو ساری دنیا کا مالک ہے۔ بلکہ ہم میں سے ہر ایک کی قسمت کا بہترین محافظ بھی ہے۔ اور ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ سب سے زیادہ محبت کرنے والی ذات بھی ہے۔ قرآن کہتا ہے خدا تم سے تمہارے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

قرآن ایک آسمانی کتاب ہے اور اس میں تحریف ناممکن ہے اور چوں کہ یہ جامع ہے اس لئے اس میں اصلاح، نظر ثانی تجدید اور تشکیل نو کی کوئی گنجائش نہیں ہے چونکہ قرآن اور سنت کی تعلیمات حدود زمانی سے آزاد ہیں اس لئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نہ تو یہ کسی خاص علاقہ کے لئے محدود ہیں اور نہ ہی کبھی بھی فرسودہ ہو سکتی ہیں۔

آپ دونوں سفر زندگی کے اس دور میں قدم رکھ چکے ہیں جہاں مسافر رخت سفر لپیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے آپ کی سانسیں آپ کی زندگی کا ضامن ہیں اور زندگی اس وقت کی جو آپ کے مثبت فیصلہ کے انتظار میں ہے، اور اگر آپ کا فیصلہ جیسا کہ میں امید کر رہی ہوں مثبت ہی ہو سکتا ہے تو پاکستان میں رہنے والی آپ کی عزیز بیٹی سے آپ کا رشتہ نہ صرف نسلی رہے گا بلکہ مذہبی بھی ہو جائے گا۔ اور آپ لوگ ہم لوگوں کے ساتھ نہ صرف اس دنیا میں محبت و آشتی کے ماحول میں زندگی گذاریں گے بلکہ انشاء اللہ ہمیشہ ہمیش کے لئے آنے والی زندگی میں بھی جنت کا ساتھ ہو گا۔ لیکن آپ لوگ نفی میں فیصلہ کرتے ہیں تو مجھے یقین ہے

..... کہ عنقریب آپ کے حاصل شدہ آرام و آرائش اور زندگی کی خوشیوں کا خاتمہ ہوجائے گا - اور زندگی موت سے ہم آغوش ہوجائے گی جو ناگزیر ہے - اور آپ کو ندامت اور تلافی کے مواقع بھی نصیب نہ ہوسکیں گے - اور ملنے والی ہولناک سزا سے فرار و تحفظ ناممکن ہوگا - جسمانی اور ذہنی اذیت ہمیشہ ہمیش کی قسمت بن جائے گی - آپ لوگ ہمیشہ ہمیش کے لئے اپنے چاہنے والوں سے الگ کردئے جائیں گے - اور ہٹلر، لینن اور اسٹالن جیسے عفریت صفت انسانوں کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوں گے -

میں آپ سے محبت کرنے والی بیٹی آپ سے اس امید پر مخاطب ہوں کہ آپ اپنے ماضی کو فراموش کرکے اس نئے دور میں قدم رکھیں گے جس کا فیصلہ مکمل طور پر آپ لوگوں پر منحصر ہے اور آپ اس سلسلہ میں صاحبِ اختیار ہیں - لیکن اس امر کو بھی ذہن نشین کرلیں کہ آپ کا مستقبل آپ کے اسی فیصلہ پر منحصر ہوگا جو آپ لوگ کریں گے -

---

(بقیہ صـ۲۲ کا) والملیبار واکثر بلاد الرکز (جلد - ۸ - صفحہ ۱ - ۳۱۷)

مولانا کی دینی خدمات کے دور رس اور ہمہ گیر اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر محمد یوسف کوکن ایم - اے، پی ایچ - ڈی نے لکھا :-

" مولانا عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کا فیض بہت گہرا اور دیرپا ثابت ہوا ہے - وہ اپنے دور کے ایک قطب اور مجدد تھے انھوں نے خدمتِ دین کا ایک بے پناہ جذبہ لوگوں کے اندر پیدا کیا - انھوں نے بہت سے نامور علماء اور شعراء پیدا کئے جن کی علمی و ادبی و دینی خدمات ہمیشہ صفحاتِ تاریخ پر چمکتی رہیں گی (الباقیات : مجلہ جشنِ صدسالہ) حضرت مولانا قاری ضیاء الدین محمد علیہ الرحمہ نے ۱۳۴۳ھ میں مدرسہ باقیات صالحات میں منعقد ایک عظیم تعلیمی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا -

جنوبی ہندوستان کی اسلامی شان و شوکت اور روحانی جاہ و جلال تاقیامت (مرحوم) مولانا عبدالوہاب کے کارناموں کی رہینِ منت رہے گی "!

ہم اس پر ان الفاظ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ مولائے مرحوم کے توسط سے بانیٔ حرمین حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی ثم مکی کا نام نامی بھی جنوبی ہند کے علمی حلقوں میں بالخصوص مدرسہ باقیات کے فیض یافتگان میں تاقیامت روشن و تابناک رہے گا -

قسط ۵

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور اُن کے ایک شاگرد رشید

۱۳۰۶ھ ماہ ربیع الاول کے اواخر میں مولانا نے اپنے استاذ گرامی مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو خواب میں دیکھا کہ "وہ کسی پُر فضا مقام پر کھڑے ہوئے مولانا کو اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ اور انھیں اشارے سے نماز پڑھنے کا طریقہ بتا رہے ہیں"، یہ خواب ایک اشارۂ غیبی تھا کہ مولانا کے سفرِ آخرت کا وقت نہایت قریب ہے۔ چنانچہ اسی ماہ کی آخری تاریخ کو مرض اسہال لاحق ہوا۔ اور اُس نے اس حد تک ضعف و نقاہت پیدا کر دیا کہ مولانا فریش ہو گئے۔ ہر چند علاج ہوا۔ لیکن طبیعت سنبھل نہ سکی آخر کار یہ مرحلہ بھی پیش آیا کہ:-

راز رویائے صادقہ بھی کھلا
انگلیوں سے ہوئی نماز ادا، - (مولانا شاکر)

استادِ عالی مقام سے مولانا کے ذہنی اور روحانی روابط کا ایک آخری تکوینی اظہار عین مرضِ موت میں بھی ہوا۔ مولانا عبدالصمد علی قدس سرہٗ لکھتے ہیں۔

"مرضِ موت میں مولانا قدس سرہٗ نے اپنے استاد مولانا مولوی رحمت اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کو منام میں یہ فرماتے ہوئے دیکھا کہ "تیار ہو جاؤ"۔

تیاری شروع ہوئی مولانا علی قدس سرہٗ لکھتے ہیں

"آپ نے عمداً آنکھ بند کر لی۔ اور ذکر اللہ میں مشغول و معروف ہو گئے اللہ

فرمایا کہ میرے سے کوئی بات مت کرو۔

حضرت مولانا کے ایک ممتاز خلیفہ مولانا شاکر علیہ الرحمہ کا بیان ہے "

جنبش لب تھی صاف اقراری ❁ کہ خفی ذکر پاک ہے جاری "۔

استغراق و محویت کی کیفیت بڑھتی گئی، ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ ہجری کی شب حضرت مکان ویلور کے ایک خدا رسیدہ بزرگ حضرت مولانا سید شاہ عبداللطیف قادریؒ نے خواب میں ایک قلعہ کے خندق کو دیکھا جو پانی سے لبریز تھا۔ لیکن۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سارا پانی جذب ہو کر رہ گیا "

بزرگ محترم نے بیدار ہو کر فرمایا! ایک فیاض زماں کا انتقال ہونے والا ہے، چنانچہ ۲۲ ربیع الثانی بروز شنبہ ظہر، عصر کے درمیانی وقت اس فیاض زماں نے داعی اجل کو اس حال میں لبیک کہا، زبان پر " اللّٰه اللّٰه کا ذکر جاری تھا اور چہرۂ انور پر سرور تبسم کی پرکیف جھلک ایک چشم دید راوی کہتے ہیں۔ ہم سنتے ہیں زبان اطہر پر اللّٰه اللّٰه جاری تھا خوش تر با تبسم ہوئی ہے جان پرواز ٭ محرم راز سے ہوا دمساز، ـــــ حضرت شاکر نے درست فرمایا۔

فانی ہے جہاں، جہاں کی ہر اک نعمت ٭ رفتار میں عمر کی ہے بجلی کی صفت

شاکر نہ جئی رہے ہمیشہ نہ ولی، ٭ لو کر گئے رخصت آج اعلیٰ حضرت

اعلیٰ حضرت مولانا عبدالوہاب جن کو مولانا سید عبدالحئی لکھنوی نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف "نزہۃ الخواطر" میں "احد اکابر المشائخ" کے الفاظ سے یاد کیا ہے بلاشبہ اپنی ذات سے ایک ادارہ تھے۔ احیاء علوم دین، دعوت و تبلیغ۔ تزکیہ و احسان، رد بدعات اور تردید عیسائیت کے جو کارنامے مولانا کی ذات سے انجام پائے اگرچہ ان کا کوئی چرچا نہیں ہوا اور تعارف و تشہیر کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ لیکن مولانا کی تاریخ ساز خدمات کے نقوش آج بھی اجاگر ہیں اور جنوبی ہند کی ملی تاریخ کا باب مولانا جیسی عہد آفریں شخصیت کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جائیگا

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت ٹیپو سلطان کی شہادت، نوابان آرکاٹ کی مغلوبیت اور انگریزی استعمار کے غلبہ و اقتدار کے نتیجے میں مسلمانوں کے ملی تشخص کے لئے جو خطرات منڈلا رہے تھے مولانا نے اس کا بروقت احساس کیا اور اپنی اصلاحی اور تعلیمی تحریک کے ذریعے جنوبی ہند کی ملی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے اس حقیقت کا اظہار درج ذیل لفظوں میں کیا ہے۔ "وھو اول من نشر العلم الشریف بعد انقراضہ فی بلاد المعبر د

(بقیہ ۴۵ پر)

فہرست کتب مکتبہ دارالعلوم دیوبند شعبہ نشرواشاعت دارالعلوم دیوبند

نام کتب	قیمت	نام کتب	قیمت	نام کتب	قیمت
فتاویٰ دارالعلوم جلد ۱	۲۴/-	دیوان المتنبی	۱۱/-	انتصار الاسلام	۹/-
〃 〃 ۲	۱۷/-	تاریخ دارالعلوم جلد ۱	۲۶/-	مصابیح التراویح	۶/۵۰
〃 〃 ۳	۲۵/-	〃 〃 جلد ۲	۴۰/-	تفسیر معوذتین	۳/-
〃 〃 ۴	۳۱/-	〃 〃 انگریزی ۱	۱۲۵/-	اسلامی عقائد اور سائنس	۲/-
〃 〃 ۵	۳۰/-	〃 〃 〃 ۲	۱۷۵/-	مودودی مذہب	۲/۵۰
〃 〃 ۶	۳۶/-	سوانح قاسمی جلد اوّل	۴۰/-	نظریہ ود قرآنی پر ایک نظریہ	۴/-
〃 〃 ۷	۳۳/-	〃 〃 دوم	۳۸/-	مکتوبات ثلثہ	۳/۵۰
〃 〃 ۸	۲۸/-	〃 〃 سوم	۱۲/-	دو ضروری مسئلے	۱/-
〃 〃 ۹	۳۶/-	ملفوظات جلد اوّل	۱۹/-	جماعت اسلامی کا دینی رخ ۱	۲/۵۰
〃 〃 ۱۰	۲۲/-	〃 〃 دوم	۳۱/-	〃 〃 ۲	۲/۵۰
〃 〃 ۱۱	۱۱/-	قبلہ نما	۳۸/-	〃 〃 ۳	۲/۵۰
مقدمہ ابن الصلاح	۱۱/-	دینی دعوت کے قرآنی اصول	۶/۵۰	〃 〃 ۴	۴/-
الفیۃ الحدیث	۱۲/-	ناقابلِ فراموش واقعات	۲۶/-	اجتماع گنگوہ	۱/-
مشکوٰۃ الآثار	۱۱/-	المنار الانوار	۷/-	درِ منثور اوّل	۱/-
الفتحیہ	۴/-	مثنوی فروغ	۲/۵۰	〃 دوم	۱/-
نفحۃ الادب	۶/-	براہین قاسمیہ	۱۶/-	اعفاء اللحیہ	۱/-
تفسیر مدارک التنزیل	۸/-	حکمتِ قاسمیہ	۵/-	ایمان وعمل	۳/-
الاشباہ والنظائر	۳۶/-	مدارج سلوک	۱۶/-	دارالعلوم دیوبند کا ایک	
عقیدۃ الطحاوی	۷/-	جائزہ تراجم قرآنی	۱۱/-	فتویٰ اور اسکی حقیقت	۱/۵۰
حسامی	۲۴/-	قرآن محکم	۵/-	ماثورہ دعائیں	۱/۵۰
ملا حسن	۱۲/-	حجۃ الاسلام	۱۲/-	دستور عقائد	۲/۵۰
مقامات حریری	۲۵/-	اسرائیل	۴/-	مکتوبات	۳/-
		قرآنی پیشین گوئی	۳/۷۵		

Regd. No. SHN-L-13-NP-21-84

DARUL-ULOOM MONTHLY

DEOBAND (U.P.)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دارالعلوم دیوبند کے ترقیاتی منصوبے

(۱) رواق خالد کی دوسری منزل اور مزید جدید دارالاقامہ کی تعمیر جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو

(۲) **دارالتربیت** (دارالاطفال) کا قیام اور اس کی تعمیر

(۳) ایک وسیع مسجد کی تعمیر جس میں اضافہ شدہ تمام طلبہ کی گنجائش ہو (قدیم مسجد ناکافی ہو چکی ہے)

(۴) علمی و دینی اجتماعات کے لئے ایک وسیع ہال کی تعمیر۔ —— (۵) ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر

(۶) مہمان خانہ کی توسیع —— (۷) نئی درسگاہوں کی تعمیر —— (۸) لائبریری کی تعمیر جدید

(۹) اساتذۂ دارالعلوم کی علمی ترقی کے لئے عالم اسلام سے علمی کتابوں کی فراہمی کا انتظام

(۱۰) تمام دنیا میں پھیلے ہوئے فضلاء دارالعلوم سے روابط اور اُن سے متعلق معلومات۔

(۱۱) نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم پر تمام ذمہ داران مدارس عربیہ کا اہم کنونشن طلب کرنا۔

(۱۲) تعلیم و تربیت کے نئے اصول وضوابط کی ترتیب اور اُن کا اجراء۔

اس ادارے کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے

دستِ تعاون بڑھانے کی شدید ضرورت ہے

مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی امداد روانہ فرمائیں —————— شکریہ

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب) دارالعلوم دیوبند یوپی

این جے پرنٹرس دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی اصلاحی

ماہنامہ

دارالعلوم

زیر سرپرستی

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

مدیر مسئول

ریاست علی بجنوری

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا علمی و دینی

ماہنامہ دارالعلوم

جلد نمبر ۶۶ اگست ۱۹۸۴ء مطابق ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ شمارہ نمبر ۵

مجلس ادارت	سالانہ زر اشتراک
مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی	ہندوستان سے ۲۵/-
مولانا ریاست علی صاحب (مدیر مسئول)	سعودی عرب، کویت، ابوظہبی وغیرہ سے
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (مدیر)	بذریعہ ایر میل ۹۰/- روپے
طابع و ناشر	جنوبی مشرقی افریقہ، برطانیہ وغیرہ سے
دارالعلوم معرفت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب	بذریعہ ایر میل ۱۰۷/- روپے
مہتمم دارالعلوم دیوبند	امریکہ کناڈا وغیرہ سے بذریعہ ایر میل ۱۱۶/- روپے
مطبوعہ	پاکستان سے بذریعہ رجل ۴۵/- روپے
محبوب پریس دیوبند (یو۔پی)	فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

ضروری گذارش

◯ اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس نمبر یا اس سے پہلے کسی نمبر میں آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ بذریعہ سرخ نشان اس کی آپ کو اطلاع بھی دی جا چکی ہے۔ لہٰذا اب آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی۔پی سے زر اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے اگلا شمارہ ۳۱/- روپے کے مطالبہ میں وی۔پی کر دیا جائے گا (مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۴۵/۰۰ روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والہ تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیج دیں اور انہیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمائیں، خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں

(مدیر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

ریاست علی

مدارس عربیہ کے ذمہ داروں سے مخلصانہ گذارش

الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ سال رواں دار العلوم دیوبند کا ایک مبارک تعلیمی سال ہے کہ سال گذشتہ جن قواعد وضوابط کا اعلان کیا گیا تھا ان پر عمل در آمد کیا گیا، ۱۴، ۱۵، ۱۶ شوال کو داخلہ کے تحریری امتحانات لئے گئے اور ۱۹ شوال کو تمام نتائج کا اعلان کر دیا گیا، کامیاب امیدواروں کی داخلہ کی کاروائی بعجلت ممکنہ مکمل کر کے ۲۵ شوال کو باقاعدہ تعلیم کا آغاز کر دیا گیا۔

اس وقت ماہ ذی قعدہ میں جس تسلسل اور انہماک کے ساتھ تعلیمی سلسلہ جاری ہے اس کے پیش نظر فضل خداوندی کے اعتماد پر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ انشاء اللہ اس سال نصاب تعلیم پورا ہوگا اور گذشتہ چند سالوں میں جو تعلیمی اضمحلال رونما ہو گیا تھا وہ انشاء اللہ ختم ہو جائے گا۔

سال رواں کے امتحانات داخلہ کے نتیجہ میں جو باتیں سامنے آئی ہیں، ان سے مدارس عربیہ کے ذمہ داروں کو مطلع کرنا ضروری ہے تاکہ موجودہ صورت حال کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی جدوجہد میں تمام مدارس متحد ہیں اور امید افزا نتائج تک پہنچنے میں سب تعلیمی اداروں کو ان کے وسائل کے مطابق حصہ دار بنایا جا سکے۔

صورت حال یہ ہے کہ امتحاناتِ داخلہ کے لئے مرتب کئے گئے سوالات کے پرچے، دار العلوم کے سالانہ امتحان کے معیار کے مقابلہ پر بہت آسان تھے، ابتدائی درجات ہی میں نہیں بلکہ اونچی جماعتوں کے پرچوں میں بھی صرف عبارت کو باعراب لکھنے اور ترجمہ کرنے پر اکتفا کیا گیا تھا اور مشکل بحثوں سے قطعاً اجتناب کیا گیا تھا نیز یہ کہ کسی بھی جماعت کی صرف ان متداول کتابوں کا امتحان لیا گیا تھا جو تمام ہی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں اسی طرح یہ بھی خیال رکھا گیا کہ سوالات، نصاب تعلیم کے آخری حصہ سے متعلق نہ ہوں اور حافظہ پر بھی انحصار نہ ہو، ان سہولتوں کی وجہ سے متعدد مدارس عربیہ کے ذمہ داروں نے امسال کے امتحان داخلہ کو معیار تعلیم کی بلندی کے لئے نقصان دہ تصور فرمایا اور آئندہ کے امتحاناتِ داخلہ کو دار العلوم کے سالانہ امتحان کے معیار کے مطابق لئے جانے کی فرمائش کی لیکن ان سہولتوں کے باوصف نتائج امید افزا نہیں رہے، سال پنجم کے ایک سو تیس

امیدواروں میں سے صرف تیس، ششم کے ایک سو چالیس امیدواروں میں سے صرف اڑتیس اور دورۂ حدیث کے دو سو اسی امیدواروں میں سے صرف ستر ہی امیدوار کامیاب ہوئے، البتہ ہفتم کے دو سو پچاس امیدواروں میں سے ایک سو بیالیس امیدوار کامیاب ہوئے۔

چونکہ امتحان داخلہ کی تمام کاپیاں کوڈ نمبر ڈال کر حضرات ممتحنین کے سپرد کی گئی تھیں اس لئے یہ بات تو یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ شرکاء امتحان کے سلسلے میں امتیاز کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اور یقیناً ناکام ہونے والے امیدوار اپنے ضعفِ استعداد ہی کی بنیاد پر ناکام رہے، اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگرچہ بعض مدارس عربیہ سے آنے والے تمام ہی امیدوار کامیاب ہو گئے لیکن ایسا بھی ہوا کہ بعض مدارس سے آنے والے امیدوار ______ سب ہی ناکام ہوئے، اکثر مدارس کے امیدواروں میں سے بعض ناکام اور بعض کامیاب ہوئے اور انہی مدارس کے اساتذہ نے تصدیق فرمائی کہ ناکام ہونے والے عام طور پر کمزور استعداد رکھتے تھے۔ امیدواروں کا یہ ضعف یقیناً محنت نہ کرنے ہی کا نتیجہ ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقتِ واقعہ ہے کہ معدودے چند طلباء استعداد کے باوجود تحریری امتحان کے تقاضوں کو پورا نہ کرنے کے سبب ناکام رہے، خط کی بدنمائی، املا کی غلطیاں، جوابات میں عبارت کی بے ربطی بھی ایسے امور ہیں جن کے سبب بعض امیدوار پرچۂ جوابات میں اپنی صحیح استعداد کا مظاہرہ نہیں کر پاتے۔

اس لئے مدارس عربیہ کے اساتذہ کرام اور ذمہ داروں سے خصوصی درخواست ہے کہ

۱۔ وہ سب سے پہلے طلباء عزیز کو تصحیح نیت کی طرف متوجہ فرمائیں کہ اس کے بغیر علمِ دین کے حصول کی کوشش ایک بے معنی بات ہے

۲۔ طلبائے عزیز کی استعداد سازی پر زیادہ سے زیادہ توجہ صرف فرمائیں، اسباق میں حاضری، نظام الاوقات کی پابندی، مطالعہ و تکرار کی نگرانی پر زور دیں۔

۳۔ نصابِ تعلیم کی تکمیل پر پوری توجہ مبذول فرمائیں، اور دارالعلوم کے نصابِ تعلیم کے مطابق طلبائے عزیز کو دارالعلوم کے شایانِ شان بنانے کی سعی بلیغ فرماتے رہیں۔

۴۔ تحسینِ خط اور تصحیح املا سے بھی غفلت نہ برتی جائے کہ تحریری امتحان میں صحیح استعداد کا اظہار ان آداب کے بغیر ممکن نہیں

۵۔ سوالات کے جواب لکھنے کا طریقہ بھی تلقین فرمایا جائے کہ مرتب اندازِ تحریر امیدواروں کی کامیابی میں بڑی حد تک معاون ہے

نیز یہ کہ تمام طلبہ ذہنی صلاحیت میں یکساں نہیں ہوتے لیکن محنت اور ذوق و شوق کے ساتھ اپنی زندگی کو علم کے لئے وقف کر دینا ایک ایسا عمل ہے جو تجربہ کی بنیاد پر کبھی ناکام نہیں رہا۔ اس وقت مدارس عربیہ کو ایک ایسی نازک صورت حال کا سامنا ہے کہ انھیں کامیاب مدرس دستیاب نہیں اور اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ

طلبائے عزیز میں محنت اور عرق ریزی کی وہ کیفیت نہیں ہے جو علوم عربیہ حاصل کرنے والوں کا طرۂ امتیاز رہی ہے

دارالعلوم دیوبند تمام ہی مدارس عربیہ کا مرکز اور مدارس میں کام کرنے والے علمائے کرام اور ذمہ داروں کی مادر علمی ہے اہم سب مل کر موجودہ تعلیمی انحطاط کے خلاف جد وجہد کرینگے تو انشاء اللہ بہت جلد اچھے نتائج حاصل ہوجائیں گے۔

اس سال بعض مدارس عربیہ کے ذمہ داروں نے اور کچھ باذوق طلبہ نے داخلہ نہ ہونے کے باوجود دارالعلوم میں قیام اور اسباق میں شرکت کی خواہش کا اظہار کیا چنانچہ ذمہ داران دارالعلوم نے اس سال سماعت یعنی اساتذہ دارالعلوم سے نجی رابطہ قائم کر کے اسباق میں شرکت کی اجازت دی ہے تاکہ یہ باذوق طلبہ، دارالعلوم کے اسباق میں شرکت کر کے، اپنے آپ کو دارالعلوم کے معیار کے مطابق تیار کر سکیں، یہ اجازت کوئی مستقل طریقہ کار نہیں ہے بلکہ عبوری طور پر استعداد سازی کا ایک تجربہ ہے، آئندہ سالوں میں شاید اس کی اجازت نہ دی جاسکے، اس لئے تمام مدارس میں تعلیم کے بہتر نظم کی طرف پوری توجہ کا منعطف کرنا ضروری ہے۔

ظاہر ہے کہ یہی طلبائے عزیز مستقبل کے معمار ہیں، مدارس عربیہ میں علم کے قصر شامخ کی تعمیر انہی کے ہاتھوں انجام پائے گی، ہندوستان اور بیرون ہند میں دعوت وتبلیغ اور اصلاح وارشاد کے تمام سلسلے انہی کے ذریعہ فروغ پائیں گے اور مسلمانوں کا علمی، دینی اور تبلیغی واصلاحی مستقبل انہی کے ذریعہ انشاءاللہ محفوظ ہوگا اس لئے مستقبل کی ان اہم ذمہ داریوں کے لئے انھیں تیار کرنا ہمارے فرائض منصبی میں ہے اور ہمیں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے ایک ایک فرد پر پوری طاقت صرف کر دینی ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں یہ کام بحمد اللہ شروع کر دیا گیا ہے، عام ضروریات زندگی تمام ہی طلباء کے لئے مہیا کی جارہی ہیں اور اچھے نمبرات حاصل کرنے والے صالح اور محنتی طلباء کی ہمت افزائی کیلئے متعدد منصوبے عمل میں لائے گئے ہیں، ہر جماعت میں اول، دوم اور سوم آنے والے طلباء کے لئے خصوصی وظائف کا اجراء کیا گیا ہے۔ اچھے کمروں کی تقسیم کے لئے عمدہ نمبرات کو معیار قرار دیا گیا ہے، وغیرہ، اس کے علاوہ بھی بعض منصوبے زیر غور ہیں جو انشاءاللہ مستقبل قریب میں عمل میں لائے جائیں گے۔

دینی تعلیم کے مستقبل کو زیادہ تابناک بنانے کی جد وجہد میں بعض رفقاء کو شکایت بھی ہوئی ہے کہ ان کے امیدوار محض سفارش کی بنیاد پر نہیں لئے گئے ہیں، لیکن خداوند قدوس کے فضل وکرم سے امید ہے کہ یہ شکایت مستقبل کی تعمیر کی جد وجہد کے لئے مفید رہے گی، انشاءاللہ۔

دعا ہے کہ جس قادر وقیوم نے نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض علم سے پرورش فرمائی ہے وہ آپ کی امت کے فرزندوں کو بھی علم دین کے چشموں سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب فرمائے۔ آمین

اسلام میں سنت و حدیث کا تشریعی مقام

از محدث کبیر علامۃ العصر مولانا محمد یوسف بنوری رح

وضع حدیث اعدائے اسلام نے احادیث نبویہ اور سنت مطہرہ سے مسلمانوں کے اس شغف اور والہانہ فریفتگی کو دیکھ کر اسلام کے اس بیش بہا سرمایہ یعنی ذخیرۂ احادیث کو ناکارہ بنانے کی ایک اور شیطانی راہ اختیار کی کہ خود ساختہ حدیثیں اور من گھڑت روایتیں صحیح احادیث و روایات کے ساتھ خلط کر کے مسلمانوں میں پھیلانی شروع کر دیں اور موقعہ بموقعہ اس کا اعلان بھی کیا کہ ہم نے اتنے ہزار موضوع حدیثیں صحیح احادیث کے ساتھ ملا کر شائع کر دی ہیں اور وہ محدثین کے حلقہ ہائے درس حدیث میں متداول ہیں اس دجل و فریب کا منشا صرف یہ تھا کہ صحیح اور ضعیف احادیث کے خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے تمام ہی ذخیرۂ احادیث سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ جائے اور دین اسلام کی یہ محکم عمارت زمین بوس ہو جائے

لیکن اللہ جل شانہ نے اپنے دین اور سنن سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حفاظت و صیانت اور بقاء و دوام کے لئے ایسے رجال کار پیدا فرمائیے جنھوں نے نقد حدیث اور تمیز صحیح و ضعیف کے لئے مستقل علوم و فنون مدون کر دیئے جن کی تعداد ایک سو علوم کے قریب تک پہنچتی ہے نیز راویان حدیث کی چھان بین اور جرح و تعدیل کی غرض سے ایک مستقل علم علم اسماء الرجال۔ یعنی تاریخ راویان حدیث۔ مدون کر دی جس کو سامنے رکھ کر علماء جرح و تعدیل نے بآسانی ایک ایک راوی حدیث پر ثقہ یا ضعیف یا کذاب و وضاع حدیث ہونے کا حکم لگایا اور اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا اور اس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ اعداء اسلام کی آخری کوشش بلکہ سازش ناکام ہو کر رہ گئی بلکہ حدیث کے بقاء و دوام کے لئے محافظ علوم وجود میں آگئے۔ ع

خدا شرے برانگیزد کہ خیرے ما درآں باشد

بلاشبہ دین اسلام ابدی دین تھا قیامت تک کی آنے والی نسلوں کے لئے سرچشمۂ ہدایت تھا اس لئے ضروری تھا کہ دین اسلام کی دونوں مشعلیں۔ کتاب و سنت کہئے یا قرآن

وحدیث ـ بھی روشن رہیں اور ہر قسم کے طوفانوں، آندھیوں اور جھگڑوں سے ان کو محفوظ رکھا جائے تاکہ حق تعالیٰ کی حجت نوع انسانی پر پوری ہو اور قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ اولادِ آدم کے کانوں میں گونجتی اور دلوں کو جھنجھوڑتی رہے، ارشاد ہے:۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيَاتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ـ (آل عمران)	"اور تم کس طرح کفر اختیار کر سکتے ہو درآں حالیکہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں تمہیں برابر پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں" اور تم میں اللہ کا رسول بھی (موجود) ہے

اور فرمان نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اسی حقیقت کا اظہار اس طرح فرمایا گیا ہے"

تركت فيكم امرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما كتابُ اللهِ وسنةُ رسوله (موطا مالک)	میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے جب تک ان کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو گے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ـ

الغرض اس کا کوئی امکان نہیں کہ کتاب وسنت کہئے یا قرآن وحدیث یا اللہ ورسول دونوں میں سے ایک کو دوسرے سے الگ کر سکیں اور اس کا بھی کوئی امکان نہیں کہ قرآن کریم پر ایمان کا دعویٰ کیا جائے اور سنت نبویہ یا احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا انکار کیا جائے، دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ پر ایمان کا دعویٰ کیا جائے اور رسول کے ماننے سے انکار

قرآن عظیم بار بار اس حقیقت کا اظہار اور اعلان کرتا ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان اور ان کی اطاعت واتباع میں انسانیت کی نجات مضمر ہے اور ان کی رسالت کے انکار ومخالفت اور نافرمانی میں انسانیت کی ہلاکت وتباہی مضمر ہے ـ رسول کی مخالفت، عداوت اور نافرمانی پر سخت سخت وعیدیں سناتا ہے ـ امت کے لئے رسول کو خدا پرستی کا اُسْوَہ اور نمونہ قرار دیتا ہے ـ قرآن کی تعلیم، اس کے معنی ومفہوم کی تعیین، اجمال کی تفصیل، ابہام کی وضاحت عبادات واحکام کی عملی تشکیل اور متعلقہ واقعات کا بیان کرنا ـ رسول کا مخصوص منصبی فرض بتلاتا ہے تاآنکہ رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت اور رسول کی مخالفت ونافرمانی کو اللہ کی مخالفت ونافرمانی قرار دیتا ہے بلکہ غور وتدبر کے ساتھ قرآن کے مطالعے سے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے

۔نجات وسعادت اور فلاح وبہبود سب کچھ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ومتابعت میں منحصر ہے نہ صرف یہ بلکہ بندہ کی حق تعالیٰ سے محبت اور حق تعالیٰ کی بندہ سے محبت دوطرفہ محبت ـــ کا معیار بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور متابعت کے بغیر میسر نہیں ہے ارشاد ہے :۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔

"(ان سے) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بھی معاف فرما دے گا۔

بہر حال ہوا یہ کہ تمام فرق باطلہ ـــ خوارج، روافض، شیعہ، اور معتزلہ، قدریہ، مرجیہ جہمیہ وغیرہ نے سنت وحدیث کے خلاف جو زہر اگلا تھا ہر دور میں ملاحدہ وزنادقہ وہی زہر نئی نئی شکلوں اور صورتوں میں اگلتے رہے ہیں اور امام ابوحنیفہ، امام شافعی کی مجاہدانہ کوششوں نے اور ان کے بعد کے تمام متکلمین امت کی مساعی نے ان کے دندان شکن اور مسکت جوابات دیئے ہیں اور اہل باطل کے حوصلے پست کر دیئے ہیں ۔

مستشرقین کی حدیث دشمنی

مستشرقین یورپ نے بھی صلیبی لڑائیوں میں فیصلہ کن شکست کے بعد انہی ہتھیاروں سے اور اسی محاذ سے اسلام کی بیخ کنی شروع کر دی اور از راہ دجل وفریب "سائنٹفک ریسرچ" (علمی تحقیقات) کے نام سے حدیث وسنت کے خلاف ایک منظم مہم چلائی اور جو زہر قدیم فرق باطلہ نے اگلا تھا از سر نو نئی نئی بوتلوں میں بھر کر اور اسلامی "علمی تحقیقات کا لیبل" لگا کر یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والی سادہ لوح اور اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ نئی نسل کے حلق سے اتارنے کی کوشش کی کبھی یہ کہا کہ "یہ احادیث تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دو سو برس بعد قلمبند ہوئی ہیں ان کا اعتبار کیا"، اور کبھی حاملین حدیث صحابہ کرام اور رجال حدیث تابعین وائمہ حدیث کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا اور بے سروپا الزامات لگائے اور کبھی عقل کو معیار تنقید بنا کر صحیح حدیثوں

(بقیہ صفحہ ۴۷) ایک بزرگ نے کیا خوب کہا ہے

"ہمارے اسلاف ہم سے زیادہ حقیقت اور زمانہ شناس تھے، ان کا ہاتھ اور ان کی انگلیاں زمانہ کی اور ملت کی نبض پر رہتی تھیں۔ اور ہماری انگلیاں نبض سے ہٹ گئی ہیں اور ہمیں معلوم نہیں کہ نبض کس طرح چلتی ہے"

(داستان شوق ابھی ناتمام ہے)

پر عقلی شبہات و وساوس کا طوفان باندھا اور ان راستوں سے تمام اسلام کے اساسی معتقدات میں ۔۔۔ ملائکہ، جنات، شیاطین، ارواح، عذاب قبر، جزاء وسزا، اعمال، جنت، دوزخ وغیرہ عقائد میں ۔۔۔ نوبنو تاویلات کے دروازے کھولنے کی کوشش کی اور عبادات میں نماز و اوقات نماز، زکوٰۃ و نصاب زکوٰۃ، روزہ، ارکان حج، قربانی وغیرہ عبادات میں نئے نئے شکوک وشبہات پیدا کرنے شروع کئے اور معاملات ۔۔۔ بیع وشراء، حرمت ربا، حدود وقصاص وغیرہ معاملات میں تحریفات وتشویہات پیدا کرنے کی کوششیں کیں، سود کو "منافع" نام رکھ کر جائز وحلال بنادیا اور شراب کو "آب جو" کہہ کر جائز کردیا غرض تمام متوارث احکام شرعیہ جن پر تیرہ سو سال سے مسلمان عمل کرتے چلے آرہے تھے نئے نئے اسلوب اور نئے انداز سے ان پر حملے کرکے پورے دین اسلام کی عمارت کو متزلزل کرنے کی جدوجہد میں زور قلم صرف کردیا ہر ہر موضوع پر تصنیفات وتالیفات کے انبار لگادیئے اور یورپ کی تمام یونیورسٹیوں میں اسلامی موضوعات پر پی ایچ ڈی (تخصص) کے شعبے قائم کردیئے یہودی اور عیسائی پروفیسر ذوعمر اور سادہ لوح طالب علموں کے ذہن مسخ کرنے کے لئے سنفرر کردیئے اور دامے، درمے، قلمے پورا زور اسلامی تعلیمات کو تباہ کرنے اور نئی نسل کو اسلام سے متنفر کرنے پر صرف کردیا۔

لیکن خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے امت کو خبردار کرنے کے لئے یہ اعلان ہوچکا تھا۔

یحمل ھذا العلم من کل	"اس علم دین کی امانت کو نسلاً بعد نسل
خلف عدولہ ینفون	امت کے برگزیدہ اہل علم اٹھاتے
عنہ تحریف الغالین	رہیں گے جو حد سے تجاوز کرنے والوں کی
وانتحال المبطلین و	تحریفوں اور اہل باطل کی دینی چوریوں اور جاہلوں
تاویل الجاھلین۔	کی تاویلوں کا پردہ چاک کریں گے"

اس لئے حق تعالیٰ نے امت کے ہر دور اور ہر عہد میں ایسے "عظماء رجال" اور رہنمایان دین "رجال کار" پیدا فرمائے جنھوں نے دشمنان دین کے تمام اعتراضات کے دندان شکن جوابات دیئے ہیں اور شکوک وشبہات کا ایسا تار وپود بکھیرا ہے اور منافقانہ ومعاندانہ اغراض کا ایسا پردہ چاک کیا ہے کہ ہمیشہ ذلیل ورسوا ہوئے ہیں اور مسلمانوں نے ان کو نکو بنا کر چھوڑا ہے

حفاظت حدیث

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر امیر ابن وزیر یمانی صاحب الروض الباسم تک اور شیخ جلال الدین سیوطی صاحب مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ تک اور اس کے بعد سے لے کر آج تک نہ صرف عربی اور اردو میں بلکہ انگریزی اور یورپ کی زبانوں میں بھی قابل قدر تصنیفات و تالیفات مخالفین حدیث و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب اور منکرین حدیث و سنت کے رد میں لکھی جا چکی ہیں۔

ہمارے اس انحطاط پذیر دور میں بھی اس پچاس سال کے عرصہ میں اسی موضوع پر بیسیوں گراں بہا تصانیف علمی کتب خانوں میں بیش بہا اضافہ کا موجب ہوئی ہیں، قدماء امت نے جو چھوٹی بڑی کتابیں اس موضوع پر تصنیف فرمائی ہیں ان کی مکمل فہرست تو راقم الحروف کی تالیف عوارف المنن مقدمۃ معارف السنن میں مذکور ہے جو عربی، اردو، انگریزی تینوں زبانوں میں ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب طبع ہوگی باقی اس پچاس سال بلکہ تیس چالیس برس کے اندر اندر جو ذخیرہ اس موضوع پر آگیا ہے قارئین کی واقفیت کے لئے اس میں سے بطور نمونہ چند کتابوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

۱۔ الحدیث والمحدثون	تالیف	محمد محمد ابو زھو	عربی
۲۔ السنۃ قبل التدوین	"	محمد عجاج خطیب	"
۳۔ الانوار الکاشفۃ	"	شیخ عبدالرحمان یمانی	"
۴۔ ظلمات ابی ریۃ	"	شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ	"
۵۔ کتاب السنۃ	"	موسیٰ جار اللہ قازانی	"
۶۔ فی الحدیث النبوی	"	شیخ مصطفیٰ زرقا شامی	"
۷۔ تدوین حدیث	"	مولانا مناظر احسن گیلانی	اردو
۸۔ بصائر السنۃ	"	مولانا امین احسن اصلاحی (؟) طوروی	عربی
۹۔ فتنۂ انکار حدیث	"	مولانا افتخار احمد بلخی	اردو
۱۰۔ فتنۂ انکار حدیث	"	مولانا سرفراز صاحب گوجرانوالہ	عربی
۱۱۔ سنت قرآن کریم کی روشنی میں	"	مولانا عبدالغفار حسن صاحب	اردو
۱۲ حدیث قرآن کی نظر میں		مقالہ شائع شدہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۱۹۵۲ء از راقم الحروف	اردو

۱۳۔ احادیث النبی الکریم	تالیف	پروفیسر روحی		اردو
۱۴۔ سنت کا تشریعی مقام قرآن کریم کی روشنی میں	″	مولانا محمد ادریس میرٹھی		″
۱۵۔ احادیث النبی الکریم	″	ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی		انگریزی

مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی کے درجہ تخصص فی الحدیث کے رفقاء نے حسب ذیل مقالات کتابی شکل میں مرتب کئے ہیں

۱۔ السنۃ النبویۃ والقرآن الکریم	از الاستاذ محمد حبیب اللہ المختار	عربی، اردو
۲۔ وسائل حفظ الحدیث وجهود الأئمۃ فیہ	″ مولوی عبدالحکیم سلہٹی	اردو
۳۔ کتابۃ الحدیث وادوار تدوینہ	″ مولوی محمد اسحٰق ڈھاکوی	″
۴۔ الکتب المدونۃ فی الحدیث واصنافها وخصائصها	″ مولوی محمد زماں کلاچوی	عربی
۵۔ علم مصطلح الحدیث وأسماء الرجال وثمراتہ	″ مولوی عبدالحق دیروی	″
۶۔ الصحابۃ وما روو وہ من الاحادیث	″ مولوی حبیب اللہ مہندی	″

یہ چھ کتابیں ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہیں[1] جس وقت امت کے سامنے یہ ذخیرہ اور حفاظت حدیث کی خدمت آجائے گی تو انشاء اللہ تعالیٰ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کے اساتذہ و متخصص طلبہ بھی حامیان سنت وحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمرہ میں شامل ہونے کا شرف حاصل کر سکیں گے وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ

بقیہ صفحہ ۱۳

قالوا یٰشعیب اصلوتک تامرک ان نترک مایعبد اٰباؤنا او ان نفعل فی اموالنا مانشاء ط انک لانت الحلیم الرشید (هود رکوع ۸)	وہ لوگ کہنے لگے کہ اے شعیب کیا تمہارا تقدس تم کو تعلیم کر رہا ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں۔ یا اس بات کو چھوڑ دیں کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں تصرف کریں واقعی آپ بڑے عقلمند دین پر چلنے والے ہیں۔

---

[1] مذکورہ مقالات میں سے اول الذکر مقالہ الحمدللہ اب طبع ہو چکا ہے۔ مرتب

تقلید اور اجتہاد

از حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و العاقبۃ للمتقین و الصلوٰۃ و السلام علیٰ سیدنا و مولانا محمد خاتم الانبیاء و المرسلین و علیٰ آلہ و اصحابہ و ازواجہ و ذریاتہ اجمعین و علینا معھم یا ارحم الراحمین۔ اما بعد۔ مسئلہ تقلید اور اجتہاد کے متعلق یہ ایک مختصر تحریر ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ طالبان حق کے لئے مفید ہوگی۔ اور خدا کے فضل سے ناظرین پر یہ امر بخوبی واضح ہو جائے گا کہ ائمہ حدیث کی نظر میں ائمہ اجتہاد کا کیا رتبہ تھا اس لئے استدلال میں اکثر و بیشتر حضرات محدثین ہی کے اقوال نقل کئے ہیں اور سب سے بڑا شاہد عدل خود حضرات محدثین کا عمل ہے، سوائے معدودے چند کے تمام محدثین اور تمام اولیاء اللہ اور عارفین ائمہ اربعہ کے تقلید ہی کرتے چلے آئے طبقات الحنفیہ اور طبقات المالکیہ اور طبقات الشافعیہ اور طبقات الحنابلہ پڑھ ڈالئے اور حضرات محدثین کی فہرست بنا لیجئے اور دیکھئے کہ کتنے محدث تقلید سے باہر رہے، صرف ابن حزم اور شوکانی جیسے چند ہی تقلید سے باہر نظر آئیں گے۔ ابن حزم اور ز اہل فہم نے ہمیشہ تقلید ہی کی۔

ہندوستان ہی میں دیکھ لیجئے کہ جس قدر اکابر علماء اور اکابر اولیاء گذرے وہ سب امام اعظم امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ ہی کے مقلد گذرے شیخ علی متقی صاحب کنز العمال متوفی ۹۷۵ھ اور شیخ عبد الاول جونپوری صاحب فیض الباری شرح بخاری متوفی ۹۸۵ھ اور شیخ عبد الوہاب برہانپوری متوفی ۱۰۰۱ھ اور شیخ محمد طاہر گجراتی صاحب مجمع البحار متوفی ۹۸۶ھ اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی شارح مشکوٰۃ متوفی ۱۰۵۲ھ اور پھر ان کے صاحبزادے شیخ نور الحق صاحب تیسیر القاری شرح فارسی صحیح بخاری متوفی ۱۰۷۲ھ پھر ان کے صاحبزادے شیخ فخر الدین شارح حصن حصین وغیرہ اور پھر ان کے بیٹے شیخ الاسلام شارح صحیح بخاری بزبان فارسی جو طبع ہو چکی ہے اور پھر ان کے بیٹے شیخ سلام اللہ شارح موطا مسمی بہ محلّیٰ اجو اب تک طبع نہیں ہوئی نہایت نفیس شرح ہے

اور دارالعلوم کے کتب خانہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے اور کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں بھی اس کا ایک نسخہ ہے، یہ سب حضرات محدث تھے اور سب حنفی تھے

علماء سندھ کو لے لیجئے شیخ ابوالحسن سندی اور شیخ عابد سندی اور شیخ ہاشم سندی اور شیخ حیات سندی وغیرہم جنھوں نے صحاح ستہ اور کتب حدیث پر حواشی لکھے اور مدینہ منورہ میں جا کر درس حدیث دیا۔ یہ سب حضرات حنفی تھے۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی اور شاہ رفیع الدین اور شاہ محمد اسحق یہ سب حضرات حنفی تھے۔ یہ ہندوستان کے تین صدی کے اکابر محدثین کے نام ہیں جن کے محدث ہونے میں حضرات اہل حدیث کو بھی کوئی شبہ اور تردد نہیں کیا یہ سب حضرات کفر اور شرک میں مبتلا تھے۔ یہ سلسلہ تو محدثین کا تھا۔ اولیاء ہند کو لے لیجئے حضرت مجدد صاحب سرہندی سے لے کر جتنے اولیاء اللہ گذرے وہ سب امام ابوحنیفہ کے مقلد گذرے اہل فہم کے لئے مسئلہ میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں، لیکن ایک نئے عنوان اور نئے طرز سے اس ناچیز نے یہ چند اوراق لکھ دیئے ہیں۔ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحمت سے ان کے موجب ہدایت بنائے۔ آمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عقل اور حافظہ

حق جل شانہ کی نعمتوں کو کون شمار کر سکتا ہے اس کی نعمتوں کی کوئی حد اور نہایت نہیں۔ اس وقت خداوند ذوالجلال کی بے شمار اور غیر محصور نعمتوں میں سے دو اہم نعمتوں کا ذکر مقصود ہے حق تعالیٰ نے اپنے خزائن رحمت سے اس انسان ضعیف البیان کو دو خاص نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ اول عقل اور پھر حافظہ عقل کو ادراک و معرفت کے لئے پیدا کیا اور حافظہ کو اس معرفت کی حفاظت کے لئے۔

عقل اول المخلوقات ہے

حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اول ما خلق اللہ العقل فقال له اقبل فاقبل ثم قال له ادبر فادبر ثم قال وعزتی وجلالی ما خلقت خلقا اکرم علی منك بك آخذ وبك اعطی وبك اثیب وبك اعاقب قال الحافظ العراقی

سب سے پہلے حق تعالیٰ نے عقل کو پیدا فرمایا پھر اس کو حکم دیا کہ سامنے ہو وہ سامنے ہو گئی پھر حکم دیا کہ پشت پھیر۔ اس نے پشت پھیری پھر فرمایا قسم ہے میری عزت اور جلال کی میں نے کوئی مخلوق تجھ سے افضل اور بہتر نہیں پیدا کی تیرے ہی ذریعہ سے

وقال عبد اللہ بن احمد فی زوائد الزہد حدثنا علی بن مسلم حدثنا سیار حدثنا (بقیہ صفحہ ۴۱)

روی من حدیث ابی امامۃ وعائشۃ و ابی ھریرۃ و ابن عباس و الحسن وعدۃ من الصحابۃ والتفصیل فی شرح الاحیاء صفحہ ۴۵۳ ج ۱

مواخذہ اور داد و دہش کروں گا اور تیرے ہی سبب سے ثواب دوں گا اور تیری ہی سبب سے عقاب دوں گا۔

اَقْبِلْ اور اَدْبِرْ کے لفظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ عقل کے لئے ایک اقبال ہے اور ایک ادبار، جو لوگ اللہ کے نزدیک صاحب اقبال ہیں وہ اقبال کے وارث ہوئے یعنی اصحاب الیمین اور اہل جنت ہوئے اور جو لوگ خدا کے نزدیک صاحب ادبار ہیں وہ ادبار کے وارث ہوئے یعنی اصحاب الشمال اور اہل نار ہوئے اور یہ اقبال وادبار کا امر تکوینی تھا نہ کہ تشریعی، امر تکوینی ہر خیر و شر کو شامل اور متناول ہے اور امر تشریعی طاعت کے ساتھ مختص ہے اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کی تقسیم امر تکوینی ہی میں ممکن ہے پس اگر یہ امر تشریعی ہوتا تو اطاعت کی وجہ سے اقبال اور ادبار والے سب ہی اصحاب الیمین بن جاتے۔ فافھم ذلک استقر فانہ دقیق ولطیف۔

عقل کی حقیقت اور اس کے اقسام

امام غزالی نے حارث محاسبی سے عقل کی تعریف حسب ذیل نقل کی ہے۔

انہ غریزۃ یتھیأ بھا ادراک العلوم النظریۃ وکأنہ نور یقذف فی القلب بہ یستعد لادراک الاشیاء۔ کذا فی الاحیاء والاتحاف صفحہ ۴۵۹ ج ۱

عقل ایک قوت غریزہ ہے کہ جس کی وجہ سے انسان علوم نظریہ کے ادراک کیلئے مستعد ہوجاتا ہے عقل گویا کہ ایک نور ہے جو منجانب اللہ دل میں ڈالا جاتا ہے جسکی وجہ سے قلب ادراک کے قابل ہوجاتا ہے۔

اور کبھی کبھی عقل کا اطلاق ان علوم پر بھی کر دیا جاتا ہے کہ جو اس قوت سے مستفاد ہوں جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے۔

اَلْعَقْلُ عَقْلَانِ مَطْبُوْعٌ وَمَسْمُوْعٌ

عقل کی دو قسمیں ہیں ایک طبعی اور ایک سمعی

(بقیہ صفحہ ۱۳) جعفر حدثنا مالک بن دینار عن الحسن یرفعہ لما خلق اللہ العقل قال لہ اقبل فاقبل ثم قال لہ ادبر فادبر ثم قال ما خلقت شیئا احسن منک بک آخذ بک اعطی فھذا کما تری سند جید فقول الحافظ العراقی و بالجملۃ فطرقہ کلھا ضعیفۃ محل تامل وکذا ایراد ابن الجوزی فی الموضوعات وتبعہ ابن تیمیۃ والزرکشی وغیرھم لا وفقایۃ مایقال فیہ انہ ضعیف فی بعض طرقہ کذا فی الاتحاف صفحہ ۴۵۵ ج ۱۔

وَلَا يَنْفَعُ مَسْمُوعٌ إِذَا لَمْ يَكُ مَطْبُوعٌ

عقل سمعی۔ اس وقت تک نافع اور مفید نہیں ہوتی جب تک کہ عقل فطری اور طبعی اس کے ساتھ نہ ہو

كَمَا لَا تَنْفَعُ الشَّمس وضَوْءُ الْعَيْنِ مَمْنُوعٌ

جیسا کہ آفتاب کی روشنی اس وقت تک مفید نہیں ہوتی جب تک کہ آنکھ میں روشنی نہ ہو۔ اور اسی کا کسی نے اردو میں کیا خوب ترجمہ کیا ہے۔

دو ہیں عقلیں میرے نزدیک اے بسر ایک طبعی ایک سمعی یاد کر
فائدہ سمعی سے کچھ ہوتا نہیں جب نہ ہو طبعی کا دل میں کچھ اثر
جیسے سورج سے نہیں کچھ منفعت گر نہ ہووے آنکھ میں نور نظر

نور عقل کو نور شریعت سے وہی نسبت ہے جو نور بصر کو نور آفتاب سے ہے آنکھ کتنی ہی روشن اور دوربین کیوں نہ ہو مگر جب تک آفتاب کی روشنی نہ ہو اس وقت تک آنکھ بیکار ہے اسی طرح نور عقل بدون نور شریعت کے معطل اور بیکار ہے اور جس طرح اندھے کو آفتاب کی روشنی مفید نہیں۔ اسی طرح آفتاب شریعت کے نور سے وہی مستفید ہو سکتا ہے جس کی عقل کی آنکھ روشن ہو آنکھ میں اگر روشنی نہیں تو آفتاب اور ماہتاب کیا کام آویں جس کی آنکھ میں روشنی نہ ہو اس کو چاہیئے کہ کسی آنکھ والے کی سنے اور اسی کا اتباع کرے جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ کافر قیامت کے روز یہ کہیں گے۔ لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو دوزخ والوں میں نہ ہوتے

غرض یہ ہے کہ علم اور حکمت فہم و فراست تفکر اور تدبر اور رضاء خداوند ذوالجلال کی معرفت اور اس کی اطاعت اور اس کی خشیت اور اس کی محبت اور رغبت اور رہبت وغیرہ وغیرہ ان تمام فضائل وکمالات کا منبع اور مطلع عقل ہی ہے۔ انبیاء مرسلین کے توسط سے خداوند ذوالجلال کے جو احکام نازل ہوئے ان سب کی مخاطب عقل ہے حافظہ کا کام یہ ہے کہ ان احکام کو یاد رکھے تاکہ تعمیل میں ذہول اور غفلت نہ ہو۔ قال تعالیٰ:۔ واتقون یا اولی الالباب۔ ولیذکر اولوا الالباب۔ فاتقوا اللہ یا اولی الالباب ان فی ذلک لآیات لقوم یعقلون۔ کذلک نفصل الآیات لقوم یعقلون۔ قد فصلنا الآیات لقوم یفقهون۔ لهم قلوب لا یفقهون بها۔ ذلک بانهم قوم لا یفقهون۔ وطبع علی قلوبهم فهم لا یفقهون۔ بل کانوا لا یفقهون الا قلیلا۔ ان فی ذلک لآیات لاولی النهی هل فی ذلک قسم لذی حجر۔ وغیر ذلک فی الآیات۔

قرآن کریم میں اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ ایمان اور تقوی اور تمام

احکام الہیہ کے مخاطب اولی الالباب اور اہل عقل ہیں

ان المکارم اخلاق مطہرۃ ذا العقل اولها والدین ثانیها

مکارم پاکیزہ اخلاق کا نام ہے جن میں سے عقل اول ہے اور دین ثانی ہے۔

والعلم ثالثها والحلم رابعها والجود خامسها والعرف سادسها

اور علم تیسرا اور حلم چوتھا اور جود وکرم پانچواں اور احسان چھٹا

والبر سابعها والصبر ثامنها والشکر تاسعها واللین عاشیها

اور بر۔ یعنی نیکی ساتواں اور صبر آٹھواں اور شکر نواں اور نرمی دسواں خلق ہیں۔ ادب الدنیا والدین للماوردی صفہ ۶ فتلک عشرۃ کاملہ۔

وقال ابراہیم ابن حسان ؎

یزین الفتی فی الناس صحۃ عقلہ وان کان محظورا علیہ مکاسبہ

عقل کا صحیح ہونا انسان کے لئے زینت ہے اگرچہ وہ معاشی فوائد سے ممنوع اور محروم ہو

یشین الفتی فی الناس قلۃ عقلہ وان کرمت اعراقہ ومناسبہ

اور عقل کی کمی آدمی کے لئے عیب ہے اگرچہ حسب ونسب کے اعتبار سے کریم اور شریف ہو

یعیش الفتی بالعقل فی الناس انہ علی العقل یجری علمہ وتجاربہ

عقل ہی کے ذریعے سے انسان زندگی بسر کرتا ہے اور عقل ہی سے علم اور تجربہ حاصل ہوتا ہے

وافضل قسم اللہ للمرء عقلہ فلیس من الاشیاء شیء یقاربہ

انسان کے لئے اللہ کی تقسیم میں سے سب سے بہتر تقسیم عقل کی ہے کوئی شے اس کے قریب بھی نہیں

اذا اکمل الرحمٰن للمرء عقلہ فقد کملت اخلاقہ ومآربہ

جب اللہ تعالیٰ کسی کی عقل کو مکمل فرما دیں تو اس کے تمام اخلاق اور دیگر ضروریات بھی کامل ہو جاتی ہیں

ادب الدنیا والدین صفہ ۳

علم اور حفظ علم۔ عقل کا ثمرہ اور پھل ہے۔ اور حفظ قوت حافظہ کا عمل ہے شریعت کی نظر میں عالم وہی ہے جو صاحب عقل اور فہم ہو۔

کما قال تعالیٰ وتلک الامثال نضربها۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں مگر للناس وما یعقلها الا العالمون ان مثالوں کو علم والے ہی سمجھتے ہیں۔

عمرو بن مرہ سے مروی ہے کہ جب میں کسی آیت پر گذرتا ہوں اور اس کی تفسیر میری سمجھ میں

نہیں آتی تو غمگین ہوتا ہوں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وما یعقلها الا العالمون حضرات صحابہ میں ابوہریرہؓ سب سے زیادہ حافظ حدیث تھے اور ابوبکر صدیق نہایت قلیل الروایت تھے مگر حضرات صحابہ بالاتفاق ابوبکر صدیقؓ کو اَعْلَمُ (سب سے بڑا عالم) سمجھتے تھے اس لئے کہ عقل اور فہم میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا چونکہ وہ نبی امی فداہ نفسی وابی وامی کے یار غار اور ثانی اثنین اذ هما فی الغار کے مصداق تھے۔ اس لئے وہ امت میں لاثانی ہوئے۔ ابی بن کعبؓ اقرأ اور سید القراء تھے مگر ابن عباس اعلم بالتفسیر تھے اور خیر القرون میں جرات اور ترجمان القرآن کے لقب سے ممتاز اور سرفراز ہوئے اسی فہم و فراست کی وجہ سے ابن عباسؓ کو امیر المومنین عمر بن الخطابؓ کی مجلس میں وہ رفعت اور منزلت حاصل تھی جو حضرات بدریین کو حاصل نہ تھی۔

حق تعالیٰ شانہ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے قصے میں فرماتے ہیں۔

ففهمناها سلیمان وکلاً اتینا حکما وعلما — اس واقعہ کے متعلق ہم نے سلیمان کو خاص فہم عطا کیا ورنہ یوں تو ہم نے دونوں ہی کو علم و حکمت دیا تھا۔

وقال علی ابن ابی طالبؓ وقد سئل هل خصکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشیٔ دون الناس فقال لا والذی فلق الحبة وبرأ النسمة الا فهما یوتیه اللہ عبداً فی کتابه وما فی هذه الصحیفة وفی کتاب عمر بن الخطاب لابی موسی الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنهما۔ فالفهم فالفهم فیما ادلی الیک فالفهم نعمة من اللہ علی عبده ونور یقذفه اللہ فی قلبه یعرف به ویدرک ما لا یدرکه غیره ولا یعرف فیفهم من النص ما لا یفهمه غیره مع استوائهما فی حفظه وفهم اصل

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو کوئی خاص چیز بتلائی ہے جو اوروں کو نہیں بتلائی فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ کو پھاڑا اور ذی روح کو پیدا کیا سوائے فہم و فراست کے ہمارے پاس کوئی خاص شئی نہیں اور فہم محض اللہ کا عطیہ ہے جس بندے کو چاہے عطا کرے اور اس صحیفہ میں کچھ احکام ہیں۔ جو آں حضرت نے لکھوائے تھے سو وہ کوئی خاص شئی نہیں سب مسلمانوں کے لئے ہیں اور حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ کو جو خط لکھا اس میں یہ بھی تھا کہ فہم وہ شئی ہے کہ جو منجانب اللہ تیری طرف ڈالی جائے پس فہم بندہ پر اللہ کی ایک نعمت ہے اور اس کا ایک نور ہے جس کو اپنے بندہ کے دل میں ڈالتا ہے جس کے ذریعہ سے بندہ ان چیزوں کا ادراک کرتا ہے جن کا دوسرا شخص ادراک نہیں کر سکتا۔ اور نصوص قرآن

معناه فالفهم عن الله ورسوله عنوان الصديقية ومنشور الولاية النبوية وفيه تفاوتت مراتب العلماء حتى عد الف بواحد فانظر الى فهم ابن عباس وقد سأله عمر و لمن حضر من اهل بدر وغيرهم عن سورة اذا جاء نصر الله والفتح وما خص به ابن عباس من فهمه منها نعي الله سبحانه نبيه الى نفسه واعلامه بحضور اجله وموافقة عمر له على ذلك و خفاؤه عن غيرهما من الصحابة وابن عباس اذ ذلك احدثهم سنا واين تجد في هذه السورة الاعلام باجله لولا الفهم الخاص ويدق هذا حتى يصل الى مراتب تتقاصر عنها افهام اكثر الناس فيحتاج مع النص الى غيره ولا يقع الاستغناء بالنصوص في حقه واما في حق صاحب الفهم فلا يحتاج الى غيرها (مدارج السالكين ج ۱ ص ۲۳ للحافظ ابن القیم)

و حدیث سے وہ باتیں سمجھتا ہے جو دوسرا نہیں سمجھتا حالانکہ حافظ اور اصل معنی سمجھنے میں دونوں برابر ہوتے ہیں پس فہم و فراست صدیقیت کا عنوان اور ولایت کا پروانہ ہے اسی کی وجہ سے علماء کے مراتب میں تفاوت ہوتا ہے حتی کہ ہزار عالم مل کر ایک کے برابر ہوتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فہم کو دیکھو کہ حضرت عمرؓ نے صحابہ بدریین کی موجودگی میں ابن عباسؓ سے اذا جاء نصر اللہ والفتح کی تفسیر دریافت کی تو ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سورۃ میں آپ کی وفات کی خبر دی گئی ہے حضرت عمر نے اس کی تصدیق کی اکابر صحابہ پر یہ بات مخفی رہی اور ابن عباس رضی اللہ عنہ جو عمر میں سب سے کم تھے وہ سمجھ گئے۔ سورۃ کے ظاہر الفاظ سے کہیں وفات کی خبر نہیں معلوم ہوتی اگر فہم خاص نہ ہوتا تو یہ معنے سمجھ میں نہ آتے معلوم ہوا کہ محض نص اور روایت کا وجود کافی نہیں جب تک فہم نہ ہو سورۃ تو سب کو یاد تھی اور ظاہر الفاظ کا ترجمہ بھی سب جانتے تھے مگر اس فہم خاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ابن عباسؓ کو مخصوص فرمایا تھا وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

شریعت کے لئے محدثین اور فقہا کی ضرورت

دین کا دارومدار دو چیزوں پر ہے۔ ایک نقل صحیح اور ایک فہم صحیح لہذا ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے کہ جو شریعت کے الفاظ کی محافظ ہو اور الفاظ شریعت کو تمام و کمال امت تک پہونچا دے یہ جماعت محدثین کی ہے۔

اور ایک جماعت ایسی چاہیئے کہ جو شریعت کے اغراض و مقاصد اور اصول و فروع کی توضیح و تشریح کرے اور اللہ اور اس کے رسول کی صحیح صحیح مراد امت کو سمجھائے یہ جماعت فقہاء اور

مجتہدین کی ہے۔ حافظ ابن قیم فرماتے ہیں۔

فلما كانت الدعوة الى الله والتبليغ عن رسوله شعار حزبه المفلحين وكان التبليغ عنه تبليغ الفاظه وتبليغ معانيه كان العلماء من امته منحصرين في قسمين احدهما حفاظ الحديث وجهابذته والقادة الذين هم ائمة الانام وزوامل الاسلام الذين حفظوا على الامة معاقد الدين ومعاقله وحموا من التغيير والتكدير موارده ومناهله والقسم الثاني فقهاء الاسلام ومن دارت الفتيا على اقوالهم بين الانام الذين خصوا باستنباط الاحكام وعنوا بضبط قواعد الحلال والحرام فهم في الارض بمنزلة النجوم في السماء بهم يهتدي الحيران في الظلماء وحاجة الناس اليهم اعظم من حاجتهم الى الطعام والشراب وطاعتهم افرض عليهم من طاعة الامهات والاباء بنص الكتاب قال الله تعالى يا ايها الذين امنوا اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولي الامر منكم الى اخره۔

(اعلام الموقعين ص ۹ ج ۱)

چونکہ دعوت الی اللہ اور تبلیغ عن الرسول جماعت مفلحین کا شعار ہے اور تبلیغ کی دو قسمیں ہیں ایک تبلیغ الفاظ کی اور ایک تبلیغ معانی کی اس لئے علماء امت دو قسموں میں منحصر ہو گئے ایک قسم حفاظ حدیث کی ہے جنھوں نے حدیث کو یاد رکھا اور حدیث کو پرکھا کھرا اور کھوٹا الگ الگ کر دیا یہی لوگ مخلوق کے امام اور مقتدا ہیں اور اسلام کی سواری ہیں انھیں حضرات نے دین کے یادگار اور اسلام کے قلعوں کی حفاظت کی اور شریعت کے سرچشموں کو متغیر اور مکدر ہونے سے بچایا دوسری قسم علماء کی فقہاء اسلام اور علماء فتوے ہیں۔ جن کے فتوے پر مخلوق کا دارومدار ہے۔ یہی جماعت اجتہاد اور استنباط احکام اور حلال وحرام کے قواعد کے ضبط کرنے کیلئے مخصوص ہے حضرات فقہا زمین میں ایسے ہیں جیسے آسمان میں ستارے انھیں کے ذریعہ حیران کو اندھیری رات میں راستہ ملتا ہے۔ اور لوگوں کو طعام اور شراب سے بڑھ کر فقہا کی حاجت ہے اور لوگوں پر فقہا کی اطاعت ماں باپ کی اطاعت سے زیادہ فرض ہے جیسا کہ قرآن کی نص موجود ہے اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ کی اطاعت کرو اور اولو الامر کی اطاعت کرو۔ یعنی فقہاء کی اطاعت کرو یعنی کتاب وسنت کا جو مطلب وہ سمجھائیں اس پر عمل کرو۔

امام شعرانی میزان صفحہ ۱۲ میں لکھتے ہیں۔

كان الامام حمدان بن سهل يقول لو كنت قاضيا لحبست كلا من هذين الرجلين ممن يطلب

امام حمدان بن سہل فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں قاضی ہوتا تو ان دو آدمیوں کو ضرور قید کرتا کہ جو حدیث کا طالب ہو اور فقہ طلب کرے

الحديث ولا يطلب الفقه او يطلب الفقه لا يطلب الحديث ويقول انظر الى الائمة المجتهدين كيف طلبوا الحديث مع الفقه ولم يكتفوا باحدهما

اور جو فقہ کا طالب ہو اور حدیث کو طلب نہ کرے دیکھو تو سہی کہ ائمہ مجتہدین نے حدیث اور فقہ دونوں کو طلب کیا صرف ایک پر اکتفا نہیں کیا۔

اور لوامع الانوار صفحہ ۱۲ میں لکھتے ہیں۔

وكان سفيان الثوري وابن عيينة وعبد الله بن سنان يقولون لو كان احدنا قاضيا لضربنا بالجريد فقيها لا يتعلم الحديث ومحدثا لا يتعلم الفقه اھ

سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ اور عبد اللہ بن سنان کہا کرتے تھے کہ اگر ہم میں سے کوئی قاضی ہو جائے تو دو شخصوں کے ضرور کوڑے لگائیں ایک وہ جو کہ فقہ سیکھتا ہو اور حدیث کا علم حاصل نہ کرتا ہو اور ایک وہ کہ جو حدیث پڑھتا ہو اور فقہ حاصل نہ کرتا ہو

محدثین اور فقہاء کے فرائض

عن ابن مسعودؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نضر اللہ عبدا سمع مقالتی فحفظها ووعاها واداها فرب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه الى من هو افقه منه رواه احمد و ابوداؤد والترمذی۔

عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تر و تازہ فرمائے اس بندہ کو جس نے میری حدیث کو سنا اور اس کو یاد کیا اور خوب یاد رکھا اور دوسروں تک اس کو پہونچا دیا کیونکہ بعضے علم کے حامل اور نقل و روایت کرنے والے خود سمجھدار نہیں ہوتے اور بعضے سمجھدار ہوتے ہیں۔ مگر جن کو یہ روایت پہونچاتے ہیں۔ وہ اس راوی سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محدثین اور فقہاء کے فرائض کو ظاہر فرما دیا۔ محدثین کا فریضہ یہ ہے کہ روایت حدیث کو بلا کم وکاست فقہاء تک پہونچا دیں اور فقہاء کا فرض یہ ہے کہ احادیث کے معانی سمجھا دیں اور حدیث کے وہ محجوب اور مخفی حقائق اور معارف اور وہ غامض اور باریک دقائق اور لطائف جہاں تک راویان حدیث کی رسائی امت پر واضح اور آشکارا کر دیں۔

اس حدیث میں اس امر کی صاف تصریح ہے کہ حافظ حدیث کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ صاحب فہم بھی ہو۔ اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راوی کو محض حامل فقہ قرار دیا یعنی محض حامل اور ناقل ہے۔ خود فقیہ نہیں۔ فقیہہ وہ ہے کہ فقہ اس کی صفت نفس ہو۔ اور فقہ جس شخص کے حق میں صفت نفس نہ ہو اس شخص کا تعلق فقہ کے ساتھ حامل و محمول کا سا ہے صفت و موصوف کا سا نہیں۔

نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ الفاظ مقصود بالذات نہیں اس لئے کہ مقصود اطاعت اور

اتباع شریعت ہے اور یہ مقصد معانی ہی کے سمجھنے سے حاصل ہو سکتا ہے محض الفاظ کے یاد کر لینے سے یہ مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوا کہ مقصود بالذات معنی ہیں اور الفاظ مقصود بالعرض ہیں۔ اور مقصود بالذات کے لئے موقوف علیہ ہیں۔ اور چونکہ معانی الفاظ ہی سے مفہوم ہوتے ہیں اور الفاظ کے تغیر سے معنی میں بھی تغیر آجاتا ہے اس لئے الفاظ کی حفاظت بھی ضروری ہوئی الفاظ کی حفاظت کے لئے تبلیغ کا حکم ہوا اور معانی کی حفاظت کے لئے تفقہ کا حکم ہوا۔ کما قال تعالیٰ

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین۔

محدث نے الفاظ حدیث کی خدمت انجام دی اس لئے اس کا نام حافظ حدیث ہوا۔ اور مجتہد نے معانی حدیث کی خدمت انجام دی اس لئے اس کا لقب فقیہ اور عالم بالحدیث ہوا ہر دو فریق نے تائید خداوندی اور توفیق ربانی سے وہ خدمات انجام دیں کہ جو قیامت تک امت کے کام آویں حضرات محدثین نے روایات اور الفاظ حدیث کی وہ تحقیق و تفتیش فرمائی کہ اس کے خلاف کسی کے لئے لب کشائی کی گنجائش نہیں۔

اور حضرات فقہاء نے خداداد استنباط اور اجتہاد سے معانی حدیث اور احکام شریعت کے ایسے اصول و فروع منضبط فرما دیئے کہ قیامت تک کسی کے لئے مجال دم زدنی نہیں۔ جزی اللہ سائر المحدثین والمستنبطین عن الاسلام و سائر المسلمین خیرا آمین یا رب العالمین۔ آنے والی امت قیامت تک حضرات محدثین اور حضرات فقہاء کے احسان میں دبی ہوئی ہے کسی کی مجال نہیں کہ حضرات محدثین یا حضرات فقہاء کے سامنے سر اٹھا سکے۔ الفاظ میں حضرات محدثین ہمارے استاد ہیں اور معانی میں حضرات فقہاء جو تعلق باہم الفاظ اور معانی کا ہے وہی تعلق حضرات محدثین اور فقہاء کا سمجھو اور الفاظ اور معانی میں تفریق کر کے نا سمجھی کا ثبوت مت دو۔

الحاصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں محدثین کو یہ حکم دیا کہ حدیث اور روایت فقہاء تک پہونچا دیں۔ تاکہ فقہاء امت کو اس کے معنی سمجھا دیں اور مسلمان منشأ نبوی کو سمجھ کر اس پر عمل کریں۔ اور ظاہر ہے کہ الفاظ حدیث کی روایت اتنی دشوار نہیں جتنا کہ اس کا سمجھنا دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایت تو تمام صحابہ کرتے تھے مگر فتویٰ تمام صحابہ نہیں دیتے تھے بلکہ اصحاب فتویٰ مخصوص حضرات تھے جیسا کہ حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہر محدث کے لئے فتویٰ دینا جائز نہیں جب تک کہ اس کو خاص علم اور خاص فہم نہ ہو صفحہ ۱۴ ج ۱ کی مراجعت کریں۔

عہد صحابہ میں اصحاب فتوی یہ حضرات تھے۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ۔ ابی بن کعبؓ۔ ابو موسیٰ اشعری۔ اور تابعین میں فقہاء سبعہ فتوی دیتے تھے۔

محدثین کو فقہاء کی احتیاج

جس طرح قراء اور ائمہ تجوید، تفسیر قرآن میں مفسرین کے محتاج ہیں اسی طرح محدثین تفسیر حدیث میں فقہاء کے محتاج ہیں۔

ائمہ مجتہدین جو فرماتے ہیں ________

وہ حدیث کی شرح ہوتی ہے اور تمام حدیث قرآن کی شرح اور تفسیر ہے حافظ عسقلانی توالی التاسیس بمعالی محمد بن ادریس صفحہ ۵۸ میں لکھتے ہیں امام احمد بن حنبل یہ فرمایا کرتے تھے۔

لولا الشافعی ما عرفنا فقہ الحدیث اگر امام شافعی نہ ہوتے تو ہم کو حدیث کے معانی نہ معلوم ہوتے۔

امام شافعیؒ جب بغداد تشریف لائے تو امام احمد بن حنبل نے محدثین کے اس حلقہ کو چھوڑ دیا جس میں یحیی بن معین اور ان کے اقران اور معاصرین شریک ہوتے تھے اور امام شافعی کی صحبت اور ملازمت اختیار کی حتی کہ اگر امام شافعی کہیں تشریف لے جاتے تو امام احمدؒ ان کی سواری کے ساتھ جاتے یحیی بن معین کو یہ ناگوار گذرا اور احمد بن حنبل کو کہلا بھیجا احمد بن حنبل نے جواب میں یہ کہلا بھیجا

ان اردت الفقہ فالزم ذنب البغلۃ (توالی التاسیس صفحہ ۵۵ للحافظ ابن حجر)

اگر حدیث سمجھنا چاہتے ہو تو امام شافعی کی سواری کی دم پکڑ لو۔

وقال الزعفرانی کان اصحاب الحدیث رقودا حتی ایقظھم الشافعی وقال الربیع بن سلیمان کان اصحاب الحدیث لا یعرفون تفسیر الحدیث حتی جاء الشافعی۔ (توالی التاسیس صفحہ ۵۹)

زعفرانی کہتے ہیں کہ اصحاب حدیث خواب میں تھے۔ امام شافعی نے آکر ان کو جگایا۔ یعنی معانی اور فقہ کی طرف متوجہ کیا۔ ربیع بن سلیمان کہتے ہیں کہ اصحاب حدیث حدیث کی تفسیر اور شرح سے واقف نہ تھے۔ امام شافعی نے آکر حدیث کے معانی سمجھائے۔

وقال داؤد بن علی امام اہل الظاہر فی مناقب الشافعی لہ قال لی اسحاق بن راھویہ ذھبت انا واحمد بن حنبل

داؤد ظاہری جو اہل ظاہر کے امام ہیں اپنی اس کتاب میں جو مناقب شافعی میں تصنیف کی۔ لکھتے ہیں اسحق بن راہویہ نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ میں اور احمد بن حنبل مکہ میں امام شافعی

الی الشافعی بمکۃ فسألتہ عن اشیاء فوجدتہ فصیحا حسن الادب فلما فارقناہ اعلمنی جماعۃ من اھل الفھم بالقران انہ کان اعلم الناس فی زمانہ معانی القران وانہ قد اوتی فیہ فھما فلو کنت عرفتہ للزمتہ قال داؤد ورأیتہ یتأسف علی مافاتہ منہ وفی روایۃ عن داؤد قال لی اسحاق لو علمت انہ بھذا المحل لم افارقہ

توالی التاسیس
للحافظ ابن حجر
ص ۵۸

کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور میں نے امام شافعی سے بعض چیزوں کے متعلق دریافت کیا۔ نہایت فصاحت اور ادب کے ساتھ ان کا جواب دیا جب ہم ان سے رخصت ہوئے تو اہل فہم کی ایک جماعت نے جو قرآن کریم کو سمجھتی تھی مجھ سے یہ بیان کیا کہ امام شافعی اپنے زمانہ میں معانی قرآن کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے اور من جانب اللہ اُن کو قرآن کے بارہ میں خاص فہم عطا کیا گیا تھا۔ اسحٰق بن راہویہ کہتے ہیں اگر مجھ کو پہلے سے علم ہوتا تو ان کی صحبت کو لازم پکڑتا داؤد ظاہری کہتے ہیں کہ میں نے اسحاق بن راہویہ کو اس محرومی پر افسوس کرتے دیکھا اور داؤد ظاہری کی ایک روایت میں ہے کہ اسحاق نے مجھ سے یہ کہا کہ اگر مجھ کو پہلے سے یہ علم ہوتا کہ امام شافعی اس مرتبہ کے ہیں۔ تو میں اُن سے جدا نہ ہوتا۔

امام نووی تہذیب الاسماء صفحہ ۴۷ امام شافعی کے ترجمہ میں لکھتے ہیں۔

وطلب منہ عبد الرحمن مھدی امام اھل الحدیث فی عصرہ ان یصنف کتابا فی اصول الفقہ کان عبد الرحمن ویحیی بن سعید القطان یعجبان بکتاب الرسالۃ وکذلک اھل عصرھا

عبدالرحمٰن بن مہدی جو اپنے زمانہ میں اہل حدیث کے امام تھے انھوں نے امام شافعی سے درخواست کی کہ اصول فقہ میں کوئی تصنیف فرمائیں اور عبدالرحمٰن بن مہدی اور یحیی بن سعید القطان امام شافعی کے رسالۂ اصول فقہ کو بہت پسند کرتے تھے اور اسی طرح اس زمانہ کے تمام علماء۔

علامہ سیوطی تبییض الصحیفۃ فی مناقب الامام ابی حنیفہؓ میں لکھتے ہیں

روی عن الحسن بن الحارث قال سمعت النضر بن شمیل یقول کان الناس نیاما فی الفقہ حتی ایقظھم ابوحنیفۃ بما فتقہ وبینہ ولخصہ۔

حسن بن حارث کہتے ہیں کہ میں نے نضر بن شمیل کو یہ کہتے سنا کہ لوگ فقہ کے باب میں سوئے ہوئے تھے ابوحنیفہ نے آکر ان کو اپنے اس علم سے جگایا جو ان کی موشگافی اور بیان اور تلخیص کا نتیجہ تھا۔

اور ساتھ ہی نضر بن شمیل کے ترجمان لکھتے ہیں کہ

كان اماما في العربية والحديث وهو اول من اظهر السنة بمرو (تذكرة الحفاظ)

عربیت اور حدیث میں امام تھے مرو میں سب سے پہلے نضرہی نے حدیث کو پھیلایا۔

وروى الضياء عن عبد الرزاق قال كنت عند معمر فاتاه ابن المبارك فسمعت معمرا يقول ما اعرف رجلا يحسن التكلم في الفقه و يسعه ان يقيس ويشرح الحديث في الفقه احسن معرفة من ابي حنيفة (تاريخ

عبد الرزاق بن ہمام کہتے ہیں کہ میں معمر کے پاس تھا کہ اتنے میں عبد اللہ بن مبارک آگئے۔ میں نے معمر کو یہ کہتے سنا کہ فقہ اور قیاس اور شرح حدیث میں ابو حنیفہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں جانتا۔

اور خطیب بغدادی تاریخ بغداد صفحہ ۳۴۳ ج ۱۳ میں لکھتے ہیں۔

حدثنا ابن المبارك قال رايت مسعرا في حلقة ابي حنيفة جالسا بين يديه يسأله ويستفيد منه (كذا في الخيرات الحسان ص ۳۱)

عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ میں نے مسعر بن کدام کو ابو حنیفہ کے حلقۂ درس میں دیکھا کہ امام کے سامنے بیٹھے ہیں ان سے سوال کر رہے ہیں اور ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔

یہی مسعر بن کدام سفیان ثوری اور امیر المومنین فی الحدیث شعبہ کے استاذ ہیں۔ اور کل صحاح ستہ میں جن سے روایتیں ہیں بغرض استفادہ امام ابو حنیفہ کے حلقہ درس میں حاضر ہیں اور سوال کر رہے ہیں کیا یہ سوال دلیل احتیاج کی نہیں۔

وعن ابي يوسف ما رايت احدا اعلم بتفسير الحديث ومواضع النكت التي فيه من ابي حنيفة (تاريخ بغداد للخطيب صفحہ ۳۴۰ ج ۱۳)

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ میں نے حدیث کی تفسیر اور اس کے نکات یعنی لطائف اور معارف کا جاننے والا ابو حنیفہ سے زائد کسی کو نہیں دیکھا۔

وسئل الاعمش عن المسئلة فقال انما يحسن جواب هذا النعمان بن ثابت واظنه بورك له في علمه (الخيرات الحسان ص ۳۱)

اعمش سے کوئی مسئلہ دریافت کیا گیا تو فرمایا اس کا جواب تو ابو حنیفہ ہی خوب دیں گے میرا غالب گمان یہ ہے کہ من جانب اللہ ان کے علم میں برکت دی گئی ہے۔

امام ابو حنیفہ ایک روز امام اعمش کی مجلس میں حاضر تھے کسی نے امام اعمش سے کچھ مسائل دریافت کئے اعمش نے ابو حنیفہ سے کہا کہ ان مسائل میں تم کیا کہتے ہو ابو حنیفہ نے ان سب مسائل کا جواب دیا۔ اعمش نے کہا تم نے یہ کہاں سے کہا اور اس پر کیا دلیل ہے ابو حنیفہ نے کہا فلاں فلاں احادیث کی بنا پر جو آپ ہی نے مجھ سے روایت کی تھیں ابو حنیفہ نے ان تمام روایات کو مع طرق اور اسانید کے پڑھ کر سنا دیا۔ اعمش نے خوب تحسین کی اور کہا کہ جو روایتیں میں نے تم سے

سو دن میں روایت کی نہیں وہ سب تم نے مجھ کو ایک ہی ساعت میں سنا دیں میں جہاں تک سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان احادیث پر عمل کرتے ہو (یعنی یہ تفقہ اور یہ استنباط حدیث پر عمل کرنے کی برکت سے ہے) پھر فرمایا

يا معشر الفقهاء انتم الاطباء ونحن الصيادلة وانت ايها الرجل اخذت بكلا الطرفين (الخيرات الحسان ص ٦١)

اے گروہ فقہاء تم طبیب ہو اور ہم یعنی محدثین عطار ہیں اور اے مرد کامل تو نے دونوں چیزوں کو لے لیا یعنی حدیث اور فقہ دونوں کو جمع کر لیا۔

اور طبیب وہ ہے کہ جو دواؤں کے خواص و آثار اور طریق استعمال اور معالجہ سے واقف ہو۔ اور عطار وہ ہے کہ جس کے پاس دواؤں کا ذخیرہ ہو اور ظاہر ہے کہ عطار کسی بیمار کا علاج نہیں کر سکتا

حافظ ذہبی تذکرۃ الحفاظ صفحہ ۱۳۵ میں اعمش کے ترجمہ میں لکھتے ہیں۔

اعمش اپنے زمانہ کے حافظ حدیث اور ثقہ اور شیخ الاسلام تھے کوفہ کے رہنے والے تھے۔ سلیمان بن مہران ان کا نام تھا ابو محمد کنیت اور اعمش لقب تھا انس بن مالکؓ کو دیکھا تھا اور ابن ابی اوفیٰؓ اور ابو وائل سے روایت کی ابراہیم نخعی کے شاگرد تھے۔ اور شعبہ اور سفیان ثوری اور سفیان ابن عیینہ کے استاذ تھے۔

وقال ابن عيينة كان الاعمش اقرأهم لكتاب الله واحفظهم للحديث واعلمهم بالفرائض وقال الفلاس وكان الاعمش يسمى المصحف من صدقه وقال يحيى بن سعيد القطان الاعمش علامة الاسلام وقال الحزني ما خلف الاعمش اعبد منه لله وقال وكيع بقي الاعمش قريبا من سبعين سنة لم تفته التكبيرة الاولى توفي في ربيع الاول سنة ثمان واربعين ومائة وله سبع وثمانون سنة رحمة الله انتهى كلام الذهبي۔

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ اعمش سب سے زیادہ قرآن کے پڑھنے والے اور سب سے زیادہ حدیث کے حافظ اور سب سے زیادہ فرائض کے جاننے والے تھے فلاس کہتے ہیں کہ صدق اور سچائی کی وجہ سے اعمش کا نام ہی مصحف ہو گیا تھا یحییٰ بن سعید القطان کہا کرتے تھے کہ اعمش اسلام کا علامہ ہے حزنی کہتے ہیں کہ اعمش نے اپنے بعد کسی کو اپنے سے زیادہ اللہ کی عبادت کرنے والا نہیں چھوڑا۔ وکیع کہتے ہیں کہ تقریباً ستر سال تک اعمش کی تکبیر اولیٰ بھی فوت نہیں ہوئی ۱۴۸ھ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت ۸۷ سال کی عمر تھی یعنی پندرہ سولہ کی عمر میں بالغ ہوئے اور پھر ستر سال تک تکبیر اولیٰ بھی فوت نہ ہوئی۔

یہ امام اعمش کا مختصر ترجمہ ذکر کیا گیا یہ امام ابو حنیفہ کے شیوخ اور اساتذہ میں سے ہیں فقہاء

کو طبیب اور محدثین کو عطار بتلا رہے ہیں اور امام ابوحنیفہ کے متعلق یہ شہادت دے رہے ہیں کہ تو حدیث اور فقہ دونوں کا جامع ہے یعنی تو طبیب بھی اور تیرے پاس دواؤں کا مخزن بھی ہے۔ بھلا ایسی شہادت کیا خلاف واقع ہو سکتی ہے۔

اور اسی طرح کا واقعہ امام اوزاعی کے ساتھ بھی پیش آیا امام اوزاعی نے بھی یہی فرمایا کہ نحن العطارون وانتم الاطباء۔ جیسے عطار کے پاس دوائیں تو ہیں مگر اس کو یہ معلوم نہیں کہ یہ دوا کس فائدہ کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اس طرح محدثین کے پاس حدیث کا ذخیرہ ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ اس حدیث سے کون کون سا مسئلہ مستنبط ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرات محدثین نے اسانید اور طرق حدیث کے جمع کرنے کا اس قدر کیوں اہتمام فرمایا حتیٰ کہ ایک ایک حدیث کو سو سو طریقوں سے جمع کیا وجہ اس کی یہ ہے کہ جب کسی مریض کو دوا کی ضرورت ہو اور دوا الافیلہ کا حال معلوم نہ ہو کہ دوست ہے یا دشمن تو جب تک اطمینان نہ ہو جائے اس وقت تک دوا کا استعمال نہ کرے گا۔

اسی بنا پر امام شافعی فرمایا کرتے تھے کہ لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے عیال ہیں یعنی علماء اور فقہاء کو فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ وہی نسبت ہے کہ جو اولاد اور عیال کو باپ کے ساتھ ہوتی ہے کہ عیال میں جو کمال ہے وہ باپ کی تربیت کا ثمرہ ہے اور حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو واجب قرار دیا ہے۔ ان اشکرلی ولوالدیک۔

امام نووی تہذیب الاسماء صفحہ ۸۱/۱ میں لکھتے ہیں کہ امام شافعی فرمایا کرتے تھے کہ امام محمد امام ابوحنیفہ کے چھوٹے شاگرد سے بقدر دو اونٹ کی کتابوں کے علم حاصل کیا۔

وعن یحیی بن معین قال کتبت الجامع الصغیر عن محمد بن الحسن وعن ابراہیم الحزلی قال قلت للامام احمد من این لک ھذہ المسائل الدقیقۃ قال من کتب محمد بن الحسن۔	امام بخاری کے استاذ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ میں نے جامع صغیر خود امام محمد سے لے کر لکھا جو ان کی مشہور تصنیف ہے ابراہیم حربی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ آپ یہ مسائل دقیقہ کہاں سے بیان کرتے ہیں کہا کہ امام محمد کی کتابوں سے۔

تہذیب الاسماء للنووی صفحہ ۸۱-۸۲/۱ج۔

ناظرین غور تو فرماویں کہ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین جیسے مسلّم امام حدیث کو امام ابوحنیفہ کے ایک تلمیذ کی کتابوں کی کیا ضرورت پیش آئی۔ ضرورت یہ تھی کہ حامل فقہ تھے۔ فقیہ

نہ تھے سمجھنے کے لئے فقیہ کے پاس چلے گئے۔ کتاب المناقب للامام الموفق صفحہ ۲ میں ہے۔

عن محمد بن سعدان سمعت من حضر یزید بن ھارون وعندہ یحی بن معین وعلی بن المدینی واحمد بن حنبل و زھیر بن حرب وجماعۃ اخرون اذ جاءہ مستفت فقال لہ یزید اذھب الی اھل العلم قال فقال لہ ابن المدینی الیس اھل العلم والحدیث عندک قال اھل العلم اصحاب ابی حنیفۃ و انتم صیادلۃ۔ انتھی۔

محمد بن سعدان کہتے ہیں کہ میں نے اس شخص سے سنا جو یزید بن ہارون کی مجلس میں حاضر تھا کہ جس میں یحیی بن معین اور علی بن مدینی اور احمد بن حنبل اور زہیر بن حرب اور دوسرے علمار کی ایک جماعت موجود تھی اتنے میں ایک شخص یزید بن ہارون کے پاس مسئلہ دریافت کرنے کے لئے آیا یزید بن ہارون نے فرمایا کہ اہل علم کے پاس چلے جاؤ اس پر ابن مدینی نے کہا کیا تمہارے پاس ایسے اہل علم اور اہل حدیث موجود نہیں۔ یزید بن ہارون نے کہا کہ اہل علم تو ابو حنیفہ کے اصحاب ہیں اور تم اہل حدیث تو عطار ہو۔

محمد بن اسحاق امام مغازی جب کوفہ آتے تو امام ابوحنیفہ کی زیارت کے لئے بار بار حاضر ہوتے اور جو مسائل مشکل ان کو پیش آتے ان میں امام ابوحنیفہ سے استفادہ کرتے۔ کذا فی کتاب المناقب للموفق صفحہ ۳۳ ج ۲

یہ وہی محمد بن اسحق ہیں کہ جو حدیث قراءۃ خلف الامام کے راوی ہیں اور امام بخاری اور امام بیہقی نے ان کا امیر المومنین فی الحدیث ہونا ثابت کیا ہے۔

عن ثابت الزاھد قال کان اذا اشکل علی الثوری مسئلۃ قال ما یحسن جوابھا الا من حسدناہ ثم یسأل عن اصحابہ ویقول ما قال فیہ صاحبکم فیحفظ الجواب ثم یفتی بہ۔ کذا فی کتاب المناقب للموفق صفحہ ۲۶۹ ج ۱ قال الحافظ ابن حجر لم تثبت روایۃ ابی حنیفۃ عن مالک وانما اوردھا الدار قطنی ثم الخطیب لروایتین وقعتا لھما باسنادین فیھما مقال ونحو ثبت نظر مالک فی کتب ابی حنیفۃ و انتفاعہ بھا کما رواہ الدراوردی وغیرہ علی ما اخرجہ ابو ابی العوام قال حدثنی یوسف بن احمد

ثابت زاہد جو کہ سفیان ثوری کے تلامذہ اور بخاری اور ترمذی کے اساتذہ میں ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب سفیان ثوری کو کسی مسئلہ میں اشکال پیش آتا تو یہ فرماتے کہ اس کا عمدہ اور بہتر جواب وہی دے سکتا ہے جس پر ہم لوگ (یعنی تم لوگ) حسد کرتے ہیں یعنی امام ابوحنیفہ، پھر امام ابوحنیفہ کے شاگردوں سے پوچھتے کہ بتلاؤ کہ تمہارے صاحب یعنی استاذ نے اس بارہ میں کیا فرمایا پھر اس جواب کو یاد رکھتے اور اسی کے مطابق فتوے دیتے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کی امام مالک سے

الکوثنا محمد بن حازم الفقیہ ثنا محمد بن علی	کوئی روایت ثابت نہیں۔ دار قطنی نے جو دو روایتیں ذکر
الصائغ بمکۃ ثنا ابراھیم بن محمد عن الشافعی	کی ہیں۔ ان کی سند میں کلام ہے البتہ امام مالک کا امام ابوحنیفہ
عن عبد العزیز بن محمد الدراوردی قال	کی کتابوں کا دیکھنا اور ان سے منتفع ہونا ثابت ہے جیسا کہ
کان بن مالک بن انس ینظر فی کتب ابی حنیفۃ	دراوردی وغیرہ نے بیان کیا کہ امام مالک امام ابوحنیفہ کی
وینتفع بھا کذا فی حاشیۃ الانتقاء لابن عبد البر صفحہ ۱۴	تصانیف کو دیکھا کرتے تھے اور ان سے نفع اٹھاتے تھے۔

اصل اہل حدیث فقہاء ہیں

اس بیان سے یہ امر بخوبی واضح ہوگیا کہ اہل حدیث فقط ان لوگوں کا نام نہیں جن کو حدیث کے فقط الفاظ یاد ہوں۔ اصل اہل حدیث وہ ہیں کہ جو حدیث کے معانی اور اس کے حقائق اور دقائق کو سمجھتے ہوں۔ چنانچہ شیخ عبد الوہاب شعرانیؒ میزان کبریٰ کے صفحہ ۶۲ پر لکھتے ہیں۔

قال الخطابی واصحاب السنن ھم	امام خطابی فرماتے ہیں کہ اصحاب سنن اور اہل حدیث وہ
حفاظ الحدیث والمطلعون علیہ کالائمۃ	لوگ ہیں کہ جو حدیث کے حافظ ہیں اور اس کے معانی اور
المجتہدین وکمل اتباعھم فانھم الذین	حقائق پر مطلع ہیں جیسے ائمہ مجتہدین اور ان کا کامل متبعین کیونکہ
یفھمون ما تضمنہ السنن من الاحکام	حدیث جن احکام پر مشتمل ہے اس کے سمجھنے والے یہی ہیں۔

الغرض اہل حدیث کا لفظ حفاظ کے ساتھ مختص نہیں فقہاء اور مجتہدین بدرجۂ اولی اس کے مصداق ہیں خصوصاً فقہاء حنفیہ کہ ان کے نزدیک مراسیل اور منقطع اور خبر مستور اور بلاغات بھی معتبر ہیں اور حدیث ضعیف کے متعلق تو امام ابوحنیفہ اور ان کے تمام اصحاب و اتباع کا مشہور و معروف مسلک ہے۔

الحدیث الضعیف احب الی من رأی الرجال	حدیث ضعیف میرے نزدیک لوگوں کی رائے سے کہیں بہتر ہے

اجتہاد اور استنباط کی ضرورت

حق جل شانہ نے بندوں کی ہدایت کے لئے ایک قانون نازل فرمایا اور بتلا دیا کہ قیامت تک تمہاری دینی اور دنیوی ضرورتوں کے لئے دستور اساسی ہے دنیا کتنی ہی پلٹیاں کھائے مگر یہ قانون اٹل ہے اس میں تغیر و تبدل نہ ہوگا۔

بڑی بڑی حکومتوں کے آئین اور قوانین میں روز تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے حالانکہ وہ قانون ایک محدود جماعت کے لئے ہوتا ہے مگر چونکہ وہ انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے اور عقل انسانی ایک شے کے بھی تمام اطراف و جوانب کا بھی احاطہ نہیں کر سکتی اس لئے روز اس میں تغیر و تبدل

ترمیم و تنسیخ کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے بخلاف قرآن کریم کے کہ جو تمام عالم کے لئے قانون ہدایت بن کر نازل ہوا ہے آج اس پر چودہ صدیاں گذر گئیں لیکن اس کے کسی اصول میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں آیا۔ دنیا جتنی ترقی کرتی جاتی ہے اس کے اصول اتنے ہی اور چمکتے جاتے ہیں۔ بھلا اس قانون اور دستور میں کیا تغیر ہو سکتا ہے یہ قانون تو اس حکیم و علیم کا اتارا ہوا ہے کہ جس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قیامت تک پیش آنے والے واقعات غیر محدود اور غیر محصور ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے حروف اور کلمات محدود اور متناہی ہیں اور جب ایک غیر محدود چیز کو محدود عبارت میں بیان کیا جائیگا تو اسکا صاف مطلب یہی ہے کہ ان غیر محدود واقعات کے احکام انہی محدود احکام سے قیاس اور استنباط کے ذریعہ سے معلوم کرنے ہوں گے کیونکہ غیر شرعی زندگی بسر کرنا جائز نہیں ایسی صورت میں اگر قیاس شرعی سے کام نہ لیا جائے اور لوگوں کو قیاس شرعی کا پابند نہ بنایا جائے تو ہر شخص واقعات میں اپنی رائے اور قیاس سے کام لے گا جس کا شریعت سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور اس کی وجہ سے دینی اور دنیوی جو مفاسد پیش آئیں گے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ حق جل علا نے اس مجمل قانون کو اپنے نبی پر نازل کیا اور اس کا پورا مطلب بھی سمجھایا کما قال ان علینا جمعہ وقرآنہ۔ فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ ثم ان علینا بیانہ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر عمل کے لئے ضرورت تھی اور جتنی حکمت اور مصلحت تھی اس قدر اس کی تفصیل فرمائی بہت سے اصول و قواعد صراحۃً اور بہت سے اصول جزئیات کے ضمن میں بیان فرمائے۔ تاکہ قیامت تک پیش آنے والے واقعات کیلئے رہنمائی کر سکیں اور اہل فہم اور ارباب فراست کے لئے گنجائش چھوڑی کہ وہ حضرات غیر منصوص مسائل میں ان اصول و قواعد کی روشنی میں اپنی رائے اور قیاس سے امت کی رہنمائی کرتے رہیں۔

قال تعالےٰ

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون

ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ اس کی توضیح اور تفسیر فرمائیں اور تاکہ اس میں غور و فکر کرنے والے غور و فکر کر سکیں۔

ناظرین غور کریں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور تفسیر کے بعد وہ کیا چیز ہے جس کو وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ سے بیان فرمایا اور مستقلاً واو عاطفہ سے لتبین پر اس کا عطف کیا گیا ہے وہ مجتہدین کا قیاس اور استنباط ہے۔

اخرج ابن ابی حاتم من طریق مالک بن انس عن ربیعۃ قال ان اللہ تبارک وتعالی انزل الیکم الکتاب مفصلا وترک فیہ موضعا للسنۃ وسن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وترک فیہا موضعا للرأی (در منثور)

امام مالک امام ربیعہ سے ناقل ہیں کہ ربیعہ نے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مفصل کتاب نازل کی اور اس میں حدیث کی جگہ چھوڑ دی۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی چیزیں حدیث سے بیان فرمائیں اور رائے اور قیاس کے لئے جگہ باقی رکھی۔

تاکہ مجتہدین اور مستنبطین اس عقل سلیم اور فہم مستقیم کو کام میں لائیں جو ان کو منجانب اللہ تفقہ اور تفکر اور تامل اور تدبر کے لئے عطا کی گئی ہے اور احکام خداوندی میں غور وفکر کریں کہ اس حکم کی کیا علت ہے جہاں وہ علت پائی جائے وہاں وہ حکم جاری کریں اور اس طرح سے غیر منصوص چیزوں کے احکام معلوم کریں اور یہ معلوم کرنا کہ اس حکم کی علت کیا ہے اور حکم کا مدار کس امر پر ہے یہ کام فقیہہ اور مجتہد کا ہے یہ عقدہ محض راوی اور ناقل سے حل نہیں ہو سکتا۔ بالفرض اگر شریعت میں رائے اور قیاس کے لئے کوئی جگہ نہ ہوتی اور ہر ہر مسئلہ کے لئے علیحدہ علیحدہ نص کے ذریعہ سے تصریح کر دی جاتی تو عقل معطل اور بے کار ہو جاتی اس کا کوئی کام باقی نہ رہتا۔ پھر آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں عقل کو جو تفکر اور تدبر اور تعقل اور تامل کا جو حکم مذکور ہے وہ غیر معقول ہو جاتا اور تمام عقول فکر اور مراقبہ کی عبادت سے محروم ہو جاتیں اور علوم کی یہ تحقیقات و تدقیقات جو سراسر تفکر اور تامل کا نتیجہ ہیں معرض ظہور میں نہ آتیں۔ اس استنباط اور اجتہاد کی برکت سے جو بال کی کھال نکلی ہے دنیا میں کہیں اس کا نام ونشان نہ ہوتا۔ اور ارباب فہم وفراست اور اصحاب سفاہت کا فرق ظاہر نہ ہوتا اور فقیہہ کی غیر فقیہہ پر فضیلت نہ ظاہر ہوتی علاوہ ازیں جب تمام احکام منصوص ہو جاتے اور کوئی حکم غیر منصوص نہ رہتا تو امت حرج اور تنگی میں پڑ جاتی اور صریح حکم کی خلاف ورزی کی وجہ سے مجرم بنتی اور غفلت خداوندی کی مستحق ٹھیرتی۔ خدا کی رحمت ہوئی کہ اس نے ہم کو اس صریح نافرمانی سے بچا لیا۔ فللہ الحمد والمنۃ۔

قال اللہ تعالی. یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اولی الامر یعنی علماء وفقہاء کی اطاعت کرو اس کے بعد اگر کسی ایسی چیز میں اختلاف پیش آئے کہ جس کا حکم کتاب وسنت اور اجماع علماء سے ثابت نہ ہو تو اللہ اور رسول

ان كنتم تؤمنون بالله واليوم الاخر ذلك خير واحسن تاويلا

کی طرف یعنی کتاب و سنت کی طرف رجوع کرو اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو یہی طریقہ بہتر ہے اور اسی کا انجام اچھا ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ادلۂ اربعہ کی طرف اشارہ ہے یعنی کتاب اور سنت اور اجماع امت اور قیاس کی طرف اشارہ ہے۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ میں کتاب اللہ کی طرف اشارہ ہے اور اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ میں سنت کی طرف اشارہ ہے اور اولی الامر سے علماء کا اجماع مراد ہے اور فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ الخ سے قیاس کی طرف اشارہ ہے یعنی جس شئی کا حکم کتاب وسنت میں منصوص نہ ہو اور اجماع علماء سے اس کا کوئی حکم معلوم نہ ہوا ہو تو ایسی صورت میں اس غیر منصوص کا حکم معلوم کرنے کے لئے کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ رجوع کا مطلب یہ ہے کہ کتاب وسنت میں اس کے نظائر کو تلاش کرو اور اس کی علت میں غور وفکر کرو اور اشتراک علت اور مماثلت اور مشابہت کی وجہ سے غیر منصوص میں منصوص کا حکم جاری کرو اور اسی کا نام قیاس اور استنباط ہے اور فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ میں تنازع سے محض باہمی منازعت اور اختلاف مراد نہیں اس لئے کہ اس کا سہل علاج یہ ہے کہ اس نزاع ہی کو ترک کر دیا جائے بلکہ تنازع سے اصول شرعیہ اور دلائل کا تجاذب اور تنازع مراد ہے۔ اور رد آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں اصول شرعیہ متجاذب ہوں۔ اور کوئی اصول اور دلیل اس مسئلہ کو اپنی طرف کھینچتا ہو اور دوسری دلیل اور دوسرا اصول اپنی طرف کھینچتا ہو تو مجتہد کو اس وقت اس ترتیب کی رعایت چاہیئے یعنی اول کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے اور پھر سنت کی طرف اور پھر اجماع امت کی طرف۔

بقیہ صفحہ ۴۵

الله مالكم من اله غيره ولا تنقصوا المكيال والميزان انى اراكم بخير و انى اخاف عليكم عذاب يوم محيط. ويقوم اوفوا المكيال والميزان بالقسط ولا تبخسوا الناس اشياءهم ولا تعثوا فى الارض مفسدين.....

فرمایا کہ اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور تم ناپ اور تول میں کمی مت کیا کرو، میں تم کو فراغت کی حالت میں دیکھتا ہوں اور مجھ کو تم پر اندیشہ ہے ایسے دن کے عذاب کا جو انواع مصائب کا جامع ہوگا۔ اور اے میری قوم تم ناپ اور تول پوری کیا کرو اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے حد سے مت نکلو

باقی صفحہ ۱۱ پر

مشاجرات صحابہؓ کے معاملہ میں امت کا عقیدہ اور عمل

از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

لفظ مشاجرہ شجر سے مشتق ہے جس کے اصل معنی تنے دار درخت کے ہیں جس کی شاخیں اطراف میں پھیلتی ہیں باہمی اختلافات و نزاع کو اسی مناسبت سے مشاجرہ کہا جاتا ہے۔ کہ درخت کی شاخیں بھی ایک دوسری سے ٹکراتی اور ایک دوسرے کی طرف بڑھتی ہیں حضرات صحابہ کرام کے درمیان جو اختلافات پیش آئے اور کھلی جنگوں تک نوبت پہنچ گئی، علماء امت نے ان کی باہمی حروب اور اختلافات کو جنگ و جدال سے تعبیر نہیں کیا بلکہ از روئے ادب "مشاجرہ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے کیونکہ درخت کی شاخوں کا ایک دوسرے میں گھسنا اور ٹکرانا مجموعی حیثیت سے کوئی عیب نہیں، بلکہ درخت کی زینت اور کمال ہے۔

ایک سوال اور جواب اسلام میں صحابہ کرامؓ کا درجہ اور مقام جو اوپر قرآن و سنت کی نصوص اور اجماع امت اور اکابر علماء کی تصریحات سے ثابت ہو چکا ہے اس کے بعد ایک قدرتی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب صحابہ کرام سب کے سب واجب التعظیم اور عدل و ثقہ و متقی و پرہیزگار ہیں تو اگر ان کے آپس میں کسی مسئلہ میں اختلاف پیش آجائے تو ہمارے لئے طریق کار کیا ہونا چاہیے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دو متضاد اقوال میں دونوں کو صحیح سمجھ کر دونوں ہی کو معمول نہیں بنایا جا سکتا عمل کرنے کے لئے کسی ایک کو اختیار کرنا دوسرے کو چھوڑنا لازم ہے تو اس ترک و اختیار کا معیار کیا ہونا چاہیئے، نیز اس میں دونوں طرف کے بزرگوں کا ادب و احترام اور تعظیم کیسے قائم رہے گی جبکہ ایک کے قول کو مرجوح قرار دے کر چھوڑا جائے گا۔

خصوصاً یہ سوال ان معاملات میں زیادہ سنگین ہو جاتا ہے جن میں ان حضرات کا اختلاف باہمی جنگ و خونریزی تک پہنچ گیا۔ ان میں ظاہر ہے کہ کوئی ایک فریق حق پر ہے، دوسرا خطا پر، اس خطاء صواب کے

معاملے کو طے کرنا عمل و عقیدہ کے لئے ضروری ہے، مگر اس صورت میں دونوں فریق کی یکساں تعظیم و احترام کیسے قائم رکھا جاسکتا ہے؟ جس کو خطا پر قرار دیا جائے اس کی تنقیص ایک لازمی امر ہے جواب یہ ہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ دو مختلف اقوال میں سے ایک کو حق یا راجح اور دوسرے کو خطا یا مرجوح قرار دینے میں کسی ایک فریق کی تنقیص لازم ہے۔ اسلاف امت نے ان دونوں کاموں کو اس طرح جمع کیا ہے کہ عمل اور عقیدہ کے لئے کسی ایک فریق کے قول کو شریعت کے مسلمہ اصول اجتہاد کے مطابق اختیار اور دوسرے کو ترک کیا، لیکن جس کے قول کو ترک کیا ہے اس کی ذات اور شخصیت کے متعلق کوئی ایک جملہ بھی ایسا نہیں کہا جس سے ان کی تنقیص ہوتی ہو خصوصاً مشاجرات صحابہ میں تو جس طرح امت کا اس پر اجماع ہے کہ دونوں فریق کی تعظیم واجب اور دونوں فریق میں سے کسی کو برا کہنا ناجائز ہے، اسی طرح اس پر بھی اجماع ہے کہ جنگ جمل میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ حق پر تھے ان کا مقابلہ کرنے والے خطا پر، اسی طرح جنگ صفین میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ حق پر تھے اور ان کا مقابل حضرت معاویہؓ اور ان کے اصحاب خطا پر، البتہ ان کی خطاؤں کو اجتہادی خطا قرار دیا جو شرعاً گناہ نہیں جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہو۔ بلکہ اصول اجتہاد کے مطابق اپنی کوشش صرف کرنے کے بعد بھی اگر ان سے خطا ہو گئی تو ایسے خطا کرنے والے بھی ثواب سے محروم نہیں ہوتے ایک اجر ان کو بھی ملتا ہے

باجماع امت ان حضرات صحابہؓ کے اس اختلاف کو بھی اسی طرح کا اجتہادی اختلاف قرار دیا گیا ہے جس سے کسی فریق کے حضرات کی شخصیتیں مجروح نہیں ہوتیں۔

اس طرح ایک طرف خطا و صواب کو بھی واضح کر دیا گیا دوسری طرف صحابہؓ کرام کے مقام اور درجہ کا پورا احترام بھی ملحوظ رکھا گیا، اور مشاجرات صحابہؓ میں کف لسان اور سکوت کو اسلم قرار دے کر اس کی تاکید کی گئی کہ بلا وجہ ان روایات و حکایات میں خوض کرنا جائز نہیں جو باہمی جنگ کے دوران ایک دوسرے کے متعلق نقل کی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں مشاجرات صحابہؓ کے بارے میں سلف صالحین کے اقوال:

تفسیر قرطبی سورۂ حجرات میں آیت وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا کے تحت مشاجرات صحابہؓ پر سلف صالحین کے اقوال کے ساتھ بہترین تحقیق فرمائی ہے جو انہیں کی طویل عبارت میں لکھی جاتی ہے۔

ترجمہ[۱] "یہ جائز نہیں ہے کہ کسی بھی صحابی کی طرف قطعی اور یقینی طور پر غلطی منسوب کی جائے۔ اس لئے کہ ان سب حضرات نے اپنے اپنے طرز عمل میں اجتہاد سے کام لیا تھا، اور سب کا مقصد اللہ کی خوشنودی تھی، یہ سب حضرات ہمارے پیشوا ہیں۔ اور ہمیں حکم ہے کہ ان کے باہمی اختلافات سے کف لسان کریں، اور ہمیشہ ان کا ذکر بہترین طریقے پر کریں، کیونکہ صحابیت بڑی حرمت کی چیز ہے اور نبی

ـــــــــــــــــــ

۱ تفسیر قرطبی ص ۳۲۲ ج ۱۶

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو برا کہنے سے منع فرمایا ہے، اور یہ خبر دی ہے کہ اللہ نے انھیں معاف کر رکھا ہے، اور ان سے راضی ہے، اس کے علاوہ متعدد سندوں سے یہ حدیث ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طلحہؓ کے بارے میں فرمایا ہے۔

"ان طلحۃ شہید یمشی علی وجہ الارض" "یعنی طلحہ روئے زمین پر چلنے والے شہید ہیں"

اب اگر حضرت علیؓ کے خلاف حضرت طلحہؓ کا جنگ کے لئے نکلنا کھلا گناہ اور عصیان تھا تو اس جنگ میں مقتول ہوکر وہ ہرگز شہادت کا رتبہ حاصل نہ کرتے، اسی طرح اگر حضرت طلحہؓ کا یہ عمل تاویل کی غلطی اور ادائے واجب میں کوتاہی قرار دیا جاسکتا تو بھی آپ کو شہادت کا مقام حاصل نہ ہوتا۔ کیونکہ شہادت تو صرف اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کوئی شخص اطاعتِ ربانی میں قتل ہوا ہو، لہٰذا ان حضرات کے معاملہ کو اسی عقیدہ پر محمول کرنا ضروری ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

اسی بات کی دوسری دلیل وہ صحیح اور معروف و مشہور احادیث ہیں جو خود حضرت علیؓ سے مروی ہیں اور جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: " زبیرؓ کا قاتل جہنم میں ہے"،

نیز حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:-

"صفیہؓ کے بیٹے کے قاتل کو جہنم کی خبر دے دو" جب یہ بات ہے تو ثابت ہو گیا کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ اس لڑائی کی وجہ سے عاصی اور گنہگار نہیں ہوئے، اگر ایسا ہوتا تو حضورؐ حضرت طلحہؓ کو شہید نہ فرماتے اور حضرت زبیرؓ کے قاتل کے بارے میں جہنم کی پیشین گوئی نہ کرتے۔ نیز ان کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہے۔ جن کے جنتی ہونے کی شہادت تقریباً متواتر ہے۔

اسی طرح جو حضرات صحابہؓ ان جنگوں میں کنارہ کش رہے، انھیں بھی تاویل میں خطا کار نہیں کہا جاسکتا، بلکہ ان کا طرز عمل بھی اس لحاظ سے درست تھا کہ اللہ نے ان کو اجتہاد میں اسی رائے پر قائم رکھا۔ جب یہ بات ہے تو اس وجہ سے ان حضرات پر لعن طعن کرنا، ان سے برارت کا اظہار کرنا اور انھیں فاسق قرار دینا، ان کے فضائل و مجاہدات اور ان عظیم دینی مقامات کو کالعدم کر دینا کسی طرح درست نہیں ہے۔ بعض علماء سے پوچھا گیا کہ اس خون کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو صحابہ کرامؓ کے باہمی مشاجرات میں بہایا گیا تو انھوں نے جواب میں یہ آیت پڑھ دی کہ

تلک امۃ قد خلت لہا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون

"یہ ایک امت تھی جو گذر گئی، اس کے اعمال اس کے لئے ہیں، اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں، اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا"

کسی اور بزرگ سے یہی سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا:۔

"یہ ایسے خون ہیں کہ اللہ نے میرے ہاتھوں کو اس میں (رنگنے سے) بچایا، اب میں اپنی زبان کو ان سے آلودہ نہیں کروں گا" مطلب یہی تھا کہ میں کسی ایک فریق کو ———— کسی معاملہ میں یقینی طور پر خطا کار ٹھہرانے کی غلطی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا

علامہ ابن فورکؒ فرماتے ہیں:۔

"ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے درمیان جو مشاجرات ہوئے ان کی مثال ایسی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے درمیان پیش آنے والے واقعات کی، وہ حضرات آپس کے ان اختلافات کے باوجود ولایت اور نبوت کی حدود سے خارج نہیں ہوئے بالکل یہی معاملہ صحابہؓ کے درمیان پیش آنے والے واقعات کا بھی ہے۔

اور حضرت محاسبیؒ فرماتے ہیں کہ:۔

"جہاں تک اس خون ریزی کا معاملہ ہے تو اس کے بارے میں ہمارا کچھ کہنا مشکل ہے، کیونکہ اس میں خود صحابہؓ کے درمیان اختلاف تھا اور حضرت حسن بصری سے صحابہؓ کے باہمی قتال کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ:۔

"یہ ایسی لڑائی تھی جس میں صحابہؓ موجود تھے اور ہم غائب، وہ پورے حالات کو جانتے تھے، ہم نہیں جانتے، جس معاملہ پر تمام صحابہؓ کا اتفاق ہے، ہم اس میں ان کی پیروی کرتے ہیں، اور جس معاملہ میں ان کے درمیان اختلاف ہے، اس میں سکوت اختیار کرتے ہیں"

حضرت محاسبیؒ فرماتے ہیں کہ ہم بھی وہی بات کہتے ہیں جو حسن بصریؒ نے فرمائی، ہم جانتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے جن چیزوں میں دخل دیا، ان سے وہ ہم سے کہیں بہتر طریقے پر واقف تھے، لہٰذا ہمارا کام یہی ہے کہ جس پر وہ سب حضرات متفق ہوں اس کی پیروی کریں، اور جس میں ان کا اختلاف ہو، اس میں خاموشی اختیار کریں، اور اپنی طرف سے کوئی نئی رائے پیدا نہ کریں ہمیں یقین ہے کہ ان سب نے اجتہاد سے کام لیا تھا، اور اللہ کی خوشنودی چاہی تھی، اس لئے کہ دین کے معاملہ میں وہ سب حضرات شک وشبہ سے بالاتر ہیں"

اس طویل عبارت میں علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اہل سنت کے عقیدے کی بہترین ترجمانی فرمائی ہے۔ عبارت کے شروع میں انھوں نے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی شہادت سے متعلق جو حدیثیں نقل فرمائی ہیں، ان سے اس مسئلہ پر بطور خاص روشنی پڑتی ہے، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ

دونوں حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار صحابہؓ میں سے ہیں، اور ان دس خوش نصیب حضرات میں آپ کا بھی نام ہے جن کے بارے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لے کر ان کے جنتی ہونے کی خوشخبری دی ہے، اور جنھیں عشرۂ مبشرہ کہا جاتا ہے، ان دونوں حضرات نے حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کرنے کے لئے حضرت علیؓ کا مقابلہ کیا، اور اسی دوران شہید ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ احادیث میں ان دونوں حضرات کو شہید قرار دیا۔ دوسری طرف حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علیؓ کے سرگرم ساتھیوں میں سے تھے اور انھوں نے پوری قوت کے ساتھ حضرت علیؓ کے مخالفین کا مقابلہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے بھی شہادت کی پیشین گوئی فرمائی، غور کیا جائے تو یہی ارشادات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ ان جنگوں میں کوئی فریق بھی کھلے باطل پر نہ تھا، بلکہ ہر ایک فریق اللہ کی رضا کے لئے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق کام کر رہا تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ اگر یہ اختلاف کھلے حق و باطل کا اختلاف ہوتا تو ہر ایک فریق کے رہنماؤں کے لئے بیک وقت شہادت کی پیشین گوئی نہ فرمائی جاتی، ان ارشادات نے یہ واضح کر دیا کہ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ بھی اللہ کی خوشنودی کے لئے لڑ رہے تھے، اس لئے وہ بھی شہید ہیں۔ اور حضرت عمارؓ کا مقصد بھی رضائے الٰہی کے حصول کے سوا کچھ نہ تھا، اس لئے وہ بھی لائق مدح وستائش ہیں۔ دونوں کا اختلاف کسی دنیوی غرض سے نہیں، بلکہ اجتہاد و رائے کی بناء پر تھا اور ان میں سے کسی بھی فریق کو مجروح و مطعون نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۵) شرح مواقف مقصد سابع میں ہے۔

رہے وہ فتنے اور جنگیں جو صحابہؓ کے درمیان واقع ہوئے تو فرقہ ہشامیہ نے تو ان کے وقوع ہی کا انکار کر دیا ہے، اور کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت اور واقعۂ جمل و صفین جن تواتر کے ساتھ ثابت ہے، یہ اس کا بے دلیل انکار ہے۔ اور جن حضرات نے ان کے وقوع کا انکار نہیں کیا ہے ان میں سے بعض نے تو ان واقعات میں مکمل سکوت اختیار کیا اور نہ کسی خاص فریق کی طرف غلطی منسوب کی، نہ حق و صواب، یہ حضرات اہل سنت ہی کی ایک جماعت ہیں، اگر ان کی مراد یہ ہے کہ یہ ایک فضول کام ہے تو ٹھیک ہے، اس لئے کہ امام شافعیؒ وغیرہ علمائے سلف نے فرمایا ہے کہ یہ ایسے خون ہیں جن سے اللہ نے ہمارے ہاتھوں کو پاک رکھا ہے، اس لئے چاہئے کہ ہم اپنی زبانوں کو بھی ان سے پاک رکھیں۔

(۱۶) شیخ ابن الہمام نے "شرح مسامرہ" میں فرمایا:

اہل سنت کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ تمام صحابہؓ کو لازمی طور پر پاک صاف مانتے ہیں اس لئے کہ اللہ نے

ان میں سے ہر ایک کا تزکیہ فرمایا ہے، نیز ان کے بارے میں اعتراضات کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اور ان سب کی مدح وثنا کرتے ہیں، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ثنا فرمائی (اس کے بعد چند آیتیں ذکر کرکے فرماتے ہیں) اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی تعریف فرمائی (پھر کچھ احادیث نقل کرکے لکھتے ہیں) اور حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان جو جنگیں ہوئیں وہ اجتہاد پر مبنی تھیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے شرح عقیدہ واسطیہ میں اس بحث پر تفصیلی کلام فرمایا ہے ان کے چند جملے یہ ہیں اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد لکھتے ہوئے فرماتے ہیں

اہل سنت ان روافض کے طریقہ سے برات کرتے ہیں جو صحابہؓ سے بغض رکھتے ہیں اور انھیں برا کہتے ہیں، اسی طرح ان ناصبوں کے طریقے سے برات کرتے ہیں جو اہل بیت کو اپنی باتوں سے، نہ کہ عمل سے تکلیف پہنچاتے ہیں، اور صحابہؓ کے درمیان جو اختلافات ہوئے ان کے بارے میں اہل سنت سکوت اختیار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ کی برائی میں جو روایتیں منقول ہیں ان میں سے بعض تو بالکل جھوٹ ہیں، بعض ایسی ہیں کہ ان میں کمی بیشی کردی گئی ہے، اور ان کا صحیح مفہوم بدل دیا گیا ہے، اور اس قسم کی جو روایتیں بالکل صحیح ہوں ان میں بھی صحابہ معذور ہیں، ان میں سے بعض حضرات اجتہاد سے کام لے کر حق وصواب تک پہنچ گئے اور بعض نے اجتہاد سے کام لیا، اور اس میں غلطی ہوگئی اس کے ساتھ ہی اہل سنت کا یہ اعتقاد بھی نہیں ہے کہ صحابہؓ کا ہر فرد تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم ہے، بلکہ ان سے فی الجملہ گناہوں کا صدور ممکن ہے، لیکن ان کے فضائل وسوابق اتنے ہیں کہ اگر کوئی گناہ ان سے صادر بھی ہو تو یہ فضائل ان کی مغفرت کے موجب ہیں، یہاں تک کہ ان کی مغفرت کے مواقع اتنے ہیں کہ ان کے بعد کسی کو حاصل نہیں ہوسکے۔

کتاب مذکور میں ابن تیمیہؒ ایک مفصل کلام کے بعد لکھتے ہیں:۔

(۱۸) اور جب سلف صالحین اہل السنۃ والجماعت کا اصول یہ پڑ گیا جو اوپر بیان کیا گیا ہے تو اب یہ سمجھئے کہ ان حضرات کے قول کا حاصل یہ ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ کی طرف جو بھی گناہ یا برائیاں منسوب کی گئی ہیں ان میں بیشتر حصہ تو جھوٹ اور افترا ہے اور کچھ حصہ تو ایسا ہے جس کو انھوں نے اپنے اجتہاد سے حکم شرعی اور دین سمجھ کر اختیار کیا، مگر بہت سے لوگوں کو ان کے اجتہاد کی وجہ اور حقیقت معلوم نہیں، اس لئے اس کو گناہ قرار دیا۔ اور کسی معاملہ میں یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ وہ خطاء اجتہادی ہی نہیں بلکہ حقیقۃً گناہ ہی ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ان کا وہ گناہ بھی معاف ہوچکا ہے، یا اس وجہ سے کہ انھوں نے توبہ کرلی، جیسا کہ بہت سے ایسے معاملات میں ان کی توبہ خود قرآن وسنت میں منقول وماثور ہے، اور یا ان کی دوسری ہزاروں حسنات وطاعات کے سبب معاف کردیا گیا اور یا اس کو دنیا میں کسی مصیبت وتکلیف میں مبتلا کرکے اس گناہ کا کفارہ

کر دیا گیا اس کے سوا اور بھی اسباب مغفرت ہو سکتے ہیں (ان کے گناہ کو مغفور و معاف قرار دینے کی وجہ یہ ہے) کہ قرآن و سنت کے دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ اہل جنت میں سے ہیں اس لئے ناممکن ہے کہ کوئی ایسا عمل ان کے نامۂ اعمال میں باقی رہے جو جہنم کی سزا کا سبب بنے اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ صحابۂ کرامؓ میں سے کوئی شخص ایسی حالت پر نہیں مرے گا جو دخول جہنم کا سبب بنے تو اس کے سوا اور کوئی چیز ان کے استحقاق جنت میں مانع نہیں ہو سکتی۔

اور عشرۂ مبشرہ کے علاوہ کسی معین ذات کے متعلق اگرچہ ہم یہ نہ کہہ سکیں کہ وہ جنتی ہے جنت ہی میں جائے گا مگر یہ بھی تو جائز نہیں کہ ہم کسی کے حق میں بغیر کسی دلیل شرعی کے یہ کہنے لگیں کہ وہ مستحق جنت کا نہیں ہے کیونکہ ایسا کہنا تو عام مسلمانوں میں سے بھی کسی کے لئے جائز نہیں جن کے بارے میں ہمیں کسی دلیل سے جنتی ہونا بھی معلوم نہ ہو۔ ہم ان کے بارے میں بھی یہ شہادت نہیں دے سکتے کہ وہ ضرور جہنم میں جائے گا تو پھر افضل المومنین اور خیار المومنین (صحابۂ کرام) کے بارے میں یہ کیسے جائز ہوگا۔ اور ہر صحابی کے پورے اعمال ظاہرہ و باطنہ اور حسنات و سیئات اور ان کے اجتہادات کی تفصیلات کا علم ہمارے لئے بہت دشوار ہے اور بغیر علم و تحقیق کے کسی کے متعلق فیصلہ کرنا حرام ہے اسی لئے مشاجرات صحابہؓ کے معاملہ میں سکوت کرنا بہتر ہے اس لئے کہ بغیر علم صحیح کے کوئی حکم لگانا حرام ہے۔ انتہی س۔ شرح عقیدہ واسطیہ ص ۱۵۶/۱۵۷)

اس کے بعد شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے صحیح روایت سے یہ واقعہ بیان کیا ہے

(۱۹) ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے حضرت عثمان غنیؓ پر تین الزام لگائے۔ ایک یہ کہ وہ غزوۂ احد میں میدان سے بھاگنے والوں میں تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ غزوہ بدر میں شریک نہیں تھے۔ تیسرے یہ کہ بیعت رضوان میں بھی شریک نہ تھے

حضرت عبداللہ نے ان تینوں الزاموں کا یہ جواب دیا کہ بے شک غزوہ احد میں فرار کا صدور ان سے ہوا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی معافی کا اعلان کر دیا مگر تم نے پھر بھی معاف نہ کیا کہ اس کا ان پر عیب لگاتے ہو۔ رہا غزوۂ بدر میں شریک نہ ہونا تو وہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہوا اور اسی لئے آپ نے عثمان غنیؓ کو غانمین بدر میں شمار کر کے ان کا حصہ لگایا اور بیعت رضوان کے وقت وہ حضورؐ ہی کے بھیجے ہوئے مکہ مکرمہ گئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس بیعت میں شریک کرنے کے لئے خود اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے کر اپنے دست مبارک سے بیعت فرمائی۔ اور ظاہر ہے کہ خود عثمان غنیؓ حاضر ہوتے اور ان کا ہاتھ اس جگہ ہوتا تو بھی وہ فضیلت حاصل نہ ہوتی کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک اس سے

ہزاروں درجہ بہتر ہے"

اس واقعہ میں غور کرو کہ تین الزاموں میں سے ایک الزام کو صحیح مان کر یہ جواب دیا کہ اب وہ ان کے لئے کوئی عیب نہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف کر دیا ہے۔ باقی دو الزاموں کا غلط بے اصل ہونا بیان فرمادیا اس کو نقل کر کے ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ یہی حال تمام صحابہ کا ہے ان کی طرف جو کوئی گناہ منسوب کیا جاتا ہے یا تو وہ گناہ ہی نہیں ہوتا بلکہ حسنہ اور نیکی ہوتی ہے اور یا وہ پھر اللہ کا معاف کیا ہوا گناہ ہوتا ہے (شرح عقیدہ واسطیہ ص۲۶۲ تا ص۲۶۴)

(۴) علامہ سفارینی نے اپنی کتاب الدرۃ المضیئہ میں پھر اس کی شرح میں اس مسئلہ پر اچھا کلام کیا ہے اس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے پہلے متن کتاب کے دو شعر لکھے ہیں۔

واحذر من الخوض الذی قد یزری بفضلھم مما جری لو تدری۔

اور پرہیز کرو صحابہ کرام میں پیش آنے والے جھگڑوں میں دخل دینے سے جس میں انہیں سے کسی کی تحقیر ہوتی ہو

فانہ عن اجتھاد قد صدر فاسلم اذل اللہ من لھم ھجر۔

کیونکہ ان کا جو عمل بھی ہوا ہے اپنے اجتہاد شرعی کی بنا پر ہوا ہے تم سلامتی کی راہ اختیار کرو، اللہ ذلیل کرے اس شخص کو جو ان کی بدگوئی کرے۔

اس کے بعد اس کی شرح میں فرمایا۔

اس لئے کہ جو نزاع وجدال اور دفاع وقتال صحابہؓ کے درمیان پیش آیا وہ اس اجتہاد کی بنا پر تھا جو فریقین کے سرداروں نے کیا تھا اور فریقین میں سے ہر ایک کا مقصد اچھا تھا اگرچہ اس اجتہاد میں برحق فریق ایک ہی ہے، اور وہ حضرت علی اور ان کے رفقا ہیں اور خطا پر وہ حضرات ہیں جنہوں نے حضرت علی سے نزاع وعداوت کا معاملہ کیا، البتہ جو فریق خطا پر تھا اسے بھی ایک اجر ملے گا اس میں صرف اہل جفا وعناد ہی اختلاف کرتے ہیں لہذا صحابہ کرام کے درمیان مشاجرات کی جو صحیح روایات ہیں ان کی بھی اس میں تشریح کرنا واجب ہے جو ان حضرات سے گناہوں کے الزام کو دور کرنے والی ہو، لہذا حضرت علی اور حضرت عباس کے درمیان جو تلخ کلامی ہوئی وہ کسی کے لئے موجب عیب نہیں نیز ابتدا میں حضرت علی نے جو حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی، وہ دو باتوں میں سے کسی ایک وجہ سے تھی، یا تو اس لئے کہ ان سے مشورہ نہیں لیا گیا تھا جیسا کہ خود انھوں نے اسی پر رنجیدگی کا اظہار فرمایا یا پھر اس سے حضرت فاطمہؓ کی دلداری مقصود تھی جو یہ سمجھتی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث سے جو حصہ مجھے ملنا چاہیئے وہ ملے پھر حضرت علیؓ نے بلاشبہ تمام لوگوں کے سامنے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اللہ کے فضل سے مسلمانوں کی بات ایک ہوگئی اور مقصد حاصل ہوگیا۔

تفہیم القرآن
ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

از مولانا جمیل الرحمٰن قاسمی پرتاپگڈھی

قوم ابراہیم اور نمرود

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کا قوم کا نمبر آتا ہے۔ یہ قوم بھی سابقہ قوموں کی طرح بت پرست تھی خدا کی وحدانیت کی منکر تھی حتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نہ صرف بت پرست تھے بلکہ وہ بت گر اور بت فروش بھی تھے اس قوم کا بادشاہ نمرود ان چار بادشاہوں میں سے ایک تھا جس کی حکمرانی ساری دنیا پر ہوئی ہے۔ اور یہ دنیا کا پہلا سرکش اور باغی بادشاہ ہے جس نے ربوبیت کا دعوی کیا سابقہ انبیاء کی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت بھی یہی تھی کہ تم لوگوں نے جو مختلف معبود بنا رکھے ہیں سب کو چھوڑ دو اور ایک خالص باری تعالیٰ کی عبادت کرو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے سلسلے میں حسب ذیل آیات صاف دلالت کرتی ہیں۔

واذکر فی الکتاب ابراهیم انه کان
صدیقا نبیا۔ اذ قال لابیه یا ابت لم
تعبد ما لا یسمع ولا یبصر ولا یغنی
عنك شیئا۔ یا ابت انی قد جاءنی من العلم
ما لم یاتك فاتبعنی اهدك صراطا سویا
یا ابت لا تعبد الشیطان ان الشیطان
کان للرحمٰن عصیا۔ یا ابت انی اخاف
ان یمسك عذاب من الرحمٰن فتکون
للشیطان ولیا۔ قال اراغب
انت عن الهتی یا ابراهیم لئن

اور آپ اس کتاب میں ابراہیم کا ذکر کیجئے۔ وہ بڑی
راستی والے اور پیغمبر تھے جبکہ انھوں نے اپنے باپ سے کہا کہ اے
میرے باپ تم ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتے ہو جو نہ کچھ سنے اور نہ کچھ
دیکھے اور نہ تمہارے کچھ کام آسکے۔ اے میرے باپ میرے پاس ایسا علم
پہونچا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا تو تم میرے کہنے پر چلو میں
تم کو سیدھا راستہ بتلاؤں گا۔ اے میرے باپ تم شیطان کی
پرستش مت کرو بے شک شیطان رحمٰن کا نافرمانی کرنے
والا ہے۔ اے میرے باپ میں اندیشہ کرتا ہوں کہ تم پر
رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب نہ آپڑے پھر تم شیطان کے
ساتھی ہو جاؤ۔ باپ نے جواب دیا کہ کیا تم میرے معبودں

لو تنته لارجمنك واهجرني مليا (سورہ مریم رکوع ۳)

سے پھرے ہوئے ہو اے ابراہیم۔ اگر تم باز نہ آئے تو میں ضرور تم کو مار پتھروں کے سنگسار کر دوں گا اور ہمیشہ ہمیش کیلئے مجھ سے برکنار ہو

خط کشیدہ فقروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس سوسائٹی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنکھ کھولی تھی اس میں لوگ باری تعالی کو چھوڑ کر مختلف معبودوں کی پرستش میں لگ گئے تھے اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں اس بت پرستی سے روکا تو قوم تو قوم خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد برافروختہ ہو گئے۔ اور بگڑ کر بولے اگر تم اس کام سے باز نہ آئے تو تمہیں سنگسار کر دوں گا لہذا تم مجھ سے دور رہو۔ اور دوسری آیتیں بھی ملاحظہ کریں

ولقد اتینا ابراهیم رشده من قبل وکنا به علمین ه اذ قال لابیه وقومه ماهذه التماثیل التی انتم لها عاکفون ه قالوا وجدنا اباءنا لها عٰبدین ه قال لقد کنتم انتم واباؤکم فی ضلال مبین ه قال افتعبدون من دون الله ما لا ینفعکم شیئاً ولا یضرکم ه اف لکم ولما تعبدون من دون الله افلا تعقلون ه (انبیاء رکوع ۵)

اور ہم نے اس سے پہلے ابراہیم کو ان کی خوش فہمی عطا فرمائی تھی اور ہم ان کو خوب جانتے تھے جبکہ انھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی برادری سے فرمایا کہ کیا مورتیں ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو وہ کہنے لگے ہم نے اپنے بڑوں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے، ابراہیم نے کہا بے شک تم اور تمہارے باپ دادے صریح غلطی میں ہیں۔ ابراہیم نے فرمایا کہ تو کیا خدا کو چھوڑ کر تم ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہونچا سکے اور نہ کچھ نقصان پہونچا سکے۔ تف ہے تم پر اور ان پر جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو کیا تم نہیں سمجھتے؟

قد کانت لکم اسوة حسنة فی ابراهیم والذین معه اذ قالوا لقومهم انا برءٰؤا منکم ومما تعبدون من دون الله کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوة والبغضاء ابدا حتی تؤمنوا بالله وحده (ممتحنہ رکوع ۱)

تمہارے لئے ابراہیم میں اور ان لوگوں میں جو کہ ان کے شریک حال تھے ایک عمدہ نمونہ ہے۔ جبکہ ان سب نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں۔ ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کیلئے عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

غور کیجئے ان تمام آیتوں میں قوم ابراہیم علیہ السلام کی ایک ہی بنیادی گمراہی کا بار بار تذکرہ کیا ہے اور وہ یہی تھی کہ وہ سب توحید باری تعالی کا راستہ چھوڑ کر خود کے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش میں لگ گئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں بار بار آواز دی کہ تم بت پرستی

سے باز آجاؤ اور ایک خدا کا راستہ پکڑو لیکن انھوں نے آپ کی ایک نہ سنی اور بت پرستی میں لگے رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعوت میں کہیں بھی کوئی باری تعالیٰ کا سیاسی حکم، اقتدار اعلیٰ، حاکمیت اور سیاسی و تمدنی ربوبیت کے منوانے کا تذکرہ دور دور تک نہیں ہے

اب نمرود کے معاملے کو لیجئے ـــ اس سلسلے میں قرآن کی آیتوں کو دیکھئے جس میں اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مناظرہ کیا ہے۔

الم تر الی الذی حاج ابراھیم فی ربہ ان اتاہ اللہ الملک اذ قال ابراھیم ربی الذی یحیی و یمیت قال انا احی و امیت قال ابراھیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب فبھت الذی کفر (بقرہ۔ ۳۵)	کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے معاملہ میں۔ اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی جب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ کہنے لگا کہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال دے اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر۔

ان آیتوں کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہوگا کہ اس سے پہلے قرآن میں جو آیتیں مذکور ہوئی ہیں ان پر غور کر لیا جائے تاکہ ان کا مفہوم سہولت سے سمجھ میں آسکے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مناظرے والی آیت سے پہلے یہ آیتیں مذکور ہیں۔

قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت و یومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا واللہ سمیع علیم۔ اللہ ولی الذین امنوا یخرجھم من الظلمات الی النور والذین کفروا اولیاء ھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات اولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون۔ (بقرہ ۳۴)	بے شک ہدایت گمراہی سے جدا ہو چکی ہے۔ اور جو شخص گمراہ کرنے والوں کو نہ مانے اور اللہ پر یقین لے آیا تو اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا مددگار ہے۔ ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور جو لوگ کافر ہوئے ان کے رفیق شیطان ہیں ان کو روشنی سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں یہی لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں۔ وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیتوں میں اہل ایمان واہل کفر اور ان کے نور ہدایت اور ظلمت کفر کا ذکر ہے اسی کی تائید میں حق تعالیٰ نے چند نظائر بیان فرمائے ہیں نظیر اول میں نمرود بادشاہ کا ذکر ہے جس کو الم تر الی الذی حاج ابراھیم ... الخ سے بیان کیا گیا ہے عام مفسرین کے بیان کے مطابق سب سے پہلا یہ شخص خدا کا منکر اور ربوبیت کا دعویٰ کرنے والا ہے یہاں میں صرف تین حوالے ذکر کرتا ہوں۔

قال البغوی ھو اول من وضع التاج علی راسہ وتجبر فی الارض وادعی الربوبیۃ (تفسیر مظہری ج۱ ص۳۶۳ بقرہ ۳۵)	نمرود ہی سب سے پہلا انسان ہے جس نے اپنے سر پر تاج رکھا اور زمین میں تکبر کیا اور ربوبیت کا دعویٰ کیا

ھو اول من تجبر وادعی الربوبیۃ کما قال المجاھد وغیرہ (روح المعانی ج۳ ص۱۵ بقرہ)

(الم تر) ای الم ینتہ علمک یا محمد (الی الذی حاج ابراھیم فی ربہ) ای وجود ربہ و ذلک انہ انکر ان یکون ثم الٰہ غیرہ کما قال بعدہ فرعون لملئہ	... اور اس نمرود نے حضرت ابراہیم سے مناظرہ اس لئے کیا کہ اس نے اس بات سے انکار کیا کہ اس جگہ اس کے علاوہ اور کوئی الٰہ ہے جس طرح اس کے بعد فرعون نے اپنے قوم کے سرداروں سے کہا۔

یہ شخص اپنے آپ کو سلطنت کے غرور سے سجدہ کرواتا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے سامنے سجدہ نہ کیا تو نمرود نے دریافت کیا تو فرمایا کہ میں اپنے رب کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتا۔ اس نے کہا رب تو میں ہوں انھوں نے جواب دیا کہ میں تجھ کو رب نہیں کہتا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ نمرود نے دو قیدی منگا کر بے قصور کو مار ڈالا اور قصوروار کو چھوڑ دیا اور کہا دیکھا میں جس کو چاہتا ہوں مارتا ہوں اور جسے چاہتا ہوں نہیں مارتا اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آفتاب کی دلیل پیش فرما کر اس مغرور احمق کو لاجواب کر دیا۔

غور کیجئے ان مذکورہ آیتوں اور مفسرین کرام کے واضح ارشادات میں نمرود کی کوئی سیاسی و تمدنی اقتدار کا مسئلہ نہیں ذکر کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی حضرت ابراہیم کی مخالفت کی بنیاد اس کا سیاسی اقتدار تھا۔ بلکہ آپؑ تو حق تعالیٰ کے پاس سے پیغام رشد و ہدایت لے کر تشریف لائے تھے اور اپنی بت پرست قوم کو یہ بتلا رہے تھے کہ یہ بت جھوٹے ہیں تمہارے لئے سلامتی صرف اس میں ہے کہ تم ایک خدا کے پرستار بن جاؤ۔ اور نمرود پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ موت و حیات کا مالک باری تعالیٰ ہے تو کیونکر رب ہو سکتا ہے میں تیرے سامنے نہ جھکوں گا اور نہ ہی سجدہ ریز ہوں گا۔

اب اس حقیقت پر پردہ ڈال کر مودودی صاحب اگر یہ کہیں کہ جھگڑا اللہ کے ماننے یا نہ ماننے پر نہ تھا بلکہ اس کی بنیاد سیاسی اقتدار تھا تو یہ قرآن کی شہادت سے کھلا ہوا انحراف ہے۔ اس آیت کی مزید تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

قوم لوط اس قوم کا معاملہ بھی سابقہ قوموں کی طرح تھا۔ اس میں ایک ایسی برائی نے جنم لے لیا تھا جس کا وجود اس سے پہلے نہ تھا۔ اس قوم نے بھی اپنے نبی کو جھٹلایا۔ اور ایمان نہ لا سکی۔ قرآن کی ان آیتوں کو غور سے دیکھیے۔

كذبت قوم لوط المرسلين اذ قال
لهم اخوهم لوط الا تتقون۔ انی
لكم رسول امين۔ فاتقوا الله
واطيعون۔ وما اسئلكم عليه
من اجر ان اجری الا علی رب
العالمين اتاتون الذكران
من العالمين وتذرون ما خلق
لكم ربكم من ازواجكم بل
انتم قوم عادون۔ قالوا لئن لم
تنتہ يا لوط لتكونن من المخرجين
قال انی لعملكم من القالين رب
نجنی واهلی مما يعملون فنجيناه
واهله اجمعين الا عجوزا فی الغابرين
ثم دمرنا الآخرين وامطرنا عليهم
مطرا فساء مطر المنذرين۔ ان
فی ذلك لاية وما كان اكثرهم
مومنين۔ (شعراء رکوع ۹)

قوم لوط نے پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ ان سے ان کے بھائی لوط نے کہا کہ کیا تم ڈرتے نہیں ہو میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں چاہتا۔ بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے کیا تمام دنیا جہان والوں میں سے تم مردوں سے فعل کرتے ہو۔ اور تمہارے رب نے جو تمہارے لئے بیبیاں پیدا کی ہیں ان کو نظر انداز کئے رہتے ہو۔ بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو وہ لوگ کہنے لگے کہ اے لوطؑ اگر تم باز نہ آؤ گے تو ضرور نکال دیئے جاؤ گے۔ لوطؑ نے فرمایا کہ میں تمہارے اس کام سے سخت نفرت رکھتا ہوں۔ لوطؑ نے دعا کی اے میرے رب مجھ کو اور میرے متعلقین کو ان کے اس کام سے نجات دے سو ہم نے ان کو اور ان کے متعلقین کو سب کو نجات دی بجز ایک بڑھیا کے کہ وہ رہ جانے والوں میں رہ گئی پھر ہم نے اور سب کو ہلاک کر دیا اور ہم نے ان پر خاص قسم کا مینہہ برسایا سو کیا برا مینہہ تھا جو ان لوگوں پر برسا جن کو ڈرایا گیا تھا بے شک اس میں عبرت ہے اور ان لوگوں میں اکثر ایمان نہیں لاتے۔

یہی مضمون سورہ اعراف، سورہ ہود، سورہ عنکبوت میں بھی مذکور ہوا ہے جس کی قدرے تشریح یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں جو ان کے ساتھ عراق

سے ہجرت کر کے ملک شام میں تشریف لائے اور خدا کی طرف سے سدوم اور اس کے گرد و نواح کی بستیوں کی طرف مبعوث ہوئے تاکہ ان کی اصلاح فرمائیں اور ان کے اس فعل جو مردوں سے لواطت کیا کرتے تھے اس سے باز رکھیں۔ یہ قوم اس گندے، خلاف فطرت اور بے حیائی کے کاموں میں نہ صرف مبتلا تھی بلکہ اس بے حیائی کی موجد بھی تھی۔ ان سے پیشتر عالم میں اس بیماری سے کوئی واقف نہ تھا۔ اولاً یہ ملعون حرکت شیطان نے سدوم والوں کو سجھائی اور وہیں سے دوسرے مقامات میں پھیلی۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اس ملعون اور شنیع حرکت کے عواقب پر متنبہ کیا اور گندگی کو دنیا سے مٹانا چاہا۔ لیکن سابقہ قوموں کی طرح آپ کی قوم نے بھی آپ کی تکذیب کی اور آخری بات جو انھوں نے کہی وہ یہ تھی کہ جب آپ ہم سب کو گندہ سمجھتے ہو اور آپ پاک بننا چاہتے ہیں تو گندوں میں پاکوں کا کیا کام اور اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہا کہ انھیں اپنی بستی سے نکال دینا چاہیے تاکہ یہ روز روز کی رکاوٹ ختم ہو جائے لیکن یہ قوم اپنے نبی کو کیا نکالتی اس کی قسمت میں عذاب الٰہی مقدر ہو چکا تھا وہ آکر رہا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت لوطؑ اور آپ کے متعلقین کو عزت و عافیت کے ساتھ صحیح سالم ان بستیوں سے نکال لیا اور ان کی بستیوں پر اپنا عذاب مسلط کیا لوط علیہ السلام کے متعلقین میں سے صرف آپ کی بیوی آپ سے علیحدہ رہی اور معذبین کے ساتھ ہلاک ہو گئی۔ غرضیکہ ان تمام لوگوں پر عذاب الٰہی آکر رہا جو اس مرض میں مبتلا تھے اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اپنے نبی کی تکذیب کرتے تھے۔

غور کیجئے ان تصریحات میں قوم لوط کی کس گمراہی کا تذکرہ کیا گیا ہے اور حضرت لوط علیہ السلام کس لئے مبعوث ہوئے تھے اب اگر مودودی صاحب یہ کہیں کہ ان کی اصل گمراہی یہ نہ تھی کہ وہ لواطت جیسے مہلک مرض کے شکار تھے بلکہ یہ تھی کہ انھوں نے باری تعالیٰ کے سیاسی اقتدار کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اور جب حضرت لوطؑ نے باری تعالیٰ کی سیاسی و تمدنی ربوبیت کا اعلان کیا تو انھوں نے اس کے ماننے سے انکار کر دیا یہ کتنی بے بنیاد بات ہے۔ قرآن کے بیان کردہ حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مودودی صاحب نے محض اپنے مزعومہ نظریئے (حکومت الٰہیہ کا قیام) کی زمین ہموار کرنے کے لئے یہ جرأت کی ہے۔

قوم شعیب یہ قوم بھی قوم عاد اور ثمود سے کوئی مختلف نہ تھی یہ قوم جہاں توحید باری تعالیٰ کی منکر اور بت پرست تھی وہیں اس میں کم تولنے اور کم ناپنے کا مرض شدت کے ساتھ تھا۔ قرآن حکیم نے ان کی برائیوں کو اس طرح بیان فرمایا ہے

والیٰ مدین اخاھم شعیبا، قال یٰقوم اعبدوا — اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا انھوں نے

باقی صفحہ ۳۱ پر

درس نظامی

اور

ہمارے اسلاف

جناب مولانا عبدالستار قاسمی ۔ رفیق مرکز دعوت اسلام دیوبند

دارالعلوم کے نمائندہ اجتماع کے موقع پر جس میں ہندوستان کے تقریباً ہر علاقہ کے ارباب علم اور اہل دین اور ذمہ داران مدارس عربیہ کی بڑی تعداد شریک تھی یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ مدارس عربیہ کے موجودہ تعلیمی نظام اور تعلیمی نصاب ۔ (درس نظامی) میں اس کی بنیادی و اساسی حیثیت (علوم عالیہ) کو برقرار رکھتے ہوئے (علوم آلیہ میں) کوئی جزوی ترمیم ہو سکتی ہے یا نہیں ۔ اگر ہو سکتی ہے تو کس قدر کتنی اور کس قدر یہ مسئلہ، اپنی اپنی جگہ، مدتوں سے زیر بحث تھا ۔ مادرِ علمی کی آغوش میں اس کے نونہال بہلوت جمع ہوئے تو انھوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اس بارے میں ارباب علم، اہل دین اور ذمہ دارانِ مدارس عربیہ نے نہایت ہوش، سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اپنا اپنا مطمع نظر پیش کیا ۔ شرکاء کی اکثریت کا فیصلہ اپنے طویل تجربات کی روشنی میں یہی تھا کہ نصاب تعلیم میں نظر ثانی ہو ۔ وہ علوم جو مقاصد کے درجہ میں ہیں، اپنی جگہ برقرار رہیں اور وہ جو محض وسائل کا درجہ رکھتے ہیں، اس میں ضروری و مناسب ترمیم و تنسیخ ہو۔

دردمندانہ اپیل اس اہم موقعہ پر دارالعلوم دیوبند کی نمائندگی کرتے ہوئے ۔ دارالعلوم کے بعض موقر ذمہ دار اساتذہ نے، ہندوستان بھر سے آئے ہوئے ارباب علم اہل دین اور ذمہ داران مدارس عربیہ سے یہ دردمندانہ اپیل بھی کی تھی آپ حضرات اپنی اپنی جگہ پہونچ کر اس بارے میں نہایت غور و فکر، سنجیدگی اور ہوش مندی سے تجزیہ فرمائیں اور اپنی قیمتی آراء سے مطلع کریں اس لئے کہ یہ مسئلہ جوش اور جذباتیت کا نہیں ہے ۔ آپ تبدیلی نصاب کے ہر پہلو پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں اور کوئی نپی تلی رائے قائم کریں ۔ خدا نے توفیق دی تو ہم اور آپ پھر اسی مادر علمی کے آغوش میں اکٹھے ہوں گے اور مل جل کر کوئی خاکہ ۔ اور لائحہ عمل تیار کر لیں گے ۔

دارالعلوم کے پرسکون وسنجیدہ ماحول میں.. نہایت متانت وسنجیدگی کے ساتھ یہ بات کہی گئی اور حاضرین نے اس دردمندانہ آواز کو اپنے دل کی دھڑکنوں کے قریب ہی محسوس کیا.. یوں ہوسکتا ہے چند گنے چنے افراد ایسے بھی رہے ہوں جنھیں یہ آواز پسند نہ آئی ہو اور ان کی دلی آرزو یہی ہو کہ موجودہ "نصاب تعلیم" میں کوئی بھی ترمیم وتبدیلی نہ ہو.. اور ہوسکتا ہے وہ اس بارے میں مخلص بھی ہوں. لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ نصاب تعلیم میں کسی ترمیم کا سوال ــــ محض جذباتیت، جوش، اور متانت وسنجیدگی سے دور رہو ــــ تو ــــ پھر اپنے ان جلیل القدر اسلاف واکابر کے بارے میں کیا کہا جائیگا جنھوں نے نہ صرف اسکی دعوت دی بلکہ "درس نظامی" میں موقع بموقع تراش خراش بھی کی.

مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رح فرماتے ہیں

دور کیوں جائیے، قریبی عہد کی ــــ ایک عہد ساز شخصیت حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رح کے یہ الفاظ، چشم بینا کے لئے سرمۂ بصیرت ہیں:

"تجویز نصاب کا مسئلہ بے حد اہم ہے، وقت کا صحیح تقاضہ ہے اور اہم ضرورت ہے، اور جیسے کچھ ہوسکے کوشش کرکے طے کرنے کی ضرورت ہے، اتفاق سمجھیں، عرصہ سے اس کا احساس ہے اور شغف رہا ہے.. لیکن اس کی ضرورت ہے کہ سنجیدہ دماغ اور مخلص حضرات تجربہ کار اصحاب جمع ہو کر کوئی خاکہ تیار کریں انفرادی کوشش نہ تو مفید ہوسکتی ہے نہ موثر نہ امت کیلئے قابل قبول." مزید فرماتے ہیں..

"نصاب کے بارے میں ایک چیز قابل گذارش ہے کہ موجودہ نصاب میں، سوائے چند کتابوں کے کوئی ایسی کتاب نہیں جس سے عربی قدماء کی تالیفات اس سے بہتر نہ مل سکیں نصاب کی ترمیم میں یہ بات پیش نظر رکھنا بے حد ضروری ہے کہ کتابیں ایسی داخل درس ہوں کہ کتاب کی لفظی بحثیں کم ہوں اور مصنف کے الفاظ کے مطالب بیان کرنے میں وقت زیادہ صرف نہ ہو" تعمیر حیات نصاب ونظام تعلیم نمبر صفحہ ۶

لمحۂ فکریہ ہوسکتا ہے کوئی اللہ کا بندہ ــ یہ کہہ جائے کہ یہ محض مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رح کی ذاتی رائے ہے... لیکن یہ بات خلاف واقعہ ہوگی کیونکہ اس ضرورت کا احساس ہر دور میں کیا جاتا رہا ہے. آپ دارالعلوم دیوبند کے موجودہ نصاب تعلیم کے بارے میں کیا کہیں گے.. وہی نصاب تعلیم.. جس کے بارے میں جزوی ترمیم وتغیر کا لفظ سنتے ہی بعض حضرات کی پیشانیوں پر شکن آجاتی ہے..

ہاں اسی نصاب تعلیم میں ــــ یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ:

"اسی نصب العین کی روشنی میں اس کا نصاب تعلیم تجویز کیا گیا جس کی اساس درس نظامی پر رکھی گئی ہے.. وقتاً فوقتاً بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے دینی تقاضوں کے پیش نظر اس میں جزوی تغیر و

تبدل بھی ہوتا رہا ہے،، مزید فرمایا گیا :

درجات عربیہ کے نصاب میں ایک حصہ علوم عالیہ کا ہے جو مقاصد کا درجہ رکھتے ہیں جیسے قرآن حکیم، علم تفسیر، علم حدیث، اصول حدیث، علم فقہ، اصول فقہ، علم عقائد و کلام، علم الفرائض والمواریث علم القراءات والتجوید۔

اور ایک حصہ علوم آلیہ کا ہے جو علوم عالیہ کے لئے ممد و معاون یا وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے علوم عربیت، صرف و نحو، معانی و بیان، منطق و فلسفہ، عروض و قوافی، بحث و نظر، مناظرہ، ہیئت، ہندسہ، حساب، طب، تاریخ و جغرافیہ، علم مدنیت، جنرل سائنس، مبادی معاشیات وغیرہ۔ (نصاب تعلیم دار العلوم دیوبند ۱۳۹۱ھ ص ۲۔۳)

ام المدارس اور نصاب تعلیم

اور لیجئے ــــــ دار العلوم دیوبند، جس سے ہندوستان کے بیشتر مدارس عربیہ ذہنی و علمی ربط رکھتے ہیں اور اسی مرکز سے ان مدارس کو آب حیات ملتا ہے . . اسی کے نصاب تعلیم میں یہ بات بھی صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ :

"پرانا نصاب، نہ اس درجہ عظیم جتنا اس کو سمجھ لیا گیا ہے اور نہ اتنا ٹھوس اور منضبط سمجھنا چاہئے کہ ہر جانب سے معقول خراش و تراش کی راہیں مسدود ہوں،، (نصاب تعلیم دار العلوم دیوبند ۱۴۰۰ھ ص ۴)

آگے چل کر فرمایا گیا :

"درحقیقت اساسی مقاصد کے حصول کے لئے نصابی کتابیں لباس کے درجے میں ہیں جنھیں ہر وقت بدلا بھی جا سکتا ہے اور دھو دھلا کر صاف و ستھرا بھی کیا جا سکتا ہے دار العلوم دیوبند اس لچک کا ہمیشہ حامی رہا ہے اور اسی لئے وقتاً فوقتاً نصاب میں ایسی تبدیلیوں کو ممنوع نہیں قرار دیا گیا جن کے نتیجہ میں تعلیم سے جو دینی مقاصد وابستہ کئے گئے ہیں وہ مضمحل نہ ہوں . . . اساسی علوم میں ــــ چند کتابوں کو چھوڑ کر ــــ باقی میں ہر وقت تبدیلی ممکن ہے،، حوالہ بالا ص ۵ و ۶

باقی آئندہ

ان شاء اللہ العزیز آپ کے سامنے قدرے تفصیل سے . . . وہ تفصیلات آئیں گی . . جن سے معلوم ہوگا . . کہ موجودہ نصاب تعلیم ــــ جسے عرف عام میں "درس نظامی" کہا جاتا ہے . . اس درس نظامی سے کس قدر متفاوت ہے جسے استاذ العلماء ملا نظام الدین نے مرتب کیا تھا . . کتنی ہی اہم اور بنیادی کتابیں ہیں جو بعد میں داخل ہوئیں اور امت کا سرمایہ افتخار بن گئیں . . اور کتنی ہی ایسی کتابیں ہیں جو کبھی "درس نظامی" کی روح اور جان تھیں ــ مگر زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر ہمارے اکابر و اسلاف نے ــ خدا کی ہزار ہا ہزار رحمتیں ہوں ان پر ــ ان کتابوں پر خط تنسیخ پھیر دیا . . اور ان دینی مقاصد کو مضمحل نہ ہونے دیا جو تعلیم سے وابستہ ہیں

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

REGD. No. SHN - L - 13 -NP - 21 - 84

DARUL-ULOOM MONTHLY

DEOBAND (U.P.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالعلوم دیوبند

کے ترقیاتی منصوبے

(۱) رواق خالد کی دوسری منزل اور [illegible] کی تعمیر جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو

(۲) **دارالتربیت** (دارالاطفال) کا قیام اور اس کی تعمیر

(۳) ایک وسیع مسجد کی تعمیر جس میں اضافہ شدہ تمام طلبہ کی گنجائش ہو (قدیم مسجد ناکافی ہو چکی ہے)

(۴) علمی و دینی اجتماعات کے لئے ایک وسیع ہال کی تعمیر۔ —— (۵) ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر

(۶) مہمان خانہ کی توسیع — (۷) نئی درسگاہوں کی تعمیر —— (۸) **لائبریری کی تعمیر جدید**

(۹) اساتذۂ دارالعلوم کی علمی ترقی کے لئے عالم اسلام سے علمی کتابوں کی فراہمی کا انتظام

(۱۰) تمام دنیا میں پھیلے ہوئے فضلاء دارالعلوم سے روابط اور ان سے متعلق معلومات۔

(۱۱) نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر تمام ذمہ داران مدارس عربیہ کا اہم کنونشن طلب کرنا۔

(۱۲) تعلیم و تربیت کے نئے اصول و ضوابط کی ترتیب اور ان کا اجراء۔

اس ادارے کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے

دستِ تعاون بڑھانے کی شدید ضرورت ہے

مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی امداد روانہ فرمائیں ——

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب) دارالعلوم دیوبند یوپی

این جے پرنٹرس دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی اصلاحی

ماہنامہ

دارالعلوم

زیر سرپرستی

مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند

مدیر مسئول

ریاست علی بجنوری

نگرانِ اعلیٰ حضرت الحاج مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند یوپی

دارالعلوم دیوبند کا علمی و دینی

ماہنامہ دارالعلوم

شمارہ نمبر ٦	ستمبر ۱۹۸۴ء مطابق ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ	جلد نمبر ٦٦

ضروری گذارش

◯ اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینہ یا اس سے پہلے کسی مہینہ میں آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ بذریعہ سرخ نشان اس کی آپ کو اطلاع بھی دی جا چکی ہے۔ لہذا اب اگر آئندہ شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا کوئی خط یا چندہ نہ آیا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی پی ہی سے زر اشتراک ادا کرنے میں آسانی ہے اگلا شمارہ - ۳۱/ روپے کے مطالبہ میں وی پی کر دیا جائے گا۔ (مدیر)

فہرست مضامین

ہندوستانی اور پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ../۵۴ روپے مولانا عبدالستار صاحب مقام کرم علی والا تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان (پاکستان) کو بھیج دیں اور انھیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو رسالہ دار العلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں

(مدیر)

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

دسویں صدی ہجری کے آخر اور گیارہویں صدی ہجری کے شروع کا زمانہ ہندوستان میں اسلام اور حامیانِ اسلام کے لئے انتہائی نازک شمار کیا جاتا ہے جبکہ مغل تاجدار جلال الدین اکبر (۹۶۳ - ۱۰۱۴) نے شہنشاہیت کی ترنگ اور عقلیت کے نشہ میں عقل و ہوش سے بے نیاز ہو کر "دین اسلام" کے متوازی "دینِ الٰہیہ" کے نام سے ایک جدید مذہب کی تحریک چلائی

دربارِ اکبری سے منسلک ایک ثقہ عالم اور مستند مؤرخ "ملا عبدالقادر بدایونی" اس جدید مذہب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اکبر کا حال یہ تھا کہ جب اس کے سامنے کسی معاملہ سے متعلق شرعی ثبوت پیش کئے جاتے تو برہم ہو کر یہ کہتا تھا کہ یہ سب ملّاؤں کی باتیں ہیں مجھ سے تو عقل و حکمت ہی کی باتیں بیان اور دریافت کی جائیں (منتخب التواریخ صفحہ ۳۰۳) اس عقلیت پرستی کے دور میں عام طور پر یہ بات مشہور کر دی گئی تھی کہ "دین کا مدار عقل پر ہے نقل پر نہیں ہے" (م ل ۳۱۱) مؤرخ بدایونی نے اس سے بھی خطرناک روش کی اطلاع دی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ برخود غلط مجتہد اور الہام و وحی الٰہی کو محال قرار دیتا غیب اور عالمِ غیب سے متعلق ارشاداتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی برملا تکذیب کرتا اور فرشتوں، جنات، معجزات، بعث بعد الموت، حساب و کتاب اور ثواب و عذاب کا کھلے لفظوں انکار کرتا تھا (صفحہ ۲۷۲) اس الحاد و زندقہ میں صرف اکبر ہی نہیں گرفتار تھا بلکہ اس کے ارد گرد رہنے والوں میں سے اکثر لوگوں کا حال یہی تھا۔ معجزاتِ نبوی کے ساتھ استہزاء کی کیفیت کو ملا بدایونی نے یوں بیان کیا ہے کہ "بھرے دربار میں ایک پیر پر کھڑے ہو کر معراجِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذاق اڑاتا اور کہتا کہ جب میں اپنا دوسرا پیر اٹھا کر کھڑا نہیں رہ سکتا تو راتوں رات ایک شخص آسمان سے اوپر کیسے پہنچ گیا پھر خدا سے باتیں بھی کیں اور جب واپس ہوا تو بستر تک گرم تھا" اس کے بعد لکھتے ہیں کہ مذاق و استہزاء کا یہی معاملہ شق القمر اور دیگر معجزات کے ساتھ بھی تھا (صفحہ ۲۷۴) اکبر کے اس علمی طریقِ استدلال سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مدعیانِ عقل کی عقل و فہم کو کس طرح زائل فرما دیتے ہیں۔

ائمہ دین اور مجتہدینِ اسلام کی توہین و تحقیر برسرِ عام کی جاتی تھی اور انھیں فقیہ کور، رجعت پسند، رفتارِ زمانہ سے ناواقف، خشک ملا اور متعصب جیسے اہانت آمیز الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ دربارِ اکبری کا ممتاز محقق، دینِ الٰہیہ کا مرتب ابو الفضل فقہاءِ کرام کے فیصلوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کرتا تھا کہ ان

مٹھائی فروخت کرنے والوں، جوتا گانٹھنے والوں اور چمڑا فروشوں کی بات کیسے مان لوں (ص۳۰) یہ ائمہ فقہ شمس الدین عبدالعزیز بن احمد الحلوانی متوفی ۴۹۸ھ اور شیخ احمد بن عمر خصاف متوفی ۲۶۱ھ کی نسبتوں کی طرف تعریض ہے)

دین اسلام کی بیخ کنی کی ان عملی کوششوں کے ساتھ علمی طور پر اسلامی عقائد و اعمال کے اندر شکوک و شبہات پیدا کرنے کی غرض سے (آج کل کی اصطلاح میں اسلام کا آزاد سائنٹفک مطالعہ کرنے کیلئے قانون ساز کونسلیں قائم کی گئیں۔ اس کمیٹی میں اسلامی عقائد اور مسلمات کے متعلق عقل کی روشنی میں فیصلے کئے جاتے اور اسلامی معتقدات کا مذاق اڑایا جاتا اگر کسی ممبر کی ایمانی غیرت بیدار ہو جاتی اور وہ ان فیصلوں پر اختلافی نوٹ لکھنا چاہتا تو اسے روک دیا جاتا تھا ص۳۱)

غرضیکہ ایک عظیم تحریک تھی جو ایک مطلق العنان، خودسر بادشاہ کی سرپرستی میں دین اسلام کے خلاف چلائی جارہی تھی اور مظلوم اسلام انتہائی کس مپرسی کے ساتھ اس کی مخالفانہ اور معاندانہ یورشوں کو برداشت کر رہا تھا۔ لیکن وہ اسلام جو دنیا میں سربلندی کیلئے برپا کیا گیا تھا آخر کب تک اس کس مپرسی اور بیچارگی کی حالت میں رہتا۔ الف ثانی کے اس محرف اعظم کی دین اسلام تحریفات دیکھ کر سرہند میں آباد خانوادہ فاروقی کے ایک فرزند رشید شیخ احمد فاروقی کی رگ فاروقیت پھڑک اٹھی اور وہ اپنی تمام تر بے سروسامانی کے باوجود برصغیر کی اس سب سے بڑی طاقت سے ٹکرا گئے ابتداء میں اگرچہ چندے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں لیکن آخر میں دنیا نے دیکھ لیا کہ محرف الف ثانی کے مقابلہ میں فتح و کامرانی مجدد الف ثانی ہی کے حصہ میں آئی اور جس گھر سے اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کی تحریک چلی تھی اسی گھر میں اورنگ زیب عالمگیر جیسا اسلام دوست اور شاہی، فقیری اداؤں کا رمز شناس بادشاہ پیدا ہوا جس نے اسلامی حمیت کا قابل ستائش مظاہرہ کرتے ہوئے ببانگ دہل اعلان کیا کہ "جد ما الکفر بود"

تین چار صدی تک کنج گمنامی میں پوشیدہ رہنے کے بعد عقلیت پرستی کا یہ اکبری فتنہ پھر سر اٹھا رہا ہے اور کبھی قادیانیت کا لباس اوڑھ کر رسالت کے مقدس عقیدہ میں رخنہ پیدا کرنا چاہتا ہے اور کبھی نیچریت کے نام سے غیب اور متعلقات غیب، جن، فرشتہ، دوزخ، جنت اور حساب و کتاب کے عقیدہ سے مسلمانوں کو منحرف کرنا چاہتا ہے، اور کبھی بہائیت کے عنوان سے ارکان اسلام اور دین کے ستون پر کلہاڑ چلاتا ہے اور کبھی شیعیت و مودودیت کے نام سے

امت کے رشتے کو سلف صالحین اور صحابہ کرام سے کاٹنے کی ناروا کوشش کرتا ہے یہ سارے کے سارے فتنے اپنے نام و لباس کے اعتبار سے اگرچہ مختلف ہیں لیکن ان سب کی روح اور آئیڈیل فتنۂ اکبری ہی ہے

الحاصل شراب وہی پرانی ہے لیکن پیالے بدل بدل کر پیش کئے جارہے ہیں، فتنہ تو وہی قدیم ہے مگر اسے مختلف رنگ برنگ لباس سے آراستہ و پیراستہ کر کے سامنے لایا جارہا ہے ارباب بصیرت جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی معرفت کی دولت سے نوازا ہے وہ تو پہلی ہی نظر میں اصل حقیقت کو تاڑ لیتے ہیں اور انھیں دیکھ کر برملا پکار اٹھتے ہیں کہ

بہر رنگ کی خواہی جامہ می پوش من انداز قدت را می شناسم

لیکن جنھیں دین کی پوری بصیرت حاصل نہیں ہوتی وہ بسا اوقات ظروف کی جدت اور لباس کی تراش و خراش سے متاثر ہو کر مبتلائے فریب ہو جاتے ہیں۔

اس لئے حضرات علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان فتنوں کی حقیقت سے عام مسلمانوں کو آگاہ کریں اور جس طرح حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ نے ان فتنوں کے مرجع و منشا یعنی فتنۂ اکبری کا مقابلہ ہر خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر کیا اور اس سلسلے میں ہر مشقت کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا آج اسی جیرت ایمانی کے ساتھ نفع و نقصان کے اندیشہ سے بالاتر ہو کر ان موجودہ فتنوں کا مقابلہ کریں اور ان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے سد سکندری بن کر کھڑے ہو جائیں۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے مسلمانوں میں خون باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں سجدے بے ذوق کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

(علامہ اقبال مرحوم)

مشاجرات صحابہؓ کے معاملہ میں امت کا عقیدہ اور عمل (قسط ۲)

از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

اسی طرح حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کا قصاص لینے میں جو توقف سے کام لیا وہ یا تو اس بنا پر تھا کہ یقینی طور پر سے قاتل معلوم نہ ہو سکا یا اس لئے کہ فتنہ فساد میں اضافہ کا اندیشہ تھا اور حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت معاویہؓ اور ان کے متبعین نے حضرت علیؓ کے مقابلہ میں جنگ کرنے کو جو جائز سمجھا اس میں ان میں سے بعض حضرات مجتہد تھے اور بعض ان کی تقلید کرنیوالے

اور اس بات پر اہل حق کا اتفاق ہے کہ ان جنگوں میں حق بلاشبہ حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، اور وہ عقیدۂ برحق جس پر کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی یہ ہے کہ یہ تمام حضرات صحابہؓ عادل ہیں، اس لئے کہ ان تمام جنگوں میں انھوں نے تاویل اور اجتہاد سے کام لیا، اس لئے کہ اہل حق کے نزدیک اگرچہ حق ایک ہی ہوتا ہے لیکن حق تک پہنچنے کے لئے پوری کوشش صرف کرنے اور اس میں کوتاہی نہ کرنے کے بعد کسی سے غلطی بھی ہو جائے تو وہ ماجور ہی ہوتا ہے گناہگار نہیں۔

اور درحقیقت ان جنگوں کا سبب معاملات کا اشتباہ تھا، یہ اشتباہ اتنا شدید تھا کہ صحابہؓ کی اجتہادی آراء مختلف ہو گئیں، اور وہ تین قسموں میں بٹ گئے، صحابہؓ کی ایک جماعت تو وہ تھی جس کے اجتہاد نے اسے اس نتیجہ تک پہنچایا کہ حق فلاں فریق کے ساتھ ہے اور اس کا مخالف باغی ہے، لہذا اس پر اپنے اجتہاد کے مطابق برحق فریق کی مدد کرنا اور باغی فریق سے لڑنا واجب ہے چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، اور ظاہر ہے کہ جس شخص کا حال یہ ہو اس کے لئے ہرگز مناسب نہیں تھا کہ وہ امام عادل و برحق کی مدد اور باغیوں سے جنگ کے فریضے میں کوتاہی کرے دوسری قسم اس کے برعکس ہے اور اس پر بھی تمام وہی باتیں صادق آتی ہیں جو پہلی قسم کے لئے بیان کی گئی ہیں صحابہؓ کی ایک تیسری جماعت وہ تھی جس کیلئے کچھ فیصلہ کرنا مشکل تھا اور اس پر یہ واضح نہ ہو سکا کہ فریقین میں سے کس کو ترجیح دے یہ جماعت فریقین سے کنارہ کش رہی اور ان حضرات کے حق میں یہ کنارہ کشی ہی واجب تھی، اس لئے

جب تک کوئی شرعی وجہ واضح نہ ہو کسی مسلمان کے خلاف قتال کا اقدام حلال نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ تمام صحابہؓ معذور اور ماجور ہیں، گناہگار نہیں، یہی وجہ ہے کہ اہل حق کے تمام قابل ذکر علماء کا اس پر اجماع ہے کہ ان کی شہادتیں بھی مقبول ہیں اور ان کی روایت بھی، اور ان سب کے لئے عدالت ثابت ہے۔ اسی لئے ہمارے ملک کے علماء نے ــــ اور ان کے علاوہ تمام اہل سنت نے ــــ جن میں ابن حمدانؒ (نہایۃ المبتدئین) بھی داخل ہیں۔ فرمایا ہے کہ:

تمام صحابہؓ سے محبت رکھنا اور ان کے درمیان جو واقعات پیش آئے ان کو لکھنے، پڑھنے، پڑھانے، سننے اور سنانے سے پرہیز کرنا واجب ہے اور ان کی خوبیوں کا تذکرہ کرنا، ان سے رضامندی کا اظہار کرنا، ان سے محبت رکھنا، ان پر اعتراضات کی روش کو چھوڑنا، انھیں معذور سمجھنا، اور یہ یقین رکھنا واجب ہے، کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ ایسے جائز اجتہاد کی بنا پر کیا جس سے نہ کفر لازم آتا ہے نہ فسق ثابت ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات اس پر انھیں ثواب ہوگا اس لئے کہ یہ ان کا جائز اجتہاد تھا، پھر کہتے ہیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا اور جس نے ان سے قتال کیا اس کی غلطی معاف کر دی گئی ہے۔" اور الدرۃ المضیۃ کی نظم میں جو مشاجرات کے معاملہ میں غور وبحث سے منع کیا گیا ہے، وہ اس لئے کہ امام احمدؒ اس شخص پر نکیر فرمایا کرتے تھے۔ جو اس بحث میں الجھتا ہو۔ اور فضائل صحابہؓ میں جو احادیث آئی ہیں۔ انھیں تسلیم فرما کر ان لوگوں سے برأت کا اظہار کرتے تھے جو صحابہؓ کو گمراہ یا کافر کہتے ہیں، اور کہتے تھے کہ صحیح طریقہ مشاجرات صحابہؓ میں سکوت اختیار کرنا ہے۔"

یہ مختصر مجموعہ ہے سلف وخلف، متقدمین ومتاخرین علماء امت کے عقائد واقوال کا جن میں تمام صحابہ کرام کے عدل وثقہ ہونے پر بھی اجماع واتفاق ہے اور اس پر بھی کہ ان کے درمیان پیش آنے والے مشاجرات میں خوض نہ کیا جائے یا سکوت اختیار کریں، یا پھر ان کی شان میں کوئی ایسی بات کہنے سے پرہیز کریں جس سے ان میں کسی کی تنقیص ہوتی ہو۔

صحابہ کرام معصوم نہیں مگر مقبول ومغفور ہیں

اسی کے ساتھ ان سب حضرات کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ صحابہ کرام انبیاء کی طرح معصوم نہیں ان سے خطائیں اور گناہ سرزد ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود اور سزائیں

جاری فرمائی ہیں احادیث نبویہ میں یہ سب واقعات ناقابل انکار ہیں۔ مذکورہ سابقہ بیانات میں اس کی تصریحات موجود ہیں ملاحظہ ہو روایت ۱۷۔ مگر اس کے باوجود عام افراد امت سے صحابہ کرام کو بچند وجوہ خاص امتیاز حاصل ہے۔

(۱) اول یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے حق تعالیٰ نے ان کو ایسا بنا دیا تھا کہ شریعت ان کی طبیعت بن گئی تھی خلاف شرع کوئی کام یا گناہ ان سے صادر ہونا انتہائی شاذ و نادر تھا۔ ان کے اعمال صالحہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام پر اپنی جانیں اور مال و اولاد سب کو قربان کرنا اور ہر کام پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضیات کے اتباع کو وظیفہ زندگی بنانا اور اس کے لئے ایسے مجاہدات کرنا جس کی نظیر پچھلی امتوں میں نہیں ملتی، ان بے شمار اعمال صالحہ اور فضائل و کمالات کے مقابلہ میں عمر بھر میں کسی ایک گناہ کا سرزد ہو جانا اس کو خود ہی کالعدم کر دیتا ہے۔

(۲) دوسرے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت اور ادنیٰ گناہ کے صدور کے وقت ان کا خوف وخشیت اور فوراً توبہ کرنا بلکہ اپنے آپ کو سزا جاری کر دینے کے لئے پیش کر دینا اور اس پر اصرار کرنا روایات حدیث میں معروف و مشہور ہیں۔ بحکم حدیث توبہ کر لینے سے گناہ مٹا دیا جاتا ہے اور ایسا ہو جاتا ہے کہ کبھی گناہ کیا ہی نہیں۔

(۳) قرآنی ارشاد کے مطابق انسان کی حسنات بھی اس کی سیئات کا خود بخود کفارہ ہو جاتی ہیں۔

ان الحسنات یذھبن السیئات

(۴) اقامت دین اور نصرت اسلام کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی عسرت و تنگ دستی اور مشقت و محنت کے ساتھ ایسے معرکے سر کرنا کہ اقوام عالم میں ان کی نظیر نہیں۔

(۵) ان حضرات کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے درمیان واسطہ اور رابطہ ہونا کہ باقی امت کو قرآن وحدیث اور دین کی تمام تعلیمات انھیں حضرات کے ذریعہ پہونچی ان میں خامی و کوتاہی رہتی تو قیامت تک دین کی حفاظت اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں اشاعت کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے ان کے اخلاق و عادات ان کے حرکات وسکنات کو دین کے تابع بنا دیا تھا ان سے اول تو گناہ صادر ہی نہ ہوتا تھا اور اگر عمر بھر میں کبھی شاذ و نادر کسی گناہ کا صدور ہو گیا تو فوراً اس کا کفارہ توبہ و استغفار اور دین کے معاملہ میں پہلے سے زیادہ محنت و مشقت اٹھا کر دینا ان میں معروف و مشہور تھا۔

(۶) حق تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت کے لئے منتخب فرمایا اور دین کا واسطہ و رابطہ

بنایا تو ان کو یہ خصوصی اعزاز بھی عطا فرمایا کہ اسی دنیا میں ان سب حضرات کی خطاؤں سے درگذر اور معافی اور اپنی رضاء و رضوان کا اعلان کر دیا اور ان کے لئے جنت کا وعدہ قرآن میں نازل فرما دیا۔

(۷) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ہدایت فرمائی کہ ان سب حضرات سے محبت و عظمت علامت ایمان ہے اور ان کی تنقیص و توہین خطرۂ ایمان ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا کا سبب ہے

یہ وجوہ ہیں جن کی بناء پر معصوم نہ ہونے اور شاذ و نادر گناہ کے صدور کے باوجود ان کے متعلق امت کا یہ عقیدہ قرار پایا کہ ان کی طرف کسی عیب و گناہ کی نسبت نہ کریں، ان کی تنقیص و توہین کے شائبہ سے بھی گریز کریں ان کے درمیان جو باہمی اختلافات اور مقاتلہ تک کی نوبت آئی ان مشاجرات میں اگرچہ ایک فریق خطا پر دوسرا حق پر تھا۔ اور علماء امت کے اجماع نے ان مشاجرات میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا حق پر ہونا اور ان کے بالمقابل جنگ کرنے والوں کا خطاء پر ہونا پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا، لیکن ساتھ ہی قرآن و سنت کی نصوص مذکورہ کی بناء پر اس پر بھی سب کا اجماع و اتفاق ہوا کہ جو فریق خطاء پر بھی تھا اس کی خطاء بھی اولاً اجتہادی تھی جو گناہ نہیں بلکہ اس پر ایک اجر ملنے کا وعدہ حدیث صحیح میں مذکور ہے اور اگر قتل و قتال اور جنگ کے ہنگاموں میں کسی سے واقعی کوئی لغزش گناہ ہوا بھی ہے تو وہ اس پر نادم و تائب ہوئے۔ جیسا کہ اکثر حضرات سے ایسے کلمات منقول ہیں (ان کا آگے ذکر کیا جائے گا)

خصوصاً جبکہ قرآن کریم نے ان کی مدح و ثناء اور ان سے اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کا بھی اعلان فرما دیا جو عفو و درگذر سے بھی زیادہ اونچا مقام ہے ملاحظہ ہوں روایات مذکورہ ہیں: نمبر ۸ نمبر ۱۹ نمبر ۲ نمبر ۲۱)

جن حضرات کے اتفاقی گناہوں اور خطاؤں کو بھی حق تعالیٰ معاف کر چکا تو اب کسی کو کیا حق ہے کہ ان گناہوں اور خطاؤں کا تذکرہ کر کے اپنا نامہ اعمال سیاہ کرنے اور اس مقدس گروہ پر امت کے اعتقاد و اعتماد میں خلل ڈال کر دین کی بنیادوں پر ضرب لگائے اس لئے سلف صالحین نے عموماً ان معاملات میں کف لسان اور سکوت کو ایمان کی سلامتی کا ذریعہ قرار دیا۔ باہمی حرب کے درمیان ہر فریق کے حضرات کی طرف جو باتیں قابل اعتراض منسوب کی گئیں ہیں۔ ان کے بارے میں وہ طریقہ اختیار کیا جو عقیدہ واسطیہ کے حوالہ سے اوپر نقل کیا گیا ہے کہ

ان قابل اعتراض باتوں کا بیشتر حصہ تو کذب و افتراء ہے جو روافض و خوارج اور منافقین کی روایتوں سے تاریخ میں درج ہو گیا ہے اور جو کچھ صحیح بھی ہے تو وہ بھی گناہ اس لئے نہیں کہ اس کو انھوں نے اپنے اجتہاد سے جائز بلکہ دین کے لئے ضروری سمجھ کر اختیار کیا، اگرچہ ان کا اجتہاد غلط ہی ہو مگر پھر بھی گناہ نہیں

اور اگر کسی خاص معاملہ میں یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ خطا اجتہادی ہی نہیں، واقعی گناہ کی بات ہے۔ تو ظاہر ان حضرات کے خوف خدا و فکر آخرت سے یہ ہے کہ انھوں نے اس سے توبہ کرلی خواہ اس کا اعلان نہ ہوا ہو۔ اور لوگوں کے علم میں نہ ہو اور بالفرض یہ بھی نہ ہو تو ان کے حسنات اور دین کی خدمات اتنی عظیم ہیں کہ ان کی وجہ سے معافی ہوجانا قریب بیقین ہے۔

البتہ بعض حضرات نے روافض و خوارج اور منافقین کی شائع کردہ روایات سے عوام میں پھیلنے والی غلط فہمی دور کرنے کے لئے مشاجرات صحابہ میں کلام کیا ہے۔ جو اپنی جگہ صحیح ہے مگر پھر بھی ایک مزلۃ الاقدام ہے، جس سے صحیح سالم نکل آنا آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے جمہور امت اور اتقیاء سلف نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔

سلف صالحین اور علمائے امت کے ارشادات کا خلاصہ

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بلا استثناء سب صحابہ کرام کے حق میں فرمایا :۔

وہ پاک دل عادات و اخلاق میں سب سے بہتر اللہ تعالیٰ کے منتخب بندے ہیں ان کی قدر کرنا چاہیے (امام احمد)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے جب حضرت عثمان غنیؓ پر تین الزام لگائے گئے۔ تو باوجودیکہ ان تین الزاموں میں ایک صحیح بھی تھا مگر حضرت ابن عمرؓ نے مدافعت فرمائی اور الزام لگانے والوں کو ملزم ٹھہرایا۔ (روایت ۱۹ ابن تیمیہ بعد صحیح)

(۳) افضل التابعین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بلا استثناء سب صحابہ کرام کے متعلق فرمایا کہ صحابہ کرام امت کے سابقین اور ان کے مقتدا ہیں اور صراط مستقیم پر ہیں (ابوداؤد کتاب السنۃ روایت ۱)

(۴) حضرت حسن بصریؒ سے قتال صحابہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ یہ معاملہ ایسا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس میں حاضر اور موجود تھے اور ہم غائب، وہ حالات و معاملات کی صحیح حقیقت جانتے تھے، ہم نہیں جانتے، اس لئے جس چیز پر وہ متفق ہو گئے ہم نے ان کا اتباع کیا اور جس چیز میں ان کا اختلاف ہوا اس میں ہم نے توقف اور سکوت کیا (روایت ۱۴ از قرطبی)

(۵) حضرت محاسبیؒ نے فرمایا کہ ہم بھی وہی بات کہتے ہیں جو حضرت حسنؒ نے فرمائی کہ ان حضرات صحابہ نے جو عمل اختیار کیا اس میں وہ ہم سے زیادہ علم رکھنے والے تھے۔ اس لئے ہمارا مسلک یہ ہے کہ جس معاملہ میں ان کا اتفاق ہو تو ہم ان کا اتباع کریں اور جس میں اختلاف ہو وہاں توقف اور سکوت اختیار کریں کوئی نئی رائے اپنی طرف سے قائم نہ کریں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ اپنے اجتہاد کی بناء پر کیا

اور ان کا مقصود اللہ تعالیٰ ہی کے حکم کی تعمیل تھی کیونکہ یہ حضرات دین کے معاملہ میں متہم نہیں تھے
(روایت ۱۴۱ از قرطبی)

(۶) حضرت امام شافعیؒ نے مشاجرات صحابہ میں گفتگو کرنے کے متعلق فرمایا: کہ یہ وہ خون ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہاتھوں کو پاک رکھا ہے۔ (کیونکہ ہم اس وقت موجود نہ تھے) اس لئے ہمیں چاہئے کہ اپنی زبانوں کو بھی اس خون سے آلودہ نہ کریں (یعنی کسی صحابی پر حرف گیری نہ کریں اور کوئی الزام نہ لگائیں بلکہ سکوت اختیار کریں) (روایت ۱۵ شرح مواقف)

(۷) امام مالکؒ کے سامنے جب ایک شخص نے بعض صحابہ کرام کی تنقیص کی تو آپ نے قرآن کی آیت والذین معہ سے لیغیظ بہم الکفار تک تلاوت فرمائی اور کہا کہ جس شخص کے دل میں کسی صحابی کی طرف سے غیظ ہو وہ اس آیت کی زد میں ہے۔ ذکرہ الخطیب ابوبکر، اور حضرت امام مالکؒ نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا جو صحابہ کرام کی تنقیص کرتے ہیں کہ یہ لوگ وہ ہیں جن کا اصل مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص ہے مگر اس کی جرأت نہ ہوئی تو آپ کے صحابی کی برائی کرنے لگے تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ معاذ اللہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برے آدمی تھے، اگر وہ اچھے ہوتے تو ان کے صحابہ بھی صالحین ہوتے (الصارم المسلول ابن تیمیہ)

(۸) امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا: کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ صحابہ کرام کی برائی کا تذکرہ کرے یا ان پر کسی عیب اور نقص کا طعن کرے، اور اگر کوئی ایسی حرکت کرے تو اسے سزا دینا واجب ہے۔ اور فرمایا کہ تم جس شخص کو کسی صحابی کا برائی کے ساتھ ذکر کرتے دیکھو تو اس کے اسلام و ایمان کو متہم و مشکوک سمجھو (روایت ۱۷)

اور ابراہیم بن میسرہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو کبھی نہیں دیکھا کہ کسی کو خود مارا ہو مگر ایک شخص جس نے حضرت معاویہؓ پر سب و شتم کی، انھوں نے اس کو خود کوڑے لگائے۔ (رواہ اللالکائی ذکرہ ابن تیمیہ فی الصارم المسلول)

(۹) امام ابوزرعہ عراقیؒ، استاد مسلمؒ نے فرمایا کہ تم جس شخص کو کسی صحابی کی تنقیص کرتے دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے جو قرآن و سنت سے امت کا اعتماد زائل کرنا چاہتا ہے اس لئے اس کو زندیق اور گمراہ کہنا ہی حق و صحیح ہے (روایت ۱۸)

یہ تو چند اسلاف امت کے خصوصی ارشادات ہیں اس کے علاوہ مذکور الصدر روایات و عبارات میں اس کو امت کا اجماعی عقیدہ بتلایا ہے جس سے انحراف کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں،

مشاجرات صحابہ کے معاملہ میں صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کا عقیدہ اور فیصلہ ہے کہ خواہ اس

وجہ سے کہ ہم ان کے پورے حالات سے واقف نہیں جن میں یہ حضرات صحابہ گذرے ہیں یا اس وجہ سے کہ قرآن وسنت میں ان کی مدح وثنا اور رضوان خداوندی کی بشارت اس کو مقتضی ہے کہ ہم ان سب کو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے سمجھیں، اور ان سے کوئی لغزش بھی ہوئی ہے تو اس کو معاف قرار دے کر ان کے معاملہ میں کوئی ایسا حرف زبان سے نہ نکالیں جس سے ان میں سے کسی کی تنقیص یا کسر شان ہوتی ہو، یا جو ان کے لئے سبب ایذا ہو سکتی ہو، کیونکہ انکی ایذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا ہے بڑا بدنصیب ہے وہ شخص جو اس معاملہ میں محقق منکر ہمہ دانی کا مظاہرہ کرے اور ان میں سے کسی کے ذمہ الزام ڈالے۔

مستشرقین اور ملحدین کے اعتراضات کا جواب

اس زمانے میں جن اہل قلم نے مصر اور ہند و پاکستان میں مشاجرات صحابہ کے مسئلہ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا، اور اس پر کتابیں لکھی ہیں ان کے پیش نظر دراصل آج کل کے مستشرقین اور ملحدین کا دفاع اور جواب وہی ہے جس کو انھوں نے اسلام کی خدمت سمجھ کر اختیار کیا ہے۔

اس وقت جبکہ عام مسلمانوں میں اپنی تعلیم کے فقدان اور نئی ملحدانہ تعلیم کے رواج نے خود مسلمانوں کے بہت بڑے طبقے کو اسلام اور عقائد اسلام اور احکام اسلام سے بیگانہ کر دیا ہے اسلاف کا ادب واحترام ان کے ذہنوں میں ایک بے معنی لفظ ہو کر رہ گیا ہے اسی کا نام آزادی خیال رکھا گیا ہے۔ مستشرقین اور ملحدین جو ہمیشہ سے اسلام پر مختلف جہات سے حملے کرنے اور لوگوں کو گمراہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

انھوں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر اسلام پر اس رخ سے حملہ شروع کیا کہ عوام میں صحابہ کے متعلق ایسی باتیں پھیلائی جائیں جن سے صحابہ کرام کا اعتماد واعتقاد جو مسلمانوں کے دلوں میں ہے وہ نہ رہے اور جب اس مقدس گروہ سے اعتماد اٹھ گیا تو پھر بے دینی کے لئے راستہ ہموار ہو گیا اس مقصد کے لئے انھوں نے مسلمانوں ہی کی کتب تواریخ پر ریسرچ اور تحقیق کے نام سے کام شروع کیا۔ اور کتب تواریخ جو صحیح وسقیم ہر طرح کی روایات پر مشتمل ہیں اور جن میں روافض وخوارج کی روایتیں بھی شامل ہیں ان میں سے چن چن کر وہ حکایات وروایات منظر عام پر لائے جن سے اس مقدس گروہ کی حیثیت اقتدار پسند لیڈروں سے زائد کچھ نہیں رہتی اور ان میں بھی ان کی زندگی کو ایک گھناؤنی تصویر میں پیش کرنے لگے۔ ہمارا نو تعلیم یافتہ طبقہ جو اپنے گھر کی چیزوں سے بے خبر اور اسلام کے ضروری عقائد واحکام سے ناواقف کر دیا گیا ہے وہ مستشرقین کی کتابیں شوق سے پڑھتا ہے، اور بدقسمتی سے ان کی بحثوں کو ہی ایک علم سمجھ کر

پڑھتا ہے وہ مستشرقین اور ملحدین کے اس دام میں آنے لگے۔

یہ دیکھ کر مسلمانوں میں سے کچھ اہل قلم نے ان کے دفاع کے لئے کام شروع کیا اور یہ بلاشبہ اسلام کی ایک خدمت تھی جو زمانہ قدیم سے علم کلام اور متکلمین اسلام کرتے آئے ہیں۔

لیکن اس کام کا جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ اصولاً غلط تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود ان کے دام میں آگئے۔ اور صحابہ کرامؓ کے تقدس اور پاکبازی کو مجروح اور اس مقدس گروہ کو بدنام کرنے کا جو کام مستشرقین اور ملحدین نہیں کر سکے تھے کہ حقیقت شناس مسلمان بہرحال ان کو دشمن اسلام جان کر ان پر اعتماد نہ کرتے تھے وہ کام ان مصنفین کی کتابوں نے پورا کر دیا۔

وجہ یہ ہے کہ کسی بھی شخصیت کو مجروح کرنے اور اس پر کوئی الزام ثابت کرنے کے لئے اسلام نے جرح وتعدیل کے خاص اصول مقرر فرمائے ہیں جو عقلی بھی ہیں اور شرعی بھی۔ جب تک الزامات کو جرح وتعدیل کے اس کانٹے میں نہ تولا جائے اس وقت تک کسی بھی شخصیت پر کوئی الزام عائد کرنا اسلام میں جرم اور ظلم ہے۔ یہاں تک کہ جو شخصیتیں ظلم وجور میں معروف ہیں ان پر بھی کوئی خاص الزام بغیر ثبوت وتحقیق کے لگا دینے کو اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ بعض اکابر امت کے سامنے کسی نے حجاج بن یوسف ثقفی پر جس کا ظلم وجور دنیا میں معروف ومتواتر ہے کوئی تہمت لگائی تو اس بزرگ نے فرمایا کہ تمہارے پاس اس کا ثبوت شرعی موجود ہے کہ حجاج بن یوسف نے یہ کام کیا ہے۔ ثبوت کوئی تھا نہیں۔ نقل کرنے والے نے حجاج کے بدنام اور معروف بالفسق ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھی کہ اس کا ثبوت مہیا کرے۔

اس مقدس بزرگ نے فرمایا کہ خوب سمجھ لو کہ حجاج اگر ظالم ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے ہزاروں کشتگان ظلم کا انتقام لے گا تو اس کے ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ حجاج پر اگر کوئی غلط تہمت لگائے گا تو اس کا بھی انتقام اس سے لیا جائے گا۔ رب العالمین کا قانون عدل اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص گناہگار فاسق بلکہ کافر بھی ہے تو اس پر جو چاہو الزام اور تہمت لگا دو۔

اور جب اسلام کا یہ معاملہ عام افراد انسان یہاں تک کہ کفار وفجار کے ساتھ بھی ہے تو اندازہ لگائیے کہ جس گروہ یا جس فرد نے اللہ ورسول پر ایمان لانے کے بعد اپنا سب کچھ ان کی رضی کیلئے قربان کیا ہو اور اپنے ایک ایک قدم اور ایک ایک سانس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کی تعمیل کو وظیفہ زندگی بنایا ہو جن کے مقام اخلاق اور عدل وانصاف کی شہادتیں دشمنوں نے بھی دی ہوں ان کے متعلق اسلام کا عادلانہ قانون اس کو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ ان کی مقدس ہستیوں کو بدنام کرنے

اوران پر الزامات لگانے کی لوگوں کو کھلی چھٹی دے دے کہ کیسی ہی غلط سلط روایت وحکایت سے بلا تنقید وتحقیق ان کو مجروح قرار دے دیا جائے۔

مستشرقین اور ملحدین تو دشمن اسلام ہیں یہ اگر جان بوجھ کر بھی اسلام کے اس عادلانہ اور حکیمانہ اصول عدل وانصاف کو نظر انداز کریں تو ان سے کچھ مستبعد نہیں۔

مگر افسوس ان حضرات پر ہے جو ان کی مدافعت کے لئے اس خونیں میدان میں اترے تھے انھوں نے بھی اس اسلامی اصول کو نظر انداز کر کے حضرات صحابہؓ کے بارے میں وہی طریقہ کار اختیار کر لیا جس کو مستشرقین نے اپنی سوچی سمجھی تدبیر سے اسلام اور اسلاف اسلام کے خلاف اختیار کیا تھا کہ صرف تاریخ کی بے سند اور غلط ملط روایات کو موضوع تحقیق اور مدار کار بنا کر انھیں روایات وحکایات کی بنیاد پر حضرات صحابہ کی شخصیتوں پر الزامات عائد کر دیئے۔

جبکہ یہ حضرات وہ ہیں کہ ان کی زندگی اور ان کے احوال کا بہت بڑا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مقدسہ کا جز رہے، اور علم حدیث میں بڑی احتیاط وتنقید کے ساتھ مدون ہو چکا ہے اس طرح بہت بڑا حصہ خود قرآن کریم میں مذکور ہے۔ کیونکہ بہت سی آیات قرآن کا نزول خاص خاص صحابہؓ کرام کے واقعات میں ہوا ہے پھر قرآن میں جو حکم آیا اگرچہ وہ سب مسلمانوں کے لئے عام قرار پایا مگر یہ صحابی تو خصوصیت سے اس کے مصداق تھے اس طرح غور کیا جائے تو انھیں آیات کے ضمن میں صحابہ کرام کے بہت سے حالات ومعاملات آجاتے ہیں جن حضرات کی زندگی کو سمجھنے اور ان کے حالات کو معلوم کرنے کے لئے قرآن کریم کی محکم آیات اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں انتہائی احتیاط وتنقید وتحقیق کے ساتھ مدون کی ہوئی روایات موجود ہوں۔ اور ان کے بالمقابل فن تاریخ کی حکایات ہوں جن کے متعلق ائمہ تاریخ کا اتفاق ہے کہ ان حکایات وروایات میں نہ صحت سند کا اہتمام ہے، نہ راویوں پر جرح وتعدیل کا محدثانہ دستور ہے، بلکہ ایک مؤرخ کا دیانت دارانہ کام ہی اتنا ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق جتنی جس طرح کی روایات اس کو پہونچی ہیں وہ سب کو جمع کر دے۔ خواہ وہ اس کے مسلک ومذہب کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ تاریخ کی صحیح وسقیم روایتیں اگر احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مستند ومعتبر روایات کے خلاف کسی شخصیت کے بارے میں کوئی تأثر دیں اور ان پر کچھ الزامات عائد کریں تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ان مجروح بے سند تاریخی روایات کو قرآن وحدیث کی شہادتوں پر ترجیح دے کر ان حضرات کو ملزم قرار دے دیا جائے۔

یہ صرف اسلامی عقیدت مندی اور صحابہؓ کی جانبداری کا مسئلہ نہیں بلکہ عقل وانصاف کا

مسئلہ ہے۔ غیر مسلم مستشرقین اور ان کے ہمنواؤں سے میرا سوال ہے کہ ایک شخص یا جماعت کے متعلق اگر دو طرح کی روایات موجود ہوں، ایک قسم کی روایات میں روایت کی پوری سند محفوظ ہے اس کے راویوں کو جرح و تعدیل کے معیار پر جانچا گیا ہے الفاظ روایت میں مکمل احتیاط برتی گئی ہے۔

اور دوسری قسم ایسی روایات کی ہیں جن میں تمام رطب و یابس صحیح و غلط روایات بلا کسی سند کے آئی ہیں اور کہیں کوئی سند ہے بھی تو اس کے راویوں کی کوئی جانچ پڑتال نہیں کی گئی نہ روایت کے الفاظ ہی جانچ تول کر لئے گئے ایسے حالات میں وہ ان دونوں قسم کی روایات" ، سے کس قسم کو اپنی ریسرچ اور تحقیق میں ترجیح دیں گے۔

اگر عقل و انصاف آج بھی کسی چیز کا نام ہے تو ایک کام کر دیکھیے کہ مشاجرات صحابہ اور ان کی باہمی جنگوں میں جو حضرات پیش پیش ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، طلحہ و زبیر، حضرت عمرو بن عاص وغیرہ۔

ان حضرات کے حالات اور ایک دوسرے کے خلاف مقالات کچھ حدیث کی کتابوں میں بھی روایات حدیث کے اصول پر پرکھ کر جمع شدہ موجود ہیں اور انھیں حضرات کے کچھ حالات و مقالات تاریخی روایات میں آئے ہیں۔ ان دونوں قسم کی روایات کو الگ الگ پڑھ کر اپنے دلوں اور دماغوں کا جائزہ لیں کہ علم حدیث میں آئی ہوئی روایات انھیں معاملات کے متعلق کیا تاثر دیتی ہیں؟ اور تاریخی روایات ان کے بالمقابل کیا تاثر چھوڑتی ہیں ذرا سا تقابل کر کے دیکھیں تو کوئی شک نہیں رہے گا کہ حدیث میں جمع شدہ روایات سے اگر کسی صحابی کی کوئی زیادتی یا لغزش بھی معلوم ہوتی ہے تو اس کا مجموعی تاثر یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ان کی شخصیت مجروح ناقابل اعتماد ہو جائے بخلاف تاریخی روایات کے کہ ان کو پڑھ کر ایک انسان دونوں فریق کو یا کم از کم ایک فریق کو غلط کار، اقتدار پسند اور اقتدار ہی کے پیچھے جنگ لڑنے والا قرار دے گا۔ مستشرقین کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار و اختلاف پیدا کریں۔ صحابہ کرام کے سب گروہ نہیں تو بعض ہی کو مجروح غیر معتمد بنا دیں۔ انھوں نے اگر قرآن و سنت کی نصوص و روایات سے آنکھیں بند کر کے صرف تاریخی روایات کی بنا پر حضرات صحابہ کے بارے میں کچھ فیصلے کئے تو کوئی بعید نہیں تھا افسوس ان مسلم اہل قلم پر ہے جنہوں نے اس میدان میں قدم رکھنے کے ساتھ اسلام کے عادلانہ اصول تنقید اور حکیمانہ جرح و تعدیل کے اصول کو نظر انداز کر کے انھیں تاریخی روایات کو مدار کار بنا لیا۔ قرآن و حدیث کی نصوص صریحہ قطعیہ نے جن بزرگوں کی تعدیل نہایت وزن دار الفاظ میں فرمائی اور دین کے معاملے میں ان کے معتمد و معتبر ہونے کی گواہی دی جن کے بارے

میں قرآن وسنت ہی کی نصوص نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ان سے کوئی گناہ یا لغزش ہوئی بھی ہے تو وہ اس پر قائم نہیں رہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مغفور ومرحوم اور مقبول ہیں اس کے بعد تاریخی روایات سے ان کو جرح والزام کا نشانہ بنانا اسلام کے تو خلاف ہے ہی عقل وانصاف کے بھی خلاف ہے۔

امت کے اسلاف واخلاف صحابہؓ وتابعین اور بعد کے علماء امت کا جو اجماع اوپر نقل کیا گیا ہے کہ مشاجرات صحابہ اور باہم ایک دوسرے کے خلاف پیش آنے والے واقعات میں سکوت اور کف لسان ہی شیوہ اسلاف ہے اس معاملے میں جو روایات وحکایات منقول چلی آتی ہیں ان کا تذکرہ بھی مناسب نہیں یہ کوئی اندھی عقیدت مندی یا تحقیق سے راہ فرار نہیں بلکہ صحیح تحقیق کا عادلانہ اور محتاط فیصلہ ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ قرآن وسنت کی نصوص قطعیہ کی رو سے یہ وہ مقدس گروہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور امت کے درمیان واسطہ بنانے کے لئے منتخب فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کیمیا اثر نے ان کے اعتقادات اعمال اخلاق وعادات میں وہ انقلاب عظیم برپا کیا کہ باوجود غیر معصوم ہونے کے ان کا قدم شریعت اسلام کے خلاف نہ اٹھتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام کی نصرت میں ان کی خدمات حیرت انگیز ہیں جن کو دشمنان اسلام نے بھی حیرت کے ساتھ سراہا ہے ان کی طرف جو قابل اعتراض بعض اعمال منسوب ہیں ان کا بہت بڑا حصہ تو وہ ہے جو سراسر جھوٹ وافتراء بھائی تحریک کی سازش اور روافض وخوارج کی گھڑی ہوئی خرافات ہیں اور کچھ وہ ہیں جو بظاہر خلاف شرع ہیں مگر حقیقۃً خلاف شرع نہیں بلکہ شرع پر عمل کرنے کی ایک خاص صورت ہے جس کو انھوں نے اپنے اجتہاد شرعی سے تجویز اور دین کیلئے ضروری سمجھا اگر اس میں ان سے خطاء بھی ہوئی تو وہ گناہ نہیں بلکہ اس پر ان کو حسب تصریح حدیث اجر بھی ملے گا۔

اور اگر کوئی ایسا کام بھی کبھی کسی سے سرزد ہوا ہے جو خطاء اجتہادی نہیں بلکہ حقیقۃً گناہ ہے تو اوّلاً ایسا کام ان کی پوری اسلامی زندگی میں اتنا شاذ ونادر رہے کہ ان کے لاکھوں حسنات اور اسلام کی اہم خدمات کے مقابلہ میں قابل ذکر بھی نہیں۔ پھر ان کے خوف خدا اور علم بصیرت کے پیش نظر یہ ظاہر ہے کہ وہ اس پر قائم نہیں رہے بلکہ تائب ہوئے اور یہ بھی نہ ہو تو شاذ ونادر خطاء وگناہ ان کی عظیم الشان اسلامی خدمات اور لاکھوں حسنات کی وجہ سے معاف ہو گیا جس کی معافی کا اعلان حق تعالیٰ کی رضاء ورضوان کے عنوان سے قرآن کریم میں کر دیا گیا ہے۔ ان حالات میں کیا عقل اور عدل وانصاف کا یہ تقاضا نہیں کہ تاریخی روایات کو منافقین ومخالفین کی روایات اور جھوٹی حکایات سے خالی بھی تسلیم

کر دیا جائے تو یہ روایات بمقابلہ روایات حدیث اور آیات قرآن کے مجروح و اجب الترک ہیں۔

عین جنگ کے وقت بھی صحابہ کرامؓ کی رعایت حدود

جماعت صحابہ کرامؓ وہ مقدس اور خدا ترس گروہ ہے جو اپنے جائز اعمال بلکہ طاعات و عبادات پر بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور خائف رہتا ہے کہ جب اپنی کسی اجتہادی خطاء پر متنبہ ہو جاتا ہے تو ندامت کے ساتھ اس کا اعتراف اور اس پر استغفار کرنا ان کا معمول ہے مشاجرات صحابہ میں جو حضرات باجماع امت حق پر تھے اور حق کی مجبوری سے انھوں نے دوسروں پر تلوار اٹھائی اور فتح بھی پائی وہ بھی شاہی فتح پر مسرور ہوئے نہ مفتوح حضرات کے مغلوب ہونے پر کوئی کلمہ فخر ان کی زبانوں سے نکلا بلکہ مقابل فریق کو بھی اللہ والا نیک نیت مگر خطاء اجتہادی میں مبتلا سمجھ کر ان کے قتل اور نقصان پر افسوس و ندامت کا اظہار کیا۔ صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی جماعت جو فریقین سے الگ غیر جانبدار رہی ان میں کسی کے ساتھ نہ رہی تھی ان کو معذور قرار دیا بلکہ ان حضرات کی تحسین بھی کی گئی۔ مندرجہ ذیل روایات اس کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔

(۱) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر جو الزامات لگائے گئے تھے ان میں جس چیز کا خلاف شرع ہونا ان کو ثابت ہو گیا اس سے توبہ کا اعلان کھلے طور پر فرمایا (شرح عقیدہ واسطیہ)

(۲) اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بصرہ کے سفر پر جہاں جنگ جمل کا واقعہ پیش آیا ندامت کا اظہار فرمایا۔ اور جب وہ اس واقعہ کو یاد کرتی تھیں تو اتنا روتی تھیں کہ ان کا دوپٹہ تر ہو جاتا تھا۔ (شرح عقیدہ واسطیہ)

(۳) حضرت طلحہؓ اپنے اس قصور پر ندامت کا اظہار فرماتے تھے کہ ان سے حضرت عثمانؓ کی مدد کرنے میں کوتاہی ہوئی (ایضاً)

(۴) حضرت زبیرؓ نے اپنے اس سفر پر ندامت کا اظہار کیا جس میں جنگ جمل کا حادثہ پیش آیا (ایضاً)

(۵) حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے (اس قتال میں حق پر ہونے کے باوجود) بہت سے پیش آنے والے واقعات پر ندامت کا اظہار فرمایا (ایضاً)

حضرت علیؓ کا واقعہ، حضرت اسحٰق بن راہویہ نے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ جنگ جمل اور جنگ صفین کے موقعہ پر آپ نے ایک شخص کو سنا کہ وہ مخالف لشکر والوں کے حق میں غلو آمیز باتیں کہہ رہا ہے آپ نے فرمایا:

ان کے بارے میں بھلائی کے سوا کچھ نہ کہو، ان لوگوں نے سمجھا ہے کہ ہم نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے اس لئے ہم ان سے قتال کر رہے ہیں۔
(منہاج السنۃ ص ۶۱ ج ۲)

نیز ایک مرتبہ حضرت علیؓ سے پوچھا گیا کہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں قتل ہونے والوں کا انجام کیا ہوگا؟ حضرت علیؓ نے دونوں فریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

لا یموتن احد من هؤلاء و قلبه نقی الا دخل الجنة۔ (مقدمہ ابن خلدون ص ۲۰۵ فصل ۳) ان میں سے جو شخص بھی صفائی قلب کے ساتھ مرا ہوگا وہ جنت میں جائے گا۔

اور جنگ صفین کے وقت راتوں میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ اچھا مقام وہ تھا جو عبداللہ بن عمرؓ اور سعد بن مالکؓ نے اختیار کیا کہ اس جنگ سے علیحدہ رہے کیونکہ یہ کام اگر انھوں نے صحیح کیا، تب تو ان کے اجر عظیم میں کیا شبہ ہے؟ اور اگر اس جنگ سے علیحدہ رہنا کوئی گناہ بھی تھا تو اس کا معاملہ بہت ہلکا ہے، اور حضرت حسنؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کرتے تھے:۔

یا حسن یا حسن ما ظن ابوک ان الامر یبلغ الی هذا ود ابوک لو مات قبل هذا بعشرین سنة (یعنی اے حسن! اے حسن! تیرے باپ کو یہ گمان کبھی نہ تھا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا، تیرے باپ کی تمنا یہ ہے کہ کاش وہ اس واقعہ سے بیس سال پہلے فوت ہو گیا ہوتا۔

اور جنگ صفین سے واپسی کے بعد لوگوں سے فرماتے تھے: کہ امارت معاویہؓ کو بھی برا نہ سمجھو کیونکہ وہ جس وقت نہ ہوں گے تو تم سروں کو گردنوں سے اڑتے ہوئے دیکھو گے۔ (شرح عقیدہ واسطیہ ص ۱۵۸، ص ۱۵۹)

معجم طبرانی کبیر میں طلحہ بن مصرف سے روایت ہے کہ جب واقعہ جمل میں حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کے لشکر کے ہاتھوں شہید ہو گئے، حضرت علیؓ اپنے گھوڑے سے اترے اور ان کو اٹھایا اور ان کے چہرے سے غبار صاف کرنے لگے اور رو پڑے اور کہنے لگے کہ کاش میں اس واقعہ سے بیس سال پہلے مر گیا ہوتا۔ (از جمع الفوائد ص ۲۱۴ ج ۲)

سنن بیہقی میں ان کی سند کے ساتھ روایت ہے کہ جنگ جمل میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقابلے پر قتال کرنے والے حضرات کے بارے میں حضرت علیؓ سے سوال کیا گیا کہ کیا یہ لوگ مشرک ہیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ شرک سے بھاگ کر ہی تو وہ اسلام میں آئے ہیں، پھر پوچھا گیا کہ کیا وہ منافق ہیں؟ تو فرمایا:۔

ان المنافقین لا یذکرون الله الا قلیلا ۰۔

یعنی منافقین تو اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں (اور یہ لوگ تو بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے ہیں)
پھر پوچھا گیا کہ پھر کیا ہیں ؟ تو فرمایا ہمارے بھائی ہیں جنھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے.
(سنن بیہقی طبع دائرۃ المعارف دکن ص۱۷۲ ج ۸)
اور اسی سنن بیہقی میں حضرت ربعی بن خراش کی روایت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا
مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میں اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما ان لوگوں میں سے ہوں گے
جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: کہ (جنت میں) ان کے دلوں کی باہمی کدورتیں نکال دیں گے.
(٦) اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ انھوں نے قسم کھاکر فرمایا: کہ
علی مجھ سے بہتر اور مجھ سے افضل ہیں" اور "میرا ان سے اختلاف صرف حضرت عثمانؓ کے
قصاص کے مسئلہ میں ہے، اگر وہ خون عثمانؓ کا قصاص لے لیں تو اہل شام میں ان کے ہاتھ پر بیعت
کرنے والا سب سے پہلے میں ہوں گا (البدایۃ والنہایۃ ص ۱۲۹ ج ۷، وص ۲۵۹ ج ۷)
(۷) جب حضرت معاویہؓ کے پاس حضرت علیؓ کی شہادت کی خبر پہنچی تو وہ رونے لگے، اہلیہ نے
پوچھا کہ آپ زندگی میں ان سے لڑتے رہے، اب روتے ہیں ؟
حضرت معاویہؓ نے فرمایا "تم نہیں جانتیں کہ ان کی وفات سے کیا فقہ اور کیسا علم دنیا سے
رخصت ہو گیا،، (البدایۃ والنہایۃ ص ۱۲۹ ج ۸)
(۸) ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے ضرار صدائی سے کہا کہ "میرے سامنے علیؓ کے اوصاف بیان
کرو" اس پر انھوں نے غیر معمولی الفاظ میں حضرت علیؓ کی تعریف کی، حضرت معاویہؓ نے فرمایا:
اللہ ابو الحسن (علیؓ) پر رحم کرے، خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے" (الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۴۳۔۴۴ ج ۳)
(۹) قیصر روم نے مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاکر ان پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا.
حضرت معاویہؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے قیصر کے نام ایک خط لکھا :۔
"اگر تم نے اپنا ارادہ پورا کرنے کی ٹھان لی تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنے ساتھی (حضرت علی)
سے صلح کرلوں گا۔ پھر تمہارے خلاف ان کا جو لشکر روانہ ہوگا اس کے ہراول دستے میں شامل ہوکر قسطنطنیہ
کو جلا ہوا کوئلہ بنادوں گا۔ اور تمہاری حکومت کو گاجر مولی کی طرح اکھاڑ پھینکوں گا،، (تاج العروس
ص ۲۰۸ ج ۷، مادہ "اصطفلین")
(۱۰) متعدد مورخین نے نقل کیا ہے کہ جنگ صفین وغیرہ کے موقع پر دن کے وقت فریقین میں جنگ
ہوتی اور رات کے وقت ایک لشکر کے لوگ دوسرے لشکر میں جاکر ان کے مقتولین کی تجہیز و تکفین میں

صرف کیا کرتے تھے (البدایۃ والنہایۃ ص ۲۴۲ ج ۷)

خلاصہ یہ ہے کہ جتنے حضرات صحابہ اس باہمی قتال میں وجوہ شرعیہ کی بنا پر پیش پیش تھے اور ہر ایک اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر مقابل سے لڑنے پر مجبور تھا۔ انھوں نے عین قتال کے وقت بھی حدود شرعیہ سے تجاوز نہیں کیا اور فتنہ فرو ہونے کے بعد ایک دوسرے کے متعلق ان کی روش بدل گئی اور جو کچھ نقصان دوسرے فریق کے لوگوں کو ان کے ہاتھ سے پہونچا باوجودیکہ وہ شرعی وجوہ کی بناء پر تھا پھر بھی اس پر ندامت وافسوس کا اظہار کیا۔

اللہ تعالیٰ کو ان واقعات کے پیش آنے سے پہلے ہی اس مقدس گروہ کے قلوب اور ان کے اخلاص للہ کا اور اپنی کوتاہیوں پر نادم و تائب ہونے کا حال معلوم تھا اس لئے پہلے ہی یہ سب کچھ معلوم ہوتے ہوئے ان سب سے راضی ہونے کا اور ان کے ابدی جنت کا اعلان قرآن میں نازل فرمادیا تھا۔ جو درحقیقت اس کا اعلان ہے کہ اگر ان میں سے کسی سے کوئی واقعی گناہ سرزد بھی ہوا ہے تو وہ اس پر قائم نہیں رہے تائب ہوگئے اور ان کے نامۂ اعمال سے اس کو محو کر دیا گیا کس قدر حیرت ہے کہ اسلام کی خدمت کا نام لینے والے بعض حضرات ان سب چیزوں سے آنکھ بند کر کے مستشرقین و ملحدین کے طریقہ پر چل پڑے۔ ان حضرات کی شخصیات و ذات پر تاریخ کی غلط سلط اور رطب و یابس روایات سے الزامات تراشنے لگے جن کو خدا تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ انھوں نے ان کو معاف نہیں کیا جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے راضی ہونے کا اعلان کر دیا یہ ان سے راضی نہیں ہوئے۔

اور جب ان سے کہا گیا تو جواب میں یہ کافی سمجھ لیا کہ ہم نے تو ایسے ثقہ اور مستند علماء اور محدثین کی کتب تاریخ سے نقل کیا ہے جن کے ثقہ اور معتمد علیہ ہونے میں کسی کو کلام نہیں اور یہ نہ سوچا کہ ان حضرات نے فن تاریخ کو فن حدیث سے الگ کیوں کیا ان کا کلام فن حدیث میں جس معیار تنقید و تحقیق پر ہوتا ہے فن تاریخ میں وہ معیار نہیں ہوتا اس میں نہ سند مکمل ہونے کی ضرورت سمجھی جاتی ہے نہ راویوں پر جرح و تعدیل کی، ان کی نظر میں خود یہ تاریخی روایات کا ذخیرہ اس کام کے لئے نہیں کہ ان سے کوئی عقیدہ کا مسئلہ ثابت کیا جائے یا کسی کی ذات و شخصیت کو ان کی بناء پر بلا تحقیق مجروح قرار دیا جائے، صحابہ کرام کا معاملہ تو بہت بالا و بلند ہے عام مسلمانوں میں سے بھی کسی کو ان تاریخی روایات کی بناء پر بلا تحقیق کے مجروح قابل سزا یا فاسق کہنے کی یا ایسے انداز میں پیش کرنے کی اجازت کسی کے نزدیک نہیں دی جاسکتی۔ جس سے پڑھنے والے ان کو اقتدار پرست اور شریعت کے حائز و ناجائز سے بے فکر قرار دیں۔

تنبیہہ | یہ بات مقدمہ کتاب میں وضاحت سے لکھی جاچکی ہے کہ اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا

کہ فن تاریخ کسی معاملہ میں قابل اعتماد نہیں۔ وہ فضول و بیکار ہے علماء اسلام نے اس فن کی جو خدمتیں کی ہیں وہ اس کی اسلامی اہمیت کی شاہد ہیں (اور مسلمان ہی درحقیقت اس فن کو باقاعدہ فن بنانے والے ہیں۔ مگر ہر فن کا ایک مقام اور درجہ ہوتا ہے۔ فن تاریخ کا یہ درجہ نہیں کہ صحابہ کرامؓ کی ذوات وشخصیات کو قرآن وسنت کی نصوص سے صرف نظر کرکے صرف تاریخی رطبایات کے آئینہ میں دیکھا جائے اور اس پر عقیدہ کی بنیاد رکھی جائے جس طرح فن طب کی کتابوں میں سے اشیاء کے حلال حرام یا پاک ناپاک ہونے کے مسائل و احکام ثابت نہیں کئے جاسکتے اگرچہ طب کی یہ کتابیں اکابر علماء کی تصنیف ہوں۔

مشاجرات صحابہؓ اور کتب تاریخ

یہاں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ عام واقعات و معاملات میں تاریخی روایات پر جتنا اعتماد کیا جاسکتا ہے مشاجرات صحابہؓ کا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں ان تاریخی روایات کے اعتماد کا وہ درجہ بھی قائم نہیں رہ سکتا وجہ یہ ہے کہ اول تو مشاجرات جس حد قتل و قتال تک پہونچے ان میں بنیادی طور پر منافقین کی سبائی تحریک کا ہاتھ تھا جن کی اسلام دشمنی کھلی ہوئی ہے پھر اسی تحریک کے نتیجہ میں خود عہد صحابہ ہی کے اندر روافض و خوارج دو فرقے پیدا ہو گئے تھے جو بعض صحابہ سے عداوت رکھتے تھے اور اس زمانے میں جیسے منافقین مسلمانوں کے ہر طبقہ بکام میں اسلامی شکل وصورت اور اسلامی رفتار و گفتار کے ساتھ شریک رہتے تھے اسی طرح یہ صحابہ کرام کے مخالف گروہ بھی اس وقت آج کی طرح کسی ممتاز فرقہ کی حیثیت میں نہ تھے کہ ان کی کتابیں حدیث و فقہ کی الگ ممتاز ہیں۔ ان کے سارے کام اہل سنت والجماعت سے الگ ہیں اس وقت یہ صورت نہ تھی جس سے عام مسلمان متنبہ ہو سکتے۔ یہ سب کے سب مسلمانوں کی ہر جماعت ہر طبقہ میں ملے جلے تھے بہت سے مسلمان بھی اپنے حسن ظن اور ان کے عدم امتیاز کی وجہ سے ان کی باتوں اور روایتوں پر اعتماد کر لیتے تھے۔ خود قرآن کریم نے ایک تفسیر کے مطابق بعض مسلمانوں کا منافقین کی باتوں سے متاثر ہونے کی تصریح فرمائی۔ وفیکم سماعون سماعون کے معنی جاسوس کے ہیں۔ اس طرح منافقین اور روافض و خوارج کی گھڑی ہوئی روایتیں بہت سے ثقہ اور معتمد علیہ مسلمانوں کی زبانوں پر بھی اعتماد کے ساتھ جاری تھیں۔ یہ معاملہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ کا تو تھا نہیں کہ اس میں روایات قبول کرنے میں کسی احتیاط اور تیقظ کا مظاہرہ کیا جاتا ——— فتنوں اور ہنگاموں کے حالات اور ان میں مشہور ہونے والی روایات کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ شہر میں کسی جگہ کوئی ہنگامہ پیش آجائے تو اسی زمانے اور اسی شہر کے رہنے والے پڑھے لکھے ثقہ لوگوں کی روایتوں کا بھروسہ نہیں رہتا کہ جس شخص سے انہوں نے سنا تھا۔

اس کو ثقہ و معتمد سمجھ کر اس کی روایت بیان کر دی مگر ہوتا یہ ہے کہ اس معتمد نے بھی خود واقعہ دیکھا نہیں کسی دوسرے سے سنا اور یوں روایت در روایت ہو کر ایک بالکل بے سروپا افواہ ایک معتمد علیہ روایت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

مشاجرات صحابہ کا معاملہ اس سے الگ کیسے ہو جاتا جبکہ اس میں سبائی تحریک کے نمائندوں اور روافض و خوارج کی سازشوں کا بڑا دخل تھا۔ اس لئے اسلامی تواریخ جن کو اکابر علماء محدثین اور دوسرے ثقہ و معتبر حضرات نے جمع فرمایا اور اصول تاریخ کے مطابق ہر طرح کی روایات جو کسی واقعہ سے متعلق ان کو پہنچی۔ تاریخی دیانت کے اصول پر سب کو بے کم وکاست درج کر دیا۔

تو اب سمجھ لیجئے کہ روایات کا مجموعہ کس درجہ قابل اعتبار ہو سکتا ہے۔ عام دنیا کے واقعات وحالات میں جو تاریخی روایات جمع کی جاتی ہیں ان میں اس طرح کے خطرات عموماً نہیں ہوتے اس لئے کتب تواریخ کا وہ حصہ جو مشاجرات صحابہ سے متعلق ہے خواہ اس کے لکھنے والے کتنے بڑے ثقہ اور معتمد علماء ہوں ان کے اعتبار کا وہ درجہ بھی ہرگز باقی نہیں رہتا جو عام تاریخی واقعات کا ہوتا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ نے ان معاملات میں جو کچھ فرمایا اگر غور کرو تو اس کے سوا کوئی دوسری بات کہنے اور سننے کے قابل نہیں حضرت حسن بصری کا یہ ارشاد پہلے روایت ۱۷۸ میں بحوالہ تفسیر قرطبی گذر چکا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

حضرت حسن بصریؒ سے قتال صحابہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا اس قتال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام حاضر تھے اور ہم غائب وہ لوگ حالات و واقعات اور اس وقت کی مقتضیات شرعیہ سے واقف تھے ہم ناواقف اس لئے جس چیز پر ان کا اتفاق ہوا اس میں ہم نے ان کی پیروی کی اور جس چیز پر ان کا اختلاف ہوا اس میں ہم نے توقف اور سکوت اختیار کیا۔ اور حضرت محاسبی اس قول کو نقل کر کے حضرت حسن کے قول کو اختیار کرتے ہیں۔ اور آخر میں فرماتے ہیں کہ ہم پوری طرح جانتے ہیں کہ ان حضرات نے اجتہاد کیا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہی کے طالب تھے کیونکہ دین کے معاملے میں یہ لوگ متہم نہیں تھے۔

یہ عقل و انصاف کا فیصلہ ہے یا تحقیق حق سے فرار

غور فرمائیے کہ ہنگامی حالات اور منافقین وروافض وخوارج کی روایات کے شیوع نے روایات میں جو تلبیس اور شبہات پیدا کر دیئے تھے ایسے حالات میں حضرت حسن بصریؒ نے جو فیصلہ فرمایا وہ

عقل سلیم اور عین عدل وانصاف کا فیصلہ یا اندھی عقیدت مندی اور تحقیق حق سے فرار۔ نعوذ باللہ منہ

یہاں غور طلب یہ ہے کہ حضرت حسن بصری جو اجلہ تابعین میں سے صحابہ کرام کو دیکھنے والے ہیں وہ صحابہ کرام کے باہمی اختلافات میں پیش آنے والے ہنگاموں کے بارہ میں یہ فرماتے ہیں کہ ہمیں ان کے حالات معلوم نہیں جس کا حاصل یہی ہو سکتا ہے کہ حالات کا ایسا علم یقینی شرعی اصول کے مطابق نہیں ہے جس کی بنا پر کسی شخصیت پر کوئی الزام لگایا جا سکے۔

تو بعد کے آنے والے مؤرخین خواہ وہ آئمہ حدیث بھی ہوں جیسے ابن جریر ابن اثیر وغیرہ ان کو صدیوں کے بعد ان حالات کا علم اس پیمانے پر کیسے ہو سکتا تھا۔ جن پر کسی عقیدہ یا عمل کی بنیاد رکھی جا سکے۔ اور نہ انھوں نے اس کا دعویٰ کیا ہے بلکہ فن تاریخ کا جو چلا ہوا دستور ہر طرح کی موافق مخالف صحیح سقیم روایات جمع کر دینا ہے اس کے مطابق انھوں نے اپنی تاریخ میں ہر طرح کی روایات جمع کی ہیں

حضرت حسن بصریؒ کا یہ فیصلہ تو ایسا ہے کہ اس میں کسی عقیدہ اور مذہب کا دخل نہیں کوئی غیر مسلم بھی اگر انصاف پسند ہو تو اس کو بھی روایات تاریخی کے التباس و تضاد کے عالم میں اس کے سوا کسی فیصلے کی گنجائش نہیں کہ بے خبری اور ضروری قابل اعتماد معلومات نہ ہونے کی بنا پر سکوت کا مسلم قرار دے

اور جن حضرات علماء نے قرآن و سنت کی نصوص کی بنا پر یہ قرار دیا کہ ان میں سے جس کسی پر کوئی واقعی الزام کسی گناہ و خطاء کا ثابت بھی ہو جائے تو انجام کار وہ اس گناہ و خطاء سے بھی عنداللہ بری ہو چکے ہیں۔ اس لئے اب کسی کے لئے جائز نہیں کہ ان کے ایسے اعمال کو مشغلہ بحث بنائے۔ اس کا مستشرقین انکار کریں تو کر سکتے ہیں کہ ان کا قرآن و رسول پر ایمان ہی نہیں۔ وہ ان کے ارشادات کو بھی غلط بتلاتے ہیں ان کی بنا پر کسی کی توثیق و تعدیل کیسے کریں مگر کسی مسلمان کے لئے تو ان کی مدافعت میں بھی اس کی گنجائش نہیں کہ ان کے اس کفر و انکار کو تسلیم کر کے اس بحث میں الجھ جائے۔ جس کا جال مستشرقین نے اسی لئے پھیلایا ہے کہ قرآن و سنت سے ناواقف یا بے فکر مسلمان اس میں الجھ کر اپنے صحابہ کرام کے مقدس گروہ کا اعتماد کھو بیٹھیں۔ ایسے لوگوں کی مدافعت بھی کرنا ہے تو اس کا محاذ یہ نہیں کہ جہاں وہ مسلمانوں کو کھینچ کر لانا چاہتے ہیں بلکہ انکی جنگ کا محاذ یہ ہے کہ ان سے قرآن و رسول کی حقانیت اور صدق پر کلام کیا جائے جو اس کو نہیں مانتا اس سے مسلمانوں کے کسی گروہ و جماعت کا تقدس منوانے کا کیا راستہ ہے۔ ایسے حالات میں تو مسلمانوں کی راہ عمل قرآن نے بتلا دی ہے کہ لکم دینکم ولی دین۔ یعنی تمہارے لئے تمہارا دین ہے ہمارے لئے ہمارا۔ کہہ کر اپنے ایمان کی حفاظت اور اس کو مضبوط کرنے کی فکر میں لگ جائیں۔ مسلمانوں کو قرآن و سنت کی نصوص سے مطمئن کریں اور غیروں کے

...کی فکر چھوڑ دیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جمہور علماء امت نے جو مشاجرات صحابہ میں کف لسان اور سکوت کو اسلم قرار دیا اور اس میں بحث مباحثہ کو خطرہ ایمان بتلایا یہ کورانہ عقیدت مندی کا نتیجہ نہیں بلکہ عقل سلیم اور عدل و انصاف کا فیصلہ ہے۔

جن حضرات نے اس زمانے میں پھر ان مشاجرات صحابہ کو موضوع بحث بنا کر کتابیں لکھی ہیں اگر واقعی ان کا مقصد اس سے ملحدین و مستشرقین کا جواب اور مدافعت ہے تو ان کا فرض ہے کہ یا تو حضرت حسن بصری کے طریق بیان کو ان کی گمراہی پر متنبہ کریں کہ اعمال و اخلاق اور کردار و عمل کے اعتبار سے جن انسانی ہستیوں کو دوست دشمن موافق مخالف سب نے بڑی حیثیت دی ہے ان کو بے اعتبار و مجروح کرنے کے لئے جو ہتھیار تم استعمال کر رہے ہو وہ ہتھیار کند و ناکارہ ہیں، تاریخ کی بے سند بے تحقیق روایات سے کسی بھی شخصیت کو ملزم نہیں قرار دیا جا سکتا ہے جب تک وہ تواتر کی حد کو نہ پہنچ جائیں۔

یا پھر ان کو یہ بتلا دینا چاہئیے کہ ہم بحمد اللہ مسلمان ہیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں جن شخصیتوں کی تعدیل و توثیق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے کر دی اس کے خلاف اگر کوئی بھی روایت ہمارے سامنے آئے گی ہم اس کو بمقابلہ قرآن و سنت کی نصوص کے جھوٹ و افترا یا کم از کم مرجوح اور مجروح قرار دیں گے۔

ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی۔

ان دو طریقوں کے سوا کوئی تیسرا طریقہ مستشرقین و ملحدین کی مدافعت کا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر خدانخواستہ اس بحث سے مقصود مدافعت نہیں محض تحقیق و ریسرچ کا شوق پورا کرنا ہے تو یہ نہ اپنے ایمان کے لئے کوئی اچھا عمل ہے نہ مسلمانوں کے لئے کوئی اچھی خدمت۔

بقیہ صفحہ ۴۷

اور اگر بالفرض اسے دارالحرب تسلیم کر لیا جائے تو بھی غیر مسلموں سے سود لینا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ جو حدیث اس موضوع پر پیش کی جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہے

تقلید اور اجتہاد قسط ۲

از حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

رائے اور قیاس کی حجیت

آیت مذکورہ سے یہ امر بخوبی واضح ہوگیا کہ غیر منصوص مسائل میں قیاس اور استنباط شرعاً حجت اور معتبر ہے و قال تعالیٰ فاعتبروا یا اولی الابصار، اے نگاہ والو عبرت پکڑو یعنی یہ سوچو کہ جن پر عذاب آیا اس کی علت کیا ہے وہ نافرمانی ہے پس سمجھ لو اگر تم نے بھی نافرمانی کی تو تم پر بھی ویسا ہی عذاب آئے گا اور اشتراک علت کی وجہ سے غیر منصوص میں منصوص کے حکم کو جاری کرنے کا ہی نام قیاس ہے جلال الدین سیوطی تفسیر اکلیل میں فرماتے ہیں استدل بہ علی حجیۃ القیاس وانہ فرض کفایۃ علی المجتہدین لان الاعتبار قیاس الشئ بالشئ۔ انتہی یعنی آیت مذکورہ اس امر کی دلیل ہے کہ قیاس حجت ہے اور مجتہدین پر قیاس فرض علی الکفایہ ہے اس لئے کہ اعتبار کے معنی ایک شئ کو دوسری شئ پر قیاس کر لینے کے ہیں قیاس کے حجت ہونے کے بارے میں بے شمار حدیثیں ہیں جن کے لئے ایک دفتر چاہیے۔ لہذا ہم صرف ایک حدیث پر اکتفا کرتے ہیں۔

عن معاذ بن جبلؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما بعثہ الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لک قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ قال فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ قال اجتہد برأیی ولا آلو قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی صدرہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا تو یہ پوچھا کہ اگر کوئی قضیہ پیش آیا تو کس طرح فیصلہ کروگے عرض کیا کہ کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کردوں گا فرمایا اگر وہ حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو عرض کیا کہ سنت اور حدیث کے مطابق فیصلہ کردوں گا۔ فرمایا کہ اگر وہ حکم حدیث میں بھی نہ پایا تو عرض کیا کہ اس وقت اجتہاد اور استنباط کروں گا اور اپنی رائے سے فیصلہ کردوں گا اور اجتہاد میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑوں گا یعنی محض اٹکل اور تخمین سے فیصلہ نہ کردوں گا بلکہ نہایت غور و فکر کے بعد فیصلہ کروں گا۔ معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ آپ نے

وقال الله الحمد لله الذی
وفق رسول رسول الله لما
یرضی به رسول الله
(رواه ابوداؤد والترمذی والدارمی)

فرطِ مسرت سے) اپنا دست مبارک میرے سینہ پہ مارا اور فرمایا
کہ الحمد للہ۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہ کے رسول
یعنی قاصد کو ایسے امر کی توفیق دی جس کو اللہ کا رسول پسند کرتا ہے
رواہ ابوداؤد والترمذی والدارمی۔

اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔

(اول) یہ کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جو قرآن اور حدیث میں ان کا حکم منصوص نہیں۔

(دوم) غیر منصوص مسائل میں اپنی رائے اور اجتہاد سے فیصلہ کرنا نہایت مستحسن اور اللہ اور اس کے رسول کی عین مرضی کے مطابق ہے

(سوم) یہ کہ رائے اور اجتہاد حق سبحانہ و تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے الحمد للہ پڑھا اور اللہ کا شکر ادا کیا اور فرطِ مسرت سے معاذ بن جبل کے سینہ پہ ہاتھ مارا اشارہ اس طرف تھا کہ دست نبوی ___ کے فیوض و برکات مجتہد اور فقیہ کے ساتھ ہیں۔ اور غیر منصوص مسائل میں صحابہ اور تابعین کا اجتہاد اور قیاس سے فتوی دینا حد تواتر کو پہونچ چکا ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ قیاس کی حجیت پر تمام صحابہ اور تابعین کا اجماع ہے امام بخاری نے قیاس کی حجیت ثابت کرنے کے لئے صحیح بخاری میں ایک باب منعقد فرمایا۔ باب من شبہ اصلاً معلوماً باصل مبین وقد بین النبی صلی اللہ علیہ وسلم حکمہما لیفہم السائل۔

• حافظ عسقلانی اسی باب کی شرح میں فرماتے ہیں

اول من انکر القیاس ابراھیم النظام وتبعہ بعض المعتزلۃ وممن ینسب الی الفقہ داؤد بن علی الظاہری وما اتفق علیہ الجماعۃ ھو الحجۃ فقد قاس الصحابۃ فمن بعدھم من التابعین وفقہاء الامصار وباللہ التوفیق۔

سب سے پہلے قیاس کا انکار نظام معتزلی اور داؤد ظاہری نے کیا اور اہل سنت والجماعت جس چیز پر متفق ہیں یعنی حجیت قیاس، وہی حجت اور معتبر ہے اس لئے کہ صحابہ اور تابعین اور فقہاء امصار نے غیر مسائل منصوص میں قیاس کیا ہے۔

وانشد ابن عبد البر لابی محمد الیزیدی النحوی المقرئ المشہور براویۃ عمرو بن العلاء من ابیات طویلۃ فی اثبات القیاس۔

لا تکن کالحمار یحمل اسفا　راً کما قد قرأت فی القرآن
مثل حمار کے مت ہو کہ دفتر اٹھائے ہوئے ہے اور سمجھتا کچھ نہیں

ان ھذا القیاس فی کل امر　عند اھل العقول کالمیزان
اہل عقل کے نزدیک۔ قیاس اور استنباط بمنزلہ ترازو کے ہے۔

لا یجوز القیاس فی الدین الا لفقیہ لدینہ صوان

دین میں صرف اس شخص کے لئے قیاس جائز ہے کہ جو نصوص کو کما حقہ سمجھتا ہو اور اپنے دین کا پورا پورا محافظ ہو یعنی ورع اور تقوی میں کامل ہو۔

لیس یغنی عن جاھل قول راو عن فلان وقول عن فلان

بلا سوچے بوجھے محض حدثنا فلان عن فلان کہہ دینا کافی نہیں۔

ان اتاہ مسترشد افتاہ بحدیثین فیہما معنیان

جس شخص کو حدیث کے الفاظ تو یاد ہوں مگر مراد معلوم نہ ہو تو ایسے شخص سے اگر کوئی استفتاء کرے تو وہ متضاد فتویٰ دے گا۔

ولنا فی النبی صلی اللہ علیہ والصالحون کلہم ان

اور ہمارے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صالحین کا اسوۂ حسنہ موجود ہے۔

اسوۃ فی مقالہ لمعاذ اقض بالرائی ان اتی الخصمان

کہ آپ نے معاذ بن جبل کو حکم دیا کہ رائے اور قیاس سے فیصلہ کرنا۔

وکتاب الفاروق یرحمہ اللہ الی الاشعری فی تبیان

اور حضرت فاروق اعظم نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو جو والا نامہ تحریر فرمایا ہے اس میں تصریح ہے۔

قس اذا اشکلت علیک امور ثم قل بالصواب والعرفان

کہ جب تجھ پر اشکال پیش آئے تو قیاس کرنا اور پھر صواب اور معرفت کے ساتھ فتویٰ دینا۔ اس میں قیاس کا حکم صراحۃً مذکور ہے فتح الباری ص ۲۲۵ ج ۱۳

رائے محمود اور رائے مذموم

حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں نہایت تفصیل سے یہ ثابت کیا ہے کہ رائے کی دو قسمیں ہیں ایک محمود اور ایک مذموم محمود وہ ہے کہ جو اصول اور قواعد کے مطابق ہو اور کتاب اور سنت اور اجماع امت سے ماخوذ ہو۔ اور مذموم وہ ہے کہ جو نصوص کے خلاف ہو یا محض ظن اور تخمین پر مبنی ہو جن احادیث اور آثار صحابہ میں رائے کی مذمت آئی ہے اس سے اس قسم کی رائے مراد ہے، اور جن آیات اور احادیث میں رائے کی تعریف آئی ہے اس سے رائے محمود مراد ہے حافظ ابن قیم۔ دونوں قسم کی روایتیں تفصیل کے ساتھ نقل کرکے فرماتے ہیں

ولا تعارض بحمد اللہ بین ہذہ الآثار عن السادۃ الاخیار بل کلہا حق وکل منہا لہ وجہ الخ اعلام الموقعین ص ۶۸ ج ۱

یعنی بحمد اللہ ان آثار میں کوئی تعارض نہیں سب حق ہیں ہر ایک کی وجہ اور محل علیحدہ ہے۔ اھ۔

اسی طرح حافظ موصوف نے اعلام الموقعین اور حافظ ابن تیمیہ نے کتاب القیاس فی الشرع الاسلامی میں قیاس کی دو قسمیں کی ہیں ایک قیاس صحیح اور ایک قیاس فاسد حافظ ابن تیمیہؒ منہاج السنۃ صفحہ ۱۲ میں فرماتے ہیں کہ صحابہ سے رائے اور قیاس کی مدح اور مذمت دونوں مروی ہیں اور دونوں قول صحیح ہیں جو رائے اور قیاس منصوص کے معارض ہو وہ مذموم ہے جیسے مشرکین کا یہ قیاس انما البیع مثل الربا ونحو ذلک اور جو رائے اور قیاس کتاب و سنت اور اجماع امت سے مستفاد ہو اور قواعد شرعیہ کے مطابق ہو وہ محمود ہے۔ انتہی۔ اسی طرح امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں ایک باب قیاس صحیح کی حجیت کے لئے منعقد کیا جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں اور ایک باب رائے مذموم اور قیاس فاسد کی تحذیر میں منعقد فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ باب ما یذکر من ذم الرای وتکلف القیاس ولا تقف ولا تقبل ما لیس لک۔ حافظ ابن حجرؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

ما یذکر من ذم الرأی ای الفتوی بما یؤدی الیہ النظر وھو یصدق علی ما یوافق النص وعلی ما یخالفہ والمذموم منہ ما یوجد النص بخلافہ واشار بقولہ من الی ان بعض الفتوی بالرأی لا تذم وھو اذا لم یوجد النص من کتاب او سنۃ او اجماع (فتح الباری ص ۲۳۸ ج ۱۳)

وقال ابن بطال التوفیق بین الآیۃ والحدیث فی ذم العمل بالرأی بین ما فعلہ السلف من استنباط الاحکام ان نص الآیۃ ذم القول بغیر علم فخص بہ من تکلم برأی بمجرد عن استناد الی اصل ومعنی الحدیث ذم من افتی مع الجھل ولذلک وصفھم بالضلال والاضلال والا فقد مدح من استنبط من الاصل لقولہ تعالیٰ لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم فالرأی اذا کان مستنداً الی اصل من الکتاب او السنۃ او الاجماع فھو المحمود واذا کان لا یستند الی شئ منھا فھو المذموم قال وحدیث سھل بن حنیف وعمر بن الخطابؓ وان کان یدل علی ذم الرأی لکنہ مخصوص بما اذا کان معارضاً للنص فکانہ قال اتھموا الرأی اذا خالف السنۃ۔ آہ (فتح الباری ص ۲۴۲ ج ۱۳)

حاصل کلام یہ ہے کہ جن آیات اور احادیث میں عمل بالرای کی مذمت آئی ہے اس سے وہ رائے مراد ہے کہ جو محض اپنی رائے ہو اور اس کی دلیل نہ ہو اور اسی طرح حدیث میں اس شخص کی مذمت آئی ہے کہ جو بلا علم اور بلا تحقیق فتوے دے اور خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو گمراہ کرے اور جو لوگ کتاب و سنت سے صحیح استنباط کرنے والے ہیں ....

اللہ تعالیٰ نے لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم میں ان کی مدح فرمائی ہے۔

تنبیہ افسوس کہ حضرات اہل حدیث حافظ ابن تیمیہ اور . . ابن قیم کی کتابوں سے رائے مذموم کے بارے میں صحابہ اور تابعین کے جو اقوال ہیں۔ ان کو تو نقل کر دیتے لیکن اصل قیاس صحیح

اور رائے محمود کے بارہ میں جو احادیث اور اقوال صحابہ انھیں کتابوں میں مذکور ہیں ان کو ذکر نہیں کرتے ہیں کیا یہ خیانت نہیں اور حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم جن کی کتابوں سے یہ عبارتیں نقل کرتے ہیں وہ خود امام احمد بن حنبل کے مقلد نہیں تھے سب کو معلوم ہے کہ حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم امام احمد بن حنبل کے مقلد تھے

لطیفہ تعجب ہے کہ حضرات اہل حدیث امام بخاری کو مجتہد بھی بتلائیں اور منکر قیاس بھی۔ بھلا جسکے پاس قیاس و اجتہاد نہ ہو اور نہ صاحب رائے ہو مجتہد کیسے ہو سکتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ رائے محمود اور قیاس صحیح کی حجیت پر تمام علماء اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے سوائے داؤد ظاہری اور ان کے متبعین جن کو فرقۂ ظاہریہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کوئی قیاس کا منکر نہیں۔ امام شعرانی نے فتوحات مکیہ سے نقل کیا ہے۔

ان الامام اباحنیفۃ کان یقول ایاکم و القول فی دین اللہ بالرأی و علیکم باتباع السنۃ	امام ابوحنیفہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کے دین میں اپنی رائے سے بات کہنے سے بچو سنت کا اتباع کرو۔

پس جب خود امام صاحب موصوف یہ فرماتے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خود اس کے مرتکب ہوں۔

لقب اصحاب الرائے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اصحاب الرائے ان فقہاء صحابہ کا لقب تھا جو حضرات صحابہ منصب افتاء پر فائز تھے وہی اس لقب کے ساتھ پکارے جاتے تھے چنانچہ کنز العمال میں ہے۔

عن القاسم ان ابا بکر الصدیق کان اذا نزل بہ امر یرید فیہ مشاورۃ اھل الرأی و الفقہ دعا رجالا من المہاجرین و الانصار دعا عمر و عثمان و علیا و عبدالرحمن بن عوف و معاذ بن جبل و ابی بن کعب و زید بن ثابت و کل ھؤلاء کان یفتی فی خلافۃ ابی بکر و انما تصیر فتوی الناس الی ھؤلاء فمضی ابوبکر علی ذلک ثم ولی عمر فکان یدعو ھؤلاء النفر۔	صدیق اکبرؓ کو کوئی بات پیش آتی تو اہل الرائے اور اہل الفقہ کو مشورہ کے لئے بلاتے مہاجرین اور انصار میں سے اہل علم کو بلاتے حضرت عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور معاذ بن جبلؓ اور ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ کو بلاتے یہی لوگ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں فتوے دیتے تھے پھر حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے وہ بھی انھیں حضرات سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اور فتوے کا مدار انھیں پر تھا۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ اہل الرائے اور اہل فقہ کا امتیازی لقب صرف فقہاء صحابہ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اہل حدیث تو تمام صحابہ تھے مگر فتوے اہل الرائے ہی دیتے تھے۔ بعد میں یہ لقب امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب کا ہو گیا اور اس زمانہ کے تمام اہل حدیث نے امام ابوحنیفہ کو امام اہل الرائے کا لقب دیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرات محدثین کے نزدیک فتوے اصحاب الرائے ہی کا معتبر تھا چنانچہ

یحییٰ بن معین سے منقول ہے۔

الرأی رأی ابی حنیفة وعلیہ ادرکت الناس — رائے تو ابوحنیفہ ہی کی ہے اور اسی پر تمام لوگوں کو پایا

اور امام شافعیؒ کا مقولہ مشہور ہے الناس فی الفقہ عیال ابی حنیفة تمام لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے عیال ہیں اور عیال لغت میں اس کو کہتے ہیں کہ جو کسی کی تربیت اور پرورش میں ہو علامہ موفق نے اسی کو نظم کیا ہے۔

ائمة هذهِ الدنیا جَمِیعًا — بلاریب عیال ابی حنیفة

اس دنیا کے تمام امام بلاشبہ امام ابوحنیفہ کے عیال اور اطفال ہیں۔

وکفة فِقْهِهِم ثَقُلَتْ عِیَانًا — وکفّةُ فقهِهِم جاءت خفیفة

امام ابوحنیفہ کے فقہ اور اجتہاد کا پلہ سب سے بھاری ہے اور اوروں کا پلہ ہلکا ہے۔ کتاب المناقب ص۱۶۸ ج۲

ابو القاسم غسان تمیمی فرماتے ہیں۔ ؎

وضع القیاس ابوحنیفة کله — فاتی بلا وضح حجة وقیاس

والناس یتبعون فیها قوله — لما استبان ضیاءه للناس

افدی الامام اباحنیفة ذا التقی — من عالم بالشرع والقیاس

سبق الائمة فالجمیع عیاله — فیما تجراه بجسن قیاس

تبییض الصحیفة فی مناقب الامام ابی حنیفةؒ للحافظ السیوطیؒ ص۲۹

سوید بن نصر جو امام ترمذی اور نسائی کے شیوخ میں ہیں فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مبارک کو یہ کہتے ہوئے سنا۔

لا تقولوا رأی ابی حنیفة ولکن قولوا تفسیر الحدیث — ابوحنیفہ کی رائے مت کہو بلکہ یہ کہو کہ حدیث کی شرح اور تفسیر ہے

کتاب المناقب للموفق ص۵۲

امام بخاریؒ کا اہل الرائے کی کتابوں سے استفادہ

حافظ ابن حجر عسقلانی مقدمہ فتح الباری میں امام بخاری کا قول نقل کرتے ہیں۔ قال فلما طعنت فی ستة عشر سنة حفظت کتب ابن المبارک ووکیع وعرفت کلام هؤلاء یعنی اصحاب الرأی ص۴۷۹ وقال ایضا لما جلست للتحدیث حتی عرفت الصحیح من السقیم وحتی نظرت فی کتب اهل الرأی الخ (مقدمہ ص۴۷۹) امام بخاری فرماتے ہیں کہ جب میں سولہ سال کے سن میں داخل ہوا تو عبداللہ بن مبارک اور وکیع کی کتابوں کو حفظ کر لیا اور اہل الرائے کے کلام کو خوب

پہچان لیا اور اس وقت تک تدریس کے لئے نہیں بیٹھا جب تک حدیث صحیح اور سقیم میں مجھ کو امتیاز نہیں ہوگیا اور اہل الرائے کی کتابوں میں خوب اچھی طرح دیکھ نہیں لیا معلوم ہوا کہ امام بخاری کے نزدیک تدریس وتعلیم کے لئے بیٹھنے سے پہلے اہل الرائے کی کتابوں کو دیکھنا اور سمجھنا نہایت ضروری تھا بغیر اس کے تدریس وتعلیم کے قابل نہیں۔ اور عبداللہ بن مبارک اور وکیع کی کتابوں کا حفظ کرنا ضروری ہے۔ اور محدثین اور فقہاء میں عبداللہ بن مبارک اور وکیع کا امام ابوحنیفہ کے تلامذہ خاص میں سے ہونا اور ان کے تفقہ کا شیدا اور دلدادہ ہونا معروف اور مسلم ہے امام بخاری کے اس کلام سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محدثین کی نظر میں اہل الرائے کا فقہ معتبر تھا اس سے استفادہ کو ضروری اور تدریس کے لئے موقوف علیہ سمجھتے تھے بلکہ معرفت احادیث کے ہم پلہ سمجھتے تھے بظاہر امام بخاری کو اہل الرائے کی کتابوں کے مطالعہ کا داعیہ یہ پیش آیا کہ اپنے اساتذہ اور اساتذۃ الاساتذہ کو فقہ ابی حنیفہ کے مدح میں رطب اللسان پایا۔

امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں یہ ارادہ فرمایا کہ یہ کتاب حدیث اور فقہ دونوں کی جامع ہو اس لئے مسائل غریبہ کے استنباط کے لئے تراجم منعقد فرمائے اسی وجہ سے علماء میں یہ مشہور ہوگیا کہ فقہ البخاری فی تراجمہ لہٰذا ایسی جامع کتاب کے لئے حدیث اور فقہ دونوں کی ہی ضرورت ہوئی۔ حدیث امام بخاری نے محدثین سے لی اور فقہ اور استنباط کے لئے اہل الرائے کی کتابوں سے مدد لی تاکہ حدیث کے ساتھ فقہ کو بھی جمع کرسکیں۔

قیاس حجت شرعیہ ہے

کتاب اور سنت اور اجماع امت سے یہ امر بخوبی واضح ہوگیا کہ قیاس شرعاً حجت اور معتبر ہے لہٰذا جو حکم اور فتویٰ قیاس شرعی کی بناء پر دیا جائے گا وہ حکم شرعی سمجھا جائے گا اور اس کا اتباع شریعت ہی کا اتباع سمجھا جائے گا۔ جو حاکم اور جج قانونی نظائر اور شواہد کی بناء پر کوئی حکم صادر کرتا ہے وہ حکم شاہی ہی سمجھا جاتا ہے اور اس حکم سے انحراف کرنے والا حکومت کا مجرم قرار پاتا ہے اس لئے کہ یہ جج کا ذاتی حکم نہیں بلکہ قوانین حکومت اور آئین سلطنت کے ماتحت ہے اس لئے رعایا پر اس کا اتباع واجب ہے۔ اسی طرح مجتہدین قیاس اور استنباط سے جو فتویٰ دیتے ہیں وہ ان کی ذاتی رائے نہیں ہوتی۔ بلکہ اصول شریعت کے ماتحت۔ شریعت کے منشاء کو ظاہر کردیتے ہیں، اس لئے تمام فقہاء بالاتفاق یہ تصریح فرمارہے ہیں کہ قیاس مثبت حکم نہیں بلکہ مظہر حکم ہے یعنی جو حکم قرآن و حدیث میں مخفی تھا قیاس نے اس کو ظاہر کردیا۔ قیاس نے اپنے طور پر کوئی مستقل حکم نہیں دیا۔ اصل حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہے۔ کما قال تعالیٰ ان الحکم الا للّٰہ نبی اور رسول کا حکم بعینہٖ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور حکم خداوندی کا مظہر ہے اس لئے حضرات انبیاء کی اطاعت، اطاعت خداوندی ہے [illegible] حضرات [illegible] ان کے قول و عمل کو [illegible] سمجھا [illegible] فقہاء و مجتہدین کے اتباع کو شرک قرار دیتے ہیں [illegible]

حضرات انبیاء کے اتباع کو بھی شرک قرار دیتے لیکن خلفائے راشدین کے سنت کو تو بدعت کہنے ہی لگے ہیں شیخ محی الدین ابن عربی قدس اللہ سرہ نے مجتہدین کی مدح میں طویل کلام فرمایا۔ اس کا ملخص اور محصل ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

حق جل شانہ نے حضرات انبیاء و مرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کو شریعت عطا فرمائی اور منصب تشریع ان کو عطا کیا۔ اور علماء امت کو ان حضرات کا وارث بنایا۔ اور احکام غیر منصوصہ میں اجتہاد اور استنباط کا حکم دیا کہ منصب تشریع میں سے مجتہدین کو کچھ حصہ ملے جس طرح نبی پر اپنی شریعت کا اتباع لازم ہے اسی طرح مجتہد کو اپنے اجتہاد پر عمل کرنا لازم ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس کا اجتہاد ہے بلکہ اس لئے کہ شریعت کی طرف سے اسی کا مامور اور مکلف ہے کہ اپنے اجتہاد پر عمل کرے۔

(۱) تشریع انبیاء اور تشریع فقہاء میں محض لفظی اور صوری اشتراک ہے حقیقت دونوں کی الگ الگ ہے چونکہ حضرات انبیاء معصوم عن الخطاء ہیں اس لئے ان کی تشریع قطعی ہے اور فقہاء معصوم نہیں اس لئے ان کی تشریع ظنی ہے۔

(۲) انبیاء کرام کی تشریع مستقل ہے اور فقہاء کی تشریع کتاب وسنت کے تابع ہے۔ اگر فقہاء کو حضرات انبیاء کی طرف سے کتاب وسنت کا مادہ عطا نہ کیا جاتا تو اجتہاد اور استنباط پر قادر نہ ہوتے

(۳) احکام شرعیہ میں ناسخ ومنسوخ ہیں اور احکام اجتہادیہ میں رجوع عن الاجتہاد ہے جس طرح حضرات انبیاء وحی الٰہی کے تابع ہیں۔ جب تک کہ کوئی دوسری وحی اس کے نسخ کے لئے نازل نہ ہو اسی طرح مجتہدین اپنے اجتہاد کے پابند ہیں جب تک کہ کوئی دوسرا اجتہاد اس کے خلاف سانح نہ ہو۔

الغرض اجتہاد ایک نفحہ ہے نفحات تشریع میں سے عین تشریع نہیں۔ لمعہ ہے لمعات وحی میں سے عین وحی نہیں۔ نور وحی کی ایک شعاع اور پرتو ہے بلاشبہ عین آفتاب نہیں مگر اس کے مباین اور مغائر بھی نہیں جیسا کہ شعاعیں آفتاب کا عین نہیں اس لئے اصل اور فرع کے احکام مختلف ہوئے۔ اور غیر بھی نہیں اس لئے وہ شعاعیں آفتاب ہی کی طرف منسوب سمجھی جائیں گی اور ان سے قطع نظر کرنا جائز نہ ہوگا۔ اسی طرح احکام قیاسیہ شریعت کی طرف منسوب ہوں گے اور احکام شرعیہ کہلائے جائیں گے۔ اور ان کا اتباع لازم اور ضروری ہوگا۔ شیخ فرماتے ہیں کہ اللھم صل علی آل محمد کما صلیت علی آل ابراھیم کا مطلب یہ ہے کہ اے پروردگار جس طرح تو نے اپنی رحمت سے آل ابراہیم میں انبیاء و مرسلین بنائے اور ان کو وحی اور شریعت عطا فرمائی اسی طرح آل محمد میں بھی ایسے علماء پیدا فرما۔ کہ وہ تشریع احکام میں انبیاء کے وارث ہوں کہ اجتہاد و استنباط سے احکام شرعیہ کی تشریح

اور تشریح فرمائیں۔ سورۃ الحمد للہ اس امت کے مجتہدین۔ انبیاء کرام کے مشابہ ہوئے اور شریعت نے ان کے اجتہاد اور استنباط کو معتبر اور حکم شرعی قرار دیا اور اس امت کے علماء اور فقہاء کا حشر قیامت میں انبیاء اور مرسلین کی صفوف میں ہوگا۔ امم کی صفوف میں نہ ہوگا۔ اور یہ اجتہاد امت محمدیہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ انتہی۔

اور بظاہر اجماع کی حجیت وہ بھی اسی امت مرحومہ کا خصیصہ ہے۔

کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تجتمع امتی علی الضلالۃ۔	آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی۔

امتی کے لفظ میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم آپ کی امت کے ساتھ مخصوص ہے مجتہدین کا قیاس اور استنباط تو تشریع انبیاء کی وراثت تھی اور اجماع بظاہر عصمت کی وراثت ہے قیاس اور استنباط میں ہر مجتہد فرداً فرداً وارث ہوا لیکن عصمت عن الخطاء یہ خاصہ نبوت کا ہے۔ اس لئے عصمت عن الخطاء کی وراثت مجموعہ امت کو برنگ اجماع عطا کی گئی۔ فرداً فرداً اس کا عطاء کرنا خلاف حکمت اور مصلحت ہے حق تعالیٰ شانہ کی تقسیم ہے جس طرح چاہیں تقسیم فرمائیں۔ علماء ربانیین کو علوم شریعت کا وارث بنایا۔ اور اولیاء اور عارفین کو حضرات انبیاء و مرسلین کی آیات بینات اور معجزات کا برنگ کرامات وارث بنایا اور چونکہ شریعت اصل نبوت ہے اور معجزہ اس کی تائید اور تصدیق کے لئے ہے مقصود بالذات نہیں اس لئے کتاب و سنت نے بہ نسبت ولایت کے علم کا پلہ بھاری رکھا۔

ظاہر نصوص کا اتباع

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ظاہر نصوص کا اتباع واجب ہے اور نص کے مقابلہ میں قیاس قطعاً ناجائز اور حرام ہے مگر ظاہر نصوص کے اتباع کا یہ مطلب نہیں کہ آیت قرآنی اور حدیث نبوی کا جو لفظی ترجمہ ہو اس پر عمل کرنا واجب ہے جب یہ آیت نازل ہوئی کہ کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود تو ایک صحابی خیط ابیض اور خیط اسود کا جو ظاہری اور لفظی ترجمہ تھا اس کے مطابق اپنے تکیہ کے نیچے ایک سیاہ اور ایک سفید ڈورا رکھ کر سو گئے۔ جب آپ کو علم ہوا تو بطور مزاح ارشاد فرمایا کہ تیرا تکیہ بہت وسیع ہے کہ جس میں خیط ابیض اور خیط اسود یعنی صبح صادق اور صبح کاذب دونوں سما گئے۔

صحابی تو اہل زبان تھے بظاہر ظاہر نص پر عمل فرمایا مگر صاحب شریعت نے اس کا اعتبار نہ فرمایا بلکہ بطور مزاح اس کا ذکر فرمایا معلوم ہوا کہ ایسی ظاہریت پر مزاح سنت نبوی ہے۔ اہل ظاہر اگر اتباع ظاہر کی وجہ

سے معذور ہیں تو حضرات فقہاء اہل ظاہر کے مزاح میں ماجور ہیں کیونکہ ایسی ظاہریت میں مزاح ہی مسنون ہے ظاہر نص کا اتباع جب واجب ہے کہ جب وہ نص صریح ہو یعنی مراد اس کی ظاہر ہو۔ کسی دوسرے معنی کا اس میں احتمال نہ ہو اور نہ وہ منسوخ ہو۔ اور نہ کوئی دلیل قوی اس کے معارض ہو اور نہ شریعت کے اصول مقررہ کے خلاف ہو۔ ایسی نص صریح کے ہوتے ہوئے عالم تو کیا ادنیٰ مومن بھی قیاس کو جائز نہیں سمجھتا اور بلاشبہ ایسی نص صریح کے مقابلہ میں قیاس کرنا شیطان کا کام ہے۔ ہاں اگر اس نص میں حقیقۃً اور مجازاً اشتراک معنی کی وجہ سے دو احتمال ہوں اور کوئی مجتہد اپنے فہم وفراست سے کسی ایک احتمال کو ترجیح دے تو یہ نص ہی پر عمل کرنا سمجھا جائے گا۔ اور کوئی عاقل اس کو قیاس بمقابلہ نص نہ کہے گا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ احزاب کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا۔

لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظۃ — کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ میں پہونچ کر۔

حسب ارشاد لشکر بنو قریظہ کو روانہ ہوا راستہ میں جب عصر کا وقت آیا تو نماز کے پڑھنے اور نہ پڑھنے میں اختلاف رائے ہوا فقال بعضھم لا نصلی حتی نأتیھا بعض نے یہ کہا کہ ہم جب تک بنو قریظہ نہ پہنچ جائیں گے اس وقت تک ہم نماز عصر نہ پڑھیں گے وقال بعضھم بل نصلی لو یرد منا ذلک بعض نے یہ کہا کہ ہم ضرور نماز پڑھیں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب نہیں کہ جو ظاہر لفظ سے سمجھ میں آتا ہے آپ کا مقصود تعجیل ہے۔ یعنی جلدی پہنچنے کی اتنی کوشش کرو کہ اگر ممکن ہو تو عصر کی نماز وہیں جا کر ادا کرو۔ آپ کا یہ مقصود نہیں کہ نماز نہ پڑھی جائے چنانچہ اس فریق نے نماز عصر راستہ میں ادا کی اور تیزی کے ساتھ روانہ ہوئے اور فریق اول نے عصر کی نماز عشا کے بعد بنی قریظہ میں جا کر پڑھی۔ جب آپ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ نے کسی پر ملامت نہیں فرمائی اب دیکھئے کہ فریق اول نے ظاہر لفظ پر عمل کیا اور نہی کو حقیقۃ پر محمول کیا۔ اور فریق ثانی نے حکم ممانعت کے صریح خلاف کیا اور نہی کو معنی مجازی پر محمول کیا یعنی ممانعت سے مقصود نماز سے منع کرنا نہیں بلکہ مقصود جلد پہونچنے کی تاکید ہے۔ اس فریق نے یہ سمجھا کہ دوسری نصوص قطعیہ اور صریحہ نے محافظۃ صلوٰۃ اور اپنے اوقات میں نماز ادا کرنے کو فرض اور ترک کو حرام قرار دیا ہے کما قال تعالیٰ ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا وقال تعالیٰ حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ ای العصر اس لئے لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظہ کی نہی اور ممانعت کو معنی مجازی پر محمول کیا۔ حق جل شانہ نے جس کو عقل سے کچھ بھی حصہ عطا فرمایا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ عمل بالرائے اور قیاس بمقابلہ نص نہیں بلکہ اجتہاد فی مراد النص ہے۔ فریق اول نے محض ظاہر لفظ پر عمل کیا اور فریق ثانی نے ظاہر معنی اور ظاہر مراد پر عمل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اول تمام ان آیات اور احادیث پر بھی عمل ہو گیا جو محافظۃ صلوٰۃ کے بارہ میں آئی

رہیں. اور فریق اول اس سعادت اور فضیلت سے محروم رہا

قال الحافظ ابن القیم فحازوا الفضیلتین امتثال الامر فی الاسراع وفی المحافظۃ علی الوقت
زرقانی شرح المواہب ص ۱۲۹ ج ۲ و فتح الباری ص ۳۱۶ ج ۷

حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ اس طائفہ نے دو فضیلتیں حاصل کیں ایک حکم تعجیل کی تعمیل اور دوسرے نماز کی اپنے وقت پر محافظت

صحیح مسلم میں ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ مجھ کو اپنے نعلین مبارکین عطا فرمائے اور یہ فرمایا کہ جو شخص تم سے ملے اور توحید اور رسالت کی شہادت دیتا ہو اس کو جنت کی بشارت سنا دو ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے مجھ کو عمرؓ ملے اور میں نے ان کو بشارت سنائی حضرت عمرؓ نے ابو ہریرہؓ کے سینہ پر زور سے ایک مکہ مارا جس سے ابو ہریرہؓ گر پڑے، اور یہ کہا کہ واپس چلے جاؤ یعنی اس بشارت کا اعلان مت کرو ابو ہریرہؓ واپس ہو گئے بارگاہ اقدس میں جا کر واقعہ عرض کیا پیچھے پیچھے عمرؓ بھی پہنچے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے ابو ہریرہؓ کو بشارت دے کر بھیجا تھا مجھ کو اندیشہ یہ ہوا کہ لوگ کہیں اس بشارت پر بھروسہ کر کے عمل نہ چھوڑ بیٹھیں اس لئے میں نے ابو ہریرہ کو روک دیا آپ نے عمرؓ کی موافقت کی اور ابو ہریرہ کو فرمایا کہ ابھی رہنے دو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ہریرہؓ کو ایک پیغام دے کر بھیجا تھا مگر حضرت عمرؓ نے یہ سمجھا کہ لوگوں پر تکاسل اور تغافل کا غلبہ ہے ایسا نہ ہو کہ غفلت شعار طبیعتیں منشا نبوی کو تو سمجھیں نہیں اور ظاہر حکم پر عمل کر کے اور مفاسد میں مبتلا ہو جائیں اس لئے سد اللذرائع ابو ہریرہؓ کو روک دیا گو بظاہر حکم نبوی کے صریح خلاف تھا مگر علت اور منشا کے اعتبار سے عین مطابق تھا۔

گفتگوئے عاشقاں در کار رب   جوشش عشق است نے ترک ادب

اہل ظاہر کی نظر ہمیشہ ظاہر لفظ پر رہتی ہے اور فقہاء کی نظر ہمیشہ علت اور منشاء پر رہتی ہے اہل ظاہر فقط لسان نبوی اور شفتین کی حرکت دیکھتے ہیں اور حضرات فقہا خداداد نور فہم اور نور فراست سے قلب نبوی اور خاطر عاطر کی حرکات ارادیہ کو دیکھ کر مراد نبوی معلوم کرتے ہیں ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ لاتکتبوا عنی شیئا الا القرآن ومن کتب عنی شیئا غیر القرآن فلیمحہ سوائے قرآن کے مجھ سے کوئی اور شئی سن کر نہ لکھو اور جس نے قرآن کے سوا مجھ سے سنکر کچھ لکھ لیا ہو اس کو مٹا دے۔

ظاہر حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حدیث کی کتابت نہ کی جائے کتابت صرف قرآن کی کی جائے۔ مگر فقہاء امت نے یہ سمجھا کہ اس ممانعت کی علت یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کو خلط نہ کیا جائے اور حدیث کو قرآن کے مشابہ نہ بنایا جائے کیونکہ دوسری نصوص سے شریعت کی حفاظت کی فرضیت اور کتابت علم کی فضیلت تواتر کے درجہ میں ثابت ہے اگر اس حدیث کے محض ظاہر الفاظ پر عمل ہوتا تو آج دنیا میں کوئی حدیث کی کتاب مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہوتی

حیات شبلی

میری نظر میں

از مولانا ابو علی ۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ

مولانا شبلی پر اُن کے شاگرد رشید اور علمی جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے جو مفصل اور جامع کتاب لکھ دی ہے اس سے وہ تمام وابستگان دامن شبلی کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں، اس میں انھوں نے مولانا شبلی کی زندگی کے تمام اہم اور قابل الذکر واقعات اور حالات اتنے بسط و تفصیل کے ساتھ قلم بند کر دیئے ہیں کہ ان پر اب مزید اضافہ مشکل ہی سے ہوسکتا ہے اس کے مقدمہ میں خلجی و تغلق شرقی و لودھی حکمرانوں کے عہد سے لے کر انگریزوں کی حکومت کے آغاز تک ہندوستان میں علوم اسلامیہ و دینیہ کے نشر و اشاعت اور درس و تدریس کی تاریخ کے ساتھ ہر عہد کے ارباب درس و تدریس اور اصحاب فضل و کمال کا تذکرہ بھی آگیا ہے، یہ اس قابل ہے کہ اس کو مزید افادہ کے لئے الگ سے کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا جائے۔ یہ سید صاحب کی تاریخ دانی اور تاریخ نگاری کا ایک شاہکار ہے اور اردو میں بالکل ایک نئی چیز ہے۔

مولانا شبلی کی علمی و ادبی و تاریخی تصنیفات اور مضامین اور ان کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت کی بنا پر ان کی زندگی ہی میں بعض عقیدت مندوں کو ان کی سوانح عمری لکھنے کا خیال پیدا ہوگیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ شائق جناب افتخار عالم صاحب مارہروی تھے، جو ڈپٹی نذیر احمد کی سوانح عمری حیات النذیر کے نام سے لکھ چکے تھے، اس کے متعلق بعض اہل نظر کا خیال ہے کہ وہ اصلاً ڈپٹی نذیر احمد ہی کی لکھی ہوئی ہے، وہ اپنے حالات املا کراتے جاتے تھے، اور یہ پوری عقیدت کے ساتھ لکھتے جاتے تھے اس طرح وہ مولانا شبلی کی سوانح عمری بھی قلمبند کرنا چاہتے تھے، کہ مولانا اپنے حالات ان کو املا کراتے جائیں، اور یہ لکھتے جائیں، اس طرح سے ان کے کارناموں میں ایک اور کارنامہ کا بھی اضافہ ہو جائے، مگر مولانا نے اس ننگ کو گوارا نہیں کیا۔ اور فرمایا کہ میں خود اپنا آلہ کیا بنا ؤں پھر سوانح عمری تو مرنے کے بعد لکھی جاتی ہے، اگر آپ لکھیں گے بھی، تو بہر حال وہ مکمل نہیں ہو سکتی، اصل میں [illegible] خواہش

تھی، کہ ان کا سوانح نگار بھی علمی شہرت وعظمت وجلالت کے لحاظ سے اسی کا ہم مرتبہ ہو، ان کی نظر انتخاب اول ہی دن سے اپنے لائق شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی پر پڑ چکی تھی، جب افتخار عالم صاحب مولانا سے مایوس ہو گئے، تو انھوں نے ان کے ان لائق وفاضل شاگرد کو درمیان میں ڈالا۔ اور ان سے مولانا کی خدمت میں سفارشی خط لکھوایا۔ تو مولانا نے ان کو لکھا، کہ بھئی منشی افتخار عالم صاحب۔ وی لالٹن کیا لکھیں گے، تم ہی جب دنیا کے تمام مکروہات سے فارغ ہو تا تو لکھ دینا۔ اس کو خدانخواستہ مولانا کے استکبار اور ترفع پسندی پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ منشی صاحب مرحوم صرف اردو فارسی کا علم رکھتے تھے، گو وہ خوش سلیقہ، خوش قلم، ثقہ اور سنجیدہ تھے، تاہم مولانا پر لکھنے کے لئے علوم عربیہ، فنون کلامیہ اور عربی ادب وتاریخ کی واقفیت واطلاع ضروری تھی، جس سے وہ محروم تھے، اس لئے مولانا کا خیال تھا، اور صحیح تھا، کہ وہ ان کی سوانح نگاری کے فرض سے بہ آسانی عہدہ برآنہ ہو سکیں گے۔ اس لئے یہ بات یہیں پر ختم ہو گئی، اس سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

سید صاحب نے مولانا کی وفات کے بعد، ان کے مختصر حالات ان کے سلسلے کلامیہ حیدرآباد کی مشہور کتاب الغزالی کے ایک نئے اڈیشن میں جو اصح المطابع لکھنؤ میں چھپ رہا تھا، بطور دیباچہ کے لکھے پھر جب دار المصنفین قائم ہوا، اور معارف نکلا تو اس کے دوسرے ہی پرچہ اگست ۱۹۱۶ء میں اس کو دوبارہ نقل کیا۔ پھر مولانا کے مرض الموت کے حالات وکیفیات اور مولانا کی زندگی کے کچھ احوال اور واقعات پر مسلسل مضمون دو تین قسطوں میں ۱۹۱۵ء کے روزنامہ "زمیندار" لاہور میں لکھے، اسی طرح مولانا کے احباب میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۰ جنوری ۱۹۱۵ء میں، مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے ماہنامہ دلگداز میں، خواجہ غلام الثقلین نے اپنے رسالہ عصر جدید دسمبر ۱۹۱۴ء میں، مولانا حسرت موہانی نے اپنے ماہنامہ اردوئے معلیٰ میں اور مولانا عبداللہ عمادی نے زمیندار لاہور نومبر ۱۹۱۴ء میں ان کے علاوہ اور بہت سے اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹروں نے ان کے حالات، مرثیے، اور نوحے لکھے اور شائع کئے۔ مولانا کی مستقل سوانح عمری لکھنے کی کوشش سب سے پہلے منشی محمد مہدی صاحب نائب مہتمم تاریخ بھوپال نے کی، انھوں نے بشیر پاشا سپرنٹنڈنٹ کے ضمن میں، مولانا کے حالات میں بھی ایک رسالہ تذکرۂ شمس العلماء مولانا شبلی کے نام سے ۱۹۱۵ء میں لکھا، غازی پور کے ایک صاحب نے انگریزی میں بھی ایک مضمون لکھا تھا، جو غالباً الہ آباد کے پانیر میں شائع ہوا تھا، لیکن ان سب پر کسی طرح سوانح عمری کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا ان کے شائع ہونے کے بعد بھی ان کی ایک مفصل اور مستند سوانح عمری کی ضرورت باقی تھی، جس کے لئے ان کی نظر انتخاب جیسا کہ ابھی آپ نے اوپر پڑھا پہلے ہی دن سے

اپنے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی پر پڑ چکی تھی، جس کے احساس سے وہ کبھی غافل نہیں رہے اور برابر اس کی فکر میں رہے

چنانچہ انھوں نے مولانا شبلی کی تمام سیرت نبوی کی تکمیل کی اور دوسرے بہت سے علمی و ملی و قومی کاموں کی مشغولیت۔ اور پھر مولانا کے خاندانی اور ابتدائی حالات سے عدم واقفیت کی بنا پر اس کام کو پہلے اپنے رفیق و شریک کار، اور مولانا شبلی کے دوسرے جلیل القدر شاگرد مولانا عبد السلام ندوی کے سپرد کیا کہ وہ مولانا سے برادری عزیز داری اور ہم وطنی کا تعلق رکھتے تھے، اور وہ اس کام کو اس لحاظ سے ان سے کہیں زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے اس کام کو اس طرح سے انجام دیا کہ اپنی برادری کے معتمد اور ثقہ بزرگوں سے جو اس وقت تک زندہ تھے، ابتدائی حالات معلوم کر کے اور مکاتیب شبلی کی دونوں جلدوں سے متفرق حالات جمع کر کے ایک سادہ سی سوانح عمری ——— انھوں نے ——— مرتب کر دی، ان کے مسودہ کو مولانا شروانی اور مولانا کے دوسرے احباب اور تلامذہ نے دیکھا تو اس میں زندگی کی روح ان کو نظر نہیں آئی، پھر یہ کام مولانا کے پرانے شاگرد مولانا اقبال سہیل کے سپرد کیا، کہ وہ بھی مولانا کے ہم برادری، ہم وطن اور عزیز تھے، اور وہ مولانا کے خاندانی حالات کی واقفیت کی بنا پر بہت کچھ لکھنے کے اہل تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، اور مولانا عبد السلام کے مسودہ کو گھٹا بڑھا کر اور اعظم گڈھ اور علی گڈھ کے زمانۂ قیام کے بہت سے نئے واقعات کا اضافہ کر کے اپنے زور قلم سے بزم میں رزم کی شان پیدا کر دی ان کا یہ مضمون ماہنامہ الاصلاح سرائے میر میں ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک سیرت شبلی کے عنوان سے مسلسل ۱۵ نمبروں میں نکلتا رہا، اس کے بعد وہ اسمبلی کی ممبری وغیرہ میں ایسے الجھے کہ وہ اس کو مکمل کرنے کے لئے مناسب وقت اور فرصت کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔ جو ان کو میسر نہیں آسکی، اور وہ ناتمام رہ گئی، اس اثنا میں مولانا کے بہت سے احباب، اعزا، اور ان کے سوانح و حالات کے مشتاق اس اشتیاق میں دنیا سے چل بسے، یہاں تک کہ مولانا کی وفات پر ۲۵۔ ۲۶ برس گذر گئے چنانچہ احباب کے مزید تقاضے اور مسلسل اصرار پر سید صاحب نے بسم اللہ کر کے ۱۹۴۰ء میں سوانح عمری کی تالیف کا آغاز کر دیا، اور تین برس کی مدت میں ۱۹۴۳ء میں اس کام کو انجام تک پہنچا دیا۔ اسی طرح سے مولانا نے اپنی سوانح عمری کے لئے جو پیشین گوئی کی تھی، وہ حرف بحرف پوری ہو گئی، اور ایک ہی دو سال میں معارف پریس میں چھپ کر قدر دانوں اور شائقین کے ہاتھوں تک پہنچ گئی، علی گڈھ کے ایک مخصوص حلقہ کے علاوہ ہر حلقہ میں پسند کی گئی، اور ان پر بہ قصر شذلمد

پروفیسر خورشید الاسلام اور ضیاء الحسن فاروقی وغیرہ نے بہت ہی حوصلہ افزا تبصرے لکھے۔

مجھ ناچیز کو نہ صرف اس کے بعض حصوں کی تبییض، کاپی اور پروفوں کی تصحیح بلکہ فہرست سازی کا بھی شرف حاصل ہے، کتاب چھپ کر بالکل تیار ہوگئی، تو سید صاحب نے مجھے فہرست مضامین بنانے کا حکم دیا میں نے سیدی صاحب کی قائم کی ہوئی چھوٹی بڑی سرخیوں کو نقل کر کے فہرست پیش کر دی فرمایا پوری کتاب پڑھ کر مضامین کے اعتبار سے فہرست بناؤ۔ میں نے مضامین کے اعتبار سے بہت ہی مفصل اور طویل فہرست بنا کر پیش کی تو بہت ہی پسند فرمائی۔ اسی کے ساتھ حواشی میں جن معاصر بزرگوں کے حالات لکھے تھے اپنی طبیعت اور ذوق سے رجال حواشی کے نام سے ان کی بھی ایک فہرست پیش کی تو اس کو بھی پسند فرمایا۔ دونوں فہرستوں کو من وعن بلا کسی ترمیم و اصلاح کے کتاب میں شامل کیا، اور عام واقفیت کے لئے ایک مہینہ کے معارف میں بھی دونوں کو شائع کیا، یہ فہرست کیا ہے کتاب کا پورا انڈکس ہے، جس میں کتاب کے مطالب ومباحث کا پورا خلاصہ آگیا ہے۔

یہ مولانا کی محض سادہ سوانح عمری نہیں ہے بلکہ ان کی وفات تک ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی، اصلاحی اور ان کے دور کی اور بہت سی تحریکوں اور سرگرمیوں کی بہت ہی مستند تاریخ بن گئی ہے، اور اس کے مقدمہ میں خلجی و تغلق، شرقی و لودھی وسوری حکمرانوں کے دور سے لے کر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبہ آگرہ و اودھ خصوصاً اس کے شمالی اضلاع بنارس، غازیپور جونپور اور اعظم گڈھ کے مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تاریخ کے ساتھ ہر دور کے ارباب فضل و کمال اور اصحاب درس و تدریس کے حالات اور کارنامے بھی قلم بند ہوگئے ہیں، جس سے اس کا افادہ اور زیادہ وسیع اور عام ہوگیا ہے۔ یہ کتاب مولانا کی سوانح عمری بھی ہے اور ان کے دور کی علمی و ادبی اور علوم دینیہ وعربیہ کے نشر و اشاعت اور درس و افادہ کی بہت ہی جامع تاریخ بھی ہے، جس پر بڑی سے بڑی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے جس طرح عرب و ہند کے تعلقات پڑھ کر اس کو اپنا موضوع بنالیا۔ اور اس پر اپنے سیال قلم سے ایک اچھا خاصا لٹریچر اکٹھا کر دیا، اسی طرح انھوں نے اس کتاب کے مقدمہ کو پڑھ کر دیار پورب میں علوم اسلامیہ کے نشر و اشاعت اور درس و تدریس کی تاریخ کو بھی اپنا موضوع بنالیا، اور سید صاحب نے جن ارباب کمال اور اصحاب درس و تدریس کا حال اجمال سے لکھا تھا، ان کے الگ الگ حالات بہت تفصیل کے ساتھ لکھے مثلاً انھوں نے سرائے میر کے ذکر میں سید علی عاشقان کا محض نام لیا ہے۔ جن کی نسبت سے اس قصبہ کا نام پڑا ہے اور جن کا مزار بھی ایک غیر محفوظ احاطہ میں موجود ہے جو صاحب مزار کی کرامت

سے روز بروز سنگ مرمر کا ہوتا جاتا ہے لیکن مولانا قاضی اطہر نے ان کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ معارف کے دو نمبروں میں لکھے ہیں، اسی طرح انھوں نے سلطان ابراہیم شرقی کے دور کے ملک العلماء، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے حالات بھی جن کا مدرسہ مسجد اٹالہ کے برامدوں میں قائم تھا بڑی تفصیل کے ساتھ معارف میں لکھے ہیں، اور تذکرہ علمائے مبارک پور تو لکھ کر قصبہ مبارک پور اور اس کے مضافات کی پوری علمی تاریخ لکھ دی ہے جو ان کا بڑا عظیم کارنامہ ہے جس کو جتنا سراہا جائے کم ہے، ان کے ان علمی و تحقیقی کارناموں کی صحیح داد تو مولانا سید سلیمان ندوی ہی دے سکتے تھے، جو بد قسمتی سے اب دنیا میں نہیں رہے کہ انھوں نے عرب و ہند کے تعلقات کی تاریخ کی جو داغ بیل ڈالی تھی، اس کو قاضی اطہر نے اتمام تک پہنچا دیا اور حیات شبلی کے مقدمہ میں جن اشخاص کا حال اجمال سے لکھا گیا تھا، ان میں سے ہر ایک پر مفصل مضمون لکھ کر ان کا موجودہ دور کے اہل علم سے پورا تعارف کرا دیا جو ایک بڑی گرانقدر علمی خدمت ہے۔

اسی طرح کی خدمت اس ضلع اعظم گڈھ کے ایک ہونہار نوجوان مصنف مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی نے بھی انجام دی ہے ان کو بھی قاضی صاحب کی طرح تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری کا بہت اچھا ذوق ہے، سلاطین شرقیہ جون پور کے دور کی تاریخ ان کا بھی موضوع ہے۔ اور اسی دور کے بعض مشاہیر علما کے سوانح و حالات میں انھوں نے مکمل مضامین لکھے ہیں، انھوں نے اپنی گراں قدر کتاب تذکرۂ علمائے اعظم گڈھ میں اعظم گڈھ کی حد تک ان تمام علماء، ادباء، فضلاء، اور اصحاب درس و تدریس کا تذکرہ جن کا ذکر حیات شبلی کے مقدمہ میں اجمال کے ساتھ آیا ہے، یا مولانا شبلی کے واقعات زندگی کے سلسلہ میں ضمناً محض ان کا نام آیا ہے بہت تفصیل سے لکھا ہے انھی میں سرائے میر کے اطراف کے ایک بزرگ مولوی محمد شفیع صاحب بھی ہیں، جن کا ذکر مدرسۃ الاصلاح کے قیام و تاسیس کے سلسلے میں بہت مجمل طور پر آیا ہے، لیکن مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی نے اپنی اس کتاب میں ان کے سوانح و حالات، اصلاحی و تعلیمی خدمات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، انھوں نے اپنے گاؤں کے قریب کے معاصر علما کے تعاون سے عربی کی یہ عظیم الشان درسگاہ قائم کر کے بقائے دوام کی مجلس میں اپنی جگہ پیدا کر لی ہے، اور اس حیثیت سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے

یہ رہنے والے ایک گاؤں سید ھا سلطان پور کے تھے۔ بچپن ہی میں سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا، حقیقی چچا حافظ قادر بخش صاحب اور ایک دوسرے چچا نے ان کو اپنی کفالت میں لے لیا، یہ

حافظ قادر بخش بسلسلہ معاش دانا پور میں رہتے تھے، اور درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، انھوں نے دانا پور ان کو بلاکر پہلے قرآن پاک حفظ کرادیا۔ اردو فارسی کی تعلیم دی پھر اسی شہر کے ایک مقام نارئیل گھاٹ کے مدرسہ میں داخل کردیا، جو اہل حدیثوں کا اس زمانہ میں بہت بڑا اور ممتاز مدرسہ تھا جس میں صوبہ بہار کے جید علماء کے علاوہ خاندان صادق پور پٹنہ کی بعض اہم شخصیتیں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہی تھیں، منصب صدارت پر مولانا سخاوت علی جونپوری کے شاگرد رشید مولانا شبلی کے استاد مولانا فیض اللہ مئوی فائز تھے، وہ مولانا محمد شفیع کی ذہانت، فطانت، صلاح وتقوی، متانت وسنجیدگی سے بہت متاثر تھے، اور ان پر بے حد شفقت فرماتے تھے، انھوں نے عربی ادب، معقولات اور منقولات کی مکمل تعلیم اسی مدرسہ دار الحدیث نارئیل گھاٹ میں حاصل کی۔ رفقاء درس میں ایک صدر مدرسہ کے نامور فرزند مولانا ابو المکارم محمد علی بھی تھے اس مدرسہ سے ۱۸۹۵ء میں فراغت حاصل کی اور مولانا فیض اللہ نے عربی میں سند فضیلت عطا فرمائی، اس زمانہ میں جہاں سید نذیر حسین محدث دہلوی کے حلقہ درس کی تمام عالم اسلام میں بڑی شہرت تھی، وہیں جاکر میاں صاحب سے بھی حدیث کے چند اسباق پڑھے اور سند واجازت حاصل کی، فراغت تعلیم کے بعد کچھ دنوں تک نارئیل گھاٹ پٹنہ کے مدرسہ میں تعلیمی خدمت انجام دی پھر اپنے وطن سیدھا، بڑھریا اور سمستی پور وغیرہ میں درس وتدریس کا سلسلہ قائم رکھا۔ وطن میں مستقل قیام کے بعد اصلاح المسلمین کے نام سے ایک انجمن قائم کی، اسی کے تحت قصبہ سرائے میر سے شمال کی طرف چند فرلانگ کے فاصلہ پر ایک چٹیل اور بے آب وگیاہ میدان میں مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد رکھی، جو ان کی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ ہے اس تقریب میں مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی کو خاص طور سے مدعو کیا گیا تھا۔ اور انہی کے مبارک ہاتھوں سے اس مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ اس میں اولین مدرس اسی قصبہ سرائے میر کے ایک نیک سیرت ونیک صفات بزرگ حافظ عبد الحیٔ صاحب تھے، جو سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادۂ رشد وہدایت سے اصلاح کا تعلق رکھتے تھے، پھر رفتہ رفتہ مولانا عبد الاحد مغیر بگی، مولانا تھانوی کے جلیل القدر اور مقرب ترین خلیفہ مولانا عبد الغنی پھولپوری، مولانا شبلی ندوی، حکیم محمد احمد نہرادی، مولانا عبد الغفور جیراج پوری جیسے درسیات اور علوم نقلی وعقلی کے ماہر اور تجربہ کار اساتذہ اس میں مدرس ہوکر آگئے۔ اور منتہی درجوں تک تعلیم ہونے لگی، بخاری شریف کے دورہ کا افتتاح مولانا سید اصغر حسین محدث نے کرایا تھا جو اس وقت مسجد اٹالہ جونپور کے ایک عربی مدرسہ میں درس وتدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، مولانا محمد شفیع کی اصلاحی انجمن جس کے جلسے اطراف میں ہر سال بڑی دھوم دھام سے ہوتے تھے اور مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبد الحق حقانی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبد الشکور لکھنوی، مولانا

شبیر احمد عثمانی، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا ابوبکر شیث جونپوری جیسے مشاہیر علماء اور مقررین ان میں تشریف لاکر اپنے مواعظ وارشادات سے لوگوں کو محظوظ اور فیضیاب کرتے تھے، اور اس کے تحت مولانا شفیع کے تنہا قائم کردہ مدرسہ سے مولانا شبلی کو کوئی عملی تعلق نہیں تھا، ۱۹۱۰ء میں اس انجمن کا سالانہ جلسہ مدرسہ کے وسیع کمپاؤنڈ میں منعقد ہوا تو اس میں مولانا عبیداللہ سندھی اور دوسرے مشاہیر علماء ومقررین کے ساتھ مولانا شبلی بھی مدعو کئے گئے۔ مولانا دارالعلوم ندوہ کے دو چھوٹے چھوٹے طالب علموں عبدالرحمن نگرامی اور معین الدین کو لے کر جو مولانا کی تربیت سے اس کمسنی میں بہت اچھی تقریر کرتے تھے۔ اس جلسہ میں شریک ہوئے ان بچوں نے اس بڑے جلسہ میں ایسی پرجوش اور ولولہ انگیز تقریریں کیں کہ ان کو سن کر سارا مجمع محو ہوگیا اور ایک مدت تک ان کی گونج مدرسہ کی فضا میں سنائی دیتی رہی ان میں سے ایک مولانا کی وفات کے بعد دارالعلوم سے فارغ ہوکر اس مدرسہ میں قرآن وادب کا استاد ہوکر آیا اور اپنی تدریسی صلاحیت قوت گویائی اور فطری ملکہ خطابت سے بہت جلد پورے مدرسہ پر چھا گیا، اور مولانا حمیدالدین فراہی ناظم مدرسہ کا اعتماد حاصل کرلیا یعنی مولانا عبدالرحمن نگرامی مرحوم جن کی عین عالم شباب میں وفات پر مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف میں لعل شب چراغ عنوان سے بڑا ہی دلدوز ماتم لکھا تھا۔

جب مولانا شبلی ندوہ کے اندرونی جھگڑوں اور اپنے مخالفین کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آکر ندوہ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگئے، اور اعظم گڑھ شبلی منزل آگئے، اور اسی کو اپنی علمی وتعلیمی قومی وملی سرگرمیوں کا مرکز بنانا طے کرلیا تو ان کے پیش نظر یہاں اور بہت سے منصوبے تھے، ان میں مدرسہ سرائے میر کا نظم واہتمام بھی تھا، جس سے ۱۹۱۰ء کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے بعد ہی ان کو غیر معمولی دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہو گئی تھی، وہ اس کو اپنے منصوبہ کے تحت مسلمانوں کا گروکل (یعنی تبلیغی مرکز) بنانا چاہتے تھے جس میں اسی دیار کے نوجوان دیہاتی طالب علموں کو دینی تعلیم کے حصول کے ساتھ اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے خاص طور سے تیار کیا جائے اور وہیں سے ملک کے ان علاقوں میں بھیجا جائے جہاں گروکل کانگڑی کے اپدیشکوں اور آریہ مبلغین کے اثر سے مسلمانوں کو اپنے دین سے برگشتہ ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا، انہوں نے اس کے متعلق مولانا حمیدالدین فراہی سے جو اس وقت حیدرآباد میں تھے، خط وکتابت بھی شروع کردی تھی، لیکن ان کی بقیہ زندگی کے یہ تمام منصوبے ابھی بروئے کار آئے بھی نہیں تھے کہ یہاں کے مستقل قیام کے چند ہی مہینوں کے بعد ایک مختصر سی بیماری میں انتقال کرگئے اور اپنی زندگی کی آخری مقدس کتاب سیرۃ النبی جس کو انہوں نے بڑے ولولہ اور جوش کے ساتھ لکھنا شروع کیا تھا ایک جلد لکھ بھی چکے تھے، اس کی تکمیل کی حسرت کے ساتھ اپنے ان تمام منصوبوں کے پورے ہونے کی حسرت بھی

اپنے ساتھ لے گئے۔

اب یہ درسگاہ جس کے محرک، بانی اور معمار مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی کی نسبت سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ انھیں بزرگوں کا مرتب کردہ نصاب جس کا اہم جزو قرآن پاک ہے اس میں پڑھایا جاتا ہے اور اسی کے فضلاء اور زیادہ تر تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور اس کا شمار ہندوستان کی کامیاب مرکزی درسگاہوں میں ہے۔

حیات شبلی کے ناپسند کرنے والوں میں تین بزرگ بہت ممتاز ہیں ایک مولانا شبلی کے گہرے دوست منشی محمد امین زبیری مہتمم تاریخ بھوپال ہیں جو اس کتاب کی تالیف کے دوران علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے پرانے فائلوں سے بہت سی مفید تحریریں، نظمیں، اور واقعات نقل کر کر کے سید صاحب کو بھیجتے رہے، سید صاحب نے ان کی اس مخلصانہ معاونت پر دیباچہ میں ان کا شکریہ بھی ادا کیا ہے۔ انھوں نے حیرت انگیز طور پر اس کے رد میں ذکر شبلی کے نام سے پورا ایک رسالہ لکھ دیا جس سے سید صاحب کو سخت تکلیف پہنچی، دوسرے شیخ محمد اکرام صاحب ہیں، جنھوں نے اس کے مقابلہ میں پہلے شبلی نامہ پھر اس میں مزید اضافہ کر کے یادگار شبلی مکمل کی، تیسرے ڈاکٹر وحید قریشی ہیں، جنھوں نے خطوط شبلی مرتبہ منشی محمد امین زبیری کی روشنی میں "شبلی کی حیات معاشقہ" کے نام سے پورا ایک افسانہ گھڑ دیا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ صرف وحید قریشی کے دماغ کا اختراع ہے جس کے لئے وہ اللہ تعالیٰ کے مواخذہ سے بچ نہیں سکتے۔

کمزوری کس میں نہیں ہوتی ہے، الانسان مرکب من الخطاء والنسیان، مولانا شبلی بھی اس سے مبرا نہیں تھے، سید صاحب نے حیات شبلی کے دیباچہ میں لکھ دیا ہے کہ شبلی، شبلی تھے، جنید و شبلی نہیں تھے، اس کتاب کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کرنا چاہئے، پڑھی لکھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ، علم و فن کی قدرداں خواتین سے خط و کتابت کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ مولانا شبلی نے ان خواتین سے خط و کتابت کا ذکر اپنے احباب و تلامذہ کے نام کے خطوط میں بھی کیا ہے ان میں ایک کی حیثیت افادہ کی تھی، اور ایک کی حیثیت استفادہ کی، مولانا شبلی بیگم بھوپال یعنی سلطان جہاں بیگم کے ادبی ذوق اور علم دوستی سے بھی متاثر تھے، اور اس کا ذکر بھی انھوں نے بہت والہانہ انداز الندوہ کے ایک مہینہ کے شذرات میں کیا ہے۔

تعارف و تبصرہ

نام کتاب — اسلامی شادی
نام مولف — مولانا نبیہہ محمد صاحب فیض آبادی
صفحات — ایک سو چوراسی (۱۸۴)
ناشر — مکتبہ الفیض جلال پور فیض آباد
قیمت — دس روپے ۱۰/۰۰

ملنے کے پتے۔ مکتبہ فاروقیہ ۲۲۰/۵ دریائی ٹولہ لکھنؤ، مکتبہ فیض القرآن دیوبند شاہد بکڈپو اردو بازار جلال پور فیض آباد۔ مکتبہ الجمعیۃ ۱۱/۱۷ بھوسال محلہ نزد ہندوستانی مسجد بھیونڈی ضلع تھانہ

کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اسلام میں شادی صرف ایک معاملہ ہی نہیں بلکہ اس کا درجہ ایک اہم عبادت کا بھی ہے اس لئے احادیث میں مختلف پیرایے سے اس کی ترغیب دی گئی ہے اور باوجود استطاعت و قدرت کے اس سے اعراض پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ اسلام جس طرح اپنی جملہ عباد میں سادگی اور اخلاص کا حکم دیتا ہے اسی طرح شادی کی تقریب میں بھی اسلام سادگی، اور نمود و نمائش سے اجتناب کا حکم دیتا ہے لیکن بد قسمتی سے مسلمانوں نے اپنے گرد و پیش سے متاثر ہو کر شادی کے اندر بیہودہ رسموں اور بیجا نمود و نمائش کو اس قدر زیادہ شامل کر لیا ہے کہ شادی اس زمانہ میں خانہ بربادی کا دوسرا ہوگیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے گھر کی آبادی کا ذریعہ بنایا تھا۔

مولانا محمد نبیہہ صاحب استاذ مدرسہ اسلامیہ کرامتیہ دار الفیض جلال پور ضلع فیض آباد تمام مسلمانوں کی جانب سے مستحق شکریہ ہیں کہ انھوں نے اسلامی شادی کے عنوان سے ایک جامع کتاب لکھ کر مسلمانوں کو نکاح کی اہمیت وافادیت سے باخبر کرنے کے ساتھ شادی کی بے ہودہ رسموں اور اس میں کئے جانے والی خرافات کی بھی نشان دہی کر دی ہے اور عقل و نقل کے ذریعہ ان رسوم کے مفاسد کو بھی نہایت دل نشیں پیرایہ میں بیان کر دیا ہے۔ فاضل مولف نے کتاب کو مفید سے مفید تر بنانے میں پوری کوشش کی ہے اور وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے گھر گھر پہنچایا جائے

نام کتاب	صدائے منبر حصہ اوّل
تالیف	مولانا محمد ثناء اللہ عمری ایم۔ اے
سن طباعت	۱۹۹۴ء
ناشر	ادارہ تحقیقات اسلامی جامعہ دارالسلام عمرآباد
قیمت	بارہ روپئے ۱۲/..

مولانا محمد ثناء اللہ عمری صوبۂ تامل ناڈ کے نوجوان علماء میں اپنی ٹھوس علمی استعداد، تقریر وتحریر میں کمال اور علوم قدیمہ وجدیدہ میں جامعیت کی بنا پر ایک خصوصی مقام رکھتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب صدائے منبر مولانا کے خطبات کا مجموعہ ہے جسے نظر ثانی کے وقت حذف وترمیم کے ذریعہ خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی ہے اور مولف اس میں ماشاء اللہ کامیاب ہیں اس مجموعہ میں سولہ عنوانات پر خطبات جمع کئے گئے ہیں جن میں بعض یہ ہیں۔

تزکیۂ اسلامی تعلیمات کا حاصل، ایمان بالغیب، منکرین حق کی ذہنیت، قرآن حکیم اور شفاء ومرض کا استعارہ وغیرہ ہر تقریر میں اساس وبنیاد کتاب اللہ کو بنایا گیا ہے۔ اور موضوع سے متعلق تمام آیات قرآنیہ کو جمع کرنے کی سعی کی گئی۔ زبان اور اسلوب بیان بھی دل کش ہے مدارس عربیہ کے طلبہ کی تقریری مشق کے لئے یہ کتاب بطور خاص مفید ہوگی۔

مولانا محمد الیاسؒ نے فرمایا ___ اکثر دینی مدارس میں یہ ایک بڑی غفلت کوتاہی ہوئی ہے کہ طلباء کو پڑھا تو دیا جاتا ہے لیکن اس کی کوئی خاص کوشش نہیں کی جاتی کہ اس پڑھنے پڑھانے کا جو اصل مقصد ہے (یعنی خدمت دین اور دعوت الی اللہ) وہ پڑھنے کے بعد اسی میں لگیں ___ اس غفلت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان مدرسوں نے بہت سے ہونہار فاضل فراغت کے بعد محض تحصیل معاش کو اپنا مطمح نظر بنا کر یا تو طب پڑھنے میں لگ جاتے ہیں اور یا پھر یونیورسٹیوں کے امتحان دے کر انگریزی اسکولوں میں ملازمت کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں، اور ان کی دینی تعلیم پر وقت اور روپیہ خرچ ہوا تھا اور جو محنت کی گئی تھی وہ نتائج کے لحاظ سے اس طرح سب غارت ہو جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات ... کام آتی ہے، لہٰذا پڑھانے سے زیادہ ہم کو اس کی فکر اور کوشش کرنی چاہئے کہ جو طلبہ پڑھ کر فارغ ہوں وہ دین کی خدمت ہی میں لگیں اور علم دین کے حقوق ادا کریں۔ اپنی کھیتی میں کچھ پیدا نہ ہو تو یہ بھی خسارہ ہے لیکن اگر پیدا ہو کر ... کے کام آئے تو یہ اور زیادہ خسارہ کی بات ہے۔ (از ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ)

باب الاستفتاء

از حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

س۔ انبیاء و اولیاء کے وسیلے سے دعا مانگنا۔ اور الٰہی بحق فلاں یا بطفیلِ فلاں یا بحرمتِ فلاں یا بوسیلۂ فلاں کہہ کر دعا مانگنا جائز ہے یا ناجائز حدیث کے حوالہ سے تحریر فرمائیں۔

ج۔ وسیلہ کے ساتھ دعا مانگنا جائز بلکہ مسنون ہے اور دعا کی قبولیت میں باعث تاثیر ہے۔ وسیلہ اللہ کی وہ رحمت ہے جس سے اللہ کے برگزیدہ بندے یعنی انبیاء و اولیاء وغیرہ نوازے گئے ہیں لہٰذا ان حضرات کے وسیلہ سے دعا کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا کی خصوصی رحمت و عنایت جو ان بزرگوں پر ہے اسے وسیلہ بنایا گیا۔ یہ بلاشبہ جائز ہے۔ البتہ اگر کوئی اللہ کو وسیلہ کا محتاج سمجھتا ہے۔ یا غیر اللہ کو حصولِ مطلب میں معین و مددگار سمجھتا ہے کہ ان حضرات کی مدد کے بغیر ہماری حاجت پوری نہ ہوگی یہ سب فسادِ عقیدہ کی باتیں ہیں اور ناجائز ہیں۔

بخاری شریف میں ہے کہ جب قحط ہوتا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضورؐ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلے سے بارش کی دعا مانگتے اور اس طرح فرماتے۔ اللھم انا کنا نتوسل الیک بنبینا فتسقینا وانا نتوسل الیک بعم نبینا فاسقنا فیسقوا (ترجمہ) اے اللہ ہم آپ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو (دعا مانگتے ہیں) وسیلہ بنایا کرتے تھے تو تو ہماری دعا قبول کر لیتا تھا اور بارش سے سیراب کر دیا کرتا تھا۔ اب ہم تیرے نبی کے چچا حضرت عباس کا ذریعہ اور وسیلہ اختیار کرتے ہیں تو ہم پر بارش برسا۔ چنانچہ بارش ہو جاتی تھی۔ (بخاری شریف)

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فقراء مہاجرین کے وسیلہ سے دعا کرنا احادیث میں ثابت ہے اور ترمذی شریف میں آیا ہے کہ آپ نے ایک صحابی کو دعا کرنے کا طریقہ اس طرح تعلیم فرمایا اللھم انی اسئلک واتوجہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ (اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں تیرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی رحمت کے وسیلہ سے (ترمذی ۱۹۷/۲)

طبرانی نے معجم صغیر میں اور حاکم و ابونعیم و بیہقی نے حضرت عمر فاروقؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے خطا ہوئی تو انہوں نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا فرمائی کہ اے اللہ میں تجھ سے بحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سوال کرتا ہوں کہ میرے گناہ کو بخش دے تو اللہ نے ان کی مغفرت فرمادی۔

ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے حضورؐ کا ارشاد ہے جو شخص اپنے گھر سے نماز کے لئے یہ کہتے ہوئے نکلا اللھم بحق السائلین علیک (اے اللہ میں سوال کرنے والوں کے حق کے بدلہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں) تو اسکی دعا قبول ہوگی

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ الٰہی بحق فلاں کہنا بھی جائز ہے اور بعض لوگ جو یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ اللہ پر مخلوق کا کوئی حق نہیں ہے لاحق للمخلوق علی الخالق تو یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ ترمذی شریف کی حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ سے دریافت فرمایا ھل تدری ماحق العباد علی اللہ اذا فعلوا قلت اللہ ورسولہ اعلم قال حق العباد علی اللہ ان لا یعذبھم (اے معاذ تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کے اوپر بندوں کا کیا حق ہے جبکہ وہ اطاعت کریں تو حضرت معاذ نے از راہ ادب عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں آپ نے ارشاد فرمایا اللہ پر بندوں کا حق یہ ہے کہ وہ بندوں کو عذاب نہ دے۔

س ۔ دوکان یا مکان کی پگڑی لینا یعنی کسی کو قبضہ دینے کے لئے اس سے رقم وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔ کیا دار الحرب میں اس کی گنجائش ہے؟۔

ج :۔ موجودہ دور میں جس طرح پگڑی لینے کا رواج عام ہوگیا ہے کہ ہر اگلا کرایہ دار جب کسی دوسرے کو دوکان یا مکان دیتا ہے تو پچھلی مرتبہ کے مقابلے میں ڈیرہ گنا دوگنا یا کئی گنا پگڑی کے پیسے وصول کرتا ہے۔ یہ شرعاً ناجائز اور رشوت ہے حق دوکان یا حق مکان کوئی ایسی چیز نہیں جو خریدی اور بیچی جائے وہ معدوم شی ہے اس کا کوئی معاوضہ لینا یا دینا حرام اور بیع باطل ہے۔ پگڑی کی رقم مکان یا دوکان خالی کرنے کے بدلہ میں مانگنا ظلم اور معصیت ہے اور کرایہ دار کو نقصان پہونچانے کے مرادف ہے۔ شریعت اسلام میں کسی کو نقصان پہونچانا اور ظلم کرنا جائز نہیں ایسے شخص کو حدیث میں ملعون کہا گیا ہے علاوہ ازیں مالک دوکان و مکان کی اجازت اور مرضی کے بغیر کرایہ دار کیلئے کسی دوسرے کو کرایہ پر دینے کا شرعاً حق نہیں۔ البتہ جس کرایہ دار نے آپ سے پگڑی لے کر دوکان یا مکان دیا تھا۔ اگر وہی شخص آپ سے دوکان یا مکان لینا چاہے تو اس سے اتنی ہی رقم آپ لے سکتے ہیں جتنی آپ نے دی ہے لیکن دوسروں سے پگڑی لینا قطعاً جائز نہیں ہے۔

بعض لوگ ہندوستان کو دار الحرب مانتے ہوئے پگڑی کی رقم لینے کے لئے گنجائش نکالتے ہیں وہ غیر مسلموں سے سود کے ذریعہ رقم لینا مباح سمجھتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں اول تو ہندوستان کو دار الحرب قرار دینا خود مختلف فیہ ہے اس کی حیثیت وطنی اتحومی کی ہے یہاں پر ہر ایک قوم کے مذہبی شعار کیلئے قانونی طور پر پوری آزادی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

غزل

فضا ابن فیضی

پاؤں کے کانٹے، روح کے نشتر، جیون جیون بکھرے ہیں
میرے عہد کے انسان ہیں یا زخم کے خرمن بکھرے ہیں

ہمت ہو تو جھانک کے دیکھو ہستی کی محرابوں سے
وقت ہے وہ دیوار کہ جس میں درد کے روزن بکھرے ہیں

موجِ نسیمِ صبحِ بہاراں خوب اسے پہچانے ہے
ہم جس پھول کی خوشبو بن کر گلشن گلشن بکھرے ہیں

لٹ جائے گی جسم کی چاندی سیم بدن ہشیار رہو
شہر کی خوابیدہ گلیوں میں جاگنے رہزن بکھرے ہیں

موتی جیسے جگمگ کرتے، پتھر جیسے بھاری لوگ
راہوں میں کنکر کی طرح حالات کے کارن بکھرے ہیں

مجھ سے میرے دورِ جنوں کے ناگفتہ حالات نہ پوچھ
جلتے آنسو، بھیگے شعلے، دامن دامن بکھرے ہیں

گھر سے باہر پاؤں نکالے اس موسم میں کون فضاؔ
غم کی دھوپ میں جلتے سائے آنگن آنگن بکھرے ہیں۔

قطعہ

کیسی توہین لفظ ہستی ہے — رہنے والو یہ کیسی بستی ہے
موت کو لوگ دیتے ہیں کاندھا — زندگی رحم کو ترستی ہے

وسیم بریلوی۔

REGD. No. GHN-L-13-NP-21-84
DARUL-ULOOM MONTHLY
DEOBAND (U.P.)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دار العلوم دیوبند
کے ترقیاتی منصوبے

(۱) رواق خالد کی دوسری منزل اور مزید جدید دار الاقامہ کی تعمیر جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو

(۲) **دار التربیت** (دار الاطفال) کا قیام اور اس کی تعمیر

(۳) ایک وسیع مسجد کی تعمیر جس میں اضافہ شدہ تمام طلبہ کی گنجائش ہو (قدیم مسجد ناکافی ہو چکی ہے)

(۴) علمی و دینی اجتماعات کے لئے ایک وسیع ہال کی تعمیر —— (۵) ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر

(۶) مہمان خانہ کی توسیع —— (۷) نئی درسگاہوں کی تعمیر —— (۸) **لائبریری کی تعمیر جدید**

(۹) اساتذۂ دار العلوم کی علمی ترقی کے لئے عالم اسلام سے علمی کتابوں کی فراہمی کا انتظام

(۱۰) تمام دنیا میں پھیلے ہوئے فضلاء دار العلوم سے روابط اور اُن سے متعلق معلومات۔

(۱۱) نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر تمام ذمہ داران مدارس عربیہ کا اہم کنونشن طلب کرنا۔

(۱۲) تعلیم و تربیت کے نئے اصول و ضوابط کی ترتیب اور اُن کا اجراء۔

اس ادارے کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے

دستِ تعاون بڑھانے کی شدید ضرورت ہے

مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی امداد روانہ فرمائیں —— **شکریہ**

(مولانا) مرغوب الرحمان (صاحب) دار العلوم دیوبند یوپی

[illegible]